وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ

# قرآن کریم
کے
# تفسیری نوٹ

## پارۂ اوّل

مُرتّبہ

## محمّد علی

تعداد جلد ایکہزار

قیمت فیجلد ۶ /

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

# سورۃ ۱ - الفاتحۃ

۱- بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - یہ سورت اور قرآن کریم کی دوسری تمام سورتیں سوائے سورہ توبہ کے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتی ہیں - اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ سکھایا ہے - کہ ہمارے ہر کام کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہونی چاہئے - چونکہ اس کلمہ میں اللہ تعالےٰ کی مدد طلب کی جاتی ہے - پس درحقیقت یہ کلمہ ایک مسلمان کی زندگی کی کنجی ہے - یہ اُسے کامل توحید سکھاتا ہے - اور اپنے ہر کام میں صرف اللہ تعالےٰ کی مدد طلب کرنے کی راہ بتاتا ہے - اور یہی عملی توحید ہے - کہ انسان اپنے ہر کام میں صرف اللہ تعالےٰ کی مدد پر بھروسہ رکھے - کسی اور مذہب نے روزمرّہ کاموں میں توحید کا عملی سبق ایسا نہیں سکھایا +

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم درحقیقت خود اُس سب سے پہلے ارشادِ الٰہی کی تعمیل ہے - جو ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو غارِ حرا میں پہنچا - بخاری میں ہے - کہ جب آپ غارِ حرا میں حسب معمول عبادتِ الٰہی میں مصروف تھے - تو فرشتہ آیا اور کہا - اقرأ یعنی پڑھ - آپ نے کہا - ما انا بقاری - میں تو پڑھنا نہیں جانتا - فرشتے نے پھر وہی لفظ دہرائے - اور آپ نے بھی اسی جواب کا اعادہ کیا - اور اسی طرح تین مرتبہ ہوا - چوتھی مرتبہ فرشتہ نے کہا - اقرأ باسم ربک الذی خلق خلق الانسان من علق اقرأ وربک الاکرم - یعنی اپنے ربّ کے نام کی مدد سے پڑھ - وہ ربّ جس نے سب کچھ پیدا کیا الخ - اسی اسم ربّ کی جس سے نبی کریم صلے اللہ

تجویز کرتے ہیں۔ اور اس لئے محدُود افعال کا ثمرہ بھی محدُود ٹھیراتے ہیں۔ رحمٰن گو اللہ تعالےٰ کا صفاتی نام ہے۔ مگر سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے پر نہیں بولا گیا۔ بلکہ یہ ایک خاص نام اللہ تعالےٰ کا ہی ہے۔ رحیم کا لفظ انسان پر بھی بولا گیا ہے +

اللہ تعالےٰ کی بے انتہا محبّت اور رحم

۵ - وہ لوگ جو اِس بات پر اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہ اسلام نے اللہ تعالیٰ کی جو صفات تعلیم کی ہیں۔ اُن میں محبّت اور رحم نہیں غور کریں۔ کہ اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی ذات میں محبّت اور رحم کی کیا تعلیم دیجا سکتی تھی۔ کہ سب سے پہلا کلمہ جو قرآن کریم میں سکھایا گیا ہے وہ سراسر محبّت اور رحم کی صفات سے بھرا ہوُا ہے۔ اور محبّت اور رحم بھی وہ محبت اور رحم جس کا دوسرے مذاہب میں نام ونشان تک نہیں ملتا۔ کیونکہ بلا بدل رحم اور محبّت اور پھر کسی فعل پر لے نہایت ثمرات کا مترتب کرنا یہ کسی دوسرے مذہب نے نہیں سکھایا۔ اگر اسلام نہ آیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی محبّت اور رحم کی یہ کامل صفات بھی دُنیا میں کسی نے نہ سکھائی ہوتیں +

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم خلاصہ تعلیم قرآنی ہے

۶ - یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ رحمانیّت اور رحیمیّت ہی اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کاملہ کی جڑھ قرار دیگئی ہیں۔ کیونکہ اس کلمہ میں جو درحقیقت تمام تعلیم قرآنی کا خُلاصہ ہے اس ذات کے جو تمام صفات کاملہ کو اپنے اندر لیئے ہُوئے ہیں۔ دوہی صفاتی ناموں کا ذکر فرمایا ہے۔ پس بسم اللہ الرحمٰن الرحیم خُلاصہ ہے سُورہ فاتحہ کا۔ جس طرح پر سُورہ فاتحہ خلاصہ ہے کُل قرآن کریم کا۔ عربوں کے اندر اور بعض دوسری قوموں کے اندر بیشک یہ رواج تھا۔ کہ وہ اپنی تحریروں کو تبرکاً اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کیا کرتے تھے۔ مثلاً عرب شروع میں لکھا کرتے تھے باسمك اللّٰھم۔ مگر تکمیل دین کا کام اسلام کے لیئے ہی اللہ تعالیٰ نے خاص کر رکھا تھا۔ کہ وہ ہر ایک کام کی ابتدا کے لیئے ایک ایسا جامع کلمہ سکھائے۔ جو درحقیقت ساری مذہبی تعلیم کا نچوڑ ہو۔ خوبیاں بیشک پہلے بھی موجود تھیں لیکن ان خوبیوں کو کمال تک پہنچانے کا کام اسلام نے ہی کیا +

نام

۷ - سُورہ فاتحہ کے بہت سے اور نام بھی آئے ہیں۔ خود قرآن کریم میں سُورہ حجر میں اس کا نام سبعًا من المثانی آیا ہے۔ یعنی وہ سات آیتیں جو بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ کیونکہ ہر ایک مسلمان کم از کم ۳۲ دفعہ روزانہ اسے نماز میں پڑھتا ہے۔ اور صحیح بُخاری میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ کہ آپ نے فرمایا سبعًا من المثانی سُورہ فاتحہ ہی ہے۔ ابُوداؤد اور ترمذی میں ایک اور حدیث ہے۔ لا صلوٰۃ الا بقراءۃ فاتحۃ الکتاب۔ یعنی فاتحۃ الکتاب کو پڑھنے کے بغیر کوئی نماز نہیں ہوتی۔ ایسا ہی اس سُورۃ کا نام ام الکتاب بھی احادیث میں آیا ہے۔ جس کے یہ معنے ہیں۔ کہ یہ سُورۃ گویا کل قرآن کریم کے لئے بطور ایک اصل یا

علیہ وسلم نے باوجود اَن پڑھ ہونے کے پڑھ لیا مدد مانگنا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں سکھایا گیا ہے -
پس بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سب کامیابیوں کی جڑ ہے +

۲- ب - پس با کے معنے یہاں ہوئے میں مدد طلب کرتا ہوں - اور یہ اللہ تعالیٰ بندے کو ایک دعا سکھاتا ہے +

۳- اللہ اُس ہستی کا نام ہے جو ساری صفات کاملہ کو اپنے اندر رکھتی ہے - اور ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک ہے - اللہ عربی زبان میں سوائے اُس حقیقی اور واحد معبود برحق کے اور کسی چیز پر نہیں بولا گیا - یہاں تک کہ عربوں نے اپنے کسی بُت کا نام کبھی اللہ نہیں رکھا - یہ لفظ اسی طرح عربی زبان میں چلا آیا ہے - اور اسے الالٰہ کا مخفف قرار دینا غلطی ہے - اور نہ یہ لفظ کسی مادہ سے مُشتق ہے - یہ بھی اسلامی توحید کی ایک مُمتاز علامت ہے - ور نہ دوسری زبانوں میں جو لفظ اللہ کے لئے بولے جاتے ہیں - اُن کا استعمال اَوروں کے لیئے بھی ہوجاتا ہے +

۴- الرحمٰن الرّحیم - یہ دونوں لفظ رحم سے مشتق ہیں - اور مُبالغہ کے صیغے ہیں - فرق یہ ہے کہ رحمٰن یعنی فعلان کا وزن کامل درجہ کے غلبہ صفت کے لیئے بولا گیا ہے - اور رحیم یعنی فعیل کا وزن تکرار کے لئے - نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ کے معانی میں جو فرق بتایا ہے وہ یہ ہے - کہ الرحمٰن رحمٰن الدنیا والرحیم رحیم الاخرۃ یعنی رحمانیّت اُس کی وہ رحم کی صفت ہے - جو دُنیا یعنی ابتدا میں کام کرتی ہے - اور رحیمیّت وہ رحم کی صفت ہے جو آخرت یعنی انجام اُمور میں کام کرتی ہے - یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ کی جو صفت رحم دُنیا میں کام کرتی ہے وہ رحم بلابدل ہے یعنی انسان کے کسی فعل کے نتیجہ کے رنگ میں اُس رحم کا اظہار نہیں ہُوا - بلکہ انسان کی پیدائش سے پہلے ہی اس نے اپنے رحم سے اس کے لئے سارے سامان مُہیّا کر رکھے ہیں - اور پھر جب انسان ایک کام کرتا ہے - تو اس کا ثمرہ مُترتب کرنے میں اللہ تعالیٰ کی صفت رحیمیّت کام کرتی ہے - یہ رحم کی صفات کے اظہار کا لطیف فرق صرف نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہی دُنیا میں ظاہر فرمایا - اور کسی زبان میں ایسے لفظ بھی نہیں - جن سے یہ باریک فرق ظاہر ہوسکے - اور خود عربوں کو یہ لفظ رحمٰن معلوم نہ تھا - یہانتک کہ سُورہ فرقان میں کفّار کا یہ قول منقول ہے قالوا وما الرحمٰن یعنی کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا چیز ہے - پس معلوم ہُوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیّت کا یہ تقاضا ہے - کہ وہ بلابدل کام کرتی ہے - اور اسمیں اُن عقائد کی غلطی کو ظاہر کیا گیا ہے - جو خُدا کی طرف رحم بلابدل منسوب کرنے سے انکار کرتے ہیں - جیسے عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ کی بنا بھی اسی غلط خیال پر ہے - کہ اللہ تعالیٰ بلا بدل رحم نہیں کرسکتا - اور صفت رحیمیّت کے ذکر سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر کرنا مقصود ہے - جو ہر نیک عمل کا بدلہ اسی قدر

خدا کی طرح محض ایک حاکم یا جج ہے۔ جو بغیر معاوضہ لئے کسی گناہ کو معاف نہیں کر سکتا۔ نہ آریوں کے خدا کی طرح قانون کے شکنجہ میں اس طرح جکڑا ہؤا ہے۔ کہ وہ خود بھی قانون کے ماتحت ہے۔ بلکہ وہ مالک ہے۔ مالک اپنی ملک پر پورا اختیار رکھتا ہے۔ وہ حاکم یا جج یا بادشاہ سے بہت بڑھ کر ہے۔ مالک اگر اپنے مملوک کو معاف کر دے تو کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس نے ظلم کیا۔ ہاں جج یا حاکم بیشک معافی کا اختیار نہیں رکھتا اور خدا تعالیٰ قانون کا بھی مالک ہے +

پس اللہ تعالیٰ کی چاروں صفات ربوبیت۔ رحمانیت۔ رحیمیت۔ مالکیت درحقیقت اس کے کامل اور بے انتہا رحم اور محبت کو ظاہر کرتی ہیں۔ جو انسانوں کے وہم و گمان سے بہت بالاتر ہے +

۱۴۔ یوم الدین۔ یوم کا لفظ قرآن شریف میں ایک آن پر بھی آیا ہے۔ کل یوم ھو فی شان اور پچاس ہزار سال پر بھی۔ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ لغت والوں نے بھی لکھا ہے۔ قد یعبر بہ مدۃ عن الزمان ای مدۃ کانت یعنی اس سے مطلق زمانہ کا کوئی حصہ مراد ہے۔ خواہ وہ کوئی سا حصہ ہو۔ دین کے معنے یہاں جزا و سزا کے ہیں۔ سو وہ جزا و سزا کی ہر آن کا مالک ہے کیونکہ اس کا قانون جزا و سزا ہر آن میں کام کرتا رہتا ہے +

۴ ۱۵۔ ایاک نعبد میں حصر کر کے بتا دیا ہے۔ کہ عبادت صرف ذات الٰہی کے لئے مخصوص ہے عبادت کا اصلی مفہوم کامل تذلل اور کامل فرمانبرداری ہے۔ مخلوقات میں سے کوئی شے ایسی نہیں کہ انسان اس کے آگے تذلل اختیار کرے یعنی ایسا جھک جائے۔ کہ اس کا اپنا کچھ نہ رہے۔ ایسا تذلل صرف اللہ تعالےٰ کے سامنے ہی اختیار کرنے کا حکم ہے۔ لا تعبدون الا اللہ۔ الا تعبدوا الا ایاہ +

۱۶۔ ایاک نستعین تیری اعانت کے سوا اور کسی کی اعانت پر بھروسہ نہیں کرتے اسلئے تیری ہی اعانت چاہتے ہیں +

۶ ۱۷۔ انعمت علیھم منعم علیہم کی تفسیر خود قرآن کریم نے دوسری جگہ فرمائی ہے۔ ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین۔ پس ان اعلےٰ سے اعلےٰ انعامات کے لئے بھی ہمیں دُعا سکھائی گئی ہے۔ جو انبیاء علیہم السلام پر نازل فرمائے۔ ان انعامات میں مکالمہ و مخاطبہ الٰہی ایک بڑا انعام ہے۔ پس اس کا دروازہ اس اُمت محمدیہ پر نہ کبھی بند ہؤا اور نہ ہوگا +

۷ ۱۸۔ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہود مغضوب علیہم اور عیسائی ضالین ہیں۔ اوّل الذکر نے مسیح کا انکار کیا۔ ثانی الذکر نے اُسے مانا مگر غلو کیا اور خدا بنا دیا۔ پس یہ تفسیر نبوی ظاہر کرتی ہے۔ کہ مغضوب علیہم سے مراد وہ گروہ ہے جو تفریط کی طرف چلا جاتا ہے اور ضالین سے مراد وہ گروہ ہے جو افراط او غلو کی وجہ سے ہلاک ہوتا ہے +

آیت

خلاصہ کے ہے۔ اور بھی بہت سے نام اس سورت کے تفاسیر میں لکھے ہیں +

نزول

۸۔ اس سورت کا نزول نہایت ابتدائی زمانہ کا ہے۔ کیونکہ جہاں تک پتہ چلتا ہے نماز میں یہ سورت ہمیشہ پڑھی جاتی رہی ہے۔ اور اسلام میں نماز قریباً قریباً نزول وحی کے ساتھ ہی شروع ہوگئی تھی۔ جیسا کہ خود قرآن کریم کی ابتدائی سورتوں اور احادیث سے پتہ لگتا ہے +

خلاصہ مضمون

۹۔ اِس سورۃ کے اندر ایک ایسی دُعا سکھائی گئی ہے جس کے کمال اور خوبی کو نہ صرف دوسرے مذاہب کی ہی کوئی دُعا نہیں پہنچتی۔ بلکہ خود قرآن کریم کی دُعاؤں میں بھی یہ دُعا سب سے اعلےٰ مرتبہ پر ہے۔ اس دُعا کی کُل سات آیات ہیں۔ جن میں سے پہلی تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی ان چار صفات کاملہ کا ذکر ہے۔ جن پر اس دُنیا کا کل نظام قائم ہے۔ یعنی ربوبیت رحمانیت۔ رحیمیت۔ مالکیت۔ اور اس طرح پر یہ پہلی تین آیتیں صرف اللہ تعالےٰ کے محامد کیلئے ہیں۔ جس کے حضور انسان حاضر ہوتا ہے۔ اور آخری تین آیتیں جو اھدنا سے شروع ہوتی ہیں۔ اس بندہ کے لئے مخصوص ہیں۔ جو جناب الٰہی میں حاضر ہو کر اپنی التجا پیش کرتا ہے۔ اور درمیانی آیت کا پہلا حصہ اقرار عبودیت کے لئے اور دوسرا حصہ اظہار استعانت کے لئے ہے۔ آخری تین آیات میں جو دُعا سکھائی گئی ہے۔ وہ اُس کمال انسانی کے حاصل کرنے کی التجا ہے۔ جو انسانی خواہش کا منتہا ہے۔ یعنی اس گروہ میں داخل ہونے کی التجا ہے جو ہر قسم کی غلطیوں اور ٹھوکروں سے بچا ہُوا منعم علیہم کا گروہ ہے۔ روٹی کا تو ذکر ہی کیا ہے گناہوں کی مُعافی کی التجا بھی نہیں۔ کیونکہ اس مقام پر تو انسان وہ حالت اپنے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جہاں گناہ ہی نہ ہو۔ پس دُنیا کی اعظم اور اکمل دُعا یہی سُورہ فاتحہ ہے +

۱۰۔ الحمد میں ال استغراقی ہے۔ یعنی ہر قسم کی محامد اور تعریفیں الحمد کے اندر داخل ہیں +

۱۱۔ للہ۔ ل استحقاق کا ہے۔ یعنی ہر قسم کی تعریفوں کی حقیقی مستحق صرف ایک ذات الٰہی ہے +

۱۲۔ رب العالمین۔ وہ بنی اسرائیل کے خُداوند کی طرح کسی ایک قوم کا خُدا نہیں بلکہ تمام جہانوں کی ربُوبیت کرنے والا ہے۔ چُونکہ قرآن کے ذریعہ اُس کی رُوحانی ربُوبیت نے کُل دُنیا پر حاوی ہونا تھا۔ اسلیئے شروع میں ہی ربّ العالمین فرمایا +

ربّ کے اصل معنی وہ ہیں جو راغب نے لکھے ہیں۔ انشاء الشئ حالا فحالا الی حد التمام یعنی ایک حالت سے دوسری حالت تک اپنی پرورش کے ذریعہ پہنچانیوالا یہانتک کہ ایک چیز اپنے کمال کو حاصل کر لیتی ہے۔ پس وہی ربّ العالمین قرآن کے ذریعہ انسان کو کمال انسانی تک پُہنچانیوالا ہے +

۱۳۔ مالک۔ اللہ تعالیٰ کی صفت مالکیت بھی اس کے رحم پر دلالت کرتی ہے۔ نہ وہ عیسائیوں کے

الفاظ یا منتشر اوراق کا مجمُوعہ نہیں۔ پھر اس کی غرض ھدایت یا دُنیا کو راہِ راست پر لانا ہے۔ پھر وہ اصُول بیان فرمادیئے ہیں۔ جن پر چلکر انسان ہدایت کو پاسکتا ہے۔ اور وہ کُل پانچ اصُول ہیں۔ تین عقاید کے رنگ میں یعنی ایمان بالغیب (اللہ تعالیٰ اور اُس کے ملائکہ پر ایمان) اللہ تعالیٰ کی وحی پر ایمان اُس پر جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوئی۔ اور اس وحی پر جو آپ سے پہلے دُنیا میں نازل ہوچکی۔ اور آخرت یعنی اعمال کی جزا و سزا پر یقین۔ اور دو عمل کے رنگ میں صلوٰۃ یعنی نماز اور دُعا جو حقُوق اللہ کا خُلاصہ اور انفاق یعنی اپنی قوتوں اور مال کو مخلوق خُدا کی بھلائی کے لیئے خرچ کرنا جو حقُوق العباد کا خلاصہ ہے۔ پھر اس کا آخری نتیجہ بتا دیا۔ کہ وہ کامیاب اور بامُراد ہوتا ہے یہ سب کچھ پہلے رکُوع میں بیان فرما دیا۔ اور یہ سُورت ابتدا کے لیئے ایسی موزُون ہے۔ کہ اگر اس کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے۔ تو دوسری کوئی سُورۃ اس کی جگہ نہیں رکھّی جاسکتی اس سے قرآن کریم کی موجُودہ ترتیب کا منجانب اللہ ہونا صاف ظاہر ہے ؛

خلاصہ مضمون

۲۳۔ اس سُورۃ میں جن مضامین کا ذکر ہے۔ وہ سب ایک سلسلہ میں منسلک اور ایک ترتیب کے ساتھ مربُوط ہیں۔ رکُوع (۱) سب سے پہلے اصُول کا ذکر کیا۔ اُن کو قبول کرنے والوں اور ردّ کرنیوالوں میں فرق بتایا۔ (۲) پھر ایک اَور گروہ کا ذکر کیا۔ جو مُنہ سے تسلیم کرتے ہیں۔ مگر دل سے نہیں مانتے (۳) پھر خُدائے واحد کی عبادت پر جو اصل الاصُول مذاہب ہے کچھ دلائل دیئے۔ اور اسے سب نیکیوں کی جڑ قرار دیا (۴) پھر یہ ذکر فرمایا کہ انسان کمال تک کس طرح پہنچتا ہے۔ اور ایک انسان کامل کا ذِکر کیا (۵) پھر ایک مُنعم علیہ قوم کا ذکر کیا۔ اور ان کو اول کامیابی کی راہ بتا کر اِنکار کی صُورت میں سزا سے ڈرایا (۶ تا ۹) پھر اس پر جو جو انعامات کیئے۔ اور جو جو نافرمانیاں اُنھوں نے کیں اُن کا ذکر فرمایا (۱۰) پھر بنی اسرائیل کے میثاق اور ان کی خلاف ورزی کا ذکر کرکے اُن کی ذلّت کی پیشگوئی کی۔ (۱۱) پھر ان کے ان اعتراضوں کا ذکر کیا جو اُنھیں اسلام پر تھے اور ان کا جواب دیا۔ کہ کیوں بنی اسرائیل میں سے یہ نبی نہیں آیا (۱۲) پھر ان کے عداوت میں اور ترقی کر جانے اور پیغمبر خُدا صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف فری میسنوں والے منصُوبوں کا ذکر کیا (۱۳) پھر اُن کو بتایا کہ اگر توریت کی شریعت کو ہم نے منسُوخ کیا ہے۔ تو اس سے بہتر اور ایک طرح سے اس کی مثل ایک شریعت تم کو دیدی ہے۔ اور بتایا کہ نجات تو صرف اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور مخلوق کے ساتھ احسان سے ملتی ہے۔ نہ برائے نام کسی مذہب کا پیرو ہو جانے سے (۱۴) پھر بتایا۔ کہ تھوڑی بہت سچّائی تو ہر مذہب میں ہے۔ پر اسلام کامل صداقتوں کا مجمُوعہ ہے

آیت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# سُورۃ ۲ - البقرۃ

نام

۱۹- اِس سُورت کا نام البقرۃ اس تذکرہ سے لیا گیا ہے - جو بنی اسرائیل کو ایک گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا جانے کے مُتعلّق اس سُورت کے آٹھویں رکُوع میں کیا گیا ہے - چُونکہ اس سُورت میں خاص طور پر یہُودیوں کا ذکر ہے - اور یہُود میں گائے کی پرستش کی مرض مصر میں رہ کر پیدا ہو چُکی تھی - اِسلئے گائے کے ذبح کا تذکرہ اس سُورت کے اہم ترین مضامین میں سے ایک مضمون ہے +

نزول

۲۰- اس سُورت کا نزُول مدینہ مُنوّرہ میں ہجرت کے بعد ہُوا - اور اس کا اکثر حصّہ مدینہ کے ابتدائی ایّام کی نازل شُدہ وحی میں سے ہے +

تعلق

۲۱- اِس سُورت کا تعلّق ایک تو بلحاظ ترتیب سُورہ فاتحہ سے ہے - چُونکہ سُورہ فاتحہ میں یہ دُعا سکھائی گئی تھی - کہ اھدنا الصراط المستقیم - تو اس کا ابتدا یُوں فرمایا - ذٰلک الکتاب لا ریب فیہ ھدی للمتقین - پھر وہاں انعمت علیھم کے راستہ کی التجا ہے - تو یہاں فرمایا اولٰئک ھم المفلحون - یعنی اِن اصُول پر چل کر انعمت علیھم میں سے بن سکتے ہیں - وہاں ایک مغضوب گروہ کا ذکر تھا - جو سرے سے اِنکار ہی کر دیتے ہیں تو یہاں اُس کی تفصیل فرمائی - کہ یہ وہ لوگ ہیں - جو سواءٌ علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم کا مصداق ہو جاتے ہیں - وہاں ضآلین کا ذکر تھا - یہاں بھی ایک گروہ کا ذکر کر کے فرمایا - کہ مُنہ سے کہنے والے پر احکامِ الٰہی پر نہ چلنے والے الذین اشتروا الضلالۃ بالھدیٰ کے مصداق ہیں +

ترتیبِ قرآنی پر دلیل

۲۲- لیکن چُونکہ سُورت فاتحہ درحقیقت ساری قرآنی تعلیم کا نچوڑ ہے - اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن شریف کی ابتدا اسی سُورت بقرہ سے ہوتی ہے - اور درحقیقت یہی سچ ہے - چُنانچہ یہاں شروع میں ہی اس پاک کتاب کی اغراض کو بیان فرما دیا ہے - اور اکمل واتم طور پر وہ باتیں بتا دی ہیں - جو ایک قوانین کا واضع بطورِ تمہید بیان کر دیا کرتا ہے - کہ اوّل یہ اُس خدائے علیم کی طرف سے ہے جو نہ صرف فطرت اِنسانی اور ضروریات بشری کو جاننے والا ہے - بلکہ گذشتہ اور آیندہ کی تمام باتوں کو بھی جانتا ہے - پھر یہ ایک کتاب ہے - پراگندہ

مفسرین نے ان کے معنے کیئے ہیں - یہ حرُوف جو مقطعات کے نام سے موسُوم ہیں - قرآن کریم کی
۲۹ سورتوں کی ابتدا میں آئے ہیں - حروف سے الفاظ کے معانی کی طرف اشارہ کر دینا عموماً سب
قوموں میں مُروّج پایا جاتا ہے - عرب میں بھی یہ دستُور تھا - چنانچہ اس مصرعہ میں

قلت لھا قفی فقالت قاف

قاف (ق) کے معنے وقفت ہیں اِسی طرح پر اس شعر میں

بالخیر خیرات وان شرٌ فآ ولا ارید الشر الا ان تآ

فآ قائمقام ہے فشرٌ کے اور تآ قائمقام ہے تشاء کے - اسیطرح پر عام بول چال میں فاء کا
لفظ قائمقام فاذھب بنا کے ہوجاتا ہے - اِن مثالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے - کہ عربی
زبان میں کوئی قاعدہ مُقرر نہ تھا - کہ فلاں حرف سے فلاں لفظ کی طرف اشارہ ہوگا - بلکہ
عبارت کے سیاق وسباق سے ہی معلوم کیا جاتا تھا - کہ کوئی حرف کس لفظ کے قائمقام ہے
یہ کہنا کہ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے اِن حرُوف کے کوئی معنے نہیں کیئے
بالکُل غلط ہے - بلکہ ان میں سے اکثر کے معانی صحابہؓ سے ہی مروی ہیں - الم - جو سُورہ بقرہ
کے علاوہ پانچ اور سُورتوں کی ابتدا میں ہے یعنی آل عمران - العنکبوت - الرّوم لقمان
السجدہ اور الم کے بعد الاعراف میں ص اور الرعد میں ر زیادہ ہے - اس کے معنے
حضرت ابن عباس اور ابنِ مسعُود رضی اللہ عنہما سے انا اللہ اعلم مروی ہیں - یعنی میں اللہ بہت
جاننے والا ہوں - چُونکہ ان سُورتوں میں بعض ان پیشینگوئیوں کا ذکر خصُوصیّت سے فرمایا ہے -
جن سے اللہ تعالےٰ کے علم کامل پر شہادت پیدا ہوتی ہے - اِس لئے ان سُورتوں کو ان حروف
سے شرُوع فرمایا - بعض نے ان حرُوف سے سُورتوں کے نام سمجھے ہیں - اور بعض نے اسماء الٰہی
کی طرف اشارہ مُراد لیا ہے - بہر حال یہ الفاظ بےمعنی نہیں ہیں +

۲۵ - ذٰلک - عربی زبان میں ذٰلک کا لفظ جس طرح اشارہ بعید کے لئے آتا ہے - اِسی طرح کسی چیز کی
عظمت کے لحاظ سے بھی یہ لفظ اس کے لئے بول دیتے ہیں - اس جگہ ذٰلک کا لفظ اس کتاب
کی عظمت کے لحاظ سے بولا گیا ہے +

۲۶ الکتاب - کتاب کا لفظ کتب سے مشتق ہے - جس کے اصل معنے جمع کرنے کے ہیں - اور چُونکہ لکھنے
میں حروف کو ایک دوسرے کے ساتھ ملایا جاتا ہے - اِس لیئے اس کے معنے لکھنے کے بھی ہیں
پس کتاب کا لفظ اس لکھی ہوئی چیز پر بولا جاتا ہے - جس کے اندر مضامین جمع ہوں - اِسی لئے
ایک خط کو بھی کتاب کہ دیتے ہیں - کیونکہ وہ اپنے اندر مضامین کو جمع رکھتا ہے - قرآن کریم
کا نام الکتاب رکھنے سے اسبات کا اظہار ہوتا ہے - کہ ارادہ الٰہی میں اس کا لکھا ہُوا ہونا

(۱۵) پھر فرمایا کہ اگر حضرت موسےٰ والی پیشگوئی کو نہیں مانتے تو اُوپر چلو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بھی تو یہی وعدہ تھا کہ اُس کی اولاد کو برکت دی جائیگی۔ اور وہ اپنی اولاد کے ایک حصّہ کو مکّہ معظمہ میں چھوڑکر اور وہاں دُعائیں کرکے یہ بتا گیا تھا۔ کہ آخر رحمتِ الٰہی اس چشمہ سے پھُوٹ کر تمام دُنیا کو سیراب کریگی (۱۶) پھر بتایا۔ کہ اسی ابراہیمی مذہب پر یہُود کی تفریط اور نصارےٰ کی افراط سے بچ کر یہ نبی کھڑا ہُوا ہے (۱۷و۱۸) پھر بتایا کہ جب ابراہیمؑ کی دُعاؤں کی صداقت یُوں ظاہر ہُوئی۔ تو یہ بھی ضرور تھا۔ کہ اُسکی دُعاؤں کا دوسرا حصّہ بھی پُورا ہوتا۔ اور اس نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قبلہ کعبہ قرار دیا جاتا۔ تاکہ خُدا کے سارے وعدے پُورے ہوتے (۱۹) پھر بتایا کہ اس قبلہ کی خاطر مُسلمانوں کو مال و جان کی بہت سی قُربانیاں کرنی پڑینگی۔ ان اصُولی باتوں کو طے کرکے اور (۲۰) پھر خُدا تعالےٰ کی توحید کے مضمون کو دوہرا کر (۲۱ تا ۳۱) پھر شریعت کی تفصیلات کی طرف رجُوع کیا یہ دکھانے کے لئے کہ یہ شریعت تفصیلات میں بھی ویسی ہی باتیں یا ان سے بہتر باتیں بتاتی ہے جو یہُود کی شریعت میں تھیں۔ چنانچہ غذاؤں کے حرام و حلال۔ قصاص۔ وصایا۔ روزوں۔ جنگ۔ حج۔ شراب۔ جُوا۔ یتامےٰ۔ زناشوی کے تعلقات۔ طلاق بیواؤں کا ذکر کرکے (۳۲و۳۳) پھر اصل مضمون کی طرف رجُوع کیا۔ کہ جس طرح پر بنی اسرائیل ایک مُردہ قوم تھی جہاد اور کوشش سے خُدا نے اُسے زندہ کردیا۔ اِسی طرح مسلمانوں کو بھی اب جہاد اور کوشش کرنا ضرُوری ہے (۳۴) پھر خُدا تعالےٰ کے حیّ و قیّوم ہونے کا ذکر کرکے یہ اشارہ کیا۔ کہ اب وہ اپنے نام لیواؤں کو زندگی بخشیگا۔ اور اُنہیں بڑی قوم بنائیگا مگر اُن کو اکراہ فی الدّین سے روکا (۳۵) پھر بتایا کہ کیونکر وہ مُردہ قوموں کو زندہ کیا کرتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے دو واقعات کا ذکر کیا (۳۶و۳۷) پھر کھول کر بتایا۔ کہ اصل جڑ ساری کامیابیوں کی انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اگر اس وقت ایک ایک دانہ ڈالوگے تو کل کو سینکڑوں نہیں ہزاروں اور لاکھوں دانے تمہیں ملینگے۔ (۳۸) پھر بتایا کہ قُربانیاں کرکے جب دولتمند ہوجاؤ تو سُود نہ کھانا۔ کیونکہ سُودخوار قوم آخر تباہ ہوجاتی ہے۔ اور اخلاق فاضلہ سے عاری (۳۹) ہاں ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اپنے حقُوق کی خوُب نگہداشت کیا کرو۔ اور لین دین کے مُعاملات کو لکھ لیا کرو (۴۰) اور سب سے آخر سب رسُولوں پر ایمان لانے کا تذکرہ کرکے پھر آخری کامیابی کی دُعا سکھائی۔ اور بتادیا۔ کہ پہلے قُربانیاں کرو پھر یوُں دُعائیں کرو تب ہم نصرت دینگے +

رکوع ۱/۱ ۱

۲۴- الم- عموماً قرآن کریم کے ترجموں میں اِن حرُوف کو بلا ترجمہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ

کے لئے لگانا بھی اس میں داخل ہے۔ صلوٰۃ اور انفاق یہ دین کے عملی حصہ کے ارکان ہیں +

۴
۳۱۔ اُنزل۔ انزال مطلق ایصال اور ابلاغ کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اور اوپر سے نیچے کی طرف لانا اس کے مفہوم میں لازمی نہیں۔ وحی الٰہی کے لئے انزل اور نزل کا لفظ کثرت سے قرآن کریم میں بولا گیا ہے +

۳۲۔ وما انزل من قبلك۔ جو وحی نبی کریم صلے اللہ علیہ سے پہلے انبیاء پر آئی۔ اس پر ایمان لانا اصول ایمان میں داخل کیا گیا ہے۔ ما انزل من قبلك سے مُراد صرف توریت و انجیل ہی نہیں بلکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ خود اس کی تصریح فرما دی۔ وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر۔ یعنی ہر قوم میں خدا کی طرف سے کوئی ڈرانے والا آچکا ہے۔ مگر قرآن کریم کو یہ ضرورت نہ تھی کہ ان تمام انبیاء کے نام لیتا یا اُن کی تاریخ بیان فرماتا۔ بلکہ فرمایا منھم من لم نقصص علیك دُنیا کے کسی مذہب نے یہ وسیع تعلیم نہیں دی۔ جو اسلام نے دی ہے۔ کہ تم کُل قوموں کے نبیوں کو مان لو بلکہ ان پر ایمان لانا اپنے اصول کے اندر داخل کر دیا۔ یقیناً یہ تعلیم ایک عرب کا رہنے والا اُمّی جو دُنیا کی تاریخ اور دُنیا کے مذاہب سے یکساں ناواقف ہو نہ دے سکتا تھا۔ بلکہ اس تعلیم کا ایسے شخص کے مُنہ سے نکلنا صاف بتاتا ہے۔ کہ یہ منجانب اللہ تھی +

۳۳۔ بالاخرة۔ آخرت پر ایمان یا یقین سے مُراد اعمال کی جزا و سزا پر یقین ہے۔ کیونکہ کامل جزا و سزا ہر قسم کے اعمال کی صرف قیامت کے دن ہی ظاہر ہوگی۔ یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ ان دو آیات کے اندر پانچ اصول دین کے بتائے گئے ہیں۔ یعنی اللہ پر ایمان۔ اس کی وحی پر ایمان۔ اعمال کی جزا و سزا پر ایمان۔ اور عملی حصہ میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا ادا کرنا۔ ان میں سے سب سے پہلے ایمان باللہ کا ذکر کیا۔ اور سب سے آخر ایمان بالآخرة کا۔ اسی لئے قرآن شریف میں کئی جگہ ایمان باللہ و بالیوم الآخر کو ان پانچوں اصول کے ماننے کے قائمقام قرار دیا ہے۔ جیسا اسی سُورت کی آیت نمبر ۸ و نمبر ۶۲ وغیرہ میں جہاں اوّل و آخر کے ذکر سے کُل کا ذکر مُراد لیا ہے۔ یہی معنے ہیں۔ ومن الناس من یقول اٰمنا باللہ وبالیوم الاخر کے۔ اور یہی معنے ہیں۔ من اٰمن باللہ والیوم الاخر وعمل صٰلحًا کے +

۵
۳۴۔ المفلحون مُفلح فلاح سے ہے جس کے معنے کامیابی کے ہیں۔ اور مُفلح وہ ہے جو اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ یہ ہدایت پر ہونے کا کھُلا کھُلا نتیجہ بتا دیا۔ کہ یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہونگے +

۶
۳۵۔ سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ اور ساری آیت کے معنے یہ ہیں۔ کہ ایسے کافر جنھوں نے نبی کے انذار اور عدم انذار کو برابر سمجھ رکھا ہے۔ وہ ایمان نہیں لاتے۔

اور ترتیب کے ساتھ اس کے مضامین کا اس کے اندر جمع ہونا۔ یہ دونوں باتیں موجود تھیں اِسی لئے جیسا کہ بخاری کی حدیث میں مذکور ہے۔ جب کبھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی۔ تو اُس کو لکھوانے اور اُس کی ترتیب دینے کا کام خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کرتے تھے +

۲۷۔ المتقین مُتقی وقایہ سے مشتق ہے۔ جس کے معنے ہیں حفظ الشیٔ مما یوذ یہ ولیضرہٗ یعنی کسی چیز کا محفوظ رکھنا اُس سے جو اسے دُکھ اور تکلیف دینے والی ہو۔ پس تقویٰ کے معنے عرف شرع میں حفظ النفس عما یؤثم کے ہوگئے ہیں یعنی اپنے آپ کو گناہ سے یا گناہ کی طرف لیجانے والی چیزوں سے بچانا۔ اور مُتقی وہ ہے جو اپنے آپ کو بچائے۔ اسی لئے فرمایا۔ کہ یہ کتاب ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو اپنے آپ کو دُکھ کی چیزوں سے بچاتے ہیں۔ اور جو بچنا نہیں چاہتے اُن کو اللہ تعالیٰ مجبور کرکے نہیں بچاتا +

۲۸۔ الغیب۔ غیب وہ چیز ہے۔ جو انسان کی ظاہر آنکھ سے یا حواس ظاہری سے پوشیدہ ہو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات نہاں در نہاں ہے۔ پس الغیب پر ایمان لانے سے مُراد اس نہاں در نہاں ذات پر ایمان لانا ہے۔ جس کے متعلق یقینی علم انبیاء علیہم السّلام کے ذریعہ آتا ہے۔ اصُول دین میں سے یہ پہلا اصل ہے +　　۲

۲۹۔ یقیمون الصلوٰۃ۔ صلوٰۃ کا لفظ زبانِ عربی میں اسلام سے پہلے دُعا کے لئے بولا جاتا تھا جیسا کہ اعشی کے اس شعر سے ظاہر ہے ؎

وقابلھا الریح فی دنّھا　　وصلّٰی علٰی دنّھا وارتسم

اسلام میں الصلوٰۃ کا مفہوم نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے سمجھا دیا۔ اور وہ پانچ نمازیں ہیں۔ جو کہ اوقات مقررہ پر ادا کی جاتی ہیں۔ اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کا ان پر اتّفاق ہے۔ ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابًا موقوتا۔ نماز کے متعلّق ہمیشہ اقامت کا لفظ نماز ادا کرنے کے مفہوم کے لئے بولا گیا ہے۔ اقام الامر کے معنے ہوتے ہیں۔ کہ کام دُرست حالت میں رکھّا۔ پس نماز کا درست حالت میں رکھنا قرآن کریم کی رُو سے ضروری ہے اور اس کے معنے نہ صرف تعدیل ارکان کے ہیں۔ بلکہ یہ بات بھی اس کے اندر داخل ہے۔ کہ وہ غرض جس کے لئے نماز کا حکم دیا گیا ہے پُوری ہو۔ یعنی ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر کی غرض عملی حصّہ میں نماز حقُوق اللہ کی ادائیگی کے قائمقام ہے +

۳۰۔ ممّا رزقنٰھم ینفقون۔ اس میں حقُوق العباد کا اصُول قائم کیا گیا ہے۔ ان الفاظ کے مفہوم میں نہ صرف مُقرّرہ زکوٰۃ کا ادا کرنا ہی آتا ہے۔ بلکہ ہر قسم کا انفاق آجاتا ہے۔ اور نہ صرف مال کا خرچ کرنا ہی بلکہ اُن طاقتوں اور قوتوں کا جو اللہ تعالےٰ نے دی ہیں مخلوق کی بہتری

کی وجہ سے ان کے دلوں پر مُہر لگادی ہے۔ اور ایک جگہ فرمایا۔ بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون۔ جو کرتوتیں کرتے تھے۔ اُنہی کا زنگ اُن کے دلوں پر بیٹھ گیا ہے اور پھر ایک جگہ نہایت صفائی سے فرمایا۔ لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم اٰذان لا یسمعون بھا اولٰئک کالانعام بل ھم اضل۔ اس آیت کو آیت زیر بحث کے ساتھ ملاکر پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ کہ دلوں پر مُہر کیا ہے۔ یہی کہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھوں پر پردہ کیا ہے۔ کہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے کانوں پر مُہر کیا ہے۔ کہ ان سے سُننے کا کام نہیں لیتے۔ چُونکہ اللہ تعالٰے ہی اعمال کے نتائج مُترتّب فرماتا ہے۔ اِسلیئے مُہر کے لگانے کو اللہ تعالٰے کی طرف منسُوب کیا ہے ✢

رکُوع ۲/۲ ۸

۳۷۔ من یقول اٰمنا باللہ وبالیوم الاخر وماھم بمؤمنین کے لفظی اور قطعی معنی یہی ہیں۔ کہ وہ اسلام لانے کا اِظہار کرتے ہیں۔ اِس رکُوع میں مُنافقین کا ذکر کیا ہے۔ یہ گروہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف آوری پر پیدا ہوگیا تھا۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے عبداللہ بن اُبی وہاں ایک مشہُور آدمی تھا۔ اور اُسے اُمید تھی۔ کہ لوگ اُسے بادشاہ بنالینگے چونکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر سب قومیں اِس بات پر مُتفق ہوگئیں کہ آپ ہی اُن کے تمام جھگڑوں کے فیصلے کریں۔ عبدُاللہ بن اُبی کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ مگر اس میں اور اُس کے ساتھیوں میں چُونکہ کھُلی مُخالفت کی بھی جُرأت نہ تھی اِس لیئے اُن کے تعلقات منافقانہ رہے۔ ایسا ہی یہُودیوں میں سے بھی بعض نے مُنافقت کی روش اختیار کرلی منافقین کا ذکر علاوہ اِس موقعہ کے سُورہ آل عمران میں آیت ۱۴۸ سے ۱۸۰ تک النّساء میں ۶۰ سے ۵۲ اتک التّوبہ میں ۳۸ سے ۱۲۷ تک اور سُورۂ منافقون میں ہے ✢

۹

۳۸۔ یخادعون اللہ۔ باب مفاعلہ بعض وقت صرف ایک کے لیئے بھی آتا ہے۔ اس کی مثالیں بہت کثرت سے ہیں۔ جیسے عاقبت اللص۔ چنانچہ لغت میں ہے۔ العرب تقول خادعت فلانا اذا کنت تروم خدعہ۔ اور اِنہی معنوں میں یُخادعون اللہ بولا گیا ہے۔ انھم یقدرون فی انفسھم انھم یخدعون اللہ۔ پس یخادعون اللہ کے معنے ہوئے وہ اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ جہاں اللہ تعالٰی کے مُتعلق آیا ہے۔ وھو خادعھم اس سے مُراد اُن کے خداع کی سزا ہے۔ اور یہ امر اللہ یستھزئ بھم کے نیچے واضح کیا گیا ہے۔ کہ ایک بدی کی سزا کا ذکر اِنہی الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مُراد سزا ہوتی ہے نہ وہ بدی ✢

جب وہ نبی علیہ السلام کی پُکار کی پروا ہی نہیں کرتے۔ تو اس سے ہدایت کیا پا سکتے ہیں۔ جس طرح پر قوم عاد نے اپنے نبی کو کہا۔ سواء علینا اوعظت ام لم تکن من الواعظین۔ یعنی ہمارے لیئے برابر ہے چاہے تُو وعظ کرے یا نہ کرے۔ اور اسی طرح پر کُفّار کے متعلق دوسری جگہ فرمایا۔ وان تدعوھم الی الھدیٰ لا یتبعوکم سواء علیکم ادعوتموھم ام انتم صامتون۔ گو یہاں سواء علیکم کا لفظ ہے مگر مفہُوم وہی ہے۔ اِس آیت کے یہ معنے دُرست نہیں۔ کہ جو کافر ہو گئے۔ اب ان کو تیرا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ انھوں نے کبھی ماننا ہی نہیں۔ کیونکہ یہ معنے واقعات کے خلاف ہیں۔ جو پہلے کافر ہوئے وہی آخر مانتے چلے گئے۔ ہاں ایسے لوگوں نے نہیں مانا جنھوں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلّم کی آواز کی پروا ہی نہیں کی۔ وہ جب تک اس حالت میں رہے نہیں مان سکتے تھے۔

۲۶۔ ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلی سمعھم۔ اس کے معنے ہیں اللہ نے ان کے دلوں اور اُن کے کانوں پر مُہر لگا دی۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ کن کے دلوں پر مُہر لگائی۔ سو یہ وہی لوگ ہیں۔ جن کا ذکر اس سے پہلی آیت میں ہے۔ کہ وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ڈرانے یا نہ ڈرانے کی پروا نہیں کرتے۔ سو اُنھوں نے برابر تیرہ یا چودہ سال تک نبی کی بات کی پروا نہ کی۔ نہ اس پر تدبّر کیا۔ نہ اُسکو سُننا پسند کیا۔ اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا۔ کہ دلوں اور کانوں پر مُہر لگ جاتی۔ کیونکہ یہ اللہ کا قانُون ہے۔ کہ جو شخص جس قوّت یا طاقت سے کام نہ لے وہ آخر سلب ہو جاتی ہے۔ جو شخص اپنے ہاتھوں کو بالکل بیکار کرے۔ اور ان سے مُدّت تک لگا تار کوئی کام نہ لے۔ آخر وہ ہاتھ خشک ہو جائیگا۔ یہی حال باقی قوےٰ کا ہے۔ جب ایک انسان ان سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے۔ تو وہ مُعطّل کر دیئے جاتے ہیں۔ پس یہ ظلم نہیں۔ بلکہ عین قانُونِ قُدرت کے مُطابق اپنے ہی ایک فعل کا نتیجہ یا سزا ہے۔ اور وہ فعل اس سُورت میں غفلت اور لاپروائی ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات اس پر شاہد ہیں۔ و منھم من یستمع الیک حتیٰ اذا خرجوا من عندک قالوا للذین اوتوا العلم ماذا قال آنفا اولئک الذین طبع اللہ علیٰ قلوبھم واتبعوا اھواءھم۔ یعنی کچھ لوگ ایسے ہیں۔ کہ بظاہر تمھاری طرف کان تو لگائے رکھتے ہیں۔ لیکن جب تمھارے پاس سے نکلتے ہیں۔ تو اُن لوگوں کو جنھیں علم دیا گیا ہے کہتے ہیں ابھی اس نے کیا کہا۔ گویا اُنھوں نے باوجود کان لگانے کے کچھ بھی نہیں سُنا۔ فرماتا ہے۔ یہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مُہر لگا دی۔ اِسی طرح پر ایک جگہ فرماتا ہے۔ بل طبع اللہ علیھا بکفرھم۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے کفر

استہزاء کرنے والے کی غرض اِس کو جس سے استہزاء کیا جائے حقیر کرنے کی ہوتی ہے۔لیکن اہل لغت کے نزدیک اس کے زیادہ پسندیدہ معنے یہ ہیں۔ یستھزئ بھم یجازیھم علی ھزئھم بالعذاب۔ یعنی اُن کی ہنسی کی سزا اُن کو دیگا۔ یا اُن کی ہنسی کا مزہ اُن کو چکھائیگا۔ کیونکہ عرب کا قاعدہ ہے۔ کہ کسی بدی کی سزا کا ذکر انہی الفاظ میں کردیتے ہیں۔ جیساکہ اس شعر میں ؎

الا لایجھلن احد علینا فنجھل فوق جھل الجاھلینا

قرآن کریم میں اس کی کھلی مثال اِن الفاظ میں ہے۔ جزاء سیئة سیئة مثلھا۔ حالانکہ جو معاملہ بطور سزا بدی کرنے والے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ وہ حقیقت میں سیئة نہیں ہے دوسری جگہ کُفّار کے استہزاء کا ذکر کرکے فرمایا۔ فحاق بھم ماکانوا بہٖ یستھزؤن۔ جس سے معلوم ہُوا کہ اللہ یستھزئ بھم کے حقیقی معنی یہی ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ اُن کو اُن کی ہنسی کی سزا دیگا +

۴۴۔ اشتروا الضّلٰلة بالھُدٰی۔ ہدایت اُن کے سامنے رکھی گئی۔ مگر اُنھوں نے اسے ردّ کیا اور گمراہی کو اختیار کیا۔ گویا ہدایت دے کر گمراہی مول لے لی + ۱۶

۴۵۔ کَمَثَلِ الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا۔ وہ شخص جس نے آگ جلائی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ۱۷ بُخاری میں ہے۔ مثلی کمثل رجل استوقد نارًا۔ الفاظ مثلھم کمثل الذی استوقد نارًا سے یہ مُراد نہیں کہ آگ جلانے والے کُفّار ہیں۔ جیساکہ اِس سے اگلی تمثیل اَوْ کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ سے مُراد یہ نہیں کہ بارش کی مثال کفار کی ہے۔ بلکہ بارش وہاں وحیِ الٰہی کی قائمقام ہے۔ اِسی طرح پر یہاں آگ جلاکر روشنی کرنے والے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کُفّار کی مثال یہ ہے۔ کہ جب روشنی ہوگئی۔ تو اب اُن کی آنکھوں کا نُور جاتا رہا۔ اِسی طرح پر دوسرے پارہ میں مثال دی ہے۔ مثلھم کمثل الذی ینعق۔ حالانکہ پُکارنے والے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں +

۴۶۔ ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ۔ روشنی ہو جانے کے بعد آنکھوں میں بصارت ہوتی تو کچھ نظر آتا۔ ۱۷ مگر ان لوگوں نے قوّتِ مُمَیِّزہ کھودی۔ پھر باہر کی روشنی اُن کو کیا فائدہ دے سکتی تھی۔ نُور کا لے جانا اللہ تعالیٰ کی طرف منسُوب کیا گیا ہے۔ جیسے فزادھم اللّٰہ مرضًا میں مرض کا بڑھانا۔ اور ختم اللّٰہ میں مُہر کا لگانا (دیکھو نوٹ ۳۶ و ۳۹) اللہ تعالےٰ اُن کی روشنی اِسلیئے لیگیا۔ کہ اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کی اس دی ہُوئی نعمت سے کام نہ لیا +

۴۷۔ صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ میں اسی حالت کی طرف اشارہ فرمایا۔ جس کی طرف ختم اللّٰہ علی قلوبھم ۱۸

آیت

۱۰ ۳۹- فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا - اِس بیماری سے مُراد یا تو اُن کے دلوں کی کمزوری ہے کہ ان میں مقابلہ کی جُرأت نہیں - اور اللہ کے اس بیماری کو بڑھانے کے یہ معنے ہُوئے کہ مُسلمانوں کی شوکت اور قُوّت دن بدن بڑھتے جانے سے ان کی یہ کمزوری اور بھی بڑھتی جاتی ہے - اور یا بیماری سے مُراد اُن کا وہ غم و غُصّہ ہے - جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے آنے اور ریاست کی اُمیدوں کے مُنقطع ہو جانے سے پیدا ہُوا - اور یہ اُن کا رنج بھی اسلام کی شوکت و قُوّت کے بڑھنے کے ساتھ بڑھتا گیا - اللہ تعالیٰ کی طرف اِس بیماری کا بڑھانا اِس لیئے منسُوب کیا گیا ہے - کہ وہ اسباب جن سے یہ بیماری بڑھی اسی نے پیدا کیئے - گو وہ چاہتے تو انہی اسباب سے ہدایت حاصل کر سکتے تھے - اس کی مثال ایسی ہی ہے - جیسے حضرت نوحؑ کہتے ہیں - فلم یزدھم دعاءی الا فرارا - میرا حق کی طرف بُلانا اُنکو بھاگنے میں بڑھاتا رہا - مطلب صرف یہ ہے - کہ جتنا مَیں اُن کو حق کی طرف بُلاتا ہوں اُتنا ہی وہ اور بھاگتے ہیں - وہ بُلانا صرف سبب ہو گیا - حالانکہ اس کا مقصُودِ اصلی بھگانا نہ تھا - اِسی طرح پر اسلام کی قُوّت و شوکت کے زیادہ کرنے کا مقصُود تو اور تھا - مگر اُن کمبختوں کے دلوں کی بیماری اس سے بڑھتی چلی گئی +

۱۰ ۴۰- بما کانوا یکذبون جھُوٹ کی سزا بڑی خطرناک ہے - حضرت ابُوبکر کا قول ہے - ایاکم والکذب فانہ مجانب للایمان - جھُوٹ سے بچو کیونکہ وہ ایمان سے دُور کر دینے والا ہے +

۱۳ ۴۱- السفھاء - سفیہ کی جمع ہے - کم عقل کو کہتے ہیں مُسلمانوں کو کم عقل اسلیئے کہتے - کہ اُن کا خیال تھا - کہ تھوڑے دنوں میں قریش مکّہ اُن کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ ملنے کی وجہ سے کُچل ڈالیں گے - مگر اُن کی اپنی کم عقلی تھی - کہ اسلام کی صداقت کے نشانوں کو نہ دیکھتے تھے +

۱۴ ۴۲- شیاطینھم - صحیح بُخاری میں ہے - قال مجاھد الی شیاطینھم اصحابھم من المنافقین والمشرکین - یعنی شیاطین سے مُراد اُن کے مُنافق اور مُشرک دوست ہیں - شاید یہاں یہُودی مُنافقوں کا ذکر ہو - بعض مُفسّرین کے نزدیک شیاطینھم سے رؤساؤھم فی الکفر مُراد ہیں - لفظ شیطان شطن سے مشتق ہے - جس کے معنے ہیں دُور ہُوا - یا شیط سے جس کے معنے بُطلان یا ہلاکت کے ہیں - پس شیطان رحمتِ الٰہی سے دُور یا ہلاک شُدہ ہستی ہے - اِنسانوں پر بھی اس کا اطلاق ہُوا ہے - دوسری جگہ واذا خلوا الی شیاطینھم کی جگہ فرمایا - اذا خلا بعضھم الی بعض - پس یہ شیطان انسان ہی ہیں +

۱۵ ۴۳- اللہ یستھزئ بھم - استھزاء کے معنے اِس جگہ بعض مُفسّرین نے انزال الھوان والحقارۃ کے کیئے ہیں - یعنی اللہ اُن پر ذلّت اور حقارت کی مار مار یگا - اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے - کہ

۲۱ اور اس کے سوا کسی اور کی عبادت جائز نہیں۔ عبادت کے معنے کے لئے دیکھو نوٹ ۱۵
اطاعت اور عبادت کے مفہوم میں بڑا فرق ہے۔ اس نظام عالم میں ایک دوسرے کی اطاعت کرنی ضروری ہے۔ مگر عبادت سوائے ایک خالق کے کسی مخلوق کی جائز نہیں۔ پس کسی کی اطاعت بھی محض اللہ تعالےٰ کی کامل فرمانبرداری کیلئے ہونی چاہئے۔ اور کسی حکم میں جو اللہ تعالےٰ کی کامل فرمانبرداری کے خلاف ہو اطاعت جائز نہیں۔ خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی سب نیکیوں کی جڑ ہے +

۵۲۔ لعلّکم۔ لعل بمعنی کے بھی آتا ہے۔ اصل استعمال اس کا اُمید دلانے کے لئے ہوتا ہے لیکن جب اللہ تعالےٰ اُمید دلائے تو وہ یقینی بات ہی ہوگی۔ اسلئے لعل کے معنے تا کہ ایسے مقامات پر ہونگے +

۲۲ ۵۳۔ فراشا۔ فراش بمعنی مفروش ہے۔ اور فرش کہتے ہیں بسط یعنی بچھانے یا پھیلانے کو پس فراش وہ چیز ہے جو بچھائی گئی یا پھیلائی گئی ہے۔ زمین چونکہ انسان کے آرام کے لئے پھیلائی گئی ہے۔ اسلئے اسے فراش کہا +

۵۴۔ بناء۔ اس چیز کو کہتے ہیں جو بنائی گئی ہو۔ مفردات میں ہے۔ البناء اسم لما یبتی بناء۔ اور سلیمان علیہ السلام کے قول میں انسان کو بناء کہا گیا ہے۔ من ھدم بناء ربہ تبارک وتعالیٰ فھو ملعون۔ مراد یہ ہے۔ کہ جو شخص کسی انسان کو ناحق مارتا ہے وہ ملعون ہے۔ آسمان کے متعلق خود قرآن کریم نے فرمایا۔ والسماء وما بنٰھا۔ اور فرمایا بنینا فوقکم سبعًا شدادا پس جو کچھ ہمیں اُوپر نظر آتا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا ہی بنایا ہوا ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک گھر کے حکم میں ہے۔ یعنی ایک نظم کے اندر داخل اور ایک سلسلہ میں منسلک ہے۔ اور زمین اس کے اندر ایک چھوٹا سا بچھونا یا انسانوں کی آرامگاہ ہے +

۵۵۔ من السماء۔ یعنی بادل سے دیکھو نوٹ ۴۹ +

۵۶۔ اندادا۔ ندّ کی جمع ہے۔ اور اس کے معنے ضد کے ہیں۔ یعنی ایک چیز کی مثل جس کو اس کے مقابلہ میں اس کے برابر ٹھیرایا جائے۔ قرآن کریم میں ند کا لفظ صرف ان معبودان باطل پر ہی نہیں بولا گیا جو پتھروں سے لوگ تراش لیتے ہیں۔ بلکہ وہ انسان جن کی محبت یا عظمت کو حد سے بڑھایا جاتا ہے اُنھیں بھی انداد کہا گیا ہے۔ ومن الناس من یتخذ من دون اللہ اندادا یحبونھم کحب اللہ +

۵۷۔ وانتم تعلمون۔ وہ موحد کہلانیوالے جو انسانوں کو اللہ تعالےٰ کا مرتبہ دیتے ہیں اور وہ بت پرست جو بتوں کی پوجا کرتے ہیں جانتے ہیں۔ کہ درحقیقت ذات الٰہی کا ہمسر تو

میں فرمایا۔ پس یا تو یہ مثال اُن کافروں کی ہے۔ جو اپنے کفر میں حد سے بڑھ جاتے ہیں۔
اور یا اُن شدید النفاق مُنافقوں کی جو آخر ہدایت سے محروم ہو کر کُفّار کے ساتھ جا ملتے ہیں +

۱۹۰ ۴۸۔ صیّب۔ رحمت کی بارش کو کہتے ہیں۔ جو نہ اندازہ سے زیادہ اور نہ تباہی کرنیوالی ہو۔ اس بارش سے وحی الٰہی کو مثال دی ہے۔ جو قلوب کو زندہ کرتی ہے۔ جس طرح بارش زمین کو زندہ کرتی ہے +

۴۹۔ من السماء۔ سماء کے معنے عربی زبان میں بلندی کے ہیں۔ سماء کُلّ شئی اعلاہ۔ اور لغت عرب میں بادل کو بھی سماء کہتے ہیں۔ اور خود بارش کو بھی۔ پس جہاں سماء سے بارش کے اُترنے کا ذکر ہو وہاں سماء سے مُراد مطلق بلندی یا بادل کے ہونگے +

۵۰۔ فیہ ظلمات ورعد برق۔ اندھیرا اور گرج ان مشکلات اور مصائب کے قائمقام ہیں۔ جو اعلائے کلمۃ اللہ میں یا قبُول حق میں پیش آتی ہیں۔ اور برق یا چمک وہ حق کی کامیابیاں ہیں۔ جو بعض وقت اپنی چمک سے آنکھوں کو چُندھیا دیتی ہیں۔ یکاد البرق یخطف ابصارھم مُنافق مشکلات سے بچنا چاہتا ہے۔ یجعلون اصابعھم فی اذانھم من الصواعق حذر الموت۔ یعنے جب اسلام کا ذرا غلبہ دیکھا تو وہ بھی ساتھ ہو لیتا ہے۔ اور جب ذرا سی مصیبت پیش آئی تو ٹھیر جاتا ہے۔ کلّما اضاء لھم مشوا فیہ واذا اظلم علیھم قاموا۔ یہ مثال اُن منافقوں کی ہے۔ جو ذرا سی مشکل سے گھبرا کر کُفّار کے ساتھ جا ملتے۔ اور کُچھ کامیابی مسلمانوں کی دیکھی تو ان کے ساتھ آ ملتے۔ جو امنوا ثم کفروا ثم امنوا ثم کفروا کا مصداق ہیں۔ اُن کی قُوّت مُمیّزہ بالکُل نہیں جاتی رہی کمزور ہے +

رکوع ۳/۳ ۲۱ ۵۱۔ اعبدوا ربکم۔ احکام میں یہ سب سے پہلا حکم ہے جو دیا گیا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ ترتیب وحی الٰہی کے ماتحت ہے۔ کیونکہ ہر مذہب یہی کہتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے سب احکام میں سے عبادتِ الٰہی پہلا حکم ہے۔ قرآن کریم نے سب سے پہلے رکھ کر اُس کی اہمیّت کو عملی رنگ میں بتا دیا۔ یہاں سب انسانوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ کہ سب عبادتِ الٰہی میں لگ جاؤ۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ بدیوں سے بچ جاؤ گے۔ اور دُکھوں سے نجات پاؤ گے۔ دوسری جگہ فرمایا۔ کہ لا تعبدون الا اللہ۔ اللہ تعالےٰ کے سوائے کسی کی عبادت جائز نہیں۔ خواہ کوئی مظہر قدرت ہو یا کوئی طاقت ہو یا کوئی انسان ہو یا اور چیز ہو۔ اور ایک جگہ فرمایا۔ کہ اِنسان کی زندگی کی اصل غرض ہی یہ ہے کہ وہ عبادتِ الٰہی میں لگ جائے۔ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ پس ربّ کی عبادت اِنسان کی زندگی کا اصل مقصد

ناکام کوششیں کر چکے تھے۔ اس طرح پر نابود کردی گئی ہو۔ کہ اس کا نام ونشان باقی نہ رہے بلکہ تیرہ سو سال گذر جانے کے باوجود پھر اُس کا نام ونشان پیدا نہیں ہوا۔ اور وہی لوگ جو بُت پرستی میں ایسے غرق شدہ تھے۔ کہ سوائے بُتوں کی امداد کے نہ قیام میں نہ سفر میں اُن کا کوئی کام ہی نہیں ہوتا تھا۔ اب ایسے توحید الٰہی کے جاں نثار ہوگئے کہ دُنیا کے چاروں کناروں میں **توحید** کا **پیغام** چند سالوں کے اندر پہنچا دیا۔ یہی حال اُن کی شراب خوری کا ہے۔ جس خطرناک مرض سے چند انسانوں کا علاج بھی مشکل ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ ایک قوم کی قوم خطرناک شراب خوری کرتی کرتی معاً ایسی بیزار ہو جائے کہ شراب کا نام تک اُن کے سامنے نہ آنے پائے۔ کیا دُنیا میں کوئی کتاب اور ایسی موجود ہے۔ جس کے ایک ہی لفظ نے ایسا تغیرِ عظیم پیدا کر دیا ہو۔ عرب کے مُلک کی ایک ایک بدی کو گنتے جاؤ۔ اور دیکھو کہ کسی ایک امر میں بھی وہ انقلاب عظیم دُنیا کی اور کسی کتاب نے پیدا نہیں کیا جو قرآن کریم نے کیا۔ اور پھر وہ اصولِ دین باندھے جن کی طرف آخر آج خود دُنیا کا میلان ہوتا جاتا ہے +

یہ دعوےٰ قرآن کریم نے صرف اسی جگہ نہیں کیا۔ بلکہ تین اور مقامات پر بھی کیا ہے۔ اور جس طرح ایک مدنی سُورت میں ہے مکّی سُورتوں میں بھی ہے۔ ایک جگہ فرمایا۔ قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ھذا القراٰن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔ اور پھر فرمایا ساری کتاب نہیں تو دس ہی سُورتیں لے آؤ۔ ام یقولون افترٰہ قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات۔ اور پھر فرمایا۔ دس نہیں تو ایک ہی سُورت لے آؤ۔ قل فاتوا بسورۃ مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین +

۶۰۔ شھداء کم۔ ایک معنے اس کے اعوانکم کے بھی کئے گئے ہیں یعنی اپنے مددگاروں کو بُلالو۔ اور شہید معنی امام بھی آتا ہے یعنی اپنے پیشرووں کو بُلالو +

۲۴
۶۱۔ النار التی وقودھا الناس والحجارۃ۔ ایک آگ سے ڈرایا ہے۔ جو مقابلہ اور مخالفت کرنیوالوں کو بھی بھسم کر جائیگی۔ اور اُن کے جھوٹے معبودوں کو بھی جلا دیگی۔ الحجارۃ کا لفظ اسلئے فرمایا۔ کہ وہ نہ صرف بُتوں کی ہی پُوجا کرتے تھے۔ بلکہ بن تراشے پتھروں کو بھی پُوجتے تھے۔ اِس آخرت کے نظارہ کا ایک رنگ دُنیا میں بھی دکھا دیا۔ جہاں نار جنگ کی قائمقام ہے کلما اوقدوا نارا للحرب اطفاھا اللہ۔ اِنہی جنگوں میں مخالفت کرنے والے بھی بھسم ہو گئے۔ اور وہ معبودان باطل جن کے بھروسہ پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی

کوئی نہیں - مگر پھر بھی فرمانبرداری میں پتھروں اور انسانوں کو اللہ تعالےٰ کا شریک کر لیتے ہیں +

۲۳ ۵۸ - سُورۃ - سُورۃ اس عمارت کو کہتے ہیں جو خوبصورت اور بلند ہو۔ مُفردات میں ہے - السورۃ المنزلۃ الرفیعۃ - اور سُور شہر کی فصیل کو کہتے ہیں - جو اُس کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے - پس قرآن کریم کی سُورت کو سُورت یا تو اِس وجہ سے کہا جاتا ہے - کہ وہ ایک منزل کے بعد دوسری منزل ہے - اور یا اِسلیئے کہ وہ اپنے اندر بعض مضامین کو مکمّل اور مجتمع طور پر اِس طرح پر لئے ہوئے ہے - جیسے شہر کی فصیل شہر کا احاطہ کیئے ہُوئے ہوتی ہے +

۵۹ من مثلہٖ - یہاں قرآن کریم نے کوئی تصریح نہیں فرمائی - کہ کس لحاظ سے مثل کا مطالبہ کیا ہے فصاحت و بلاغت میں قرآن کریم بیشک بے نظیر ہے - یہاں تک کہ مخالفین کو تسلیم کرنا پڑا ہے - کہ عربی زبان میں فصاحت و بلاغت کا معیار ہی قرآن کریم قرار پاگیا ہے مگر قرآن کریم اگر ایک جگہ ایک بات کی تصریح نہ فرمائے - تو دوسرے موقعہ پر فرما دیتا ہے - اِس کتاب کا اصلی مقصد جو کہ شروع کتاب میں ہی بیان فرمایا - یہ ہے ذٰلک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین - یعنی اِس کتاب کی اصل خصُوصیّت یہ ہے - کہ یہ ایک ہدایت ہے - ایسا ہی اَور بھی بہت جگہ پر قرآن کریم کو ھُدیٰ کہا ہے - پس من مثلہٖ کا سب سے بڑا نشان یہ ہے - کہ جو کتاب اس کی مثل ہونے کا دعوےٰ کرے - وہ دُنیا میں وہی انقلابِ عظیم پیدا کر کے دکھائے - اور قوموں کو گمراہیوں اور غلطیوں سے نکال کر اُسی طرح ہدایت پر لائے جس طرح قرآن کریم نے کیا - یہ ایسا معیار ہے - کہ جس پر پرکھنے سے قرآن کریم کی فضیلت دُنیا کی سب کتابوں پر روز روشن کی طرح ظاہر ہو جاتی ہے - اِس میں مخالفین سے صرف یہی مُطالبہ نہیں کیا گیا - کہ وہ کوئی اس کی مثل نئی سُورت بنائیں - بلکہ یہ مطالبہ عام الفاظ میں ہے - فأتوا بسورۃ یعنی ایک سُورت لے آؤ - خواہ کہیں سے لے آؤ - نہ اس کی مثل پہلی کتابوں میں کوئی سُورت ہے نہ آئندہ ہو سکیگی - قرآن کریم کا یہ بینظیری کا دعوےٰ جس کو دُنیا میں پیش ہُوئے تیرہ۱۳ سَو سال گذر گئے آج اُسی طرح پر قائم ہے جیسے اُس وقت تھا - کوئی شخص نہیں دکھا سکتا - کہ دُنیا کی اور کسی کتاب نے ایسا انقلابِ عظیم دُنیا میں پیدا کر کے دکھایا ہو - جیسا قرآن کریم نے پیدا کیا - کہ نہ صرف تئیس سال کے عرصہ میں ایک مُلک کی کایا پلٹ دی - بلکہ دُنیا کے کثیر ممالک پر ایسا ہی انقلاب پیدا کر کے دکھا دیا - کیا اس کی کوئی نظیر ہے - کہ اس قدر قلیل عرصہ میں کسی کتاب کے ذریعہ سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں برسوں کی جمی ہُوئی بُت پرستی جس کو دُور کرنے کے لئے یہُودی اور عیسائی

لغت میں ہے ثم استعیر للمبقی دائماً ؂

۲۶
۶۷- اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلاً مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَھَا - چونکہ اصل مضمون اس رکوع میں توحید الٰہی کا ہے اس مضمون سے رکوع شروع ہؤا - اسی پر ختم ہو گا - اسی کی تائید میں قرآن کریم کا کلام الٰہی ہونا بھی ثابت کیا گیا ہے - یہاں بھی اسی توحید کے مضمون کی طرف اشارہ ہے - عربی زبان میں نہایت درجہ کی کمزوری کی مثال بعوضہ یعنی مچھر سے دی جاتی ہے - چنانچہ انکی امثال میں ہے - اضعف من بعوضۃ - پس مچھر کی مثال سے مُراد یہاں نہایت درجہ کی کمزور شے کی مثال ہے - اور فما فوقھا اسلیئے فرمایا - کہ اللہ تعالیٰ نے جو مثالیں معبودان باطل کی دی تھیں - وہ تو مچھر سے اُوپر ہی تھیں - حالانکہ اگر مچھر سے بھی مثال دی جاتی جس کے ساتھ نہایت درجہ کی کمزور شے کی مثال دی جاتی ہے تو بالکل صحیح تھا - ایسی مثالیں اللہ تعالےٰ اس سے پہلے اپنی وحی میں بیان فرما چُکا تھا - چنانچہ سُورۂ عنکبوت میں فرمایا - مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت اتخذت بیتا وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت - یعنی اُن لوگوں کی مثال جو اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے مددگار یا مُحافظ بناتے ہیں مکڑی کی مثال کی طرح ہے - کہ وہ ایک گھر بناتی ہے - اور یقیناً سب گھروں سے کمزور مکڑی کا گھر ہے - اسی طرح پر دوسری جگہ بھی مثال دی ہے - یا ایھا الناس ضرب مثل فاستمعوا لہ ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ وان یسلبھم الذباب شیئا لا یستنقذوہ منہ ضعف الطالب والمطلوب (الحج) پچھلے رکوع میں بھی اللہ تعالیٰ نے دو مثالیں بیان فرمائی ہیں - جن میں منافقوں کا ذکر بیان فرمایا ہے ؂

۶۸- یضل بہ کثیرًا - بعض کے نزدیک یہ کلام مُعترضین کا قول ہے - اور سارے کا جواب وما یضل بہ الا الفاسقین میں دیا ہے - مگر یہاں اضل کے لفظ کے معنی اچھی طرح سمجھ لینے چاہئیں - اضلّ کے ایک معنے تو بہکا دینا یا غلط راہ پر ڈال دینا ہے - مگر ان معنوں میں یہ لفظ اللہ تعالےٰ کی طرف قرآن کریم میں منسُوب نہیں کیا گیا - بلکہ بار بار شیطان کو مُضل کہا گیا ہے - اب یہ تو ظاہر امر ہے - کہ کلام الٰہی میں اضلال کا فعل اللہ تعالیٰ کی طرف اور شیطان رجیم کی طرف ایک ہی معنی میں منسُوب نہیں ہو سکتا - جب بہکانے یا غلط راہ پر ڈالنے کا فعل شیطان کی طرف منسُوب کیا گیا - تو وہی فعل خُدا کی طرف ہرگز ہرگز منسُوب نہیں ہو سکتا - علاوہ ازیں قیامت کے دن غلط کار لوگ جو عُذر پیش کرتے ہیں - وہ تو یہی ہے - کہ ہمارے سرداروں اور شیطانوں نے ہمیں دھوکہ دے کر

مخالفت کی جاتی تھی۔ وہ بھی اُسی آگ کا ایندھن بن گئے +

۲۵ ۶۲۔ جنّٰتٍ تجری من تحتھا الانھار۔ بہشتی زندگی کا نقشہ قرآن کریم نے اکثر اوقات انہی الفاظ میں کھینچا ہے حقیقت ان نعمائے جنّت کی کیا ہوگی۔ قرآن کریم میں فرمایا۔ فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین۔ یہ ان ظاہری آنکھوں سے پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مالا عین رأت۔ پس اُن کی حقیقت میں کوئی انسان دخل نہیں دے سکتا۔ ہاں جس طرح یہ ایک طرف ایمان اور اعمال صالحہ ضروری رکھے ہیں۔ اسی طرح پر دوسری طرف اُس کا ثمرہ جنّات اور نہروں کے رنگ میں بیان فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ کو ایمان کے لیئے اسی طرح ضروری قرار دیا ہے جس طرح نہروں یعنی پانی کو درختوں کے لیئے جس طرح پانی کے بغیر درخت خشک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ ایمان بھی خشک اور مُردہ ایمان ہے جس کی آبپاشی اعمال صالحہ سے نہ ہوئی ہو +

۶۳۔ ھذا الذی رزقنا من قبل۔ یعنی ان ثمرات اعمال صالحہ کو ظاہری شکل میں دیکھ کر استنباطاً لوگ کہیں گے۔ کہ یہی ثمرات اُن اعمال صالحہ کے ہم کو پہلے یعنی دُنیا میں بھی دیئے گئے تھے۔ گو اس وقت اُن کو ظاہری آنکھیں نہیں بلکہ باطنی آنکھیں ہی دیکھ سکتی تھیں +

۶۴۔ واتوا بہ متشابھا۔ یعنی وہ ثمرات اُن پہلے ثمرات سے ملتے جُلتے ہونگے۔ کیونکہ گو اُن کی حقیقت ایک ہوگی۔ مگر شکلیں مختلف۔ یا مُراد یہ ہے۔ کہ بہشت کے ثمرات ایک دوسرے سے ملتے جُلتے ہونگے +

۶۵۔ ازواج مُطھرۃ۔ پاک بیبیاں۔ بڑی تطہیر تو وہی ہے۔ جو یزکیھم میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کی۔ پھر بہشت تو وہ جگہ ہے۔ کہ جہاں کسی قسم کی آلائش اور ناپاکی باقی رہ ہی نہیں سکتی جنّتیوں کے دلوں کے اندر کے کینے بھی صاف کر دیئے جاتے ہیں۔ ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا علےٰ سرر متقابلین۔ انہی ازواج یا بیبیوں کے مُتعلّق دوسری جگہ فرمایا۔ ادخلوا الجنۃ انتم وازواجکم تحبرون۔ کہ تم اور تمہاری بیبیاں عزّت کے ساتھ جنّت میں داخل ہو جاؤ (الزخرف) اور پھر سُورۂ یٰسین میں فرمایا۔ ھم وازواجھم فی ظلل علی الارائک متکئون +

۶۶۔ خالدون۔ خلود کے اصل معنی ہیں کسی چیز میں بگاڑ کا نہ آنا۔ اِس لیئے مُخلِد اسکو کہتے ہیں جو مُدّت طویل تک باقی رہے۔ اور خلد کے معنی مُطلق بقا و اقامت کے آتے ہیں یعنی باقی رہا یا ایک جگہ میں رہا۔ اور مخلد اُس شخص کو کہتے ہیں جیسے بڑھاپا دیر سے آئے۔ پس خلود کے معنے میں لازم طور پر دوام نہیں ہے۔ ہاں ان معنوں پر بھی استعارۃً بولا جاتا ہے جیسا

۶۹۔ الفٰسقین۔ الفسق الخروج عن القصد الفاسق فی الشریعۃ الخارج عن امر اللہ بارتکاب الکبیرۃ۔ فسق کے لغوی معنے تو اعتدال کی حد سے نکلجانے کے ہیں۔ اور ہماری شریعت میں فاسق اُسے کہتے ہیں۔ جو کسی کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے اللہ تعالےٰ کی اطاعت سے نکلجائے۔ قرآن کریم نے لفظ فاسق کو جس معنی میں استعمال کیا ہے۔ اُس کی تشریح خود اس جگہ فرما دی ہے یعنی فاسق وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے عہد اور قانون کو اس کے مضبوط ہو جانے کے بعد توڑتا ہے یعنی اُس کی سب سے بڑی بیماری یہ ہے۔ کہ وہ بد عہد ہوتا ہے۔ ایک عہد کر کے پھر اُسے توڑتا ہے چنانچہ سورت توبہ میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔ کہ اگر تم دُنیا کو اللہ اور اُس کے رسول اور اُس کی راہ میں جہاد سے بڑھ کر محبوب بنالوگے۔ تو تم فاسقوں میں داخل ہوگے۔ کیونکہ مسلمان قوم کا یہ عہد اللہ تعالیٰ سے تھا۔ کہ وہ دُنیا کو دین پر مُقدّم نہیں کرینگے۔ بلکہ اُنھوں نے اپنا جان و مال اور اپنا سب کچھ اللہ کی رضا کے لیئے بیع کر دیا ہے۔ پھر فاسق کا نشان یہ بتایا۔ کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے وہاں وہ توڑتا ہے۔ سب سے بڑا حکم توڑنے کا تو خود اللہ تعالےٰ سے ہی ہے۔ اور شیطان سے تعلق توڑنے کا حکم ہے۔ سو فاسق اللہ تعالےٰ سے تعلق توڑتا اور شیطان سے جوڑتا ہے۔ اور آخری علامت یہ بتائی۔ کہ اُن کی کھلی نشانی یہ ہے کہ پھر وہ زمین میں بھی فساد پھیلاتے ہیں ؂

۷۰۔ ثُمَّ کے معنے پھر۔ لیکن بعض وقت تذکرہ میں ثُمَّ سے مُراد یہ نہیں ہوتی۔ کہ اُس پہلے واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ ظہور میں آیا۔ بلکہ محض ایک اور امر کا ذکر کرنا مُراد ہوتا ہے۔ چنانچہ عام طور پر کہتے ہیں۔ اعجبنی ما صنعت الیوم ثم ما صنعت امس اعجب۔ جو تو نے آج کیا۔ وہ مجھے بہت اچھا لگا۔ پھر جو تُو نے کل کیا تھا وہ تو اُس سے بھی عجیب تھا۔ یہاں ثم یا پھر سے مُراد صرف اس قدر ہے۔ کہ پھر ایک اور واقعہ کا ذکر کرتا ہوں۔ یہی معنے لفظ ثُمَّ کے یہاں ہیں ورنہ یہ مُراد نہیں کہ زمین میں سب کچھ پیدا کر کے پھر آسمان بنایا۔ کیونکہ دوسری جگہ فرمایا۔ والارض بعد ذٰلک دحٰھا ؂

۷۱۔ فسوّٰھن سبع سمٰوٰت۔ سماء کے معنے بُلندی کے میں پہلے بتا چکا ہوں۔ اور یہ لفظ ہر اُوپر کی چیز پر بولا جاتا ہے مُفردات میں ہے۔ کُلّ سماء بالاضافۃ الی ما دونھا فسماء و بالاضافۃ الی ما فوقھا فارض یعنی ہر ایک سماء اپنے سے نیچے والے کی نسبت سے سماء ہے۔ اور اپنے سے اوپر والے کی نسبت سے الارض یعنی زمین ہے۔ اور دوسری جگہ فرمایا۔ ومن الارض مثلھن اور ایک جگہ سبع سمٰوٰت کو سبع طرائق یعنی سات راستے بھی فرمایا ہے۔ پھر ایک جگہ سماء کو دُخان بھی کہا ہے۔ سو ہو سکتا ہے۔ کہ سبع سمٰوٰت سے مُراد نظام شمسی کے سات اوّل درجے

۲۹

غلط راہ پر ڈالا۔ ربنا ارنا الذین اضلّٰنا من الجن والانس۔ یہ عذر کبھی نہیں کرتے۔ کہ خدایا تونے ہمیں خود ہی غلط راہ پر ڈالا تھا۔ پس قطعی اور یقینی طور پر معلوم ہو گیا۔ کہ اضلال کا لفظ بہکانے یا غلط راہ پر ڈالنے کے معنے میں ہرگز اللہ تعالیٰ کی نسبت نہیں بولا گیا +

اب اضلال کے ایک دوسرے معنے بھی آئے ہیں یعنی جب کوئی شخص کسی شے کی وجہ سے خود ایک غلط راہ کو اختیار کرے۔ حالانکہ وہ شے اس کو غلط راہ پر ڈالنے والی نہیں۔ اسکی مثال حضرت نوح علیہ السّلام کی یہ عرض ہے جو اُنھوں نے بارگاہ الٰہی میں کی۔ فلم یزدھم دعاءی الا فرارا۔ میرے بُلانے نے ان کو اور بھاگنے میں ہی بڑھایا۔ حالانکہ بُلانا خود کوئی بھگانے والی شے نہ تھی۔ بلکہ بھاگنے کے مفہوم کے بالکل خلاف اس کا مفہوم ہے۔ وہ بُلاتے ہیں۔ وہ بھاگتے ہیں۔ مگر پھر بھی چونکہ جس قدر وہ بُلاتے تھے اسی قدر وہ اور دُور بھاگتے تھے۔ اسلیئے بھاگنے کو اپنی دُعا کی طرف منسوب کر دیا۔ انہی معنوں میں یضل بہٖ کثیرا ہے کیونکہ خود ہی بعد میں یھدی بہٖ کثیرًا کہکر یہ فرمادیا ہے۔ کہ جس چیز کی وجہ سے وہ گمراہ ہوتے ہیں۔ وہ تو اصل میں اُن کی ہدایت کی چیز ہے۔ اور اس کی غرض ہی ان کو راہ دکھانا ہے۔ مگر یہ ایسے کمبخت ہیں۔ کہ ہدایت کی چیز سے بھی گمراہ ہی ہوتے ہیں +

اضلال کے ایک تیسرے معنے بھی زبان عربی میں آئے ہیں۔ اور وہ کسی شخص کو گمراہ پاکر اُسے گمراہ قرار دینا ہے۔ اُس معنی کی مشہور مثال طرفہ کا شعر ہے ؎

وما زال شربی الراح حتی اضلنی صدیقی وحتی ساءنی بعض ذلکا

یہاں لفظ اضل صاف طور پر گمراہ قرار دینے کے معنے میں استعمال ہُوا ہے۔ اور قرآن کریم نے جہاں فعل اضلال کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ وہاں صاف یہ مفہوم پایا جاتا ہے چنانچہ فرمایا۔ وما یضل بہٖ الا الفاسقین۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا اضلال تو اُسی کے لئے ہے۔ جو پہلے ہی فاسق ہو چکا۔ تو جو پہلے ہی فاسق ہے گمراہ تو وہ پہلے ہی ہو چکا اب اس کو اور کیا گمراہ کرنا تھا۔ پس معلوم ہُوا کہ یہاں اضل کے معنے گمراہ قرار دینے یا گمراہی کا فتوےٰ صادر کرنے یا گمراہی کا نتیجہ یعنی سزا دینے کے ہیں۔ اس کو سُورۂ الاعراف میں نہایت صفائی سے بیان فرمایا ہے۔ وفریقًا حق علیھم الضلالۃ انھم اتخذوا الشیاطین اولیاء من دون اللہ۔ یعنی ایک فریق پر گمراہی کا فتوےٰ صادق آتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ اللہ کے سوائے شیطانوں کو اپنا کارساز بنا لیتے ہیں۔ اس کے مؤید اور بہت سی آیات قرآنی ہیں کہیں فرمایا۔ یضل اللہ الکافرین کہیں یضل اللہ الظالمین کہیں یضل اللہ من ھو مسرف مرتاب +

ذات چونکہ وراء الوراء ہے۔ اس لیئے اس کا قول بھی انسان کے قول سے علیحدہ رنگ کا ہے پھر مختلف حالات کے مطابق اس قول کے معنے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً یانار کونی بردا و سلاماً میں محض آگ کو حکم ہے۔ اسی طرح پر انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون۔ اور بعض وقت یہ قول الہام اور وحی کی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسے رامتباز ولی انبیاء اور رسولوں کی حالت میں۔ لیکن جہاں شیطان کو کچھ کہا ہو۔ وہاں یہ مراد نہ ہوگی۔ یہاں ملائکہ کو کچھ فرمایا ہے۔ تو چونکہ ملائکہ وہ ہستیاں ہیں۔ جو وسائط کے طور پر اللہ تعالیٰ کے احکام کو تعمیل میں لاتی ہیں۔ جیسا کہ اُن کی شان میں فرمایا۔ وھم بامرہ یعملون۔ تو پس یہاں اللہ تعالیٰ کا ملائکہ کو فرمانا نہ بطور مشورہ کے ہے نہ کسی اور غرض کے لیئے۔ بلکہ ارادہ الٰہی کا اظہار فرمایا۔ تاکہ وہ ہو جائے ✣

۷۳۔ للملئکۃ۔ ملائکہ یا ملک کا مادہ خواہ ملک بمعنی قوت ہو۔ اور خواہ الوک بمعنی رسالت مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ وہ اللہ تعالےٰ کی ایک مخلوق ہے۔ جو نظام عالم جسمانی اور عالم رُوحانی میں وسائط ہیں۔ اور وہ محض قوتوں اور طاقتوں کا نام نہیں۔ بلکہ ایک علیحدہ مخلوق ہے۔ عالم رُوحانی میں تو اُن کا ثبوت ہمیں اس طرح ملتا ہے۔ کہ جس طرح ہم دیکھتے ہیں۔ کہ انسان کو جس قدر قوٰے دیئے گئے ہیں۔ ان کے ظہور میں آنے کے لیئے بیرونی وسائط کی ضرورت ہے۔ جیسے آنکھ کے لیئے روشنی کی وغیرہ۔ اسی طرح پر عالم رُوحانی میں بے نیکی اور بدی کی جو قوتیں انسان کے اندر ہیں۔ اُن کے عمل میں آنے کے لیئے وسائط ہونے ضروری ہیں۔ یہی نیکی کے محرک ملائکہ اور بدی کے محرک شیاطین ہیں۔ عالم جسمانی میں بھی یہ ظاہر بات ہے۔ کہ ایک طاقت بذات خود کوئی چیز نہیں۔ وہ وسائط جن کے ذریعہ سے وہ طاقتیں اپنا کام کرتی ہیں۔ یا جو ہستیاں اُن طاقتوں پر مُوکل ہیں۔ وہ ایک مخلوق ہے جس کو ہم اسی طرح اس ظاہری آنکھ سے دیکھ نہیں سکتے۔ جس طرح خُود ان طاقتوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ مگر ظہور ان دونوں کا ہم نتائج میں دیکھتے ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ملائکہ کی ہستی سے انکار کیا جائے۔ یا ان کو محض طاقتیں ٹھیرایا جائے۔ مگر چونکہ ہر کام پر علیحدہ ملائکہ متعیّن ہیں جو اُس کے مدبّر ہیں۔ پس یہاں جن ملائکہ سے ارشاد الٰہی ہوا۔ وہ وہی ملائکہ ہیں جن کا تعلق اس امر سے ہوگا ✣

۷۴۔ خلیفۃ۔ کے معنے حاکم یا بادشاہ اور پیچھے آنے والے کے بھی ہیں۔ بعض نے خلیفہ سے مُراد صرف زمین کو آباد کرنے والے سے ہی ہے۔ پھر بعض نے مُراد صرف حضرت آدم علیہ السلام کو لیا ہے۔ اور بعض نے اس سے مُراد بنی آدم کو لیا ہے۔ اور اس کے مؤید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد

آیت ۲۹

کے سیارے ہوں۔ کیونکہ اول درجہ کے سیارے زمین سمیت کُل آٹھ ہی قرار دیئے ہیں۔ اور کبھی فضاء میں اُن کے راستوں پر یہ لفظ بول دیا ہو۔ یا ہو سکتا ہے۔ کہ ستاروں کے سات طبقے مُراد ہوں جو کھُلی آنکھ سے نظر آ سکتے ہیں (انسکلو پیڈیا برٹینیکا) یا کوئی اور سات بلندیاں ہوں جن کا آیندہ سائنس کو علم ہو جائے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بہت سی باتیں قرآن کریم کی جو لوگوں کو سائنس کے خلاف معلوم ہوتی تھیں۔ آج علمی ترقّی نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ وہ خلاف نہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ سبع اور سبعین یعنی سات اور ستّر وغیرہ الفاظ عربی زبان میں بعض وقت صرف کثرت کے ظاہر کرنے کے لیئے بولے جاتے ہیں۔ چنانچہ سُورۂ توبہ میں جہاں ان تستغفرلھم سبعین مرۃ آیا ہے۔ وہاں ازہری نے لکھّا ہے۔ کہ یہ باب تکثیر اور تضعیف سے ہے یعنی کثرت کے اظہار کے لیئے لامن باب حصر العدد۔ گنتی مقصود نہیں۔ اور لسان العرب میں ہے۔ قد تکرر ذکر السبعۃ والسبع والسبعین والسبعمائۃ فی القرآن وفی الحدیث۔ والعرب تضعھا موضع التضعیف والتکثیر کقولہ تعالیٰ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل یعنی سات اور ستّر اور سات سو کا ذکر قرآن اور حدیث میں بار بار آیا ہے۔ اور عرب لوگ اس کو زیادتی اور کثرت کے اظہار کے لیئے بولتے ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کمثل حبۃ۔ یعنی مثل اس دانے کے جس سے سات بالیں پیدا ہوتی ہیں +

رکوع ۴ ۳۰

۲۷۔ واذ قال ربک۔ قول کا لفظ عربی زبان میں مختلف افعال کے اظہار کے لیئے آتا ہے۔ مفردات میں ہے۔ کہ قول کے ظاہر معنی تو یہی ہیں۔ کہ نُطق سے یعنی بول کر کچھ ظاہر کیا جائے۔ لیکن اس کے علاوہ جو بات دل میں ہو۔ اُس پر بھی قول کا لفظ آجاتا ہے۔ کسی چیز کی حالت کسی بات پر دلالت کرے۔ تو اُسے بھی قول کہدیتے ہیں۔ جیسے امتلأ الحوض وقال قطنی۔ حوض بھر گیا۔ اور اس نے کہا میرے لیئے بس ہے۔ اور بھی بہت سے معانی دیئے ہیں۔ اسی طرح پر تاج العروس میں قال بیدہٖ قال برجلہٖ قال براسہٖ قال بثوبہٖ وغیرہ کی مثالیں دی ہیں جن کے معنے ہیں اُس نے پکڑ لیا۔ چلا گیا۔ اشارہ کیا کپڑا اُٹھایا۔ اسی طرح پر قول کا لفظ سوائے انسان کے دوسروں کے لیئے بھی بولا گیا ہے۔ جیسے قالت لہ الطیر۔ اور قرآن کریم میں ہے قالتا اتینا طائعین۔ جس کی تفسیر میں مفردات میں ہے۔ ان ذٰلک کان بتسخیر من اللہ تعالےٰ۔ اسی طرح پر یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قول کا لفظ جب اللہ تعالےٰ کی طرف منسُوب ہوتا ہے۔ تو اُس سے اِس قسم کا نُطق تو قطعاً مُراد ہوتا ہی نہیں جس قسم کا نُطق انسان کا ہے۔ کیونکہ انسان کا نُطق تو خاص خاص مخارج سے خاص خاص آوازوں کا نکلنا ہے۔ اللہ کی

آیت ۳۱

۷۸ - ان کنتم صادقین - اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے - کہ علم تام ہر شے کا اللہ تعالیٰ کو ہی ہو سکتا ہے - اور دوسرے یہ کہ اگر ایک پہلو نقص کا انسان میں نظر آتا ہے - تو دوسرا پہلو کمال کا بھی موجود ہے - درحقیقت انسان کا کمال اور اُس کی ساری فضیلت یہی ہے - کہ اُس کو اللہ تعالیٰ اپنے کلام سے مشرّف فرماتا ہے - اور خود علم سکھاتا ہے - ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اسی لئے سیّد ولد آدم ہُوئے - کہ آپ کو وہ پاک کلام سکھایا گیا - جو کلام الٰہی میں سب سے بڑا مرتبہ رکھتا ہے - الرّحمٰن علّم القراٰن خلق الانسان علمہ البیان یہاں الانسان سے مُراد انسان کامل حضرت محمّد مُصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے ہے حضرت آدم کو تو صرف اسماء سکھائے تھے - مگر آپ پر پُوری وضاحت فرمائی - کہ البیان سکھایا +

۳۳

۷۹ - انّی اعلم غیب السمٰوات - درحقیقت یہی ظاہر کرنا مقصود تھا - کہ سب علوم تو اللہ تعالیٰ کو ہی ہیں جس کو جس قدر چاہے دیدیتا ہے - سارا علم ملائکہ کو بھی نہیں دیا - بلکہ ایک انسان کو ملائکہ سے بھی بڑھ کر علم دیدیا - ما تبدون تو وہی حصّہ ہے جو ملائکہ کو معلوم ہوگیا - یعنی انسان کے فساد اور خونریزی کا - اور ما کنتم تکتمون وہ حصّہ ہے جو ان سے مخفی رہا یعنی کہ انسان کو کمال علم دیا گیا ہے +

۳۴

۸۰ - اسجدوا لاٰدم سجدہ کے معنے انقیاد اور خضوع کے ہیں یعنی مُطیع ہوجانا جُھک جانا - جس انسان کو اللہ تعالیٰ برگزیدہ بناتا ہے - ملائکہ بھی اُس کے فرمانبردار ہوجاتے ہیں بعض نے کہا ہے - کہ اسجدوا لاٰدم کے معنے ہیں آدم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرو - مگر چونکہ سجدہ کے معنے عبادت کے نہیں - بلکہ انقیاد اور اطاعت کے ہیں اسلئے پہلے معنی میں کوئی ہرج لازم نہیں آتا - جب اللہ تعالیٰ انسان کو اپنے کلام سے مُشرّف فرماکر اس کو اصلاح خلق کے لیئے کھڑا کرتا ہے - تو ملائکہ کو اسکی فرمانبرداری کا حُکم دیتا ہے تا وہ دلوں کے اندر نیکیوں کی تحریک کریں - ورنہ اگر ہم اپنے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کو ہی دیکھیں تو کس طرح ملک کُفر شرک جہالت توہم پرستی شراب خوری بدکاری سے بھرا ہُوا نظر آتا ہے - بلکہ ساری دُنیا کا یہی نقشہ ہے ایک انسان کا کام نہ تھا - کہ اس تمام مُلک کو ایک ہی آواز سے ایسا پاک کردیتا - کہ اس کی مثل دوسری قوم پاکیزگی کے مرتبہ کو پہنچی ہُوئی ایک بھی دُنیا میں نظر نہیں آتی - نہ آپ سے پہلے اور نہ آپ کے بعد - پس حق یہ ہے - کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو آپ کا فرمانبردار بنادیا - تا وہ انسانوں کے دلوں میں نیکیوں کی تحریک کریں - اس لیئے ان کے تمام گند دُھل گئے - اور وہ ایک

ہے ـ ھوالذی جعلکم خلائف الارض ـ اِس طرح پر خلیفہ کے معنے ہونگے ـ خلفاً یخلف بعضھم بعضاً ـ یعنی جو ایک دوسرے کے پیچھے ایک دوسرے کے قائمقام ہوتے رہتے ہیں ملائکہ کا یہ کہنا قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا بھی بتاتا ہے ـ کہ اولادِ آدم کی طرف ہی اشارہ ہے ـ کیونکہ حضرت آدم جو اصفیا میں سے تھے ـ اُن کے متعلّق تو یہ نہیں کہا جا سکتا تھا ـ کہ وہ فساد کرینگے ـ بلکہ فساد اور خونریزی بنی آدم کی طرف ہی منسوب ہو سکتی ہے ـ یہ یاد رکھنا چاہیئے ـ کہ نہ تو قرآن کریم نے اِنسان کی پیدائش کی تاریخ چھ ہزار سال سے بتائی ہے ـ جیسا کہ بائبل میں ذکر ہے ـ اور نہ ہی یہ فرمایا ہے ـ کہ آدم سے پہلے زمین پر کوئی مخلوق نہ تھی +

۷۵ - اتجعل فیھا ـ یہ نہ تو مشورہ ہے نہ اعتراض ہے ـ بلکہ بنی آدم کی ایک نُمایاں خصوصیّت کا ذکر ہے ـ اور درحقیقت اِنسان کامل کی ضرورت اِس لیئے ہوتی ہے ـ کہ تا وہ زمین سے فساد کو دُور کرے ـ اور ہر اِنسان کامل کی مخالفت بھی ہوتی ہے ـ پس جو ملائکہ اس امر پر متعیّن تھے اُن کو اس کا علم ہو جانا کہ بنی آدم زمین پر فساد اور خونریزی کرینگے کوئی قابلِ اعتراض امر نہیں ہاں اُن کو اِنسان کے کمالات کا علم ابھی نہیں دیا گیا تھا ـ اسلیئے جب اللہ تعالےٰ نے کمالات انسانی کا کوئی پہلو ملائکہ پر ظاہر فرمایا ـ تو اُنھیں اپنی لاعلمی کا اقرار کرنا پڑا +

۷۶ - نحن نسبّح بحمدك ـ تسبیح کے معنے ہیں ـ اللہ تعالیٰ کے ہر نقص سے مبرّا ہونے کا اقرار کرنا ـ ملائکہ مُعترض نہیں ـ اسی لیئے ساتھ ہی وہ اللہ تعالیٰ کے ہر نقص سے پاک اور بے عیب ہونے کا اظہار کرتے ہیں ـ گو بنی آدم کے اندر اُنھیں فساد اور خُونریزی کا نقص نظر آتا ہے مگر وہ سمجھتے ہیں ـ کہ اللہ تعالےٰ کا فعل احق و حکمت سے خالی نہیں +

۳۱

۷۷ - کلّ الاسماء ـ وہ کیا اسماء تھے ـ اللہ تعالےٰ نے یہاں نہیں فرمایا ـ البتّہ جس طرح یہاں علّم آدم الاسماء کلھا کے بعد ملائکہ کو سجدہ کا حکم دیا ـ اِسی طرح پر دوسری جگہ فرمایا ـ فاذا سویته و نفخت فیه من روحی فقعوا له ساجدین ـ گویا نفخ رُوح کے بعد سجدہ کا حکم دیا ـ قرآن کریم کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے ـ کہ رُوح کا لفظ اللہ نے اپنے کلام پر بھی بولا ہے جیسے فرمایا ـ کذلك اوحینا الیك روحاً من امرنا ـ جہاں بالاتفاق رُوح سے مُراد کلام الٰہی ہے ـ سو ان دونوں موقعوں کی تطبیق اسی طرح ہو سکتی ہے ـ کہ یہاں علم اسماء دینے سے مُراد کلام الٰہی کا نفخ کرنا لیا جائے جِس سے انسان حقیقی کمال کو پاتا ہے ـ تفسیر کبیر میں ہے ـ علمه صفات الاشیاء ونعوتھا وخواصھا لان صفات الشئ دالة علےٰ ماھیته +

عمداً اس کا ارتکاب نہیں کیا - مگر بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں - کہ خواہ انسان عمداً انکو کرے یا بھول کر کرے - نتیجہ کچھ نہ کچھ بھگتنا پڑتا ہے - پس آدم کو بھی اس حالت سے جو فراغت کی زندگی تھی - کُلَا مِنْهَا رَغَدًا - نکلنا پڑا ✣

۸۵ - اھبطوا بعضکم لبعض عدو - گو ھبطہ کے معنے اُوپر سے نیچے آنے کے ہیں لیکن جب انسان کے لئے بولا جائے - تو جیسا کہ مفردات میں ہے - اس میں صرف ایک استخفاف کا رنگ پایا جاتا ہے - جیسا کہ نزول میں شرف و اکرام کا - پس ایک نقصان کی حالت کی طرف آنے کو ھبطہ کہتے ہیں - اور ایسا ہی دُکھ یا تکلیف کی حالت میں جانے کو بھی کہتے ہیں - اسی معنی میں ہی بنی اسرائیل کو کہا - اھبطوا مصرا - بعضکم لبعض عدو یا ایک دوسرے کی دشمنی میں انسان کی اسی صفت کا اظہار ہے - جس کا ذکر پہلے بھی فرمایا - من یفسد فیھا ویسفك الدماء - ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑے اور باہمی مخالفتیں یہی انسان کے آرام کی زندگی کو مصائب میں تبدیل کردیتی ہیں - مگر جب ہم انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں پر نظر ڈالتے ہیں - تو اُن کی بھی مخالفت کا ہونا ایک قاعدہ کلیہ نظر آتا ہے - بلکہ جس قدر مخالفتوں کا سامنا اُن کو کرنا پڑتا ہے اتنا دوسروں کو نہیں - اور انہی مخالفتوں اور مشکلات سے ہی آخر اُن کا کمال ظاہر ہوتا ہے - سو معلوم ہوتا ہے - کہ درحقیقت کمال انسانی کو حاصل کرنے کے لئے اس مرحلہ کو طے کرنا ہی ضروری ہے - جو لوگ مشکلات سے بچنا اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں - وہ آدم کی سنّت پر نہیں چلتے - اور نہ ہی وہ کمالِ انسانی کو حاصل کرسکتے ہیں ✣

۸۶ - فتاب علیہ - جب انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے - تو اللہ تعالیٰ بھی اُس کی طرف رجوع برحمت کرتا ہے - اللہ تعالیٰ نے خود ہی انسان پر رحم کرنے کے لئے اسے کچھ کلمات سکھائے ہیں - جب انسان اُن کو سیکھ لیتا اور عملی رنگ میں اپنے اندر لے لیتا ہے - تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نیچے آجاتا ہے - توبہ کے اصلی معنی رجوع کے ہیں - انسان کی طرف سے توبہ یہ ہے - کہ وہ اللہ کی طرف لوٹ جائے - پس ہر رجوع انسان کا جو اللہ تعالیٰ کی طرف ہو وہ اُس کی توبہ ہے - اور جب انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے - تو اللہ تعالیٰ بھی اُس کی طرف رجوع فرماتا ہے - بلکہ وہ توّاب بہت بڑھ کر رجوع فرمانے والا ہے - گناہگاروں اور بےگناہوں کو یکساں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کی ضرورت ہے پس توبہ کرنا گناہ کی نشانی نہیں جیسا غلطی سے سمجھ لیا گیا ہے ✣
(۳۷)

۸۷ - اھبطوا منھا جمیعا - اللہ تعالیٰ سب انسانوں کو ایک ہی حالت میں رکھتا ہے - اور ایک ہی
(۳۸)

آیت ۳۴

مُزکّی کے ہاتھ سے خُود مُزکّی اور مُطہر ہو کر دُنیا کے لئے ہادی بنے۔ لتکونوا شھداء علے النّاس ویکون الرّسُول علیکم شھیدا +

۸۱۔ اِلّآ اِبْلِیْس۔ ابلیس کے متعلق دوسری جگہ فرمایا۔ کان من الجن ففسق عن امر ربہٖ جس سے معلوم ہوا۔ کہ ابلیس ملائکہ میں سے نہ تھا۔ بلکہ جنّوں میں سے تھا۔ اِس صُورت میں اِلّا استثنائے مُنقطع ہوگا۔ ابلاس اُس حُزن یعنی غم کو کہتے ہیں۔ جو سخت ترین مایُوسی سے اِنسان کے لاحق حال ہوتا ہے۔ اسی سے ابلس اور ابلیس مُشتق ہیں مجرموں کے مُتعلق قرآن کریم میں آتا ہے یبلس المجرمون۔ اور کُفّار کے مُتعلّق فَاِذَا ھُم مُبلسون۔ پس ابلیس وہ ہستی ہے جو رحمت الٰہی سے مایُوس ہے۔ اسلیئے فرمایا۔ کان من الکافرین۔ یعنی وہ کافروں میں سے تھا +

آیت ۳۵

۸۲۔ الجنۃ۔ یہ جنّت وہ دارُ الجزا نہیں ہوسکتا۔ جس میں بعد موت نیک لوگ داخل ہونگے۔ کیونکہ اس کے متعلّق فرمایا ہے۔ وَمَا ھُمْ منھا بمخرجین۔ یعنی اس سے وہ کبھی نکالے نہیں جائیں گے۔ مگر اس جنّت سے آدم کو نکلنا پڑا۔ اور اس رکُوع کے شرُوع میں جاعلٌ فِی الاَرضِ خلیفۃ فرما کر یہ ظاہر کر دیا۔ کہ وہ جنّت بھی کوئی زمینی جنّت ہی تھا +

۸۳۔ ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ۔ ہمیں اِس پر کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت محسُوس نہیں ہوتی۔ کہ کس چیز سے روکا تھا۔ ہمیں جس بات کا علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے۔ کہ ہمیں کس چیز کے قریب جانے سے اللہ تعالےٰ نے روکا ہے۔ سو اُن سب ممنُوعات کو ایک ہی لفظ میں جمع کر دیا۔ جہاں فرمایا۔ لا تقربوا الفواحش ما ظھر منھا و ما بطن۔ یعنی ظاہر اور چھپی ہُوئی ہر قسم کی فواحش کے قریب جانے سے بچنا چاہیئے۔ قرآن کریم نے بُری باتوں اور بُرے کاموں کو بھی بُرے درخت سے مثال دی ہے۔ مثل کلمۃ خبیثۃ کشجرۃ خبیثۃ۔ پس اللہ تعالیٰ نے آدم کو کسی شجرۃ سے روکا تھا۔ جو اُس کے لئے مُضر تھا۔ کیونکہ اُس کا نتیجہ فرمایا۔ کہ اُس کے قریب جانے سے اپنی جان پر ظلم کرنیوالے ہوگے +

آیت ۳۶

۸۴۔ فَاَزَلَّھُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْھَا۔ وہ جو دوسرے کو بُرائی کی طرف لیجانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ شیطان۔ رحمتِ الٰہی سے دُور اُفتادہ ہے۔ اُس کا کام ہے دلوں میں وساوس پیدا کرنا۔ اِلنسان آخر انسان ہے۔ کوئی انسان بھی اللہ تعالیٰ کی طرح کمزوری اور نقص سے خالی نہیں بڑے بڑے آدمیوں سے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ مگر قرآن کریم نے آدم کی اس غلطی کا خُود دوسری جگہ ذکر فرما دیا۔ کہ فنسی آدم ولم نجد لہ عزما۔ یعنی آدم بھُول گئے

سے عبرت نہ پکڑی +

بنی اسرائیل اُس قوم کا نام ہے - جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں - جن کا دوسرا نام اسرائیل ہے - جس کے معنے عبرانی زبان میں (اسر = عبد اور ایل = اللہ) عبداللہ کے ہیں - حضرت یعقوب حضرت ابراہیم علیہما السلام کے پوتے ہیں - اور بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل آپس میں دو بھائی بھائی قومیں ہیں - جو دونوں حضرت ابراہیم کی اولاد ہیں

یہاں یہ سوال کیا گیا ہے - کہ قرآن کریم کون سے بنی اسرائیل کو مخاطب کرتا ہے - اگر اُن کو جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہیں - تو ان پر تو وہ انعام نہیں ہُوئے - جن کا تذکرہ قرآن شریف میں ہے - اور اگر اُن کو جن پر انعام ہُوئے تھے - تو وہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں زندہ موجُود نہیں - اصل بات یہ ہے - کہ قرآن کریم تو ایک قوم کو مخاطب فرماتا ہے - افراد محض قوم کے اجزا ہوتے ہیں - وہ بدلتے رہتے ہیں - مگر قوم تو ایک ہی رہتی ہے - جس طرح ہر انسان کے جسم کے اجزا بدلتے رہتے ہیں - مگر انسان تو وہی ہوتا ہے - پس حقیقت یہ ہے - کہ اللہ تعالےٰ ہم کو یہ سمجھانا چاہتا ہے - کہ افراد درحقیقت قوم کے اجزا ہوتے ہیں - اور جس طرح جسم کے اجزا کوئی وقعت نہیں رکھتے - سوائے اس کے کہ وہ جسم کے بقا میں مُعاون ہیں - اِسی طرح قوم کے افراد بھی کوئی وقعت نہیں رکھتے - جب تک کہ وہ اپنے آپ کو قوم کے بقا میں مُعاون نہیں بناتے - اِس حقیقت کو فراموش کرنے سے مُسلمانوں میں سے ایثار اور قُربانی کی رُوح اُٹھ گئی ہے - سو یاد رکھنا چاہئے - کہ قرآن کریم کی مخاطب بنی اسرائیل قوم ہے نہ اس کے خاص خاص اجزا یعنی افراد +

۹۰ - نعمتی التی انعمت علیکم - وہ کونسی نعمت تھی - اس کا ذکر خُود قرآن کریم نے ہی دوسرے موقعہ پر فرما دیا - واذ قال موسیٰ لقومہ یقوم اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا - یعنی اس قوم کے اندر نبیوں کا پیدا ہونا اور ساری قوم کو بادشاہ بنا دینا - گویا رُوحانی اور دُنیاوی دونوں قسم کی اعلےٰ سے اعلےٰ نعمت جو انسان کو حاصل ہو سکتی ہے - وہ بنی اسرائیل کو دی تھی +

۹۱ - اوفوا بعھدی اوف بعھدکم - یہاں دو عہدوں کا ذکر فرمایا - بنی اسرائیل کا عہد اللہ تعالےٰ سے اور اللہ تعالےٰ کا عہد بنی اسرائیل سے - اِن دونوں عہدوں کا ذکر استثناء ۲۶ : ۱۷ و ۱۸ و ۱۹ میں ہے " تُو نے آج کے دن اقرار کیا ہے - کہ خُداوند میرا خُدا ہے - اور میں اس کی راہوں پہ چلوں گا - اور اُس کی شرعوں اور اُس کے حقُوق اور اُس کے حُکموں کی محافظت کرونگا - اور اُس کی آواز کا شنوا ہُونگا - اور خُداوند نے بھی آج کے دن تجھ سے

دروازہ ہے جس میں سے سب کو گذرنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی سزا نہ تھی۔ بلکہ سب انسانوں کو کمال انسانی تک پہنچنے کے لئے آسائش اور آرام کی زندگی کو چھوڑنا ضروری تھا۔ اسی لئے ساتھ ہی فرمایا۔ کہ اس حالت سے نکل آنے کے بعد تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آتی رہیگی۔ اور کمال انسانی کو وہی حاصل کر سکیں گے۔ جو اس ہدایت کی پیروی کرتے رہیں

۸۸- فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ یہی وہ آخری مرتبہ ہے۔ جس کو نجات کہا گیا ہے۔ کہ انسان ایک ایسی حالت میں پہنچ جائے۔ جس میں اُس کے لئے خوف و حُزن کوئی نہ رہے۔ یہ اعلےٰ مقام انسان کو اصلی رنگ میں تو بعد الموت ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ کے لئے جو لوگ صدق و وفا دکھاتے ہیں۔ اُن کو اس دُنیا میں بھی یہ رنگ دکھا دیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ ان آیات کے نزول کے وقت کیسے خوف کی حالت میں تھے۔ کہ چاروں طرف سے دشمن کا غلبہ ہو رہا تھا۔ مگر الٰہی ہدایت کی کامل پیروی نے اسی دُنیا کی زندگی میں اُن کو سب خوف سے آزاد کر کے خوف کے بعد امن پیدا کر دیا۔ اور غم یا حُزن کا نام و نشان باقی نہ رکھا۔ کیونکہ جس کو اللہ تعالےٰ کامیاب کرے۔ اس کو جان اور مال کے اتلاف کا بھی کچھ غم نہیں ہوتا۔ لیکن کافروں کے لئے جو سب کچھ خرچ کر کے آخر ناکامی کا مُنہ دیکھتے ہیں۔ فسینفقونھا ثم تکون علیھم حسرۃ کا نظارہ درپیش ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں سچے مومن کو اللہ تعالےٰ مشکلات کے اندر بھی خوف و حُزن سے آزاد کر دیتا ہے۔ جو خدا کا ہو جاتا ہے۔ وہ کسی سے ڈر نہیں سکتا۔ اور نہ اس کو کچھ غم باقی رہتا ہے۔ سو روحانی رنگ میں اس دُنیا میں یہ مرتبہ صرف کامل فرمانبرداروں یعنی سچے مُسلموں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ اور آخرت میں بھی وہی اس کو پائیں گے۔ خوف اور حُزن والوں کا نام اصحابُ النّار رکھا ہے ❊



۸۹- یٰبنی اسرائیل۔ سب سے پہلے اصُول دین بتا کر ماننے والوں کی حُسن عاقبت اور انکار کرنیوالوں کے انجام کا ذکر فرمایا۔ پھر مُنہ سے ماننے والوں اور عملاً انکار کرنے والوں کا ذکر کیا۔ پھر توحید الٰہی کا ذکر فرما کر انسان کے کمال کا ذکر کیا۔ کہ وہ ترقی کرے۔ تو کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ اور نافرمانی اپنا شیوہ بنالے تو انجام کیا ہوتا ہے۔ اب اس کے بعد ایک قوم کا ذکر شروع کرتا ہے۔ جس پر اللہ تعالےٰ نے بڑے بڑے انعام بھی نازل فرمائے۔ مگر جب انھوں نے فرمانبرداری کے طریق کو چھوڑ کر نافرمانی کی راہ اختیار کی۔ تو وہی برگزیدہ قوم عذاب اور دُکھ اور مصیبت کا نشانہ بن گئی۔ تاریخ کے واقعات کا بتانا مقصود نہیں بلکہ مُسلمانوں کو عبرت دلانا مقصود تھا۔ مگر افسوس کہ اس قوم نے بھی گذشتہ قوموں کے واقعات

کہ مَیں وہ موعود نبی ہوں - ساری بائبل کو پڑھ جاؤ - پُرانے عہد نامے کو بھی اور نئے کو بھی - کسی نبی نے یہ نہیں کہا - کہ مَیں وہ موسےٰ کی مانند نبی ہوں - حتّٰے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی یہ دعوےٰ نہیں کیا - اور انجیل سے یہ ثابت ہے - کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے وقت تک (اور مسیحؑ کے بعد کوئی نبی آیا نہیں) بنی اسرائیل اس موعُود نبی کے منتظر تھے - جس کی شہادت یوحنا باب اول آیت ۲۱ سے ملتی ہے - کہ اُنھوں نے - یوحنّا بپتسمہ دینے والے سے دریافت کیا - کہ کیا "تُو وہ نبی ہے" - جِس پر تمام بائبلوں میں استثناء ۱۸ - ۱۵ و ۱۸ کا حوالہ موجُود ہے - یعنی وہ موعُود نبی جِس کے آنے کی پیشگوئی موسٰے نے کی تھی - اور نہ صرف کسی نبی نے وہ نبی ہونے کا ہی دعوےٰ نہیں کیا - بلکہ سارے نبی مسیحؑ سمیت اس خبر کو تازہ کرتے آئے - اور کسی نہ کسی رنگ میں ایک اور نبی کے آنے کی خبر بتاتے رہے - ان ساری پیشگوئیوں کو اس مختصر نوٹ میں درج نہیں کیا جا سکتا - یہ ساری پیشگوئیاں بنی اسرائیل کے پاس موجود تھیں - اور اُنہی کو ما معکم کہا ہے - پس جب بنی اسرائیل میں سے کوئی اس پیشگوئی کا مصداق ہونے کا مُدّعی نہیں - اور ہوتا بھی کیونکہ جب اللہ تعالےٰ نے دو دفعہ وضاحت کر دی تھی - کہ وہ بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا - پس جب بنی اسمٰعیل میں سے وہ نبی اُٹھا تو اُس نے اُٹھتے ہی یہ بھی کہہ دیا - کہ مَیں وہ مثیلِ موسیٰ ہوں - جیسا کہ فرمایا - انّا ارسلنا الیکم رسولًا شاھدًا علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولا - جس کا مفہوم یہی ہے - کہ یہ رسُول جو تمہاری طرف بھیجا جاتا ہے - اُس رسُول کا مثیل ہے جو فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا - پس بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے کسی نبی کا موسیٰ کی مانند ہونے کا دعوےٰ نہ کرنا - اور محمّد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مثیل موسیٰ قرار دیا جانا ایک نہایت کھُلی دلیل اور ایک بیّن ثبوت اس امر کا تھا - کہ آپ ہی اُن تمام پیشگوئیوں کے مصداق ہیں جو کہ بنی اسرائیل کے پاس موجُود تھیں - پس قرآن کریم مصدقًا لما معکم ہُوا - کہ اُس نے ان پیشگوئیوں کی سچّائی دُنیا پر ظاہر کرکے اُن کی تصدیق کر دی - اور اصل میں تصدیق کی محتاج بھی پیشگوئیاں ہی ہُوا کرتی ہیں ✤

۹۳ - ثمنًا قلیلا - تھوڑا مُعاوضہ یعنی دُنیا کی زندگی ہے - بنی اسرائیل کے علماء و رؤسا نے محض اس دُنیوی زندگی میں اپنی عزّت و وجاہت قائم رکھنے کی خاطر ایک کھُلے کھُلے حق سے انکار کر دیا - اللہ تعالےٰ فرماتا ہے - قل متاع الدنیا قلیل ✤

۴۲ ۹۴ - لا تلبسوا الحق بالباطل - الحق تو وہ کھلی پیشگوئیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے

آیت ۴۰

اقرار فرمایا۔ جیسا اُس نے تجھ سے وعدہ کیا تھا۔ کہ تو اُس کی خاص گروہ ہووے۔ اور تو اُس کے سب احکام کی محافظت کرے۔ اور تجھے سارے گروہوں سے جنھیں اس نے پیدا کیا صفت اور نام اور عزّت میں بالا کرے۔ اور تو خداوند اپنے خدا کی مُقدّس گروہ ہووے" خُداوند کی آواز کے شنوا ہونے کے مُتعلق ذیل کے الفاظ یاد رکھنے ضروری ہیں "۔ اور ایسا ہوگا۔ کہ جو کوئی میری باتوں کو جو وہ میرا نام لے کے کہیگا نہ سُنیگا۔ تو میں اُس کا حساب اس سے لونگا"۔ استثناء ۱۸ : ۱۹۔ جہاں "وہ" سے مُراد پیغمبر موعُود ہے۔ پس سب سے پہلے بنی اسرائیل کو مخاطب کرکے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تم اپنے اس عہد کو پُورا کرو۔ کہ تم میری آواز کو سُنوگے۔ اور وہ آواز اب تمہیں وہی موعود پیغمبر پہنچا رہا ہے۔ میں تم کو پھر دُنیا میں ایک بڑی قوم بنا دونگا +

۴۱

۹۲۔ مصدقاً لما معکم۔ قرآن کریم کو اِس بات کا مُصدّق کہا گیا ہے۔ جو بنی اسرائیل کے پاس تھی۔ ما معکم درحقیقت وہ پیشگوئیاں تھیں۔ جو باوجود توریت و دیگر صُحف انبیاء میں صدہا تغیّرات کے اب تک اُن کے ہاں محفُوظ چلی آتی تھیں۔ اور یہ بھی ایک عجیب اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔ کہ اُس نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو پیشگوئیاں تھیں اُن کو اس دستبرد سے محفُوظ رکھا۔ ما معکم اس کو اسلیئے کہا۔ کہ ان پیشگوئیوں کے مُطابق وہ اب تک اس انتظار میں تھے۔ کہ اُن کا مصداق ظاہر ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو پیشگوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے بنی اسرائیل کو پہنچائی تھی۔ وہ یہ تھی "خُداوند تیرا خدا تیرے لیئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کریگا۔ تم اس کی طرف کان دھریو ..... میں اُن کے لئے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا اور اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اُسے فرماؤنگا۔ وہ سب ان سے کہیگا"۔ استثنا، باب ۱۸ آیت ۱۵ و ۱۸۔ اب اس پیشگوئی کے مطابق یہ ضروری تھا۔ کہ موسیٰ سا ایک نبی آئے۔ اور وہ بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے آئے (دیکھو نوٹ ۸۹) اب یہ تو ظاہر ہے۔ کہ جب تک حضرت موسےٰ کی شریعت قائم تھی۔ اس شریعت کے پیرووں میں سے کوئی شخص موسےٰ کی مانند نبی نہ ہوسکتا تھا۔ کیونکہ وہ سب ایک رنگ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلفاء تھے۔ گو وہ اپنے اپنے زمانہ کی ضرورت کے مطابق کچھ نہ کچھ نئے احکام بھی بنی اسرائیل کو پہنچاتے رہے ہوں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بنی اسرائیل میں سے یشوُع سے لے کر عیسےٰ علیہما السلام تک کسی نبی نے یہ دعویٰ نہیں کیا

آیت ۴۶

۹۸ - یظنون - ظن کے معنے یہاں یقین کے ہیں - مفردات میں ہے - کہ توہم سے لیکر یقینی علم تک ظن کا لفظ استعمال ہوتا ہے +

الرابع رکوع ۴/۴ ۴۷

۹۹ - فضلتکم علی العالمین - تفاسیر میں عالمین کی تفسیر میں ہے - علی عالم من کنتم بین ظہریہ او عالمی زمانهم او جم غفیر - یعنی یا تو وہ لوگ مُراد ہیں جو اُن کے سامنے تھے یعنی اُن کے زمانہ کے لوگ یا عالمین سے مُراد گروہ کثیر ہے - اور یہی صحیح ہے - کیونکہ وہی بنی اسرائیل جن کی یہاں فضیلت کا ذکر ہے - آگے چلکر انہی کے متعلق فرمایا - باؤ بالغضب علی غضب اور ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ - پس یہ فضیلت اُسی وقت کے لیئے تھی - جب اُنمیں انبیاء بھی آتے تھے - اور دُنیوی رنگ میں بھی اُنکو دوسروں پر بادشاہ بنایا گیا تھا - پھر وہ فضیلت چھن گئی +

۴۸

۱۰۰ - واتقوا یوماً ...... ولا ھم ینصرون - پچھلے رکوع میں بنی اسرائیل کو انعام یاد دلاکر یہ فرمایا تھا - کہ اب بھی اگر تم اپنے عہد پر قائم ہوجاؤ - تو اللہ تعالے پھر تم سے وہی مُعاملہ کریگا - اور تم کو دینی اور دنیوی برکات سے متمتع کریگا - اِس رکوع میں اور اس کے بعد انکار کی صُورت میں جو ان کا انجام ہوگا وہ ظاہر فرماتا ہے - قیامت کا دن وہ ہے جس دن اعمال کے ثمرات اپنے اصلی رنگ میں سامنے آئینگے - اُس وقت نہ تو کوئی شخص اپنی جگہ دوسرے کو پیش کرسکیگا - کہ اسکی بجاے اس دوسرے کو سزا دیدی جاے - نہ کوئی شخص جس نے ظلم اور انکار سے کام لیا ہے - اور حق کی مخالفت پر کمر بستہ رہا ہے - کوئی سفارشی پیش کرسکیگا - نہ ہی کوئی مُعاوضہ پیش کرکے اپنا چھٹکارا کرسکیگا - غرض یہ کہ کسی طرح پر بھی مدد نہ ہوگی اس دُنیا میں بھی اللہ تعالے نے ایک رنگ اُس سزا کا یہود کو چکھا دیا - کہ جو مشرکین اور مُنافقین رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے برخلاف اُن کو برانگیختہ کرتے تھے - اور جن کو وہ خُود آپ کی مخالفت کے لیئے اُکساتے تھے - وہ آخر اُن کی کوئی مدد نہ کرسکے - ان کے ساتھ وعدے تو کرتے رہے - لئن اخرجتم لنخرجن معکم .... ولئن قوتلتم لننصرنکم - مگر آخر ہوا وہی جو اللہ تعالے نے پہلے سے فرمادیا تھا - کہ کوئی مدد اُنکو نہ ملی - بلکہ ہر ایک ظالم پر اس دُنیا میں ایک ایسا وقت آتا ہے - کہ اُس وقت نہ کوئی دوسرا اُس کی سزا کو اُٹھا سکتا ہے - نہ کسی کی سفارش پیش کی جاسکتی ہے - نہ کوئی معاوضہ اُس کا لیا جاتا ہے - اور نہ کوئی یار و مددگار ہی ہوتا ہے - واقعہ تو بنی اسرائیل کا ہے - مگر سب کچھ مسلمانوں کو عبرت دلانے کے لیئے - مگر اِس قوم نے اگر عبرت حاصل نہیں کی - تو آخر اسی قسم کی سزا کا دن ان کو بھی اسی دُنیا میں دیکھنا پڑا +

آیت ۴۲

تھیں۔ اور الباطل ان کی اپنی خواہشات یا جو کچھ وہ اپنی طرف سے بڑھاتے تھے۔ اور اِس طرح پر سچ کو جھوٹ کے ساتھ ملا کر حق کو ملیا میٹ کرنا چاہتے تھے +

۹۵۔ تکتموا الحق۔ یعنی حق کو چھپاؤ نہیں۔ تلبسوا پر عطف ہے۔ جس کے پہلے لا موجود ہے۔ بنی اسرائیل نے جب دیکھا۔ کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو اُن پیشگوئیوں کا مصداق قرار دیتے ہیں۔ تو اُنھوں نے یہ کوشش کی۔ کہ ان پیشگوئیوں کو ظاہر نہ ہونے دیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ اُن کے سرداروں کا یہ قول مذکور ہے۔ قالوا اتحدّثونھم بما فتح اللہ علیکم۔ یعنی جو پیشگوئیاں اللہ تعالےٰ نے تم پر کھول دی ہیں۔ اُن کے متعلّق مسلمانوں سے کیوں تذکرہ کرتے ہو +

۴۳

۹۶۔ وارکعوا مع الرّاکعین۔ یہُودیوں کو بھی جماعت کے ساتھ (یہاں مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کیونکہ راکعین کا اُس وقت یہی ایک گروہ تھا) بلکہ نماز پڑھنے کا ارشاد ہوتا ہے۔ اب مسلمان اوّل تو نماز نہیں پڑھتے۔ جو پڑھتے ہیں وہ۔ جماعت کی پروا تک نہیں کرتے الا ماشاء اللہ +

۴۵

۹۷۔ واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ جب کبھی اللہ تعالےٰ کی طرف سے کوئی مبعوث ہوتا ہے۔ تو لوگوں کو اُس کے سمجھنے میں غلطی لگتی ہے۔ پُرانے خیالات دل میں ایسے راسخ ہوتے ہیں۔ کہ وہ کھُلی کھُلی باتوں کے انکار پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ یہُودیوں کو نصیحت فرماتا ہے۔ کہ صبر اور دُعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد چاہو تو اللہ تعالیٰ تم پر حق کھول دیگا۔ صبر کے معنے طاعات پر قائم رہنے اور معصیت سے بچنے کے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بھی مُراد ہو۔ کہ جلدی نہ کرو صبر سے دیکھو۔ اور مخالفت میں قدم جلد نہ اُٹھاؤ۔ لا تکونوا اوّل کافر بہ۔ کیونکہ اِس نبی موعُود کی صداقت کی یہ علامت استثنا ۱۸:۲۱ و ۲۲ میں بیان کی ہے "اور اگر تُو اپنے دل میں کہے کہ مَیں کیونکر یہ مانوں کہ یہ بات خُداوند کی کہی ہُوئی ہے۔ تو جان رکھ کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے۔ اور وہ جو اُس نے کہا ہے واقع نہ ہو۔ یا پُورا نہ ہو۔ تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی"۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنی بیکسی اور تنہائی کی حالت میں مکّے میں بارہا اللہ تعالیٰ کی ان پیشگوئیوں کو بتا چکے تھے۔ کہ وہ آخر میں کامیاب ہونگے۔ اور جو لوگ حق کی مخالفت کرتے اور اسے نابُود کرنے کے درپے ہیں۔ وہ ناکام اور ذلیل ہونگے۔ پس اہل کتاب کو چاہئے تھا۔ کہ انکار کرنے سے پہلے یہی انتظار کرتے کہ آیا یہ پیشگوئیاں پُوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ اور ان مُشکلات کے اندر صبر اور دُعا سے کام لیتے +

آل فرعون سے مُراد فرعون کے لوگ یعنی اُس کی رعایا اور اُس کے پیرو ہیں۔ آل اصل میں وہی لفظ ہے۔ جو اھل ہے۔ مگر آل کا لفظ ہمیشہ کسی عظیم الشان انسان کی طرف مُضاف کیا جاتا ہے۔ جیسے عظیم الشان نبیوں یا عظیم الشان بادشاہوں کی طرف۔ اور اس کے اندر سب مُتبعین داخل ہو جاتے ہیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایک مُتقی میری آل ہے +

۱۰۲۔ یسومونکم سُوء العذاب۔ بنی اسرائیل قریباً چار سو سال مصر میں رہے۔ اور خود اسرائیل یعنی حضرت یعقوب مع اپنے بیٹوں کے حضرت یُوسف کی وجہ سے وہاں جا آباد ہُوئے تھے۔ مگر چُونکہ دوسرے مُلک کے رہنے والے تھے۔ آہستہ آہستہ مصر کے بادشاہوں نے ان کو خدمتگاری کے کاموں اور ذلیل کاموں پر لگانا شروع کیا۔ قرآن کریم نے اُن دُکھوں کی تفصیلات نہیں دیں۔ مگر توریت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نہایت ذلیل قسم کے مُشقّت کے سب کام ان سے لیئے جاتے تھے "اور مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی۔ اور اُنھوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے اُن کی زندگی تلخ کی۔ اُن کی ساری خدمتیں جو وے اُن سے کراتے تھے مشقت کی تھیں"۔ خروج ۱: ۱۳و۱۴ +

۱۰۳۔ یذبحون ابناءکم ویستحیون نساءکم۔ لڑکوں کو مار ڈالتے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے "تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائی جنائیوں کو ...... یُوں کہا۔ کہ جب عبرانی عورتوں کے لئے تم دائی کا کام کرتی ہو ..... اگر بیٹا ہو تو اُسے ہلاک کردو۔ اور اگر بیٹی ہو تو جینے دو"۔ خروج ۱: ۱۵و۱۶۔ اور پھر اسی باب ۲۲ آیت میں ہے "اور فرعون نے اپنے سب لوگوں کو تاکید کرکے کہا۔ کہ ان میں جو بیٹا ہو۔ تم اُسے دریا میں ڈال دو۔ اور جو بیٹی ہو جیتی رہنے دو"۔ منشاء یہ تھا کہ قوم کمزور ہو جائے۔ اور آہستہ آہستہ نابُود ہو جائے +

۵۰

۱۰۴۔ واذ فرقنا بکم البحر۔ حضرت مُوسیٰ جب بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے چل پڑے تو فرعون نے بھی اُن کا تعاقب کیا۔ آخر جب بحیرۂ قُلزم کے شمالی سرے پر پہنچے تو پیچھے فرعون کا لشکر بھی نظر آیا۔ آگے سمندر تھا اور پیچھے ایک جرّار لشکر۔ بنی اسرائیل بہت گھبرائے۔ اس حالت میں حضرت موسےٰ نے جن کو اللہ تعالےٰ کے وعدوں پر پُورا بھروسہ تھا فرمایا۔ کلا ان معی ربی سیھدین۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں میرا ربّ میرے ساتھ ہے۔ وہ مجھے راہ دکھا دیگا۔ چنانچہ حضرت مُوسےٰ کو

شفاعۃ کے متعلق یہاں اس قدر ذکر کر دینا ضروری ہے۔ کہ شفاعۃ شفع سے مشتق ہے۔ جس کے اصل معنے ہیں۔ ضم الشئ الی مثلہ یعنی ایک چیز کو اُس کی مثل یا اُس جیسی چیز سے ملا دینا۔ سو شفاعت کا اصل مفہوم دوسرے کے ساتھ ملجانے کا ہے۔ ایسے طور پر کہ اس کی مدد کرنیوالا ہو۔ اور مذہبی اصطلاح میں شفاعت یہ ہے۔ کہ انسان کی بعض کمزوریاں اُن پاک اور بلند مرتبہ لوگوں کی وجہ سے جن کے ساتھ اُس کا تعلق ہے مُعاف کردی جائیں۔ اسلام میں شفاعت کا مسئلہ حق ہے۔ مگر شفاعت اذنِ الٰہی سے ہے۔ من ذا الذی یشفع عندہٗ الا باذنہ۔ لا تنفع الشفاعۃ الا من اذن لہ الرحمٰن۔ لا یشفعون الا لمن ارتضیٰ۔ سب سے بڑھ کر شفاعت ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ جو قیامت کے دن آپ اپنی اُمّت کے لیئے فرمائیں گے۔ بلکہ کُل نوعِ انسانی کے لئے۔ اور درحقیقت آپ کی شفاعت کا ثبوت تو اس دُنیا میں بھی ملگیا۔ کیونکہ جس طرح پر آپنے اس دُنیا میں ان لوگوں کو جنھوں نے آپ کے ساتھ تعلق پیدا کیا تھا۔ ہر قسم کی آلائشوں اور گناہوں اور کمزوریوں سے پاک کرکے رُوحانیت کے اعلےٰ سے اعلےٰ منازل طے کرادیئے جن کا سلسلہ قیامت تک جاری ہے اور رہیگا۔ یہ کمال قوّت قدسی اور کسی نبی میں نہیں پایا جاتا۔ نہ دُنیا کی تاریخ کوئی ایسا انسان پیش کرسکتی ہے۔ جس نے اِس طرح پر ایک قوم کو نہیں قوموں کی قوموں اور ملکوں کے ملکوں کو کمزوریوں اور گندوں سے پاک کرکے رُوحانیت کی اعلےٰ منازل طے کرادی ہوں۔ پس قیامت میں سبسے اوّل آپ کی شفاعت کا ہونا بالکل حق مسئلہ ہے۔ جس کا ثبوت آپ کی ذات اقدس نے اِس دُنیا مینبھی دیدیا۔ اور اِس آیت زیرِ بحث میں جو فرمایا۔ کہ لا یقبل منھا شفاعۃ تو اس سے مُطلق شفاعت کی نفی لازم نہیں آتی۔ کیونکہ ایک تو یہاں اُس نفس کا ذکر ہے۔ جس نے پاکوں اور برگزیدوں سے بالکل قطع تعلق کرلیا۔ بلکہ اُن کے ساتھ عداوت کی۔ سو وہ شفاعت سے کیا فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ اور دوسرے شفاعت کوئی ایسی چیز نہیں۔ کہ ایک مجرم کسی سفارشی کو لیجا کھڑا کرے۔ یا اُسے پیش کرسکے۔ کہ اس کی سفارش کی وجہ سے مجھے چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ شفاعت کرنیوالا اللہ تعالیٰ کے اذن سے ان لوگوں کے لئے جنھوں نے اپنے تعلّقات کو اس سے مُنقطع نہیں کرلیا شفاعت کریگا +

عدل اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو قیمت اور قدر میں کسی چیز کے مساوی ہو +

۴۹ ۱۰۱۔ اٰل فرعون۔ فرعون نام نہیں بلکہ لقب کے طور پر ہے۔ جس طرح پر ایران کے بادشاہ کسرے اور روما کے قیصر کہلاتے تھے۔ اسی طرح مصر کے بادشاہ فرعون کہلاتے تھے۔

خواہ غیر معمولی - وہ دونوں قسموں پر قادر ہے +

۱۰۵- وانتم تنظرون - وہ دشمن جو اُن کو تباہ کرنا چاہتا تھا - بلکہ جس کے متعلق یقین ہو چکا تھا کہ اب تھوڑی دیر میں وہ تباہ کردیگا کس قدر خوشی کا مقام تھا - کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بنی اسرائیل کی آنکھوں کے سامنے ہلاک کردیا - اِسی طرح پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دشمنوں کو بھی اُن کی آنکھوں کے سامنے تباہ کرکے دکھادیا +

۵۱

۱۰۶- ثم اتخذتم العجل من بعدہٖ - حضرت موسےٰ نے جب حسب فرمانِ الٰہی اپنی قوم سے چالیس دن کے لیئے علیحدگی اختیار کی - تو آپ کی غیر حاضری میں قوم نے ایک بچھڑو بناکر اُس کی پرستش شروع کردی - مصر میں جہاں بنی اسرائیل چارسو سال تک رہے تھے گائے کی پرستش ہوتی تھی - اور گو یہ ایک مُوحد قوم تھی - مگر مصریوں کی گائے کی پرستش نے اُن کو بھی گائے کی عظمت کی طرف مائل کردیا - اور یہ بیماری درحقیقت اُن کے اندر جڑ پکڑ گئی تھی - اسکی مثال بعینہٖ ایسی ہی ہے - جیسے مسلمانوں نے کئی صدیوں تک ہندوؤں میں رہ کر اُن کی بعض مُشرکانہ عادات کو اپنے اندر لیلیا ہے - جن میں سب سے بڑی مرض پیر پرستی اور قبر پرستی ہے - بچھڑو کے بنانے کے تفصیلی واقعات قرآن کریم کی سُورہ طٰہٰ میں اور توریت میں کتاب خروج کے ۳۲ باب میں ہیں - ان دونوں میں جو بڑا بھاری اختلاف ہے وہ یہ ہے - کہ توریت میں حضرت ہارونؑ کی طرف بچھڑو کا بنانا اور خود اُسکی پرستش میں شریک ہونا منسوب کیا گیا ہے - مگر قرآن کریم حضرت ہارونؑ کو جو خُدا کے ایک نبی تھے بالکُل بریّ ٹھیراتا ہے - اور حق یہی ہے - کیونکہ جو شخص خُدا کی طرف سے نبوّت کے عظیم الشان منصب پر کھڑا کیا جاتا ہے - وہ کبھی شرک کا مُرتکب نہیں ہوسکتا - پس توریت کا بیان اس بارہ میں صحیح مُتصوّر نہیں ہوسکتا - اور خود یہ امر اس کے غلط ہونے پر شاہد ہے - کہ حضرت ہارون کو اگر وہ واقعی بچھڑو بنانے والے تھے تو سزا کیوں نہ دیگئی - حالانکہ دوسرے لوگوں کو سزا ملی - اور بائیبل کی رُو سے وہ قتل ہوئے +

۵۲

۱۰۷- الفرقان - کتاب کے علاوہ یہاں حضرت مُوسےٰ کو الفرقان دیا جانے کا ذکر ہے - فرقان لغت کی رُو سے دو چیزوں کے درمیان فرق کرنے کا نام ہے - پس الفرقان وہ چیز ہے - جس کے ذریعہ سے حق اور باطل میں فرق کردیا جائے - اِسی لیئے بعض نے اس کے معنے فتح و نُصرت کے بھی کیئے ہیں - مگر اصل مفہُوم فرقان کا حق اور باطل میں فرق کرنے کا ہے - حضرت موسےٰ کی زندگی میں وہی واقعہ فرقان نظر آتا ہے - جس نے اُنکے اور اُن کے دشمنوں کے درمیان کُھلا کُھلا فرق کردیا - یعنی بنی اسرائیل کا صحیح سلامت نکل آنا

حکم ہؤا - کہ تم بنی اسرائیل کو سمندر میں ڈال دو رستہ ہو جائیگا - سو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ایسا ہؤا - کہ بنی اسرائیل کو راستہ ملگیا - اور وہ صحیح سلامت دوسری طرف نکل آئے - توریت میں اس کی تشریح یُوں کی ہے - کہ خداوند نے یہ سبب بڑی پوربی آندھی کے تمام رات میں دریا کو چلایا - اور دریا کو سکھا دیا" خروج ۱۴ : ۲۱ - مگر قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی تفصیلات بیان نہیں فرمائیں - صرف اسی قدر بتایا ہے - کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ایسے سامان پیدا کر دیئے تھے - کہ جب بنی اسرائیل وہاں سے گذرے تو انھیں رستہ ملگیا - مگر جب فرعون کا لشکر وہاں پہنچا تو وہ غرق ہو گیا - سر سید نے اپنی تفسیر میں یہ دکھایا ہے - کہ اُس زمانہ میں بحیرہ قلزم ایسا گہرا نہ تھا - اور جوار بھاٹے سے بھی یہ ممکن ہو سکتا تھا - کہ ایک وقت رستہ قابل گذر ہو جائے - اور دوسرے وقت پانی زیادہ ہو جائے - مگر ہمیں درحقیقت قرآن کریم کے الفاظ میں ایسی تشریحات کی چنداں ضرورت نہیں - اور جہاں خود قرآن کریم نے تفصیلات کو چھوڑ دیا ہے - ہمیں اُن کے بڑھانے کی چنداں ضرورت نہیں - جس طرح پر بھی ہُؤا - یہ ایک امر واقع ہے - کہ بنی اسرائیل اُس سمندر سے صحیح سلامت گذر آئے - اور فرعون کا لشکر اُن کی آنکھوں کے سامنے دریں غرق ہو گیا - اور ہم تو سمجھتے ہیں - کہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت بھی ہے - کہ ایک کو مہلک جگہ یا ہلاکت کے سامانوں کے اندر محفوظ رکھے - اور دوسرے کو اُسکے حفاظت کے سامان رکھتے ہُوئے یا ایک محفوظ جگہ میں ہلاک کر دے - جہاں قرآن کریم نے اِس واقعہ کو حضرت مُوسےٰ کے لیئے فرقان قرار دیا ہے - بدر کے واقعہ کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے لیئے فرقان قرار دیا ہے - اب دیکھو وہی بدر کا میدان ہے - جس میں کُفّار نے عُمدہ سے عُمدہ اور محفوظ سے محفوظ جگہ روک لی ہے - پانی پر بھی قبضہ کر لیا ہے - جمعیت بھی مسلمانوں سے تگنی سے زیادہ ہے - آدمی بھی جنگ آزمودہ اور بڑے بڑے بہادر ہیں - سامان جنگ بھی ہر طرح کا بکثرت موجود ہے - اور بالمقابل مسلمانوں کو جگہ بھی اچھی نہیں ملی - محفوظ بھی نہیں - جمعیت بھی بہت تھوڑی پھر کمزور - سامانِ جنگ قریباً کچھ نہیں - با ایں اللہ تعالیٰ نے ایک جرّار لشکر کو ایک تھوڑی سی جمعیت کے سامنے اُن کے سارے حفاظت کے سامانوں کے ہوتے ہُوئے ہلاک کر کے اپنی قدرت کا نظارہ دکھا دیا - اس میں تو میری سمجھ میں فرعونیوں کے غرق کرنے سے بھی بڑھ کر اپنی قدرت اور طاقت کا اظہار فرمایا ہے - سو ہمارے پاس اس واقعہ پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں واقعہ ہؤا - خواہ اُس کے لیئے اللہ تعالیٰ نے کوئی معمولی سامان پیدا کر دیئے ہوں اور

۵۶ ۱۱۱ - بعثنکم من بعد موتکم - موت کا لفظ قرآن کریم میں چھ مختلف معنی میں آیا ہے جیسے مفسرین اور اہل لغت نے لکھا ہے (۱) نشو و نما کی قوت کے جاتے رہنے پر خواہ انسان و حیوان یا نباتات میں جیسے فرمایا - تحی الارض بعد موتھا - احیینا بہ بلدۃ میتا (۲) احساس کے جاتے رہنے پر - مثلاً یلیتنی مت قبل ھذا (۳) زوال عقل یا روحانی موت جسے جہالت سے بھی تعبیر کیا ہے - جیسے فرمایا - اومن کان میتا فاحییناہ اور انک لا تسمع الموتی (۴) وہ غموم و ہموم جو زندگی کو مکدر کر دیتے ہیں - ویاتیہ الموت من کل مکان وما ھو بمیت (۵) نیند پر - چنانچہ توفی کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے - ھو الذی یتوفٰکم باللیل - اور نیند کو عربی زبان میں موت خفیف اور موت کو نوم ثقیل کہتے ہیں (۶) انقطاع حیات پر جیسے انک میت وانھم میتون - یہاں بعض نے روحانی موت مراد لی ہے - اور بعثنکم کے معنے لیئے ہیں - بعثنکم انبیاء - مگر چونکہ صاعقہ کے لفظ سے بیہوشی مراد ہو سکتی ہے پس یہاں اس بیہوشی کا نام موت رکھ دیا ہے - اور اس بیہوشی کی حالت سے اٹھانے کو بعثنکم فرمایا ہے ؞

۵۷ ۱۱۲ - وظللنا علیکم الغمام - یعنی بنی اسرائیل کو ایک ایسے جنگل میں رہنا پڑا - جہاں گرمی بڑی سخت تھی - اور مکانات کچھ نہیں - پس ان حالات کے اندر بادل کا آجانا بھی عظیم الشان نعمائے الٰہی میں سے تھا - مگر یہاں یہ نہیں لکھا - کہ ہر وقت ساری قوم پر بادل کا سایہ رہتا تھا - کسی سخت مصیبت اور گھبراہٹ کے وقت بادلوں کا سایہ کر دیا ہوگا ؞

۱۱۳ - انزلنا علیکم المن والسلوٰی - انزال مطلق پہنچانے کو کہتے ہیں - دیکھو نوٹ ۳۱ اسی لیئے فرمایا - وان من شیٔ الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم - یعنی ہر چیز کے خزانے تو ہمارے پاس ہیں - اور ایک معین اندازہ کے مطابق وہ چیزیں ہم اس عالم میں پہنچاتے رہتے ہیں - اور فرمایا انزلنا الحدید - ہم نے لوہا بھی پیدا کیا - پس اسی قانونِ الٰہی کے مطابق من اور سلوی بھی پہنچائے - من کے لغوی معنی احسان کے ہیں - سو بعض کے نزدیک تو من ایک گوند ہے - یا جیسا کہ مفردات میں ہے شبنم کی طرح درختوں پر رات کو جم جاتی ہے - اور کھانے میں میٹھی ہوتی ہے - اور بعض اہل لغت نے اسے ترنجبین کہا ہے - اور سلوی پرندہ ہے جیسے بٹیر - مگر زجاج نے کہا - کہ من اس کا نام ہے - خواہ کچھ ہی ہو جو ان کو بیابان میں بلا مشقت دیا گیا -

آیت ۵۳

اور فرعونیوں کا سمندر میں غرق ہو جانا - اس واقعہ نے حضرت موسٰےؑ کی صداقت کو ایک طرف اور اُن کے دشمنوں کے باطل پر ہونے کو دوسری طرف روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا اور چونکہ قرآن کریم میں بدر کے دن کو یوم الفرقان کہا گیا ہے - یوم الفرقان یوم التقی الجمعٰن - اور بدر کا واقعہ ایک شدید مناسبت حضرت موسےٰ کی زندگی کے اس واقعہ سے رکھتا ہے - لہذا یہی حضرت موسےٰؑ کا فرقان ہے - دیکھو نوٹ نمبر ۱۰۴ +

۵۴ ۱۰۸- فاقتلوا انفسکم - اپنے لوگوں کو قتل کر دو - انہی لوگوں کو قتل کر دینے کا حُکم معلوم ہوتا ہے جنھوں نے بچھڑے کے بنانے میں زیادہ حصّہ لیا ہو گا - گو سامری کو جو اس ساری شرارت کا راس رئیس تھا - ایک اور قسم کی سزا دی گئی جس کا ذکر دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے - اسی سُورت میں انفسکم کا لفظ دو جگہ استعمال کر کے بتا دیا ہے - کہ اس سے مُراد اپنا آپ نہیں بلکہ اپنے لوگ ہیں - دیکھو آیت نمبر ۸۴ و ۸۵ - ولا تخرجون انفسکم من دیارکم اور ثم انتم ھٰؤلاء تقتلون انفسکم - واقعی کچھ لوگ قتل بھی ہوئے تھے یا نہیں - قرآن کریم نے بیان نہیں فرمایا - بلکہ فتاب علیکم سے معلوم ہوتا ہے - کہ ممکن ہے کہ توبہ کر لینے پر مُعاف ہی کر دیا ہو - البتہ بائیبل میں لکھا ہے - کہ ایک دن میں تین ہزار آدمی قتل کیئے گئے +

۵۵ ۱۰۹- حتّٰی نری اللہ جھرۃ - یہ نہایت گستاخانہ سوال تھا - کہ ہم تو مانیں گے ہی نہیں جب تک کہ اللہ کو ان آنکھوں سے کھلا کھلا نہ دیکھ لیں - حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے وہ کُھلے کُھلے نشانات تو دیکھ چُکے تھے - پھر یہ جُرأت کہ ہم مانیں گے ہی نہیں جب تک یُوں نہ ہو - اِسی لیئے سزا دی گئی +

۱۱۰- الصاعقۃ - دوسری جگہ قرآن کریم میں فرمایا - فلما اخذتھم الرجفۃ - پس الصاعقۃ کے معنے وہی ہیں - جو لغت والوں اور بہت مفسّرین نے لکھے ہیں - الصاعقۃ کل امر ھائل - ہر ایک ہولناک امر کو صاعقہ کہہ دیتے ہیں - کڑک ہو یا زلزلہ یا کوئی اور خوفناک امر جو انسان کو سخت خوف کی حالت میں کر دے - چنانچہ ایک قول یہ بھی لکھا ہے - سمعوا حسیسھا فخروا صعقین - کہ آگ کی آواز کو سُن کر بیہوش ہو کر گر پڑے - اور یہ بھی لکھا ہے قیل اصاب موسیٰ ما اصابھم وقیل صعق ولم یمت - یعنی جو حالت اُنکی ہو گئی تھی - وہی حضرت موسےٰ کی بھی ہو گئی تھی - اور آپ بیہوش ہو گئے تھے اور مرے نہیں - بہر حال محققین کا اس پر اتفاق ہے - کہ صاعقہ موت نہیں - بلکہ وہ سبب ہے جس سے موت وارد ہو سکتی ہے +

۵۸ اُتارے جائیں۔ گویا استغفار کرنے کا حکم تھا۔ چنانچہ سیرۃ ابن ہشام میں حدیبیہ کے ذکر میں ہے۔ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو فرمایا۔ قولوا نستغفر اللہ ونتوب الیہ۔ کہو ہم اللہ کی مغفرت مانگتے ہیں۔ اور اُس کی طرف رجوع یعنی توبہ کرتے ہیں۔ تو صحابہ نے اسی طرح کہا۔ تو آپ نے فرمایا۔ واللہ انھا لحطۃ التی عرضت علی بنی اسرائیل فلم یقولوھا۔ یعنی یہی وہ حطۃ ہے جو بنی اسرائیل پر پیش کیا گیا مگر انھوں نے نہ کہا۔ پس حطۃ کے کلمہ میں درحقیقت استغفار کرنے کا حکم تھا کہ استغفار سے اللہ تعالیٰ کی حفاظت طلب کی جاتی ہے۔ اور انسان گناہوں سے بچتا ہے +

۵۹ ۱۱۷۔ فبدّل الذین ظلموا۔ تبدیلی یہی تھی۔ کہ بجائے اس کے کہ گناہوں سے اللہ تعالیٰ کی حفاظت طلب کرتے اور استغفار کرتے جیسا کہ حکم تھا گناہوں میں مبتلا ہوئے۔ اور اس طرح گویا خدا کے حکم کو انھوں نے بدل دیا۔ جب انسان گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو پھر شریعت کا بھی استخفاف کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے۔ کہ آخر اُن کی حالت یہاں تک پہنچی۔ کہ حطۃ کے حکم کے ساتھ بھی استہزاء کرنے لگے۔ اور اُس کی بجائے حبۃ فی شعرۃ کہدیتے۔ مگر تبدیل حکم کے لازمی معنے یہ نہیں کہ ایک لفظ کی بجائے دوسرا لفظ بول دے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یریدون ان یبدلوا کلام اللہ۔ اور تفاسیر میں لکھا ہے۔ انھم غیروا ما شرع لھم ولم یعملوا بما انزل اللہ۔ یعنی جو شریعت دی گئی تھی اُسے بدل دیا۔ اور جو اللہ نے اُتارا تھا اُس پر عمل نہ کیا +

۱۱۸۔ رجزا من السماء۔ رجز کے معنے عذاب کے ہیں۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے طاعون کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ انہ رجز عذب بہ بعض الامم۔ یہ وہ رجز یا عذاب ہے۔ جس کے ساتھ بعض قوموں کو عذاب دیا گیا۔ جب انسان ناپاکی اور رجس کی راہیں اختیار کرتا ہے۔ تو پھر اسی کے موافق اسے سزا بھی ملتی ہے۔ اور جب حد سے زیادہ پلیدی بڑھ جاتی ہے۔ تو اُس کی سزا اسی دُنیا میں بھی آجاتی ہے۔ من السماء کا لفظ اس لئے فرمایا۔ کہ گناہوں کی پاداش کے طور پر سزا نازل ہُوئی +

رکوع ۷
۶۰ ۱۱۹۔ اذا ستسقیٰ موسیٰ لقومہ فقلنا اضرب بعصاک الحجر۔ بائبل میں دو موقعہ پر ذکر ہے۔ کہ قوم نے پیاس کی شکایت حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے پاس کی۔ اور حضرت موسیٰ

اور مفردات میں ہے۔ کہ ہو سکتا ہے۔ من اور سلویٰ دونوں سے ایک ہی چیز کی طرف اشارہ ہو۔ اور اس لحاظ سے اُس کا نام من رکھ دیا۔ کہ وہ بطور احسان کے اُن کو دیا گیا اور مشقت نہیں کرنی پڑی۔ اور سلویٰ اس لحاظ سے کہ وہ اُن کے لیئے موجب تسلی ہُوا۔ بہرحال یہ وہ رزق تھا جو اللہ تعالیٰ بیابان میں اُن کو پہنچاتا رہا۔

۵۸

۱۱۴- هٰذِهِ الْقَرْيَةَ - یہ قریہ سطیم معلوم ہوتا ہے۔ جس کا ذکر گنتی باب ۲۵ آیت ۱ سے ۳ میں ہے۔ سو اسرائیل سطیم میں مقیم ہُوئے اور لوگوں نے موآبیوں کی بیٹیوں سے حرامکاری شروع کی۔ انھوں نے اپنے معبودوں کی قربانیوں پر لوگوں کی دعوت کی سو لوگوں نے کھایا۔ اور اُن کے معبودوں کو سجدہ کیا۔ اور اسرائیلی بعل فغور سے ملے۔ تب خُداوند کا قہر بنی اسرائیل پر بھڑکا۔ یہ قہر بصورت وبا تھا۔ جیسا کہ اسی باب کی آیت ۸ و ۹ میں بیان کیا ہے "تب بنی اسرائیل میں سے وبا جاتی رہی جو اُس وبا سے مرے چوبیس ہزار تھے"۔ پس جس قدر واقعات قرآن کریم نے بیان فرمائے ہیں وہ سب سطیم پر صادق آتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا وہاں مقیم ہونا۔ خُدا کی نافرمانی کرنا۔ اور وبا میں پکڑے جانا۔ اور یہ حضرت موسےٰؑ کے ہی وقت کا واقعہ ہے ✣

۱۱۵- وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا - شہر کے دروازے میں فرمانبرداری کی حالت میں داخل ہونا۔ یہ بنی اسرائیل کو حکم تھا۔ سجدہ فرمانبرداری اور اطاعت کا ہی نام ہے۔ یہ معنے نہیں ہوسکتے کہ سجدہ پر اصرار رکھے ہُوئے گھٹتے گھٹتے شہر میں داخل ہوتا بلکہ اس نئے شہر میں داخل ہوتے وقت خصوصیت سے فرمانبرداری کا حکم دیا۔ کہ شہری زندگی میں طرح طرح کے محرکات بدیوں کے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو جنگل میں موجود نہ تھے۔ چنانچہ اُوپر جو نوٹ ۱۱۴ میں حوالہ نقل کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کس طرح پر وہاں داخل ہوتے ہُوئے اُن کو پہلا ابتلا یہ پیش آیا۔ کہ دوسری قوم کی خوبصورت عورتوں سے زناکاری میں مُبتلا ہُوئے۔ پھر اُن لوگوں کی محفلوں میں شامل ہوکر آخر شیطان کے ہو گئے۔ اِس لیئے خصوصیت سے حکم تھا۔ کہ شہر میں داخل تو ہوتے ہو۔ مگر کامل فرمانبرداری کی حالت میں داخل ہونا یعنی داخل ہوتے بھی اور داخل ہوکر بھی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کو مقدم رکھنا ✣

۱۱۶- قُولُوا حِطَّةٌ - مفردات میں لکھا ہے۔ کہ حطۃ کے معنی ہیں۔ حطہ عنا ذنوبنا۔ یعنی ہمارے گناہ معاف کیئے جائیں۔ یا ہمارے بوجھ (یعنی گناہوں کے بوجھ)

معنے ہو سکتے ہیں۔ اپنے سوٹے سے چٹان کو مار۔ اپنے سوٹے سے چٹان پر چلا جا۔ اپنی جماعت کے ساتھ پہاڑ پر چلا جا۔ بہر حال اللہ تعالےٰ نے وہاں خواہ کوئی بھی صورت ہو بارہ چشمے پانی کے نکال دیئے۔ سوٹے کے مارنے سے بھی چشموں کا نکل آنا کوئی ایسی بات نہیں جسے ہم تسلیم نہ کر سکیں۔ البتہ جو معنی بعض مُفسرین نے لکھے ہیں۔ کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام ایک پتھر ساتھ لیئے پھرتے تھے جو تین گز مُربع کا تھا۔ جہاں اُسے جنگل میں رکھتے اور سوٹا مارتے وہیں بارہ چشمے بہہ نکلتے جن سے چھ لاکھ آدمی اور اُن کے مال مویشی سیراب ہو لیتے۔ اس قصہ کا کوئی نشان قرآن کریم میں نہیں ملتا۔ نہ ہی اگر دُعا پر اللہ تعالےٰ نے حضرت موسےٰ کو یہی حُکم دیا ہو۔ کہ تم چٹان پر چلے جاؤ اور وہاں بارہ چشمے نکل آئے ہوں تو یہ کوئی معجزہ کا انکار ہے۔ کیونکہ ایسے جنگل میں جہاں پانی نہ ملتا ہو نبی کو پانی کے چشموں کی اطلاع دیدینا یہ خود بڑا اعظیم الشان معجزہ ہے۔ اور اس سے اگلی ہی آیت میں جب بنی اسرائیل نے کھانے کی مختلف اشیاء مانگیں۔ تو اللہ تعالےٰ نے یہی فرمایا کہ جاؤ کہیں آباد ہو جاؤ۔ اور کھیتی باڑی کرلو مطلوبہ چیزیں نکل آئیں گی +

۱۲۰- کُلّ اُناس - ہر ایک قوم نے الگ الگ گھاٹ بنالیا - کیونکہ بارہ قوموں کی تعداد کے مُطابق بارہ چشمے تھے +

۱۲۱- طعام واحد - ایک ہی قسم کا کھانا جو دن رات اُنھیں ملتا تھا +

۶۱

۱۲۲- فوم - لہسن اور گیہوں دونوں پر بولتے ہیں - مگر یہاں لہسن ہی مُراد معلوم ہوتا ہے۔ اور دوسری قرأت میں ثوم بھی آیا ہے۔ جو لہسن کو ہی کہتے ہیں +

۱۲۳- اتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیر - وہ غذا اعلےٰ درجہ کی تھی - اور زندگی بھی سپاہیانہ - مگر سبزی ترکاری کے لیئے ضرورت تھی کہ زمیندار بنیں - پس اُسی قدر اُن کے اصل شغل یعنی سپاہیانہ زندگی کو نقصان پہنچنا لازم تھا - اور اصل غرض جو فتح ارض مقدس تھی - وہ مفقود ہوتی تھی +

۱۲۴- اھبطوا مصرًا - کسی شہر میں اُتر پڑو - مُلک مُصر مُراد نہیں - بلکہ مصر بمعنی شہر ہے مطلب یہ ہے - کہ شہر میں اُتر کر زمین کو کاشت کرو - تو یہ چیزیں بھی پیدا ہو جائیں گی +

۱۲۵- ضربت علیھم الذلة والمسکنة - شہری زندگی طرح طرح کی غذائیں آرام اور آسائش اُس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے - کہ ایک قوم دن بدن کمزور ہوتی چلی جاتی ہے - پس ذلّت اور مسکنت یعنی نے دست و پا ہو جانا ضروری تھا - چنانچہ اس کی وجہ

نے دونوں موقعہ پر اللہ تعالیٰ سے دُعا کی - پہلا موقعہ خروج ۱۵ : ۲۳ سے ۲۷ تک ہے -
"اور جب وے مارہ میں آئے .... تب لوگوں نے یہ کہ کے موسےٰ سے شکایت کی - کہ ہم
کیا پیویں - اُس نے خُداوند سے فریاد کی .... پھر وے ایلیم کو جہاں پانی کے بارہ چشمے اور
ستر درخت کھجور کے تھے پُہنچے اور اُنھوں نے پانی پر خیمے کھڑے کیئے" - اور دوسرا موقعہ خروج
۱۷ : ۱ - ۷ تک ہے - "اور رفیدیم میں ڈیرا کیا - وہاں لوگوں کو پینے کو پانی نہ تھا -
سو لوگ موسیٰ سے جھگڑنے لگے - اور کہا ہم کو پانی دے کہ پیویں .... موسےٰ نے خُداوند
سے فریاد کر کے کہا - کہ میں ان لوگوں سے کیا کروں ... خُداوند نے موسےٰ کو فرمایا -
کہ لوگوں کے آگے جا اور بنی اسرائیل کے بزرگوں کو اپنے ساتھ لے اور اپنا عصا
.... ہاتھ میں لے .... تو اس چٹان کو ماریو - اُس سے پانی نکلیگا - کہ تا لوگ
پیویں - چنانچہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کے بزرگوں کے سامنے یہی کیا" +

اب ہم نے یہ دیکھنا ہے - کہ قرآن کریم ان دونوں موقعوں میں سے کس موقعہ کی
طرف اشارہ کرتا ہے - پہلے موقعہ پر بارہ چشموں کا ذکر ہے - اور قرآن کریم میں بھی
بارہ چشموں کا ذکر ہے - قد علم کُلّ اناس مشربھم - اور دوسرے موقعہ پر
چٹان کا ذکر ہے - اور قرآن کریم میں بھی حجر کا ذکر ہے - جس کے معنے چٹان کے ہیں
ایک اور امر پہلے موقعہ کی طرف اشارہ ہونے کے مؤید یہ ہے - کہ ایلیم جہاں وہ بارہ
چشمے تھے - آج تک عیون موسےٰ کے نام سے مشہور ہے - یعنے موسےٰ کے چشمے ( دیکھو
بائیبل ڈکشنری مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ) جس سے معلوم ہوتا ہے - کہ یہ چشمے
حضرت موسےٰ کے نام سے کچھ خصوصیت رکھتے ہیں + باقی رہے قرآن کریم کے الفاظ
اضرب بعصاك الحجر - سو اس میں کچھ شک نہیں - کہ وہ بھی دونوں موقعوں پر
چسپاں ہوسکتے ہیں - اضرب الحجر کے معنے ہو سکتے ہیں (۱) چٹان کو مار یا (۲) چٹان
پر چلا جا - چنانچہ تاج العروس میں ضرب الارض کے معنے ہیں - اُس نے زمین میں
سفر کیا یعنی وہی معنی جو ضرب فی الارض کے ہیں - اور یہ محاورہ تو خود قرآن کریم نے
بھی استعمال فرمایا ہے - واٰخرون یضربون فی الارض - اذا انتم ضربتم فی الارض - باقی
رہا لفظ عصا سو اس کے معنے سوٹے اور جماعت کے دونوں آئے ہیں - چنانچہ خوارج
کے متعلق آتا ہے - قد شقوا عصا المسلمین - جس کی تفسیر ان الفاظ سے کی گئی ہے
فرقوا جماعتھم - اور اسی طرح ایاك وقتیل العصا کے معنے لکھے ہیں - ایاك ان تکون
قاتلا او مقتولا فی شق عصا المسلمین - پس اضرب بعصاك الحجر کے تینوں

ہوسکتی۔ اس لیئے وہ دوسروں کو اپنے مذہب میں داخل نہ کرتے تھے عیسائی گو دوسرو نکو
اپنے مذہب میں داخل تو کرتے تھے۔ مگر درحقیقت اُن کی کتاب میں بھی اصول تو یہی
بیان کیا گیا تھا۔ کہ ہمیں دوسری قوموں سے غرض نہیں۔ حضرت مسیحؑ نے بار بار یہی کہا
کہ میں تو بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ اور جب ایک
کنعانی عورت اُس کے پیچھے ہولی۔ اور چلّائی تو اُس کو یہ جواب دیا گیا "میں
اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہُوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا"۔
مگر وہ پھر بھی چلی آئی۔ تو حضرت مسیحؑ نے کہا "مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی لیکر
کُتّوں کو پھینک دیویں"۔ متی ۱۵: ۲۲-۲۶- اور صابیوں کا دین تو اور بھی محدُود
تھا۔ پس سب کو مخاطب کرکے فرمایا۔ کہ اسلام کا دائرہ ایسا تنگ نہیں۔ کہ ایک
قوم اس کے اندر داخل ہوسکے۔ اور دوسری نہ ہوسکے۔ بلکہ جو کوئی بھی ایمان
لے آئے۔ اور نیک عمل کرے وہی نجات اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کو پاسکتا ہے۔ دوسری
طرف الذین اٰمنوا کو شامل کرکے یہ سمجھا دیا کہ نرا دعوی ایمان کوئی شے نہیں جبتک
اُس کے ساتھ اعمال صالحہ نہ ہوں۔ سو ایک طرف تو سب قوموں کو یہ خوشخبری سُنائی
کہ اسلام کا پاک پیغام ساری قوموں کے لیئے ہے۔ دوسری طرف خود ان لوگوں کو
جو ایمان لانے کا دعوے کرتے ہیں یہ سمجھا دیا۔ کہ وہ حالت نجات کی جو لا خوف
علیھم ولا ھم یحزنون کا مصداق ہے۔ وہ خالی ایمان کے دعوے سے پیدا نہیں
ہوتی۔ بلکہ جب تک وہ ایمان عملی رنگ میں آکر اعمال صالحہ کی صُورت نہ پکڑے۔ اس
وقت تک وہ حالت مسلمان کو بھی میسّر نہیں آسکتی +

الذین ھادوا۔ جو شخص یہُودیوں میں داخل ہو۔ اُس کے لئے ھادیا
ھُود کا لفظ بولتے ہیں۔ مگر اصل میں یہُودکا نام یہُودا پر ہے۔ جو حضرت
یعقوب علیہ السّلام کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے۔ کہ ھاد
بمعنی تائب ہے۔ اور یہُود کو اس لیئے کہا گیا۔ کہ اُنہوں نے بچھڑو کی پرستش سے
توبہ کی تھی۔ مگر چونکہ اصل لفظ عبرانی ہے۔ پہلی وجہ دُرست معلوم ہوتی ہے +

النصارٰی۔ نصران کی جمع ہے۔ عام طور پر نصرانی کہا جاتا ہے۔ یہ نام
حضرت مسیح علیہ السلام کے قریہ ناصرہ سے لیا گیا ہے۔ گو بعض کا خیال ہے۔ کہ اس
نام میں حضرت مسیحؑ کی نصرت کی طرف اشارہ ہے۔ مگر پہلی وجہ دُرست معلوم ہوتی ہے +

الصابئین۔ صابی کی جمع ہے۔ عرب میں صابی کا لفظ ہر اُس شخص پر

بھی ساتھ ہی بتادی۔ ذٰلک بانھم کانوا یکفرون بآیات اللہ یعنی ذلّت اور مسکنت اسلیئے آئی۔ کہ احکامِ الٰہی کا انکار کرتے تھے +

۱۲۶۔ یقتلون النبیّین۔ نبیوں کو قتل کرتے تھے۔ اور قتل کرنے کے منصوبے کرتے تھے۔ یہ ضرور نہیں کہ یہ بھی حضرت موسیٰ کی زندگی کا واقعہ ہو۔ بلکہ بعد کا ذکر ہے۔ جب ان میں نبی آتے تو وہ اُن کے قتل کے درپے ہو جاتے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بعض نبیوں کو قتل بھی کیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی یہود کو نبیوں کے قتل کرنے کا الزام دیا ہے " اور کہتے کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں اُن کے شریک نہ ہوتے۔ اسی طرح تم اپنے پر گواہی دیتے ہو۔ کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو" (متی ۲۳: ۳۰ و ۳۱) اور" اے یروسلم اے یروسلم جو نبیوں کو مار ڈالتی" (متی ۲۳: ۳۷) وغیرہ اور حضرت یحیٰے کے قتل کا واقعہ بھی ثابت ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ نبی کے قتل ہونے سے اُس کا کاذب ہونا لازم آتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ نہ کہیں قرآن کریم نے ایسا فرمایا۔ بلکہ ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ کے متعلق باوجود وعدۂ عصمت کے فرمایا۔ افائن مات او قتل۔ یعنی اگر آپ وفات پاجائیں یا قتل کیئے جائیں۔ تو کیا تم شرک میں واپس چلے جاؤ گے۔ یعنی اس سے آپ کی صداقت پر حرف نہیں آسکتا +



۱۲۷۔ ان الذین آمنوا والذین ھادوا۔ پچھلے رکوع کے خاتمہ پر یہود کے لیئے اُن کی نافرمانیوں کی وجہ سے ایک سخت وعید فرمایا۔ وہ یہ کہ یہ ہمیشہ ذلّت اور مسکنت کی حالت میں رہیں گے۔ اور اللہ تعالےٰ کے غضب کے نیچے آگئے ہیں۔ اس آیت میں اُن کو وہ راہ بتاتا ہے جس راہ پر چلکر وہ پھر قوموں میں ممتاز ہوسکتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے غضب سے نکلکر اُس کی رحمت کے اُمیدوار ہوسکتے ہیں۔ اصل غرض تو یہود کو ہی یہ بتانا تھا۔ کہ باوجود ان سب باتوں کے اب بھی ہم تم پر رحم کرنے کو تیار ہیں کیونکہ پہلی آیات میں بھی یہودیوں کا ذکر ہے۔ اور بعد کی آیات میں بھی۔ مگر یہاں عام اصول بیان فرما دیا۔ کہ نجات کی ٹھیکیدار کوئی خاص قوم نہیں۔ بلکہ خواہ کوئی یہودی ہو یا نصرانی ہو یا صابی ہو جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ اور یوم آخر پر ایمان لاتا اور اعمال صالحہ بجالاتا ہے وہی نجات کا مستحق ہو جاتا ہے۔ یہودیوں کے تذکرہ میں اس اصول کے بیان کرنے کی ایک یہ بھی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ اس قوم کا خیال تھا۔ کہ سوائے بنی اسرائیل کے دوسری کوئی قوم اللہ تعالیٰ کی رحمت کی حقدار بھی نہیں

۶۲

لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون کا مصداق ہوتے - بلکہ اور قوموں پر تو خوف اور حزن کی حالت زیادہ طاری ہُوئی - اور صرف مسلمان ہی اس کا مصداق ہوئے - کہ ہر طرح کے خوف اور حُزن سے جن کے اندر سب سے بڑھ کر وہی تھے انہیں بالکل آزاد کیا گیا +

۶۳

۱۲۸ - اخذنا میثاقکم - اخذ میثاق یا عہد کا لینا جب اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب فرماتا ہے - تو اس کا منشاء یہی ہوتا ہے - کہ ایک قوم کو بذریعہ اُن کے نبی کے کچھ احکام دیئے جاتے ہیں - اور وہ اس نبی پر ایمان لاکر گویا یہ اقرار کرتے ہیں - کہ ہم ان احکام کی تعمیل کرینگے - نصارے کے متعلق بھی اسی طرح عہد لینے کا ذکر ہے - ومن الذین قالوا انا نصاریٰ اخذنا میثاقھم - اسی طرح مسلمانوں سے بھی عہد لیا گیا ہے -

۱۲۹ - رفعنا فوقکم الطور - طور پہاڑ کو کہتے ہیں - معنے یہ ہُوئے کہ ہمنے تم پر پہاڑ کو بلند کیا - یعنی پہاڑ تمہارے اوپر تھا اور تم اس کے نیچے تھے - کسی بلند چیز کے آنکھوں کے سامنے آجانے پر بھی لفظ رفع بولتے ہیں - جیسے کہ حدیث میں ہے - فرفعت لنا صخرۃ جس کے معنے بحار الانوار میں لکھے ہیں ظھرت لابصارنا - یعنی لفظی معنے تو یہ ہونگے - کہ ہمارے لیئے چٹان یا پہاڑ اُٹھایا گیا - مگر مطلب صرف اس قدر ہے - کہ پہاڑ ہماری آنکھوں کے سامنے آگیا - بعینہٖ یہی معنی رفعنا فوقکم الطور کے یہاں ہیں - ورنہ خدا یُوں جبر اور اکراہ سے لوگوں سے معاہدے نہیں کرایا کرتا - کہ ایک پہاڑ سروں کے اُوپر لاکر رکھدے اور کہے کہ اگر نہیں مانتے تو ابھی اس پہاڑ کو گراکر تمہیں ہلاک کر دونگا - توریت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے - جہاں خروج باب ۱۹ آیت ۱۷ و ۱۸ میں لکھا ہے "اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا - کہ خدا سے ملادے - اور وے پہاڑ کے نیچے آکھڑے ہوئے - اور سب کوہ سینا پر زیر و بالا دھواں تھا - اور پہاڑ سراسر ہلگیا" - کانہ ظلۃ کی تشریح بھی انہی الفاظ سے ہو جاتی ہے +

۶۵

۱۳۰ - اعتدوا منکم فی السبت - سبت کے اصل معنے لغت میں قطع یعنی کاٹنے کے ہیں - یہودیوں کے لیئے عبادت کا ہفتہ میں ایک دن مقرر تھا - جس دن اُن کو حکم تھا - کہ وہ کوئی کام نہ کریں - اور صرف عبادت کے لئے اُس دن کو مخصوص رکھیں چونکہ اس دن معمولی کاروبار نہیں کیئے جاتے تھے - اسلیئے سبت اس کا نام رکھا گیا - اور چونکہ کاروبار کے بند کرنے سے سکون اور راحت بھی انسان کو ملتی ہے - اِس لیئے سبت کا لفظ آرام کے معنوں میں بھی آیا ہے - وجعلنا نومکم سباتا - یہودیوں

بول دیتے تھے - جو اپنے دین سے نکل کر دوسرے دین میں چلا جائے - اور یہ صبأ سے مشتق ہے - پھر بعض نے کہا - کہ وہ فرشتوں کی پرستش کرنے والی ایک قوم ہے بعض نے کہا ستاروں کی پرستش کرنے والی - اور بعض نے کہا یہود اور نصاریٰ کے بین بین ان کا مذہب ہے - انسکلوپیڈیا بری ٹینیکا میں جو تحقیق اس لفظ کی کی گئی ہے - وہ مفسرین کے اس خیال کے مطابق ہے - جس کا ذکر میں نے آخر میں کیا ہے اس انسکلوپیڈیا میں صابی کی تشریح یہ کی گئی ہے - کہ وہ ایک نیم عیسائی فرقہ تھا - جو یوحنا بپتسمہ دینے والے کے مریدین کے ساتھ بہت ملتا جلتا ہے - بہرحال ان چار فرقوں کا ذکر کرنے سے منشاء یہی ہے - کہ کوئی سا بھی دین ہو یا کوئی قومیت ہو اسلام کا دروازہ سب کے لئے کھلا ہے - دوسری جگہ اسی مضمون کی آیت میں علاوہ ان فرقوں کے مجوس کا نام بھی بڑھا دیا ہے +

من آمن باللہ والیوم الآخر - میں پہلے بتا چکا ہوں - کہ قرآن کریم میں بہت جگہ ایمان باللہ والیوم الآخر کو اسلام میں داخل ہونے کے ہم معنی رکھا ہے - دیکھو نوٹ ۳۳ و ۳ - نیز دیکھو سورۂ مجادلہ کی آخری آیت - وہاں یہ فرمایا لا تجد قوما یومنون باللہ والیوم الآخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ - یعنے اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانیوالی قوم اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھنے والے لوگوں سے محبت کے تعلقات نہیں رکھ سکتی - اور آخر پر اسی قوم کے متعلق فرمایا - اولئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منہ - اور پھر سب سے آخر انہی کو حزب اللہ قرار دیا +

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے - کہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کی حالت وہ مرتبہ ہے - جو کہ روحانی زندگی کی آخری نہایت ہے - پس اسلام اس بات سے تو انکار نہیں کرتا - کہ دوسرے مذاہب میں بھی نیک لوگ ہو سکتے ہیں - لیکن وہ مقصد اصلی انسانی زندگی کا جس کا نقشہ قرآن کریم میں لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کے الفاظ میں کھینچا گیا ہے - وہ سوائے اسلام کے حاصل نہیں ہو سکتا - کیونکہ وہ اعلےٰ مرتبہ نہایت درجہ کی صفائی کو چاہتا ہے - اور اس کی راہ صرف اسلام میں ہی محفوظ ہے - اور خود نتیجہ نے بھی ظاہر کر دیا - کہ من آمن باللہ والیوم الآخر سے کیا مراد ہے - کیونکہ اُن ساری قوموں میں جو اس وقت عرب میں موجود تھیں سوائے مسلمانوں کے اور تو کسی نے اس حالت کو نہ پایا - کہ وہ

انھوں نے شیطان کی پرستش کی - ان لوگوں کی حالت بہت ہی بدتر ہے - اور وہ سیدھی راہ سے بہت دور بھٹک گئے - اب جائے غور ہے - کہ انہی کو ایک جگہ بندر کہا دوسری جگہ بندر اور سؤر اور شیطان کے پرستار کہا - اور یہ فرمایا - کہ وہ سیدھی راہ سے بہت دور چلے گئے ہیں - بندروں کو تو نہیں کہا جا سکتا - کہ وہ سیدھی راہ سے بہت دور ہیں - اس طرح پر ملزم ہمیشہ انسان کو ہی کیا جایا کرتا ہے +

پھر اس سے بڑھ کر ایک اور شہادت ہے - سورۂ نساء میں انہی یہود کو مخاطب کر کے فرمایا - یا ایھا الذین اوتوا الکتاب اٰمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم من قبل ان نطمس وجوھا فنردھا علی ادبارھا او نلعنھم کما لعنا اصحٰب السبت یعنے اے اہل کتاب اگر تم ایمان نہ لاؤ گے - تو ہم تمہارے مونہوں کو پیٹھوں پر پھیر دینگے یا تم پر اسی طرح لعنت کرینگے - جس طرح سبت والوں پر لعنت کی تھی - اب غور کرو - کہ ان یہود پر جو ایمان نہیں لائے کیا لعنت کی گئی - یہ کہ ان کی شکلیں بندروں کی ہو گئیں - یا یہ کہ وہ بندروں کی طرح ذلیل ہو گئے - نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مخالف یہود کی شکلیں اگر بندروں کی ہو جاتیں - تو ہم سمجھ لیتے کہ پہلے سبت والوں کی بھی صورتیں مسخ ہو کر وہ انسانوں کی شکل میں نہ رہے تھے - بلکہ بندروں کی شکل اُن کی ہو گئی تھی - لیکن جب یہاں ہم دیکھتے ہیں - تو گو وعدہ اُسی لعنت کا ہے - جو اصحاب سبت پر ہوئی تھی مگر ہوا تو یہی کہ وہ ذلیل ہو کر نکالے گئے - پس معلوم ہوا کہ اصحاب سبت پر بھی یہی لعنت برسی تھی کہ وہ ذلیل اور حقیر کر دیئے گئے - اور ایک جگہ (الاعراف) کو نوا قردۃ خاسئین فرما کر آگے فرمایا - واذ تاذن ربک لیبعثن علیھم الی یوم القیامۃ من یسومھم سوء العذاب - گویا ان کے بندر بننے کی تشریح فرمائی - کہ ان پر ایسے لوگ مسلط ہوتے رہینگے جو ان کو دُکھ دیتے رہینگے - چنانچہ مفردات راغب میں اس کے معنی میں یہ قول لکھا ہے - قیل بل جعل اخلاقھم کا خلاقھا - یعنی کہا جاتا ہے - کہ اُن کے اخلاق بندروں کے سے ہو گئے تھے - اور ابن جریر میں ہے - کہ مجاہد نے کہا - لم یمسخوا انما ھو مثل ضرب اللہ لھم مثل ما ضرب کمثل الحمار و قال مسخت قلوبھم ولم یمسخوا قردۃ - یعنی اُن کی صورتیں مسخ نہیں ہوئیں - یہ صرف ایک مثال ہے جو اللہ تعالےٰ نے دی ہے - جیسے کہ گدھے کی مثال دی ہے - اور کہا کہ ان کے دل مسخ ہو گئے - اور اُن کی صورتیں بندروں کی صورتوں میں مسخ نہیں ہوئیں +

بندر کی بڑی خصوصیت جس کے لیئے عربی زبان میں اُس کی مثال دی جاتی ہے زنا ہے -

کالاعتداء فی السبت یہ تھا۔ کہ انھوں نے اس دن کو بھی اپنے کاروبار میں لگانا شروع کردیا۔ اور اس طرح پر عبادت الٰہی کو بالکل ترک کردیا۔ یہ سچ ہے کہ مسلمانوں میں کوئی دن اس طرح عبادت کا مقرر نہیں۔ کیونکہ اسلام نے ہر ایک بات کو کمال تک پہنچایا ہے۔ ساتویں دن ایک دن عبادت کے لیئے خاص کرنا ابتدائی حالات کے لیئے موزون تھا۔ لیکن کمال انسانی یہی تھا۔ کہ انسان اپنے سارے کاروبار کے اندر عبادت الٰہی میں لگا رہے۔ اسلیئے اسلام نے پانچ نمازیں منقرر کردیں۔ جن کے اوقات اس طرح پر اشغال دنیا کے اندر آجاتے ہیں۔ کہ جو شخص حضور قلب سے پانچ وقت نماز پڑھے۔ ممکن نہیں کہ اس کا دل ایک لمحہ کے لیئے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے غافل ہوسکے۔ اسی لیئے جمعہ کا دن بھی سارا عبادت کے لیئے خاص نہیں کیا۔ بلکہ اس میں بھی عبادت کا ایک وقت ہی رکھا ہے۔ چنانچہ جمعہ سے پہلے تو فرمایا۔ اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع معلوم ہوا کہ جمعہ سے پہلے تجارت یا کاروبار میں مشغول رہنا منع نہیں۔ اور نماز کے بعد فرمایا فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ۔ یعنی بیشک اپنے کاروبار میں لگ جاؤ اور اللہ کو یاد کرتے رہو۔ افسوس کہ جس طرح یہودیوں نے سبت کے معاملہ میں اعتدا کیا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں نے بھی کیا ہے۔ نماز کی اذان سنتے ہیں اور مسجد کو نہیں جاتے۔ جمعہ کے دن کی بھی پروا نہیں +

۱۳۱۔ کونوا قردۃ خاسئین۔ ذلیل بندر ہو جاؤ۔ ان الفاظ کے معانی میں بھی لوگ بہت دور نکل گئے ہیں۔ حالانکہ بات تو سیدھی تھی۔ قرآن کریم ایسے محاورات سے بھرا پڑا ہے۔ اندھے بہرے گونگے کہنے سے یہ مراد نہیں۔ کہ سچ مچ یہ ظاہری حواس باطل ہیں۔ فانھا لا تعمی الابصار ولٰکن تعمی القلوب التی فی الصدور آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں۔ بلکہ وہ دل جو سینوں کے اندر ہیں اندھے ہو جاتے ہیں۔ پھر کسی شخص کی مثال کتے کی بیان کی۔ کسی کی گدھے کی۔ سب سے پہلے قرآن کریم کو لو۔ المائدہ میں فرماتا ہے۔ قل ھل انبئکم بشر من ذٰلک مثوبۃ عند اللہ من لعنہ اللہ وغضب علیہ وجعل منھم القردۃ والخنازیر وعبد الطاغوت اولٰئک شر مکانا واضل عن سواء السبیل۔ یعنی کیا میں تم کو ان لوگوں کی خبر دوں۔ جو اللہ کے نزدیک اس سے بھی بدتر بدلہ کے مستوجب ہیں۔ یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی۔ اور ان پر غضب نازل کیا۔ اور ان میں سے بندر اور سُور بنائے۔ اور

جائیگا"۔ اور اسی طرح گنتی ۱۹ : ۱-۱۹ آیت میں جو ایک لال گائے کے ذبح کرنے کا ذکر ہے"۔ جو بے داغ اور بے عیب ہو۔ اور جس پر کبھی جوا نہ رکھا گیا ہو"۔ ان دونوں تذکروں سے صرف اسقدر معلوم ہوتا ہے۔ کہ بنی اسرائیل میں گائے کی مُشرکانہ عظمت کی وجہ سے اللہ تعالےٰ نے حضرت موسےٰ کو ایسے احکام دیئے تھے۔ کہ اس قسم کی گاے ذبح ہوتی رہے۔ مگر ان واقعات میں اس قصہ کی طرف جو مُفسّرین نے بلا تحقیق لکھ دیا ہے ہرگز کوئی اشارہ تک بھی نہیں پایا جاتا۔ ہاں ان سے ہم اس قدر نتیجہ ضرور نکالتے ہیں۔ کہ جس قسم کی گائے کا تذکرہ قرآن کریم میں ہے۔ اِسی قسم کی گائیں ذبح کرنے کا حُکم اور بھی حضرت موسیٰ نے دیا ہے۔ وہ خاص گاے جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسکی پرستش کی طرف بھی طبائع کا رُحجان تھا۔ چنانچہ اس کے مُتعلق ان الفاظ کا آنا کہ تسرالناظرین اسے دیکھ دیکھ کر لوگ خوش ہوتے ہیں۔ اور پھر فرمانا۔ فذبحوھا وما کادوا یفعلون یعنی وہ اسے ذبح کرنا نہ چاہتے تھے بتاتا ہے۔ کہ اس خاص گائے کے ذبح کروانے کا یہی منشاء تھا۔ تا ایسا نہ ہو کہ عجل کی طرح یہ بھی ایک معبُود بن جائے +

رکُوع ۹/۹ ۷۲

۱۳۳۔ واذ قتلتم نفسا فادّرءتم فیھا۔ جو اجتہاد میرا اس آیت کی تفسیر کے مُتعلّق ہے۔ وہ میں نے قرآن کریم کے دوسرے موقعوں کو ملحُوظ رکھ کر اور الفاظ کے معانی کو ملحوظ رکھ کر جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے کر دیا ہے۔ مجھے کوئی صحیح حدیث یا مُعتبر روایت یا توریت یا یہودیوں کی ہی کوئی روایت نہیں ملی۔ جس کی بنا پر اس قصہ کو قبُول کیا جائے جو مُفسّرین نے لکھا ہے۔ پچھلے سارے واقعات کو جن کا ذکر یہُود کے مُتعلّق کیا گیا ہے پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ کہ ان کے ان جرموں اور نافرمانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں ساری قوم شریک ہوتی تھی۔ یہاں بھی ساری قوم ہی مخاطب ہے۔ اب یہ تو ظاہر ہے۔ کہ بنی اسرائیل کی چھ لاکھ کی قوم میں آخر قتل کے واقعات بھی ہوتے ہونگے۔ پھر کسی ایک خاص واقعۂ قتل کو ساری قوم کی طرف کس طرح منسُوب کیا جا سکتا ہے۔ جب ساری قوم اسمیں شریک نہیں۔ مُفسّرین نے جو قصہ یہاں لکھا ہے۔ وہ صرف اس قدر ہے۔ کہ ایک شخص کا بھتیجا اُس کی لڑکی سے شادی کرنا اور اس کے سارے مال و دولت کا وارث ہونا چاہتا تھا۔ چچا رضامند نہ ہُوا تو بھتیجے نے رات کو جا کر اُسے قتل کر دیا۔ اور لاش ایسی جگہ پھینک دی۔ کہ الزام کسی دوسرے کے سر پر آئے۔ اب اس قصہ کی رُو سے جس کا ماخذ نہ قرآن میں نہ حدیث میں نہ توریت میں ہے۔ صرف ایک آدمی قاتل ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں ساری قوم مخاطب ہے۔ کہ تم سب نے ایک نفس کو قتل

چنانچہ کہا جاتا ہے - ازنی من قرد - یعنی بندر سے بھی زیادہ زانی - اس لحاظ سے بھی یہود واقعی بندر ہو گئے تھے - جیسا کہ حزقیل ۲۲: ۹ سے ۱۱ میں ہے "تیرے بیچ میں وے ہیں جو فسق و فجور کرتے ہیں - تیرے بیچ باپ کو بھی اُنھوں نے بے ستر کیا - کسی نے دوسرے کی جورُو سے بُرا کام کیا ہے - اور دوسرے نے اپنی بہو سے بدذاتی کی ہے اور کسی نے اپنی بہن اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے درمیان خراب کیا ہے" - اور پھر سزا کو ان الفاظ میں بیان کیا "ہاں میں تجھ کو قوموں میں کھنڈا دونگا - اور تجھے ملکوں میں پراگندہ کر دونگا" - گویا ایک طرف اگر یہود کے اخلاق بندروں سے ہو گئے - تو دوسری طرف اللہ تعالےٰ نے انہیں سزا بھی ایسی ہی دی - کہ اُن کو ذلیل کر کے بندروں کی طرح دربدر کیا ◆

۶۷ ۱۳۲ - ان تذبحوا بقرۃ - یہ ایک گائے کے ذبح کرنے کا حُکم ہے - اور کوئی ذکر مطلق نہیں کہ اس گائے کے ذبح کو کسی مقتُول سے کچھ تعلق ہے - نوٹ ع۱۰۶ میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ اسرائیلیوں نے مصریوں سے گائے کی پرستش کو لیا - اسی لیئے انھوں نے ایک بچھڑو کی شکل بنا کر اس کی پرستش بھی کی - اسی لیئے حضرت موسےٰ کی شریعت میں ایسی گائیں ذبح کرنے کا حُکم بھی خاص خاص موقعوں پر تھا - جو ہل وغیرہ کے کام میں نہیں لگائی جاتیں - بلکہ پھرنے اور کھانے کے لیئے چھوڑ دی جاتی ہیں - اس قسم کی گائے کی عظمت مُشرک قوموں میں بہت ہوتی ہے - اور اس کی مثال سب سے عُمدہ خود ہمارا مُلک ہندوستان ہے - جہاں ایسی گائیں بکثرت چھوڑی جاتی ہیں - بنی اسرائیل میں بھی ایسی گائیں بہت عظمت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں - چنانچہ باوجود ان سارے احکام کے جو اس قسم کی گائیں ذبح کرنے کے لیئے حضرت موسےٰ کی شریعت میں پائے جاتے ہیں - یہ مرض بنی اسرائیل سے گئی نہیں - بلکہ ہوسیع نبی نے بھی اس کا رونا رویا ہے - دیکھو ہوسیع ۵/۴ اور ۵/۱۰ ہاں یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے - کہ استثناء ۱۹: ۱ - ۹ میں جو حکم ہے "اگر اس سرزمین میں جس کا خُداوند تیرا خُدا تجھے وارث کرتا ہے - کسی مقتُول کی لاش کھیت میں پڑی ہوئی ملے اور معلوم نہ ہو - کہ اس کا قاتل کون ہے - تب تیرے بزُرگ اور تیرے قاضی باہر نکلیں ... ایک بچھیا لیں جس سے ہنوز کچھ خدمت نہ لی گئی ہو - اور جوئے تلے نہ آئی ہو ... وادی میں اس بچھیئے کی گردن کاٹیں ... پھر اس شہر کے سارے بزُرگ جو مقتُول سے نزدیک ہیں - اس بچھیئے کے اُوپر جو اس وادی میں گردن ماری گئی اپنے ہاتھ دھوئیں ... تب وہ خُون اُنھیں بخشا

منۂ الخ - یعنی اُن کا یہ دعویٰ ہے - کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم رسُول اللہ کو قتل کردیا - حالانکہ اُسے انھوں نے قتل نہیں کیا نہ صلیب پر مارا - بلکہ وہ اُن کے لیئے مُشبہ بالمقتول ہوگیا - اور جو لوگ اس کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں - وہ اسبارے میں شک میں ہی ہیں - اب یہ کُل واقعات سُورہ نساء کے یہود کے مُتعلق ان واقعات کا خلاصہ ہیں - جو سُورت بقرہ میں بالتفصیل بیان ہوئے ہیں - اور سُورت بقرہ کی اِس آیت کے مُقابل سُورت نساء میں حضرت مسیح علیہ السّلام کا واقعہ ہے - جس کی ساری تفصیلات بالکُل اس واقعہ کے ساتھ جس کا یہاں ذکر ہے ملتی ہیں - پس کوئی بعید بات نہیں - کہ یہاں اسی حضرت مسیح علیہ السّلام والے واقعہ کی طرف ہی اشارہ ہو - اور اِس طرح جس بات کی سُورت نساء میں تفصیل کردی - اُسے یہاں اجمالاً بیان کردیا - اور جس کی یہاں تفصیل کردی اُسے سُورت نساء میں اجمالاً بیان کردیا - پس جہانتک میں غور کرتا ہوں اذ قتلتم نفساً میں جس نبی کے واقعۂ قتل کی طرف اشارہ ہے جو کوئی مشہور واقعہ ہے - جس کا الزام ساری قوم یہود پر ہے - جس کے قتل کے بارے میں اختلاف ہوا ہے - جو واقعی قتل سے بچ گیا اور واللہ مخرج ما کنتم تکتمون کا مصداق ہُوا ہے - وہ یہی حضرت مسیح علیہ السّلام ہی ہیں - اور اس واقعہ کے بعد نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے کے واقعات کا ذکر شروع ہوجانا بھی یہی بتاتا ہے +

اب یہ سوال ہے - کہ یہاں تو فرمایا - کہ اذ قتلتم حالانکہ حضرت مسیحؑ کے متعلق سُورۂ نساء میں فرمایا ما قتلوہ - سو اس کا جواب یہ ہے - کہ یہُود نے اپنی طرف سے فعل قتل کو اُس حد تک پہنچا دیا تھا - کہ وہ مقتول ہوجاتے - تو جب اشرف علی القتل ہو چُکا - تو ہم اُسے قتل کے نام سے موسُوم کرسکتے ہیں - جیسا کہ شاعر کہتا ہے - اذا ما مات میت من تمیم - حالانکہ مرنے والا مرنے کے بعد میت بنتا ہے - بلکہ سُورت نساء میں اس لفظ کے بڑھانے سے وما قتلوہ یقیناً یہ ظاہر ہوتا ہے - کہ اُنھوں نے اپنی طرف سے فعل قتل کردیا تھا - مگر وہ یقینی قتل نہیں ہُوا - سو یہ کوئی اعتراض نہیں - کیونکہ جب وہ فعل قتل کرچکے - تو اُن کی طرف تو وہ فعل منسُوب ہوگیا - اب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اُس کو بچالیا - اور اس کا ذکر بھی ساتھ ہی فرمادیا - کہ واللہ مخرج ما کنتم تکتمون +

۱۳۴ - فقلنا اضربُوہ ببعضہا - صرف یہی ایک فقرہ ہے - جس نے گائے کے ذبح کے واقعہ کو اس قتل نفس والے واقعہ کے ساتھ ملانے کے لیئے وہ قصہ بنوایا ہے جس کی بنیاد کوئی (آیت ۷۳)

کردیا - اب قرآن کریم میں ساری قوم کو جب مُلزم کیا ہے - تو قتل انبیا علیہم السلام کے لئے ہی کیا ہے - چنانچہ اس سے ایک رکوع پہلے فرمایا تھا - کہ یہود پر غضب الٰہی اسلئے آیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا کُفر کرتے اور نبیوں کو قتل کرتے تھے - اس کے بعد اُن کے احکام کے انکار کی مثالیں تو بیان کیں - اب قتل کی ایک مثال بیان فرماتا ہے پس ساری قوم پر اس قتل کا الزام دینے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے - کہ یہاں کسی نبی کے قتل کی طرف اشارہ ہے - اور خود نفساً کا لفظ بھی اس پر دلالت کرتا ہے - کہ اس نفس کی شہرت اور اس واقعہ کی عظمت کے لحاظ سے اسے نکرہ لایا گیا ہے - پس اذ قتلتم نفساً میں لازماً کسی نبی کے واقعۂ قتل کی طرف اشارہ ہے - جو ایک مشہور واقعہ تاریخ میں ہے ✦

دوسری تخصیص اس واقعہ کی ان الفاظ سے کی فادّٰرءتم فیہا - یعنی پھر تم نے اس قتل کے واقعہ میں اختلاف کیا - اور تیسری تخصیص یہ فرمائی - واللہ مخرج ما کنتم تکتمون - کہ تم تو اسے قتل کر کے مخفی کرنا چاہتے تھے - مگر اللہ تعالیٰ نے اسے ظاہر کرنا تھا - یہاں سے دو باتیں اور معلوم ہوتی ہیں - یعنی ایک یہ کہ اسی نبی کے متعلق بعد میں ان لوگوں میں اختلاف بھی ہوا - اور دوسرے یہ کہ قتل کرنے والے اس کے قتل کرنے میں کامیاب بھی نہیں ہوئے ✦

ان پانچوں باتوں کے علاوہ یعنی ساری قوم کا اس الزام کے نیچے ہونا - یہ قتل کا واقعہ کسی نبی کے متعلق ہونا - پھر یہ ایک مشہور و معروف واقعہ ہونا - پھر اس کے قتل کے بارے میں اختلاف ہو جانا - پھر اللہ تعالیٰ کا اس کو اس قتل سے بچا لینا چھٹی بات یہ ہے - کہ جب ہم ان واقعات کا مقابلہ قرآن کریم میں ایک دوسرے موقعہ سے کرتے ہیں - تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی سب الزامات یہود پر دینے کے بعد جس واقعہ قتل کا ذکر کیا ہے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کا واقعہ ہے - چنانچہ سورۂ نساء کے بائیسویں رکوع کو پڑھو - وہاں پہلے ارنا اللہ جھرۃ کی درخواست اور صاعقہ کا آنا - پھر بچھڑے کو معبود بنانا اور اللہ تعالیٰ کا عفو کر دینا - پھر پہاڑ کے نیچے وعدہ کا لیا جانا - شہر میں فرمانبرداری کی حالت میں داخل ہونے کا حکم دینا پھر سبت کے بارے میں اعتداء کرنے سے روکنا - اور ان کا ان سب وعدوں کو توڑنا - اور کفر بآیات اللہ اور قتل انبیاء کی وجہ سے ان کا پکڑے جانا ان سب امور کا جو کہ درحقیقت اس سورۃ کے پچھلے تین رکوع کا خلاصہ ہیں ذکر کر کے ایک واقعۂ قتل کا ذکر فرمایا - وقولھم انا قتلنا المسیح عیسی ابن مریم رسول اللہ وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم وان الذین اختلفوا فیہ لفی شک

۷۳
پھر کسی وقت اللہ تعالےٰ کوئی بہتر معنے مجھے یا کسی اور کو سمجھا دے - اور اگر ان الفاظ کے معنے یہی لیئے جانے ضروری سمجھے جائیں - کہ اس مذبوحہ گائے کے گوشت کے ٹکڑے کو کسی مقتول کے جسم سے مارو - تو شاید اسکی یہ صورت ہو کہ مقتول میں کچھ رمق باقی ہو - اور اس سے کچھ ہوش آگئی ہو - اور اس نے اصل واقعہ بتا دیا ہو - مگر اس صورت میں بھی بہرحال وہ چچے اور بھتیجے والا واقعہ ویسا ہی بے بنیاد ہے - اور یہ کہنا پڑیگا - کہ یہ کوئی واقع ہؤا ہوگا جس کا ہم کو کوئی علم نہیں - واللہ اعلم بالصواب +

۷۴
۱۳۵ - ثم قست قلوبکم ... اس واقعہ کے بعد جس کا ذکر پچھلی دو آیات میں ہے - پھر یہودیوں کے دلوں کے سخت ہو جانے کا ذکر فرمایا ہے - اس سے اگلی آیت میں مسلمانوں کو خطاب ہے - کہ ایسے لوگوں کا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا کیسا مشکل امر ہے - جو خود اپنے نبیوں کے خلاف قتل کرنے سے نہیں رُکے - اس سے بھی مزید شہادت اسبات کی ملتی ہے - کہ پچھلی دو آیات میں حضرت مسیح علیہ السلام کے واقعات کا ذکر ہے +

۱۳۶ من الحجارۃ لما یتفجر منہ الانھار - پتھروں میں سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں - یہ نظارہ تو عام ہے - غرض اس طرف توجہ دلانے کی معلوم ہوتی ہے - کہ پتھر جیسی چیز میں سے بھی نہریں نکلتی ہیں - تو تمہارے دلوں سے وہ علوم کی نہریں کیوں نہیں بہ نکلتیں - جو دُنیا کو سیراب کریں - یا نہر نہیں تو کچھ پانی ہی بہ نکلے - ان منھا لما یھبط من خشیۃ اللہ پر لوگوں کو یہ اعتراض وارد ہؤا ہے - کہ پتھر کو خشیۃ الٰہی کیا ہوسکتی ہے - لیکن اول تو یہ بھی درست نہیں - دُنیا کی ساری چیزیں آخر اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہی ہیں - اور قرآن کریم میں تو بار بار فرمایا ہے - کہ تمام چیزیں اس کی تسبیح کرتی ہیں - اور ایک جگہ فرمایا فلما تجلے ربہ للجبل جعلہ دکا - یعنی تجلّی الٰہی سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا - اللہ تعالیٰ کی تجلیات جیسے انسان پر ہوتی ہیں - اسکی دوسری مخلوق پر بھی ہوتی ہیں - دوسرے ایسی باتوں کو بیجان چیزوں کی طرف منسوب کرنے سے ایک حالت کا اظہار مقصود ہوتا ہے - چنانچہ ایک جگہ فرماتا ہے - جدارا یرید ان ینقض یعنی ایک دیوار جو گر جانے کا ارادہ کرتی تھی یعنی اس کی حالت ایسی تھی - کہ وہ گرنے کو تھی - اسیطرح پر جب پہاڑوں پر زلزلے آتے ہیں - اور پتھر گرتے ہیں - تو اُن کے گرنے کی حالت ایسی ہوتی ہے - جس میں خشیۃ اللہ کا رنگ نظر آتا ہے - اور یا یہ مراد ہے - کہ ایسے اوقات میں انسانوں کے دلوں پر بھی خشیۃ اللہ غالب آجاتی ہے - پس جو حالت پتھروں کے گرنے سے انسانوں کے دلوں پر طاری ہوتی ہے

نہیں ہے۔ یہاں دو ضمیریں ہیں۔ ایک مذکر اضربوہ میں ضمیر ہ اور دوسری مؤنث جو ببعضھا میں ہے۔ اس سے پہلی آیت میں یہی ضمیر ھا فادرئتم فیھا میں واقع ہوئی ہے۔ اور وہاں یہ ضمیر اس فعل قتل کی طرف جاتی ہے۔ جو اذ قتلتم نفسا سے مفہوم ہوتا ہے بعض تفسیروں میں بھی اس ضمیر کا فعل قتل کی طرف جانا تسلیم کیا ہے۔ دیکھو تفسیر بحر المحیط۔ الضمیر عائد علی النفس وقیل علے القتلۃ فیعود علی المصدر المفھوم من الفعل۔ پس ببعضھا میں ھا کی ضمیر اسی فعل قتل کی طرف جاتی ہے۔ اور ہ کی ضمیر نفس کی طرف ہے۔ اور ضرب کے معنے مارنے کے بھی آتے ہیں۔ اور مثال دینے یا مشابہ کرنے کے بھی جیسے فرمایا۔ کذالک یضرب اللہ الحق والباطل۔ تو اضربوہ ببعضھا کے معنے یہ ہوئے۔ کہ اسے بعض قتل سے مارو۔ یا بعض قتل سے مشابہ کردو۔ اور یہ دونوں معنے اس تفصیل کے ساتھ چسپاں ہیں۔ جو سورت نساء میں مذکور ہے۔ وہاں بھی شبہ لھم فرما کر یہ بتایا ہے۔ کہ مقتول کے ساتھ مشابہ کیا گیا تھا۔ یہاں بھی یہی فرمایا کہ اسے مقتول کے ساتھ مشابہ کردو یا پورا قتل اس پر وارد نہ ہونے دو۔ بلکہ بعض قتل وارد ہونے دو۔ فقلنا میں حکم ان ملائکہ کو ہے جن کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کے احکام نفاذ پاتے ہیں۔ یعنی اُن کو حکم دیا گیا۔ کہ مسیح علیہ السلام پر پورا قتل وارد نہ ہونے دو۔ بلکہ کچھ حصہ قتل کا وارد ہونے دو یا مشابہ بالمقتول کردو۔ اور انجیل میں جو واقعات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صلیب کے مندرج ہیں۔ ان پر یہ حکم الٰہی نہایت صفائی سے منطبق ہوتا ہے۔ کیونکہ حضرت عیسےٰ اور ان کے ساتھ جو دو اَور مصلوب تھے۔ انھیں جب چند گھنٹے کے بعد صلیب سے اُتار لیا گیا۔ کیونکہ اگلا دن متبرک ہونے کی وجہ سے کوئی شخص صلیب پر لٹکا نہ رکھا جا سکتا تھا۔ تو حضرت عیسےٰ کے ساتھیوں کی ٹانگیں تو توڑ دی گئیں۔ مگر حضرت مسیح کی ٹانگیں نہیں توڑی گئیں۔ اور درحقیقت صلیب کی موت یا تو تین دن تک بھوک پیاس اور تشنج سے صلیب کے اُوپر لٹکا رہنے سے واقع ہوتی تھی۔ یا اگر جلد اُتارنا پڑے تو اُتار کر ہڈیاں توڑی جاتی تھیں۔ اب حضرت مسیح چند گھنٹے صلیب پر رہے۔ مگر قتل کو کامل طور پر وارد کرنے کے لئے جو ہڈیاں توڑنی ضروری تھیں۔ وہ بات وقوع میں نہیں آئی۔ اور اس طرح قتل صلیب کا ایک حصہ ان پر وارد ہوا اور دوسرا نہیں۔ جس سے قرآن کریم کے الفاظ اضربوہ ببعضھا کی صداقت روشن ہے۔ جو کچھ اس وقت ان الفاظ کے معانی مجھے سمجھ میں آئے ہیں لکھ دیئے ہیں۔ شاید

ان کتابوں میں ہدایت اور نور کا ہونا بھی قرآن کریم نے تسلیم کیا ہے سو اس میں کیا شک ہے۔ کہ اوّل تو اُن کی پیشگوئیوں میں ہی ہدایت اور نور ہے۔ اور دوسرے اُن کے اندر اور بھی بہت سی صداقت کی باتیں موجود ہیں۔ سو جہاں ان دونوں کے متعلّق فیھا ھُدی ونورا کے لفظ فرما کر یہ ظاہر کیا۔ کہ ان میں ایک حصّہ ہدایت اور نور کا پیشگوئیوں کے رنگ میں ہے دوسری طرف ان میں صداقتوں کے ہونے سے انکار نہیں کیا مگر ہماری پاک کتاب سراسر ہدایت اور نور ہی ہے۔ ہاں ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دوسرے لوگوں کی طرح یہ تنگدلی نہیں دکھائی۔ کہ وہ کسی کی کسی خوبی کو بھی تسلیم نہ کرتے۔ بلکہ اُن کو یہاں تک اجازت دی۔ کہ تم اپنے اپنے مذاہب پر ہی رہ کر اُنکی تعلیم پر عملدرآمد کرو۔ تاکہ کچھ تو نیکی کے حقدار بنو۔ یہ گویا درحقیقت مذہبی آزادی کی بُنیاد رکھی تھی۔ جس کیلئے اہل کتاب کو اس کتاب کا ممنونِ احسان ہونا چاہیئے تھا۔ نہ یہ کہ اس سے اُلٹا نتیجہ نکال کر یہ کہتے۔ کہ اب گویا قرآن کریم ہی کوئی شے نہیں۔ کیونکہ ہمارے اندر بھی بعض خوبیوں کا ہونا تسلیم کرتا ہے۔ اور ہمیں اپنا مذہب رکھنے کی آزادی دیتا ہے +



۱۳۸۔ اتحدّثونھم بما فتح اللہ علیکم۔ یعنی وہ پیشگوئیاں جن کا علم تم کو ہے۔ تم اُن کا ذکر مُسلمانوں سے کیوں کرتے ہو۔ کیونکہ اس کا نتیجہ تو یہ ہوگا۔ کہ وہ اُن کے ذریعہ سے تمہارے ربّ کے نزدیک حُجّت پکڑینگے۔ درحقیقت دل تو اُن لوگوں کا چور تھا۔ جانتے تھے کہ وہ پیشگوئیاں ایسی صاف اور صریح حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوّت پر شاہد ہیں۔ کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ میں ایک حُجّت کا کام دے سکتی ہیں۔ اس لیئے اپنے جاہل معتقدین سے کہتے تھے۔ کہ تم مُسلمانوں سے ان کا ذکر نہ کیا کرو۔ اس کا جواب اگلی آیت میں دیا ہے۔ اولا یعلمون ان اللہ یعلم ما یُسرّون وما یعلنون۔ یعنی اگر درحقیقت وہ پیشگوئیاں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر شاہد ہیں تو یہ کہنا کہ مُسلمانوں کو یہ نہ بتایا کرو محض حماقت ہے۔ کیونکہ اگر وہ نبی سچّا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور اسکو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی علم ملتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تو ظاہر اور چُھپی دونوں باتوں کو جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے وہ کس طرح چھپالیں گے۔ پس ان کا ظاہر کرنا نہ کرنا برابر ہے۔ اور درحقیقت اللہ تعالیٰ تو اس کا اظہار نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مدینہ آنے سے مُدّت پہلے بلکہ اوائل میں ہی فرما چکا تھا۔ جب آپ پر وحی ابتداً ابھی ہی سورت مُزمّل میں اُتاری تھی۔ انا ارسلنا الیکم رسولا شاھدًا علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولا۔

اُس کو بتھروں کی طرف منسوب کردیا ہے ✦

۷۵ ۱۳۷۔ ثُمَّ یُحَرِّفُونَهٗ ۔ توریت یا دیگر کُتب انبیاء میں جن کا مجموعہ کتاب یا بائبل کہلاتا ہے ۔ تحریف کا واقع ہونا ایک ایسا بیّن امر ہے ۔ کہ آج اس پر ہمیں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ۔ خُود عیسائی محققین نے اسبات کو تسلیم کرلیا ہے ۔ کہ ان کتابوں میں بہت کچھ تحریف لفظی بھی ہوئی ہے ۔ اور تحریف معنوی بھی صحیح ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن کریم نے لفظ تحریف کا عام طور پر استعمال کیا ہے ۔ جس کے اندر تحریف لفظی اور تحریف معنوی دونوں آجاتے ہیں ۔ اور جب دونوں باتوں کا وقوع ثابت ہو تو تحریف کے لفظ میں دونوں مُراد لیجائینگی ۔ پُرانے عہد نامہ کی تحریف تو اسی حد تک تھی ۔ مگر انجیل کی تحریف تو اس سے بھی آگے بڑھ گئی ۔ اصل انجیل دُنیا سے نابُود ہوگئی ۔ اور ہمارے سامنے جو اناجیل اس وقت پیش کیجاتی ہیں ۔ ان میں کچھ کچھ اقوال حضرت مسیح علیہ السلام کے رہ گئے ہیں ۔ جن کو ان کے بعض حواریوں یا مُریدوں نے مُدّت بعد اِکٹھا کیا ۔ اسبات کو آج عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے ۔ کہ متی مرقس اور لوقا کی انجیلیں غالبًا ایک ہی اصل سے لی گئی ہیں جو مفقوُد ہے ۔ اب جو مسلمانوں پر سوال کیا جاتا ہے ۔ کہ اگر اصل حالت میں توریت اور انجیل موجود نہ تھیں ۔ تو قرآن کریم نے انکی تصدیق کس طرح کی ۔ اور اہلِ توریت اور انجیل کو کیوں کہا جاتا تھا کہ تم توریت اور انجیل پر عمل کرو ۔ اور کہ خود ان کتابوں کا نام وہی رکھنے سے جو یہود اور عیسائیوں میں مُروّج تھا پایا جاتا ہے ۔ کہ انہی کتابوں کو صحیح تسلیم کرلیا گیا ہے ۔ کیونکہ اور کسی توریت یا انجیل کا وجود نہیں پایا جاتا ۔ سو اصل بات یہ ہے ۔ کہ تصدیق کے معنے یہ تو ہو نہیں سکتے ۔ کہ جو کچھ ان کے اندر ہے اسکو صحیح تسلیم کرلیا ہے ۔ بلکہ تصدیق کا اصلی مطلب تو وہی ہے جو نوٹ ۹۲ میں بیان ہوچکا ہے ۔ اور علاوہ بریں اصل اصوُل تو ایک ہی ہیں ۔ باقی رہا توریت اور انجیل پر عمل کرنے کا سوال ۔ سو وہ تو ایک اقل درجہ کا مطالبہ ہے ۔ جیسا کہ فرمایا قل یا اهل الکتاب لستم علی شئی حتی تقیموا التوراۃ والانجیل ۔ یعنی تمہارا دعویٰ تو یہ ہے ۔ کہ ہم توریت اور انجیل پر عامل ہیں ۔ مگر درحقیقت تم ان پر بھی عمل نہیں کرتے ۔ جب تک تُم ان پر بھی عمل کرکے نہ دکھاؤ ۔ تو یہ سب نری لاف و گزاف ہے ۔ چُونکہ ان کتابوں میں ایک حصّہ کلام الٰہی کا اور بالخصوص پیشگوئیوں کا محفوُظ بھی چلا آتا ہے ۔ اس لیئے ان کا وہی نام بیان فرمایا جو تھا ۔ کسی کتاب یا کلام میں تحریف ہوجانے سے اس کا نام بدل دینے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ ہاں

کے عوض میں تین دن تک دوزخ میں رہنا تسلیم کر کے خود ہمیشہ کے لئے چھٹکارا
پایا - اب کتنا ہی گنہگار عیسائی ہو کفارہ پر ایمان لے آئے تو بس کافی ہے -
ساری بدیوں کے نتائج سے محفوظ رہیگا - اور محض ایک اتنی بات کو مان لینے سے کہ
ایک شخص مصلوب ہو کر ہمارے گناہ لے گیا - اللہ تعالیٰ کے سارے قانون اعمال
اور اُن کے نتائج کے متعلق باطل قرار دیئے - اسلام نے اُن غلطیوں کو دُور کیا
مگر آج کل مسلمانوں کی یہ حالت ہے - کہ کثیر حصہ اپنی جہالت کی وجہ سے یہ سمجھے ہوئے
ہے - کہ وہ اپنے پیروں کے پیچھے لگ کر بہشت میں جا داخل ہونگے - حالانکہ
اللہ تعالیٰ کا کوئی ایسا حکم نہ ایک قوم کے ہاتھ میں ہے نہ دوسری کے +

۸۱ ۱۴۳ - بلٰے من کسب سیئۃ و احاطت بہ خطیئتہ - غلط خیالات کی تردید کر کے
اپنا قانون بیان فرمایا - کہ کوئی بھی ہو جب بدی کماتا ہے - یعنی جب بدی کے
پیچھے ہی لگ جاتا ہے - اور اپنے قوئے کو بدی کی طرف ہی لگا دیتا ہے - تو پھر
اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے - کہ اُس کی خطائیں سب طرف سے اسے گھیر لیتی ہیں
کیونکہ وہ خود اپنے لئے کوئی نکلنے کی راہ نہیں چھوڑتا - تو یہی اُس کی بدکاریاں
قیامت کے دن کھلے کھلے طور پر آگ بن جاتی ہیں - جو شخص بدی کے مقابلہ کی
کوشش کرتا ہے - اس سے اگر بدی کا ارتکاب بھی ہو جائے تو بھی احاطت بہ
خطیئتہ کا مصداق نہیں ہوتا - بلکہ وہ اس جد و جہد میں آخر بدی پر غالب آجاتا
ہے +

رکوع ۱۰ ۸۳ ۱۴۴ - و اذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل - معمولی طور پر سمجھا کر اب اُن کے معاہدات اُن کو
یاد دلاتا ہے - جس قدر احکام الٰہی بنی اسرائیل کو حضرت موسےٰ علیہ السلام کی معرفت
دیئے گئے - وہ سب میثاق میں داخل ہیں - انہی میں سب سے پہلا حکم یہ تھا - کہ
اللہ کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرنا - جس کو بار بار توریت میں بیان کیا گیا ہے
اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ دوسرا حکم اس کی مخلوق کے ساتھ احسان کا ہے جنمیں
سب سے پہلے والدین کا ذکر فرمایا کیونکہ وہ بھی ایک حد تک انسان کی ربوبیت میں
معاون ہوتے ہیں - للناس حسنا پر ختم کیا - یعنی سب لوگوں کو نیک باتیں کہو
یا اُن سے نیکی کرو - قول کے مختلف معانی کے لئے دیکھو نوٹ ۴۲ - توریت کے
مختلف مقامات کے لئے جن میں یہ احکام دیئے گئے ہیں - دیکھو خروج ۲۰ : ۳
(ایک خدا کی عبادت) خروج ۲۰ : ۱۲ (ماں باپ کی عزت) استثنا ۵ : ۱۰ (ذوی القربیٰ

آیت ۷۹

یعنی یہ رسُول تو اُس رسُول کا مثیل ہے۔ جو فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا۔ اور اِس طرح پر حضرت موسیٰ سے مماثلت جو ان پیشگوئیوں کی اصلی جان تھی۔ اُس کا اظہار تو مُدّت پہلے ہوچکا تھا +

۷۸ ۱۳۹۔ امانی۔ یہ لفظ امنیۃ کی جمع ہے جس کے مشہور معنی آرزو کے ہیں یعنی اپنے اندر ایک تصوّر پیدا کر لینا۔ اور چونکہ کذب یعنی جھوٹ بھی ایک تصوّر کا باندھ لینا ہوتا ہے۔ جس کی حقیقت کوئی نہ ہو۔ اِسلیئے امنیۃ کے معنی جھوٹ کے بھی ہوگئے ہیں۔ چنانچہ مجاہد نے یہاں یہی معنے اختیار کیئے ہیں۔ کہ وہ کتاب تو کچھ جانتے نہیں۔ ہاں جھُوٹ جانتے ہیں۔ جس کو وہ کتاب کا حصّہ ہی سمجھتے ہیں۔ اور بعض نے اُس کے معنے کیئے ہیں۔ اس طرح پر پڑھنا کہ معنے کچھ نہ سمجھیں۔ کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی آرزو ہوتی ہے۔ اور حقیقت اس پڑھنے کے نیچے کچھ نہیں۔ اس سے مُسلمانوں کو بھی یہ سبق لینا چاہیئے۔ کہ انہیں قرآن کریم کے اور نماز کے معنے سیکھنے کی کس قدر ضرورت ہے +

۷۹ ۱۴۰۔ یکتبون الکتاب بایدیھم۔ کتابت تو انسان ہاتھ سے ہی کرتا ہے۔ مُراد یہ ہے کہ خدا کی کتاب کی بجائے اپنی طرف سے کچھ لکھ کر کہتے ہیں۔ کہ یہ خُدا کا کلام ہے چُنانچہ ثم یقولون ھذا من عند اللہ میں اس کو کھول دیا ہے۔ یعنی اپنی طرف سے کچھ باتیں لکھ کر کہدیتے ہیں۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے مُسلمانوں میں بھی یہ بیماری ایک رنگ میں موجُود ہے۔ بہت سی اپنی تجویز کردہ باتوں کو اللہ تعالےٰ کے کلام کی طرف منسوب کرتے ہیں +

۱۴۱ ثمناً قلیلا سے مُراد دُنیا ہے۔ کیُونکہ اسی دُنیا کے مال اور دُنیوی وجاہت کی خاطر حق کو قبُول کرنے سے اِنسان رُکتا ہے۔ اور حق میں جھُوٹ کی ملاوٹ کرتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا۔ قل متاع الدنیا قلیل۔ یعنی دُنیا کا سارا سامان درحقیقت ایک تھوڑی سی اور حقیر شے ہے +

۸۰ ۱۴۲۔ ایاما معدودۃ۔ گنتی کے دن یعنی تھوڑے دن۔ لکھا ہے کہ یہُودی کہتے تھے۔ ہم کو صرف چالیس دن عذاب ہوگا۔ اور بعض کہتے تھے سات دن سیل لکھتا ہے کہ یہُودیوں میں یہ ایک مُسلّم بات ہے۔ کہ کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی بدکار کیوں نہ ہو گیارہ ماہ یا ایک سال سے زیادہ دوزخ میں نہ رہیگا۔ عیسائیوں نے تو اَور بھی کمال کر دیا۔ کہ حضرت مسیح علیہ السّلام کا ساری دُنیا یا کفّارہ پر ایمان لانے والی دُنیا

مدینہ میں خزرج اور اوس دو بڑی قومیں تھیں۔ جن کی باہم جنگ رہتی تھی۔ اور یہودیوں کی دو بڑی قوموں میں سے ایک یعنی نضیر خزرج کے حلیف بن گئے تھے اور دوسرے یعنی قریظہ اوس کے۔ پس جب خزرج اور اوس میں باہم جنگ ہوتی تھی۔ تو یہ یہودی بھی ان قوموں کے ساتھ ملکر اپنے بھائی بندوں سے جنگ کرتے انھیں قتل کرتے اور گھروں سے نکلواتے۔ لیکن جب جنگ ختم ہوجاتی تو جو یہودیوں کے قیدی غالب فریق کے ہاتھ آتے اُن کے چھڑوانے میں پھر دونوں یہودی قومیں یعنی نضیر اور قریظہ برابر حصّہ لیتے۔ اسی لیئے فرمایا۔ وان یاتوکم اسارٰی تفادوھم۔ یعنی جب قید ہوکر آتے ہیں۔ تو پھر ان کا فدیہ دیتے ہو۔ حالانکہ پہلے خود ہی ان کے قتل اور قید کرنے میں مُعاون ہوتے ہو۔ حالانکہ اگر دوسرے حکم کی تعمیل ضرُوری سمجھتے تھے۔ تو پہلے حکم کی تعمیل کرکے ایکدوسرے کے قتل کرنے یا کرانے سے ہی کیوں نہ رُکتے تھے +

اور اگر اشارہ اس معاہدہ کی طرف ہے جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ہؤا تو آیندہ واقعات کی طرف اشارہ بطور پیشگوئی ہے۔ کہ اس معاہدہ کے باوجود پھر اسی قوم کے قتل کرانے اور اخراج میں تم لوگ مُعاون بنوگے۔ جن کے ساتھ یہ عہد کیا ہے۔ کہ ہم اور تم ایک قوم ہیں۔ اور تمہارے دشمنوں سے ہم جنگ کرینگے۔ چنانچہ یہودیوں نے اس مُعاہدہ کی خلاف ورزی کی۔ اور کفّار کو مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ اُکساتے رہے۔ بلکہ ہر قسم کی خبریں اُنھیں پہنچاتے اور خود مسلمانوں کے اُوپر اُن کو چڑھا کر لاتے اور اندر سے وقت پر اُن کی امداد کا وعدہ کرتے۔ اس صُورت میں ان یاتوکم اُسارٰی تفادوھم میں اشارہ معاہدہ کی طرف ہوگا۔ یعنی اس معاہدہ کی رُو سے تم اسبات کے پابند ہو۔ کہ مُسلمانوں کے ساتھ ملکر ایسی صُورت میں روپیہ خرچ کرو +

۱۴۷۔ فما جزاء من یفعل ذٰلک منکم الا خزیٌ فی الحیٰوۃ الدُّنیا ویوم القیامۃ یردون الیٰ اشد العذاب۔ قرآن کریم نے بارہا اپنے ان وعدوں اور وعیدوں کی صداقت کا جو دوسری زندگی کے مُتعلق ہیں یہ ثبوت دیا ہے۔ کہ اس دُنیا میں بھی کچھ وعدے اور وعید دیئے ہیں۔ جن کے پُورا ہونے سے دوسری زندگی کے متعلق وعدہ وعید کا یقین ہوسکتا ہے۔ یہی صُورت یہاں بھی فرمائی۔ کہ اگر تم ایسا کروگے تو نتیجہ پہلے تو اسی دُنیا کی زندگی میں دیکھ لوگے۔ کہ یہاں رُسوائی اور ذلّت ہوگی۔ چنانچہ اس

مساکین کی مدد) استثناء ۱۴: ۲۸ و ۲۹ (یتامٰے۔ عام لوگوں سے احسان) ✢

۸۴ ۱۴۵۔ و اذ اخذنا میثاقکم لا تسفکون دماءکم ولا تخرجون انفسکم من دیارکم۔ پہلے معاہدہ میں عام طور پر نیکیوں کا ذکر فرما کر ایک اور معاہدہ کا ذکر کیا۔ کہ آپس میں امن قائم رکھنا۔ ایک دوسرے کی جائداد مکانات کا لالچ نہ کرنا (خروج ۲۰: ۱۷) یا اس معاہدہ کی طرف اشارہ ہے۔ جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف آوری پر یہود اور مسلمانوں کے درمیان ہؤا۔ جس کے رُو سے یہود نے اقرار کیا کہ وہ مسلمانوں کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھیں گے۔ اس معاہدہ کے چند فقرات ابن ہشام سے نقل کیئے جاتے ہیں"۔ ھذا کتاب من محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین المومنین والمسلمین من قریش و یثرب ومن تبعھم فلحق بھم وجاھد معھم انھم امۃ واحدۃ من دون الناس .... وان یھود امۃ مع المومنین للیھود دینھم وللمسلمین دینھم ... وان بینھم النصر علی من حارب اھل ھذہ الصحیفۃ ... وان الیھود ینفقون مع المومنین ما داموا محاربین وان یثرب حرام جوفھا لاھل ھذہ الصحیفۃ ... وانہ ماکان بین اھل ھذہ الصحیفۃ من حدث او اشتجار یخاف فسادہ فان مردہ الی اللہ والی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان فقرات کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ یہ ایک مُعاہدہ ہے۔ محمد النبی صلے اللہ علیہ وسلم سے قریش اور اہل یثرب (مدینہ) کے مومنوں مُسلمانوں کے درمیان اور جو کوئی اُن کے پیچھے آئے اور ان سے ملجائے۔ اور ان کے ساتھ ملکر کوشش کرے۔ کہ وہ سب ایک قوم کے حکم میں ہیں ...... اور کہ یہود بھی مومنوں کے ساتھ ایک قوم کے حکم میں ہیں۔ یہودی اپنے دین پر رہینگے۔ اور مسلمان اپنے دین پر ... جو شخص اس معاہدہ والوں سے جنگ کریگا۔ اس کے مقابل وہ ایک دوسرے کی مدد کرینگے۔ اور کہ یہودی مومنوں کے ساتھ ملکر خرچ کرینگے۔ جب تک وہ جنگ کریں۔ اور کہ یثرب (مدینہ) کا اندر ان کے درمیان محترم ہو گا (یعنی کسی قسم کی خونریزی مدینہ کے اندر ایک دوسرے کی نہیں کرینگے۔ نہ ایک دوسرے کے مال کو لیں گے۔ یا اُسے کسی قسم کا دُکھ پہنچائیں گے) اور کہ اس مُعاہدہ کے فریقوں میں اگر باہم کوئی جھگڑا یا فساد ہو جائے۔ تو وہ اللہ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹایا جائیگا ✢

۸۵ ۱۴۶۔ ثم انتم ھٰؤلاء تقتلون انفسکم و تخرجون فریقا منکم من دیارھم ...

۸۸ پردہ یا غلاف کے اندر ہو۔ یہ گویا درحقیقت اپنے مکرم معظم ہونیکی طرف اشارہ تھا تکبّر کی راہ سے کہتے تھے۔ کہ ہمارے دلوں پر تمہاری بات کا اثر نہیں ہو سکتا۔ فرمایا۔ بلکہ اصل بات تو یہ ہے۔ کہ لعنھم اللہ بکفرھم کہ کفر کی وجہ سے وہ رحمت الٰہی سے دُور جا پڑے ہیں۔ اور اسلیئے اب ان کے دل حق بات کو قبول نہیں کرتے۔ یا غُلْف غلاف کی جمع ہے۔ اور مُراد یہ ہے۔ کہ ہمارے دل علم اور حکمت سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہم تمہاری باتوں کی کیا پروا کرتے ہیں۔ فرحوا بما عندھم من العلم کا مصداق ہو گئے۔ لعن کے معنے ہیں۔ اطرد و ابعدہ عن الخیر یعنی نیکی سے اور خیر و برکت سے دور کرنے کا نام لعنت ہے۔ انہی معنوں میں قرآن شریف میں یہ لفظ استعمال ہؤا ہے۔ پھر یہ لعنت بعض وقت اس دُنیا میں ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے یہود کیحالت میں کہ وہ ایک ملک سے دوسرے میں اور دوسرے سے تیسرے میں نکالے جاتے اور کامل ظہور اس کا یوم آخر میں ہوگا۔ کہ ہر قسم کی خیر و برکت سے محروم کیئے جائیں گے ✤

۸۹ ۱۵۱۔ کانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا۔ یعنی اس رسول کے ذریعے جس کے وہ انتظار میں تھے کُفّار پر غالب آنے کی خواہش کیا کرتے تھے۔ استثناء ۲۸: ۱۲ میں اُن کو یہ وعدہ دیا گیا تھا۔ کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی آواز کو سُنینگے۔ تو اُنھیں دُنیا کی سب قوموں پر غالب اور سب میں ممتاز کیا جائیگا۔ اور استثناء ۱۸: ۱۵۔ ۱۸ میں یہ واضح کیا گیا ہے۔ کہ اس موعُود نبی کو قبول کرنا ہی اللہ تعالیٰ کی آواز کو سُننا ہے۔ پس وہ اپنی ساری کامیابیوں اور دوسری قوموں پر غلبہ کو موعُود نبی کے آنے کے ساتھ وابستہ سمجھتے تھے۔ اور اسی لیئے دُعائیں کیا کرتے تھے۔ کہ خُدایا تو اس موعُود نبی کو مبعُوث فرما۔ اسی لیئے قرآن کریم نے پہلے یہ فرما کر کہ لما جاء ھم کتاب من عند اللہ مصدق لما معھم۔ جب وہ پہلی پیشگوئیوں کو سچ کر دکھانے والی کتاب آگئی۔ پھر اُن کو یاد دلایا ہے۔ کہ تُم وہی قوم ہو جو دُعائیں مانگا کرتے تھے۔ کہ وہ نبی آئے۔ تاکہ ہماری ذِلّت کے دن ختم ہوں ✤

۱۵۲۔ فلما جاء ھم ما عرفوا کفروا بہ۔ قرآن کریم نے بار بار یہ فرمایا ہے۔ کہ یہُود اور اہل کتاب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے تھے۔ یعنی اسبات کو جانتے تھے۔ کہ درحقیقت یہی نبی ان پیشگوئیوں کا مصداق ہے۔ یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم۔ مگر باایں آپ کو قبول کرنے سے اِنکار کرتے تھے۔ آج عیسائی اِس بات کا اِنکار کرتے ہیں۔ اور نہ صرف خود ہی کرتے ہیں۔ بلکہ ایسے موقعہ پر یہودیوں کے بھی وکیل

آیت ۸۵

رسوائی کو اُنھوں نے اُٹھایا ۔ مگر جب اِنسان کی آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے ۔ تو پھر اُسے کچھ نظر نہیں آتا ۔ اِس صریح اور بیّن نشان سے جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ان کو دیا گیا تھا ۔ اُنھوں نے کچھ فائدہ نہ اُٹھایا ۔ بلکہ کفر پر ہی اصرار کیا ۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم بہت مُدّت تک ان کی شرارتوں پر درگذر سے کام لیتے رہے ۔ مگر آخر بنی نضیر کو اخراج اور بنی قریظہ کے جنگی آدمیوں کو قتل کرنے کا حُکم دینا پڑا ۔

رکوع ۱۱ ۱۱

۸۷ ۱۴۸ ۔ وآتینا عیسی ابن مریم البینٰت وایّدنٰہ برُوح القدس ۔ حضرت موسیٰ اور آپ کے بعد جو رسُول آئے اُن کا اور پھر اسرائیلی سلسلہ میں آخری رسُول حضرت عیسیٰ بن مریم کا ذکر کرکے یہ بتایا ۔ کہ یہودی ایک شریر قوم ہے ۔ پہلے اپنے نبیوں سے بھی ایسا ہی سلوک کرتے رہے ہیں ۔ جس طرح اب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کر رہے ہیں حضرت مسیح علیہ السّلام کے متعلق جو کچھ ذکر آجائے لوگ اُسے عجُوبہ بنانے کے درپے ہوتے ہیں ۔ البیّنات کھُلے دلائل کو کہتے ہیں ۔ یہ البیّنات حضرت مسیح کو دیئے گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی دیئے گئے ۔ ولقدجاءکم موسیٰ بالبیّنات ۔ بلکہ سب رسُولوں کو دیئے گئے ۔ قل قد جاءکم رسل من قبلی بالبیّنات ۔

رُوح القُدس سے بعض کے نزدیک مُراد جبرئیل علیہ السّلام ہیں ۔ جو انبیاء پر وحی لاتے ہیں ۔ یا خود وہ وحی مُراد ہے ۔ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام پر انجیل کا آنا مُراد ہے ۔ قرآن کریم کو بھی رُوح فرمایا ہے ۔ وکذٰلک اوحینا الیک رُوحًا من امرنا ۔ یعنی اسی طرح ہم نے اپنے امر سے ایک رُوح تیری طرف وحی کی ہے ۔ کلام الٰہی کو رُوح اِسلیئے کہتے ہیں ۔ کہ وہ بھی لوگوں کو زندگی بخشتی ہے ۔ بلکہ وہی حقیقی زندگی کا سرچشمہ ہے ۔ قرآن کریم میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق فرمایا ۔ وایدھم بروح منہ کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی رُوح کے ساتھ اُن کی تائید فرمائی ۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت کے لیئے بھی یہ دُعائیہ کلمہ فرمایا ۔ وروح القدس معک ۔ یعنی رُوح القدس تیرے ساتھ ہو ۔

۱۴۹ ۔ فریقًا تقتلون ۔ یہاں بجائے ماضی کے جو فریقًا کذّبتم میں استعمال کیا ۔ مضارع کا صیغہ تقتلون استعمال کیا ہے ۔ اس میں یہُود کے اُن منصُوبوں کی طرف اشارہ ہے ۔ جو وہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے قتل کے لیئے کر رہے تھے ۔

۸۸ ۱۵۰ ۔ قالوا قلوبنا غلف ۔ غُلفٌ ۔ اَغلَف کی جمع ہے ۔ جس کے معنے ہیں وہ چیز جو

۹۰ ۱۵۳ - بغیاان ینزل اللہ من فضلہٖ علیٰ من یشاء : پچھلی آیت میں یہ بتایا تھا - کہ یہود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو شناخت کر چکے ہیں - مگر پھر بھی اِنکار کرتے ہیں اِس انکار کی وجہ اس آیت میں بتائی - کہ صرف اُن کو حسد ہے - کہ اللہ تعالیٰ نے کسی دوسری قوم پر کیوں اپنے فضل کو نازل کیا - یعنی بنی اسرائیل میں سے کیوں یہ نبی نہیں آیا یہی ایک بات تھی کہ جس کی وجہ سے اُنھوں نے اِس قدر کھلے دلائل کی پروانہ کی - یہی معنے اُن کے اس قول کے ہیں جو اگلی آیت میں مذکور ہے - نؤمن بما انزل علینا یعنی جو بنی اسرائیل پر اُترا ہے ہم اُس پر ایمان لاتے ہیں +

۹۱ ۱۵۴ - وھوالحق مصدقالما معھم - یہ پہلا جواب اُن کے اس اعتراض کا ہے - کہ ہم پر کیوں نہیں اُترا - فرمایا وہ تو تمہاری ہی پیشگوئیوں کی تصدیق کر رہا ہے +

۱۵۵ فلم تقتلون انبیاء اللہ من قبل - یہ دوسرا جواب اُن کے اعتراض کا ہے - فرمایا - تم یہ کہنے میں بھی جھوٹے ہو - کہ نؤمن بما انزل علینا - کیونکہ اس سے پہلے تم اپنے نبیوں کو بھی تو قتل کرتے رہے ہو +

۹۳ ۱۵۶ - قالوا سمعنا وعصینا - اس جُملہ کے معنے یا تو یہ ہیں کہ اُنھوں نے کہا کہ ہم نے تمہاری بات سُن لی - لیکن تمہارے حکم کی نافرمانی کرتے ہیں - اور یا یہ کہ مُنہ سے کہا ہم نے سُن لیا - مگر دل سے نافرمانی کی - کیونکہ قول کا لفظ مجازاً وہاں بھی بولا جاتا ہے جہاں کسی چیز کی حالت سے کسی امر کا اِظہار کرنا ہو - گو نُطق کی کیفیت موجود نہ ہو - جس کے لئے دیکھو نوٹ ۶۲ +

۱۵۷ - واشربوا فی قلوبھم العجل - ان الفاظ کے معنے تو صرف اِسی قدر ہیں - کہ بچھڑے کی محبّت اُن کے دلوں میں رچ گئی تھی - چونکہ دلوں میں شرک تھا - اِس لئے احکام الٰہی کی عظمت نہ رہی - مگر توریت میں لکھا ہے "اور اُس نے اُس بچھڑے کو جسے اُنھوں نے بنایا تھا لیا - اور اُس کو آگ سے جلایا - اور پیس کر خاک سا بنایا - اور اُس کو پانی پر چھڑک کر بنی اسرائیل کو پلایا" خروج ۳۲ : ۲۰ - قرآن کریم میں سُورۂ طٰہٰ میں فرمایا - کہ اس کو جلا کر اُس کی خاکستر کو دریا میں ڈالدیا تھا +

۹۴ ۱۵۸ - فتمنوا الموت - یہاں یہود کو کہا ہے تمنوا الموت - سُورۂ آل عمران میں نصاریٰ کو بھی اِسی قسم کے مُقابلہ کے لئے بُلایا ہے - قل تعالوا ندع ابناءنا وابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتھل فنجعل لعنۃ اللہ علی الکذبین - یعنے دونوں فریق اپنے اپنے بچّوں اور عورتوں اور مردوں کو بُلائیں - پھر نہایت عاجزی سے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کریں - کہ

بن جاتے ہیں ۔ کہ ان بیچاروں پر خواہ مخواہ الزام دیا گیا ہے ۔ کہ وہ پہچانتے تو تھے ۔ مگر انھوں نے عمداً انحراف کیا ۔ لیکن جب ہم واقعات پر نظر کرتے ہیں ۔ تو قرآن کریم اہل کتاب پر اس الزام کے دینے میں بالکل صادق نظر آتا ہے ۔ اور یہ صداقت اور بھی چمک اُٹھتی ہے ۔ جب ہم اس کا مقابلہ دوسرے انبیاء سے کرتے ہیں اوروں کو چھوڑ کر حضرت مسیح علیہ السلام کو ہی لے لو ۔ جو بیّنات کے ساتھ آئے تھے ۔ اُن کے پہچاننے میں کس قدر دُشواریاں یہود کو پیش آئی تھیں ۔ کیونکہ ملاکی نبی کی پیشگوئی میں مسیح کی شناخت کی صاف علامت یہ بتائی گئی تھی ۔ کہ اس سے پہلے ایلیا دوبارہ آئیگا ۔ اب ایلیا تو دوبارہ آتا نہیں ۔ بلکہ یہودیوں کو کہا جاتا ہے ۔ کہ یوحنا ایلیا ہے چاہو تو قبول کرلو ۔ کس قدر مشکلات کا سامنا ہے ۔ کہ پیشگوئی میں ایلیا کے دوبارہ آنے کا ذکر ہے ۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام اُس کی تاویل یہ کرتے ہیں ۔ کہ یوحنا ہی ایلیا ہے ۔ کیونکہ وہ ایلیا کے رنگ میں اور ایلیا کی خو بو کو لیکر آیا ہے ۔ اب اس کے بالمقابل دیکھو کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی آمد کی پیشگوئیاں کس صفائی سے پوری ہوتی ہیں ۔ یہود اور عیسائی دونوں کو اس بات کا اعتراف ہے کہ بنی اسرائیل کے سارے نبیوں میں موسیٰ سے لے کر عیسیٰ علیہم السلام تک کسی نبی نے استثناء ۱۸: ۱۵ و ۱۸ والی پیشگوئی کا جس میں موسےٰ کے مثل نبی آنے کا وعدہ دیا گیا تھا دعویٰ نہیں کیا ۔ اُدھر بنی اسرائیل کے سلسلہ میں نبوّت کا دروازہ بھی مسدود نظر آرہا ہے ۔ کیونکہ وہ قوم جس میں پے در پے نبی آتے تھے ۔ اب چھ سو برس گذر گئے نہ یہودی کسی نبی کا آنا مانتے ہیں نہ عیسائی ۔ دونوں معترف ہیں کہ موسےٰ کا موعود مثیل نہیں آیا ۔ دونوں مانتے ہیں کہ چھ سو برس اس قوم کے اندر نبوّت سے خالی گذر گیا ۔ جو اب بجائے خود ان کے اندر سے نبوّت کے فضل کے ختم ہو جانے پر شاہد ہے ۔ دونوں کو یہ بھی معلوم ہے ۔ کہ موسیٰ کا مثیل موسےٰ کا پیرو نہیں ہوسکتا ۔ دونوں یہ بھی مانتے ہیں کہ پیشگوئی میں بنی اسرائیل کے بھائیوں کا ذکر ہے ۔ یعنی بنی اسمٰعیل کا ۔ دونوں کو یہ بھی معلوم ہوچکا ہے ۔ کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کردیا ہے ۔ کہ آپ مثیل موسےٰ نبی ہیں ۔ اور یہ بھی کھولکر بتادیا ہے ۔ کہ تمہاری کتابوں میں جو پیشگوئیاں ہیں ان کا مصداق ہوں ۔ پس جس قدر صفائی سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس پیشگوئی کا مصداق ثابت ہوتے ہیں ۔ وہ ایک انسان کو جو تعصّب سے خالی ہوکر غور کرے یقین کے مرتبہ تک پہنچادیتی ہے +

۹۸　اور رسُولوں کا دشمن ہے۔ جبرئیل کا ذکر تو دوبارہ اسی خصوصیت کی وجہ سے کیا۔ اور میکال کا ذکر اسلیئے کیا۔ کہ یہود اُسے اپنا دوست سمجھتے تھے۔ دانیال ۱۲: ۱ میں میکال کے مُتعلق لکھا ہے "وہ بڑا سردار جو تیری قوم کے فرزندوں کی حمایت کے لیئے کھڑا ہے"۔ میکال کے ساتھ عداوت کا ذکر اس لیئے فرمایا۔ کہ اب اسے بھی اپنا دوست مت سمجھو۔ اور یہ خیال نہ کرو۔ کہ وہ تمہاری حمایت کے لیئے کھڑا ہوگا۔ کیونکہ اس وقت سب ملائکہ کو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمانبردار بنا یا گیا ہے +

بندہ کی عداوت اللہ تعالیٰ سے یہ ہے۔ کہ وہ اس کے احکام کو رد کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کی عداوت سے مُراد اُس سزا کا آنا ہے جو دُشمنوں کے لیئے ہوتی ہے۔ فان اللہ عدو للکافرین کا درحقیقت یہی منشاء ہے۔ کہ جو لوگ دشمن بنتے ہیں۔ پھر اُن سے دشمنوں والا ہی مُعاملہ ہوگا۔ یعنی اُس دشمنی کی سزا انہیں دی جائیگی۔ یہ بھی ویسی ہی مثال ہے۔ کہ ایک فعل کی سزا کا ذکر اُنہی الفاظ میں کر دیا گیا ہے۔ دیکھو نوٹ ۴۳

۱۰۲　۱۶۲- ما تتلوا الشیاطین علیٰ ملک سلیمٰن۔ اِس رکُوع میں یہُود کی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھتی ہُوئی عداوت کا ذکر ہے۔ جیسا کہ ابتدائی آیات رکُوع سے ظاہر ہے۔ اور اس آیت میں یعنی نمبر ۱۰۲ میں یہُود کے منصُوبوں اور کارروائیوں کا ذکر ہے۔ جو وہ خُفیہ طور پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف کرتے تھے۔ چنانچہ پچھلی آیت یعنی آیت ۱۰۱ میں اِس بات کا ذکر کیا۔ کہ جب وہ رسُول ساری پیشگوئیوں کی تصدیق کرنیوالا آگیا۔ تو ان بدبختوں نے اس پیشگوئی کو پسِ پُشت پھینک دیا۔ اور کتابُ اللہ نے جو معیار رسُول کی شناخت کا دیا تھا بجائے اس کے کہ اس کتاب اللہ کی پیروی کرتے اور رسُول کو قبُول کرتے شیطانی باتوں کی پیروی شروع کر دی۔ یہاں الشیاطین سے کون مُراد ہیں۔ مُفسّرین کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض کے نزدیک شیاطین الجن مُراد ہیں۔ بعض کے نزدیک شیاطین الانس یعنی یہی اِنسان جو شیطانی راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک خُود وہ یہُودی لوگ ہیں جنھوں نے طرح طرح کی باتیں حضرت سُلیمان کے متعلق گھڑلی تھیں۔ جن کی بنا پر وہ ہر قسم کی شرارتوں وغیرہ کو جو دوسروں کے خلاف کرنا چاہتے تھے جائز کر لیتے تھے۔ چنانچہ تتلوا الشیاطین علے ملک سلیمان سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں وہ معنے تو ہو نہیں سکتے۔ جو یتلوا علیھما یا تلہ میں ہو سکتے ہیں۔ یعنی دوسرے کو پڑھ کر سُنانا۔ کیونکہ شیطانوں نے مُلک سلیمان کو پڑھ کر کیا سُنانا تھا۔ یہاں تلا علیہ اسی

آیت ۹۴

جو فریق جھوٹ اختیار کر رہا ہے - اُس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت پڑے - پس یہی فتمنوا الموت کی تصریح ہے - چنانچہ حضرت ابن عباسؓ نے یہی معنے اِس آیت کے کیئے ہیں - ادعوا بالموت علی ای الفریقین اکذب - یعنی دونوں فریق میں سے جو جھوٹا ہے اُسکی موت مانگو - اِسی لیئے اگلی آیت میں فرمایا ولن یتمنوہ ابدًا بما قدّمت ایدیھم - یعنی ایسی تمنا نہیں کرینگے اِس وجہ سے جو اُن کے اپنے ہاتھ پہلے کر چکے ہیں - یعنی اپنی بدعملیوں کی وجہ سے جانتے ہیں - کہ اگر ہم نے ایسی دُعا کی تو اُس کا اثر تو ہم پر ہی پڑے گا +

۹۶

۱۵۹ - ومن الذین اشرکوا - یعنی مشرکوں سے بھی بڑھ کر دُنیا کی زندگی پر حریص ہیں - ہزار سال کی زندگی کی دُعا بالخصوص اہل فارس میں دی جاتی ہے - اور ہزار سال بزی کا فقرہ فارسی زبان میں مشہور ہے - لیکن عذاب الٰہی تو ایسی چیز ہے - کہ ہزار سال بھی زندہ رہیں - تو پھر بھی عذاب آخر آکر ہی رہیگا +

رکوع ۱۲/۱۲

۹۷

۱۶۰ - عدوا لجبریل - بخاری میں ہے - کہ جبر اور میک اور سراف کے معنے عبد یعنی بندہ کے ہیں - اور ایل کے معنے اللہ - پس جبریل اور میکال دونوں کے لفظی معنے عبد اللہ کے ہُوئے - اِس رکوع میں یہود کی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے عداوت کا ذکر ہے - پچھلے رکوع میں بتایا تھا - کہ وہ با وجود شناخت کرنیکے مانتے نہیں - یہاں بتایا کہ بات اسی حد تک نہیں - بلکہ وہ اور ترقی کر کے اب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہو گئے ہیں - تو یہ دشمنی اُن کی نبی کریم سے کیا ہے - یُوں کہو کہ جبرئیل سے دشمنی ہے - کیونکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے دشمنی محض اس وجہ سے ہے - کہ آپ پر کیوں وحی اُتری - مگر یہ تو وہ وحی ہے کہ جبرئیل کو دے کر اللہ تعالیٰ نے اُسے محمد رسُول اللہ صلے اللہ کے قلب مُبارک پر نازل کیا - یا جو جبرئیل نے آپ کے قلب پر اُتاری - پس درحقیقت جبرئیل سے دشمنی ہوئی - کہ اُس نے کیوں اس وحی کو بنی اسرائیل پر نہیں اُتارا اور بنی اسمٰعیل پر اُتارا ہے - ممکن ہے یہُودی یہی سمجھتے ہوں - کہ جبرئیل نے ہماری قوم سے عداوت کی ہے - اور وحی کو دوسرے پر اُتار دیا ہے - مصدقًا لما بین یدیہ و ھدی و بشریٰ کہکر اس وحی کی صداقت کو ظاہر فرمایا +

۹۸

۱۶۱ - من کان عدوًا للہ - جو شخص محمد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دشمن ہے - اسلیئے کہ اس پر وحی کیوں آئی - وہ نہ صرف جبرئیل کا دشمن ہے - بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے - کیونکہ جبرئیل تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت عمل کرتا ہے - اور پھر وہ سارے ملائکہ

نے کُفر نہیں کیا - بلکہ جہاں کہیں کسی نبی کی خصوصیّت کی جاتی ہے - وہاں درحقیقت کوئی ایسی وجہ ہوتی ہے - چُونکہ یہُودیوں کے اور افتراؤں میں سے جن کا ذکر ماتتلوا الشیاطین علی ملك سلیمٰن میں ہے - ایک یہ افترا بھی تھا جو ان کی کُتب مُقدسہ تک راہ پا گیا تھا - اسلیئے اُس کی تردید کی خاص ضرورت پیش آئی - کہ یہ محض سلیمان علیہ السلام پر افترا ہے - ولکن الشیاطین کفروا مین بھی اسی طرف اشارہ ہے - کہ یہ افترا کرنے والے شیطان ہی درحقیقت کافر ہیں - درحقیقت یہ ایک ہی بات بائیبل کی تحریف کا فیصلہ کر دیتی ہے - کہ اُس میں برگزیدہ نبیوں کی طرف کُفر تک منسُوب کیا گیا ہے - اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے - کہ قرآن کریم بائیبل کی بعض باتوں کو واقعی تحریف اور جھُوٹ قرار دیتا ہے - مثلاً یہاں وما کفر سلیمان فرمانا - حالانکہ بائیبل کفر کو ان کی طرف منسُوب کرتی ہے - صاف ظاہر کرتا ہے - کہ قرآن کریم کُل بائیبل کو دُرست نہیں مانتا - اور یہ اسلام اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا کس قدر زبردست ثبُوت ہے - کہ گو آپ نے بائیبل کو کبھی پڑھا نہیں - کیوُنکہ پڑھنا تو آپ جانتے ہی نہ تھے - نہ کہیں سے اسکے سُننے کا موقعہ ملا - مگر کس طرح اُس کی غلط باتوں کو غلط قرار دے کر ان سے اختلاف کیا ہے - پس یہ خُوب یاد رکھو کہ قرآن کریم جہاں بائیبل سے اختلاف کرتا ہے بائیبل کی غلطی اور تحریف کی وجہ سے کرتا ہے - اور یہ بھی اللہ تعالےٰ کی شان ہے - کہ آج خُود پادریوں کو اسبات کا اعتراف کرنا پڑا - کہ واقعی اس موقعہ پر بائیبل نے کُفر اور شرک کو سلیمان کی طرف غلطی سے منسُوب کیا ہے - چنانچہ پادری ٹی - کے کین صاحب بائیبل کی انسکلو پیڈیا کالم ۴۶۸۹ میں لکھتے ہیں - " غالباً یہ تو صحیح ہے کہ سلیمان کی بہُت سی بیبیاں تھیں جن میں سے کچھ اسرائیلی قوم کی اور کچھ غیر اسرائیلی تھیں مگر اس نے ان سب کے لیئے قربانگاہ نہیں بنائے تھے - نہ ہی اس نے ان بیبیوں کے دیوتاؤں کی پرستش کو اللہ تعالےٰ کی عبادت کے ساتھ ملانے کا کبھی ارتکاب کیا " - پس یہ کیسی صفائی سے معلوم ہوتا ہے - کہ (۱) بائیبل میں تحریف ہُوئی ہے - اور (۲) ایسے موقعہ پر ہی قرآن کریم بائیبل سے اختلاف کر کے حق کو ظاہر فرما دیتا ہے - پس خُوب یاد رکھو کہ جہاں بائیبل اور قرآن کریم میں اختلاف ہوگا - وہاں قرآن ہی حق پر ہوگا +

۱۶۴ - یُعلّمون النّاس السحر - یعنی یہی شیطان ہی لوگوں کو سحر سکھاتے ہیں سحر کیا چیز ہے

معنی میں استعمال ہؤا ہے۔ جیسے قال علیہ کہ لیتے ہیں۔ یعنی افترا کرنے کے
معنوں میں۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے۔ تلا علیہ اذا کذب وتلا عنہ اذا صدق
یعنی جب کسی پر کوئی شخص جھوٹ بولے تو کہتے ہیں تلا علیہ۔ اور جب جو
کسی دوسرے نے کہا ہو وہی کہدے تو کہتے ہیں تلا عنہ۔ اور ملک سلیمان کے
معنے ہیں شرعہ ونبوتہ وحالہ یعنی اُسکی شریعت اور اُس کی نبوّت اور اُس کا
حال۔ پس اس جُملہ یعنی وا تبعوا ما تتلوا الشیاطین علیٰ ملک سلیمٰن کے
معنے یہ ہوئے۔ کہ یہ یہُودی ان باتوں کی پیروی کرتے ہیں۔ جو شیطانی چال
چلنے والوں نے سلیمان کی نبُوّت پر افترا کر رکھی ہیں۔ اور اس میں کچھ شک
نہیں۔ کہ شریر لوگوں نے بہت سی باتیں سُلیمان کی طرف منسُوب کر رکھی تھیں۔ حتّےٰ کہ
آج مسلمانوں میں بھی بعض باتیں اسی رنگ کی پائی جاتی ہیں۔ اور طرح طرح کے
نقش سلیمانی اور سحر سُلیمانی بناتے ہیں۔ اور بہت سی بیہودہ باتوں کو جو خوُد
لوگ بطور شرارت ایجاد کرتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کی طرف منسُوب کیا جاتا ہے۔
ضرُور ہے۔ کہ ان باتوں کی اصلیّت بھی یہُود سے ہی لی گئی ہو +

۱۶۳- ما کفر سلیمٰن۔ حضرت سلیمانؑ کے ساتھ یہُود کی بعض اقوام کو عداوت ہو گئی تھی۔
اور اِسلیئے اُنھوں نے حضرت سلیمان کی طرف بہت سی کُفر کی باتیں بھی منسُوب کر دیں۔
یہاں تک کہ اُن کی یہ باتیں اُن کی تحریف شُدہ کُتب مُقدسہ میں بھی راہ پا گئیں۔
چنانچہ اسلاطین ۱۱: ۴ میں ہے۔ کہ اُس کی جوروُں نے اُس کے دل کو پھیرا۔
کیونکہ ایسا ہؤا کہ جب سلیمان بُوڑھا ہؤا۔ تو اُس کی جورؤں نے اُس کے دل کو
غیر معبُودوں کی طرف مائل کیا۔ اور اُس کا دِل خُداوند اپنے خُدا کی طرف مائل نہ تھا۔"
اور پھر چھٹی آیت میں ہے۔ کہ سُلیمان نے خُداوند کی نظر میں بدی کی۔" اور پھر ۹ و ۱۰
آیت میں ہے "سو از بسکہ اس کا دل خُداوند اسرائیل کے خُدا سے جو اُسے دوبار
دکھائی دیا برگشتہ ہؤا۔ اسلیئے خُداوند سلیمان پر غضبناک ہؤا۔ کہ اس نے اسے
حُکم کیا تھا۔ کہ وہ اجنبی معبُودوں کی پیروی نہ کرے۔ پر اُس نے خُداوند کے حُکم کو
یاد نہ رکھا"۔ مگر یہ سب کچھ محض یہُودیوں کا حضرت سلیمان علیہ السّلام پر افترا ہے۔
اور قرآن کریم اِسی لیئے کُفر سے آپ کی بریّت ظاہر فرماتا ہے۔ ورنہ کسی نبی کے متعلق
یہ کہنے کی ضرُورت پیش نہیں آئی۔ کہ اُس نے کُفر نہیں کیا تھا۔ پس وما کفر سلیمان
کہنے کے یہ معنے نہیں کہ اور نبی تو نعُوذ باللہ من ذٰلک کُفر کرتے رہے تھے مگر سلیمان

کا پتہ اس سے لگتا ہے۔ کہ مؤرخین نے لکھا ہے۔ کہ اس کے گرد اگرد کی فصیل ۵۵ میل لمبی تھی۔ اُس کی بلندی ۳۰۰ فٹ اور موٹائی ۸۵ فٹ تھی۔ بخت النصر کے وقت جو یہودیوں کی تباہی کا موجب ہؤا یہ شہر عروج پر تھا۔ مگر تھوڑا ہی عرصہ بعد ایرانی بادشاہ خورس نے جس کا ذکر یسعیاہ نبی کی کتاب میں ہے اُسے فتح کیا۔ اور کچھ عرصہ بعد تباہ ہوگیا۔

۱۶۷۔ ھاروت وماروت۔ ہاروت اور ماروت کے متعلق جس قدر قصے مفسرین نے لکھے ہیں۔ اُن کی اصل یا تو ایرانی مجوسیوں میں کچھ ملتی ہے۔ اور یا یہودیوں میں خود قرآن کریم یا کسی صحیح حدیث سے اِن قصّوں کی اصلیت کا کچھ پتہ نہیں چلتا اور چونکہ ایسے قصّے ملائکہ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتے۔ جن کی شان میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ و یفعلون ما یؤمرون اسلیئے ہم اُن کو ردّ کرنے پر مجبور ہیں۔ مجوسیوں میں جیسا کہ سیل نے لکھا ہے۔ یہ قصّہ مشہور تھا۔ کہ ہاروت اور ماروت دو باغی فرشتے ہیں۔ جو بابل میں سر نیچے کر کے لٹکائے گئے ہیں۔ اور اِسی طرح یہودیوں میں ایک فرشتے کا قصّہ مذکور ہے۔ ان دونوں کو ملا کر بعض لوگوں نے نئے سرے یا قصّے ہاروت اور ماروت کی نسبت بنا لیئے ہیں۔ قرآن کریم میں صرف اس قدر لکھا ہے۔ کہ وہ کوئی دو فرشتے تھے جن پر کچھ نازل بھی کیا گیا تھا۔ مگر ان پر لوگوں نے بہت سے افترا کر لیئے ہیں۔ پس یہودیوں اور مجوسیوں کے یہ قصّے اُنہی افتراؤں میں سے ہیں۔ چونکہ فرشتوں پر جو کچھ نازل ہوتا ہے۔ وہ درحقیقت اُن کی وساطت سے اللہ تعالےٰ کے کسی برگزیدہ اِنسان پر نازل ہؤا کرتا ہے۔ اِسلیئے ان دو فرشتوں کے ذریعہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کسی برگزیدہ اِنسان پر کوئی بات نازل کی گئی تھی۔ اِس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مگر بائیبل میں یسعیاہ نبی کی کتاب کو پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہ خورس نے جس کو بائیبل میں خدا کا مسیح کہا گیا ہے۔ جو دراصل ایرانی تھا بابل کی تباہی اور یہودیوں کے نجات دلانے اور بیت المقدس کو دوبارہ آباد کرنے کا کام کیا۔ کیونکہ اُس نے بابل کو فتح کیا۔ گو تباہ اُس کے پیچھے ہؤا۔ اُس نے یہودیوں کو جنھیں بابل کے بادشاہ بخت النصر نے قید کر دیا تھا رہائی دی۔ اور اس نے بیت المقدس کو جسے بابل کے بادشاہوں نے ویران کر دیا تھا از سر نو آباد کرایا۔ پس ممکن ہے کہ ہاروت اور ماروت اُنہی فرشتوں کا نام ہو۔ جو خورس پر نازل ہوئے ہوں۔ اور یسعیاہ نبی کی کتاب ۴۵ : ۲ میں ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ خورس کو فرماتا ہے۔ "میں تیرے آگے چلونگا۔ اور ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کرونگا۔ میں پیتل کے دروازوں کے ٹکڑے

مُفردات راغب میں ہے۔ السحر خداع وتخییلات لا حقیقۃ لھا۔ یعنی سحر اُن دھوکے کی باتوں اور تخیلات کو کہتے ہیں۔ جن کی حقیقت کچھ نہ ہو۔ اِسلیئے سحرہ کے معنے ہیں خدعہ یعنی اُسے دھوکا دیا۔ اور اشعار عرب میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ امرؤ القیس کے اس شعر میں۔ ونسحر بالطعام وبالشراب۔ اور جوہری کا قول ہے۔ کل مالطف ودق ماخذہ فھو سحر یعنی ہر ایک چیز جس کی اصل لطیف اور دقیق ہو اُسے سحر کہا جاتا ہے۔ اور تاج العروس میں ہے۔ السحر الفساد اور کسی چیز کو مسحور کر لینے کے معنے اسے فریفتہ کر لینے کے بھی ہیں۔ جیسے کہتے ہیں۔ المرأۃ تسحر الناس بعینھا۔ اور حدیث میں ہے۔ ان من البیان لسحرا۔ ای مایصرف قلوب السامعین۔ یعنی بعض بیان سحر کا حکم رکھتا ہے۔ اور مُراد یہ ہے کہ وہ سامعین کے دلوں کو اپنی طرف پھیر لیتا ہے۔ سحر کے معنے جو عوام میں مشہور ہیں۔ یعنی کسی چیز کی صُورت یا طبیعت کو بدل دینا اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ پس شیطان جو سحر لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اس سے مُراد وہی فریب اور دھوکے کی باتیں ہیں +

۱۶۵- وما انزل علی الملکین۔ یہ علی ملک سلیمٰن پر عطف ہے۔ ترکیب یُوں ہُوئی۔ واتبعوا ما تتلوا الشیاطین علی ملک سلیمان ... وعلی ما انزل علی الملکین۔ یعنی یہ یہُود ایک تو ان افتراؤں کی پیروی کرتے ہیں۔ جو شیطانوں نے سلیمان کی نبوّت کے متعلّق کیئے ہیں۔ اور دوسرے اُن افتراؤں کی جو اس وحی کے مُتعلق کیئے گئے ہیں۔ جو دو فرشتوں پر بابل میں اُتاری گئی۔ یعنی جس طرح سلیمان علیہ السّلام پر کچھ افترا لوگوں نے کیئے۔ اور شرارت کی باتیں اور جھُوٹی باتیں اُن کی طرف منسُوب کی ہیں۔ اسیطرح بابل کے دو فرشتوں ہارُوت اور مارُوت کے مُتعلّق بھی لوگوں نے بہت سے افترا کیئے ہیں۔ اور جھُوٹی باتیں اُن کی طرف منسُوب کی ہیں۔ وہ شرارت کی باتیں لوگوں کی بنائی ہُوئی ہیں مگر اُن کو نبیوں اور ملائکہ کی طرف منسُوب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ نبی اور ملائکہ ایسی باتوں سے پاک ہوتے ہیں + یا ما نافیہ ہے۔ اور یہ معنی ہیں کہ کچھ نازل نہیں کیا گیا +

۱۶۶- ببابل۔ بابل ایک نہایت قدیم آباد شہر تھا۔ جو مُدّت تک عراق عرب کا دارُالخلافہ رہا۔ دریائے فرات پر واقع تھا۔ جس کے دونوں طرف اب اُس کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں۔ ۲۳۰۰ قبل مسیح میں بھی یہ دارُالخلافہ تھا۔ اس کے لفظی معنی بعض کے نزدیک خدا کا دروازہ ہیں ( باب = دروازہ۔ ایل = اللہ ) اس شہر کی کسی زمانہ میں عظمت

شناخت اس کی اگلے فقرہ میں بیان کی ہے +

۱۷۱- وما ھم بضآرین بہٖ من احدٍ الا باذن اللہ - یعنی جس رنگ کے منصوبے یہ لوگ ان شیطانی تعلیموں کے ذریعہ سے کررہے ہیں جنکو وہ انبیاء اور ملائکہ کیطرف منسوب کرتے ہیں اُن کی غرض اصل میں کوئی نقصان پہنچانا ہے - ضرر پہنچانے کی نفی اِسلئے کی تا یہ بتایا جائے - کہ وہ اپنی غرض کے حاصل کرنے میں ناکام رہینگے +

پس اب یہ چار شناخت کی علامتیں ہمارے ہاتھ میں آگئیں - اوّل یہ کہ کچھ شیطانی منصوبے اور کارروائیاں اس وقت یہود کررہے ہیں - خود اُن کو شیطانی کہہ کر اُن کی شناخت کی علامت بتادی - دوسرے یہ کہ وہ اُن باتوں کو نبیوں اور ملائکہ کی طرف منسوب کرتے ہیں - تیسرے یہ کہ مرد اور عورت میں تفرقہ کرتے ہیں - چوتھے یہ کہ ان کی غرض ان منصوبوں اور کارروائیوں میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ضرر پہنچانا ہے - پس درحقیقت ان الفاظ میں جو واتبعوا ما تتلوا الشیاطین سے شروع ہو کر آیت کے آخر تک ہیں - اُن خفیہ سوسائیٹیوں کی طرف اشارہ ہے - جو فریمیسنوں کے رنگ میں تھیں - اور جن کی اصل غرض نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابیوں کو نقصان پہنچانا یا بالفاظ دیگر خفیہ اسباب سے اسلام کو نیست و نابود کرنا تھا - اور یہ عداوت کی آخری حد تھی - ان خفیہ منصوبوں کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ سورت مجادلہ میں فرمایا ہے - جہاں بعینہٖ اس قسم کے الفاظ ہیں - جیسے کہ اس آیت میں - انما النجوی من الشیطن لیحزن الذین اٰمنوا و لیس بضارھم شیئاً الا باذن اللہ - یعنی خفیہ مشورے شیطانی کام ہیں (آیت زیر بحث میں بھی اُن کو شیطانی ہی کہا گیا ہے) اور اُن کی غرض یہ ہے - کہ مومنوں کو غم پہنچے - مگر یہ خفیہ مشورے مومنوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے - ہاں جو نقصان مومن کو پہنچتا ہے - وہ اللہ کے اذن سے پہنچتا ہے - یہاں صفائی سے خفیہ منصوبوں کی غرض مومنوں کو نقصان پہنچانا بیان فرمادی ہے - پس اِن دونوں مقامات کو اکٹھا پڑھنے سے یہ بات صفائی سے معلوم ہوجاتی ہے - کہ اس آیت میں اُن خفیہ منصوبوں کا ذکر ہے - جن میں کچھ فریمیسنوں کا بھی دخل تھا - اور جن کی غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تباہ کرنے کی تھی - اور یہ یہود کی شرارت کا انتہائی درجہ تھا - جو اُن کو کھولکر سمجھا دیا گیا - اور آخر یہ بھی بتادیا گیا - کہ یتعلمون ما یضرھم ولا ینفعھم یعنی جو کچھ اس قسم کی منصوبہ بازیاں سیکھتے ہیں - یہ خود ان کے نقصان کا موجب ہونگی -

جُدا پلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کروں گا۔ اور لوہے کے بینڈوں کو کاٹ ڈالوں گا" جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خورس نے اللہ تعالےٰ سے حکم پاکر ہی یہ کارروائی کی تھی۔ اور چونکہ یہاں اس حکم میں ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور کاٹ ڈالنے کا ذکر ہے۔ اور ہاروت اور ماروت بھی ھرت اور مرت سے مُشتق ہیں۔ جن کے معنے توڑنے اور پھاڑنے کے ہیں۔ اسلئے ممکن ہے۔ کہ ہاروت اور ماروت اُنہی فرشتوں کا نام ہو۔ جو خورس پر اللہ تعالےٰ کا یہ حکم لیکر نازل ہوئے ہوں۔ بہرحال ہاروت اور ماروت دو فرشتے ہیں۔ جن کا تعلق بابل کی تباہی سے کچھ ہے۔ مگر اُن کی نسبت جو قصّے مجوسیوں وغیرہ میں مشہور تھے۔ اُن کو محض افترا قرار دیا گیا +

۱۶۸۔ وما یعلمٰن من احد حتّی یقولا انما نحن فتنۃ۔ منجملہ ان مفتریات کے جو ہاروت اور ماروت کی طرف منسوب کی جاتی ہیں یہ ہے کہ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں مگر سکھانے سے پہلے یہ کہ لیتے ہیں۔ کہ ہم تو ایک آزمائش کے رنگ میں پکڑے گئے ہیں۔ تم خواہ مخواہ ہم سے سحر سیکھ کر ارتکاب کفر نہ کرو۔ اس بے سرو پا قصّے کی نسبت اللہ تعالےٰ فرماتا کہ وہ تو کسی کو کوئی تعلیم ہی نہیں دیتے۔ کہ یُوں کرو یا یُوں کرو۔ حتّٰے کہ ان کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آئے کہ ہم فتنہ ہیں تو کفر نہ کر۔ اِس طرح پر اِس سارے قصّے کی نفی کردی ہے۔ جو اُن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے +

۱۶۹۔ فیتعلّمون منھما۔ یعنی ان دونوں قسم کے افتراؤں سے یہ یہودی وغیرہ یہ سیکھتے ہیں۔ جو سیکھتے ہیں اُس کا ذکر اگلے نوٹ میں ہے۔ منھما میں ضمیر ان دونوں افتراؤں کی طرف جاتی ہے۔ جن میں سے ایک افترا حضرت سلیمان علیہ السلام پر اور دوسرا افترا ہاروت اور ماروت پر ہے +

۱۷۰۔ ما یفرقون بہٖ بین المرء وزوجہٖ۔ یہ اُن کی ساری تعلیم کی شناخت کی ایک علامت بیان کردی ہے۔ دُنیا میں صرف ایک ہی سوسائٹی بر رنگ مذہب ایسی ہے۔ جس میں مرد اور عورت میں تفرقہ کیا جاتا ہے۔ یعنی مردوں کو اس کا ممبر بنایا جاتا ہے۔ مگر عورتوں کو نہیں۔ اور یہ فریمیسنوں کا مذہب ہے۔ ورنہ اور کسی مذہبی سوسائٹی میں یہ تفرقہ جائز نہیں رکھا گیا۔ اور مذہب کی غرض اگر واقعی زندگی کو نیک بنانا ہے۔ تو پھر یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک مذہب ایسا تفرقہ جائز رکھے۔ کہ نسل اِنسانی کے آدھے حصّہ کو اس مقصد کے حاصل کرنے کی اجازت ہی نہ دے۔ پس اس علامت کے بیان کردینے سے درحقیقت قرآن کریم نے ہمیں یہ بتادیا ہے۔ کہ اس کا اشارہ کس سوسائٹی کی طرف ہے۔ دوسری

واللہ یختص برحمتہٖ میں یہ اشارہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُس وحی الٰہی کی رحمت کے ساتھ تم کو مخصوص کر لیا ✤

۱۰۶ ۱۷۴۔ ماننسخ من ایۃٍ اوننسھا نات بخیر منھا اومثلھا۔ ان الفاظ کے معنے تو صرف اس قدر ہیں۔ کہ ہم کسی حکم کو منسوخ نہیں کرتے یا بھلواتے نہیں۔ مگر اُس سے بہتر یا اُس جیسا لے آتے ہیں۔ مگر چونکہ اس آیت کو ناسخ و منسوخ کے مسئلہ میں بُنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اسلیئے یہاں اس پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت محسُوس ہوتی ہے ✤

سب سے پہلے غور طلب امر سیاق وسباق آیت ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ پچھلے سے پچھلے رکُوع میں یہُود کے اس اعتراض کا ذکر تھا۔ کہ یہ وحی بنی اسرائیل میں نازل ہونی چاہیئے تھی۔ مگر محض اسلیئے کہ بنی اسمٰعیل پر نازل ہُوئی انھوں نے از روئے حسد اس کا انکار کیا۔ اور نہ صرف انکار ہی کیا۔ بلکہ دشمن بن گئے۔ اور ہر طرح کی شرارتیں اور منصوبے کرنے لگے۔ چونکہ درمیان میں ان شرارتوں اور منصوبوں کا ذکر آکر بات لمبی ہوگئی تھی۔ اسلیئے اصل مضمون کی طرف متوجہ کرنے کے لیئے پھر فرمایا۔ کہ اصل اعتراض ان کا یہ ہے۔ کہ تم پر یہ خیر و رحمت کیوں نازل ہوئی۔ کیونکہ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ اگر بنی اسرائیل کے کسی نبی پر نازل ہوتی۔ تو حضرت مُوسےٰ کی شریعت منسُوخ نہ ہوتی۔ مگر محمدؐ رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اس کے نازل ہونے سے جو بنی اسمٰعیل میں سے ہے یہ بھی ضرور ہوا۔ کہ حضرت موسےٰ کی شریعت منسُوخ ہو۔ پس اصل جواب تو اسبات کا دیا گیا ہے۔ کہ اگر شریعت مُوسوی کے کچھ احکام منسُوخ ہوگئے ہیں۔ یا وہ بھلوا دیئے گئے ہیں۔ تو اس سے بہتر اس شریعتِ محمدؐی میں بتا دیئے گئے ہیں۔ او مثلھا میں گویہ بھی بتایا ہے۔ کہ بعض احکام ویسے ہی ہیں جیسے پہلی شریعت میں تھے۔ مگر مثل کے لفظ میں استثنا ۱۸ : ۱۸ کی پیشگوئی کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ لفظ آیۃ کے معنی میں یہ ضروری نہیں کہ قرآن کریم کی آیت ہی ہو۔ بلکہ اکثر استعمال اس لفظ کا عام ہے۔ خواہ کسی نبی پر حکم نازل ہُوا ہو۔ فرمایا والذین کفروا وکذبوا بایاتنا۔ یا فرمایا۔ اما یاتینکم رُسل منکم یقصون علیکم ایاتی۔ پس سیاق مضمون تو یہ چاہتا ہے۔ کہ یہاں جن احکام کے نسخ کا ذکر ہے۔ وہ احکام شریعت سابقہ کے ہیں۔ نہ کہ قرآن کریم کے احکام ✤

اور جس نفع کی اُمید اُن سے رکھتے ہیں۔ وہ انہیں نہیں ملیگا۔ سو ایسا ہی ہوُا کہ اُن سب شرارتوں میں وہ آخر ناکام ہُوئے +

۱۰۴ لا تقولوا راعنا۔ پچھلے رکوُع میں یہوُدیوں کی انتہائی شرارتوں کا جو وہ خُفیہ منصُوبوں کے رنگ میں کر رہے تھے ذکر کرکے اب اس بات کا ذکر فرماتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے اگر ان کی شریعت کو منسُوخ کیا ہے۔ تو اس سے بہتر ایک شریعت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی ہے۔ مگر اس ذکر سے پہلے اُن کی ایک دوسری قسم کی شرارت کا ذکر کرتا ہے۔ وہ شرارت تو عملی رنگ کی تھی۔ کہ تباہی کے لئے منصُوبہ بازیاں کرتے تھے۔ مگر یہ شرارت زبان کی تھی۔ کہ باوجُود ہر قسم کے عہد مُعاہدوں کے اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی طرف سے ہر قسم کی رعایتوں کے ملحُوظ رکھا جانے کے اگر ایک طرف خُفیہ منصُوبوں میں مشغُول تھے۔ تو دوسری طرف معمُولی بول چال میں شرارت سے باز نہ آتے تھے۔ بلکہ سیدھے الفاظ کو توڑ مروڑ کر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کے کلمات بول دیتے تھے۔ منجُملہ اُن کے لفظ راعنا کو بطور مثال بیان فرمایا ہے۔ راعنا کے معنے تو ہیں۔ ارعنا سمعك یعنی ہماری بات سنئیے۔ تو مسلمان چونکہ بعض وقت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بات سمجھنے کے لئے ایسا عرض کردیتے تھے۔ ان بدبختوں نے اُس میں بھی ایک شرارت کی راہ اختیار کی جس کو خود قرآن کریم نے دوسری جگہ بیان فرمادیا ہے۔ راعنا لیا بالسنتھم (النساء) یعنی راعنا بولتے ہیں۔ تو زبان مروڑ کر یعنی بجائے راعنا کے رَاعِنَ کہہ دیا۔ جس کا تلفظ راعنا کے تلفظ سے ملتا جُلتا ہے۔ مگر جس کے معنے ہیں۔ یہ احمق ہے بیوقوف ہے۔ کیونکہ لفظ راعنا رعی سے مشتق ہے جس کے معنے رعایت کے ہیں۔ اور رَاعِنَ رعن سے مشتق ہے۔ جس کے معنے رُعُونت حماقت جہالت کے ہیں۔ پس مسلمانوں کو حکم دیا۔ کہ یہ شریر لوگ چونکہ بوجہ اپنی شرارت کے الفاظ کے بولنے میں گستاخی کرتے ہیں جس سے فساد وغیرہ کا اندیشہ ہے۔ اسلئے تُم ایسے الفاظ کو چھوڑ دو۔ جن کو وہ اِس طرح مروڑ سکیں۔ اور راعنا کی بجائے انظرنا کہہ دیا کرو۔ جس کے معنے ہیں۔ ہمیں ڈھیل یا مُہلت دیجئیے +

۱۰۵ ان ینزل علیکم من خیر من ربکم۔ نہ اہل کتاب یعنی یہودی اور عیسائی اور نہ ہی مشرکین عرب اسبات کو پسند کرتے ہیں۔ کہ مسلمانوں پر کوئی خیر نازل ہو خیر سے مُراد بالخصوص وحی الہی ہے۔ وہی سب سے بڑی خیر ہے۔ جو کسی پر نازل ہوسکتی ہے۔

کو منسوخ قرار دیا۔ تو بعض نے عند التحقیق صرف پانچ آیتوں کو منسوخ کہا۔ اب ایک طرف ساری اُمت کی اجماعی شہادت اسبات پر موجود ہے۔ کہ جو کچھ بین الدفتین موجود ہے یہ سب کچھ نبی کریم صلے اللہ علیہ کا لکھوایا اور بتایا ہؤا ہے۔ اور قرآن کریم خود کُل کو ھدی للناس فرماتا ہے۔ حالانکہ اگر اس کے بعض حصّے جو بعض کے نزدیک سات سو آیات تک پہنچ جاتے ہیں ناقابل عملدر آمد ہوتے تو اس کو کھولکر یہ بتانا چاہئیے تھا۔ پھر اب ایک طرف تو کُل کو قابل عملدر آمد ماننے کی شہادت اُمّت کی اجماعی شہادت۔ کتاب کی اپنی شہادت۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شہادت ہے۔ دوسری طرف اُس کے کسی حصّہ کو ناقابل عملدر آمد ماننے کیلیئے ہم کس کی بات مانیں۔ آیا ان کی جو سات سو آیات کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ یا اُن کی جو پانچ آیتوں کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ یہ اختلاف خود ہی بتا رہا ہے۔ کہ درحقیقت کسی شخص کے ہاتھ میں کوئی شہادت اس امر کی موجود نہیں۔ کہ کوئی آیت قرآن کریم کی واقعی منسوخ ہے اور اگر یہ کہا جائے۔ کہ بہر حال کم ازکم پانچ آیتوں پر تو اتفاق ہے۔ تو مَیں کہتا ہوں۔ کہ جس تحقیق کی رُو سے بقیہ ۶۹۵ منسوخ گردانی ہوئی آیات کو قابل عمل قرار دیتے ہیں۔ کیا وہ تحقیق ایک قدم اور آگے اُٹھانے سے مانع ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں۔ کہ وہ پانچ بھی درحقیقت منسوخ نہ ہوں؟ ممکن نہ ہونے کے کیا معنے۔ مَیں کہتا ہوں۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک آیت بھی جو اس قرآن کے اندر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے لکھائی ہو وہ منسوخ ہو جب تک کہ خود آپ ہی اُسے منسوخ قرار دینے والے نہ ہوں +

درحقیقت یہ ناسخ منسوخ کا جھگڑا کیوں پیش آیا۔ محض اسلیئے کہ بعض لوگوں نے بعض آیات کو دوسری آیات کے خلاف سمجھا۔ پس جہاں یہ سمجھ نہ آیا کہ فلاں دو آیات میں کیونکر تطبیق ہو سکتی ہے جھٹ ایک آیت کو منسوخ قرار دیدیا۔ مثلاً یُوں کہدیا۔ کہ عفو اور درگذر کا حُکم جہاں جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ وہ قتال کے حُکم کے ساتھ منسوخ ہو گیا۔ حالانکہ یہ کس قدر غلط ہے۔ عفو اور درگذر کے احکام پر تو قتال کے اندر بھی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم عمل کرتے رہے۔ کیا فتح مکّہ میں جو عفو اور درگذر سے کام لیا اُس کی نظیر دُنیا میں اور کہیں ہے۔ پھر یہ کس قدر جُرأت ہے کہ کہدیا جائے۔ کہ عفو اور درگذر کے احکام منسوخ ہو گئے تھے۔ تو کیا نعوذ باللہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کے خلاف کرتے تھے۔ قتال کا حُکم اپنی جگہ اُن ضروریات

لیکن اکثر مُفسرین نے اسے نسخ آیات قرآنی پر لگایا ہے - اب یہاں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے - کہ آیا نسخ آیات قرآنی سے مُراد کونسی آیات کا نسخ ہے - اگر تو اس سے مُراد کوئی ایسی آیات کا نسخ ہے - جو بین الدفتین موجُود نہیں - تو اس سے کچھ بحث نہیں - اور اسی معنی پر بُخاری کی وہ روایت محمُول ہو سکتی ہے - جو حضرت عمر علیہ السلام کی ہے - وانا لندع من قول ابیّ وذالک ان ابیا یقول لا ادع شیئا سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقد قال اللہ تعالیٰ ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا لیکن اگر اس سے مُراد کوئی ایسی آیات ہیں - جیسے کہ عام مُفسّرین کا مذہب ہے - جو بین الدفتین موجُود ہیں - تو اس قسم کے نسخ پر سب سے پہلے تو یہ سوال ہے - کہ ان آیات کو جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حُکم سے قرآن کریم کے اندر لکھی گئیں کس نے منسُوخ کیا - اگر کسی آیت کے مُتعلق جو پہلے کسی سُورت میں خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے لکھائی ہو - خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو - کہ فلاں آیت جو فلاں سُورت میں فلاں جگہ لکھائی گئی وہ اب منسُوخ سمجھی جائے - تو بحث ختم ہو جاتی ہے - ہم اس آیت کو منسُوخ مانیں گے - لیکن اگر خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی آیت کو منسُوخ نہ فرمایا ہو - تو پھر ہم یہ دریافت کر سکتے ہیں - کہ دُنیا میں کس شخص کو یہ اختیار ہے - خواہ وہ کوئی صحابی ہو خواہ امام ہو خواہ مُفسّر ہو - کہ وہ قرآن کریم کی کسی آیت کو جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خود قرآن کریم کے اندر لکھائی ہو منسُوخ قرار دے - میرے نزدیک نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد دُنیا میں کسی شخص کو یہ اختیار نہیں کہ کسی آیت کو منسُوخ قرار دے - اب جب ہم تحقیق کرتے ہیں - تو معلوم ہوتا ہے - کہ نسخ آیات کی ان ساری روایات میں جو کُتب احادیث یا کُتب تفاسیر میں موجُود ہیں ایک بھی روایت ایسی نہیں جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہو یا جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فلاں آیت کو منسُوخ فرمایا تھا - پس جب کسی دوسرے شخص کا قول نسخ آیات کے مُتعلق سند نہیں اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد نہیں - کہ فلاں آیت منسُوخ ہے - تو ایک مرحلہ اس سوال کا تو اس جگہ طے ہو جاتا ہے - کہ ہمارے پاس کوئی واقعی سند ایسی نہیں جس کی بناء پر قرآن کریم کی ان آیات میں سے کسی آیت کو جو بین الدفتین موجُود ہیں منسُوخ قرار دیا جائے +

نسخ پر کسی صحیح سند کے نہ ہونے کا ہی یہ نتیجہ ہے - کہ اگر بعض لوگوں نے سات سو آیات

۱۰۶

جاتے تھے - بلکہ وہ حافظِ قرآن صحابی جن کا کام ہی قرآن کو حفظ رکھنا تھا وہ بھی ساتھ ہی بھول جاتے تھے - بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ چونکہ ہر ایک آیت لکھوا دی جاتی تھی وہ تحریریں بھی کسی طرح ساتھ ہی محو ہو جاتی تھیں - غرضیکہ بین الدفتین جو کچھ موجود ہے اس میں کسی نسخ کا عقیدہ صریحاً غلط ہے - صحابہ کے متعلق جو بعض روایات میں ایسے الفاظ آ گئے ہیں - ان سے اس سے زیادہ کچھ مطلب معلوم نہیں ہوتا - کہ وہ ایک حکم کو جس میں کسی دوسرے کی تفصیل ہو جاتی تھی - ایک رنگ میں اُس کا ناسخ کہہ دیتے ہونگے جیسے مثلاً پانی مل جانے پر تیمم کا حکم منسوخ ہو جاتا ہے - اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حکم درحقیقت قابل عملدر آمد نہیں رہتا - بلکہ یہ منشاء ہے - کہ ایک حکم بعض شرائط کے ماتحت دیا جاتا ہے - جب تک وہ شرائط اور حالات پیدا نہ ہوں - اس وقت تک اس حکم پر بھی عمل نہیں ہو سکتا - مثلاً قتال کا حکم اس معنی میں منسوخ نہیں - کہ قرآن کریم کا حکم اب باطل ہو گیا - ہاں یوں کہہ سکتے ہیں - کہ چونکہ اس وقت وہ حالات موجود نہیں جن کے ماتحت قرآن کریم نے حکم قتال دیا تھا - اسلئے اس وقت اُس حکم پر بھی عمل نہیں ہو سکتا - اس سے آگے عقیدۂ نسخ کو بڑھانا قرآن کریم سے امن کو اُٹھا دینا ہے +

۱۰۸

۱۷۵ - ان تسئلوا رسولکم - یہاں یہودی مخاطب معلوم ہوتے ہیں - یعنی جب تم پر اس رسول کی جو تمہاری طرف بھیجا گیا - اور بوجہ مثیل موسیٰ ہونے کے درحقیقت تمہارا ہی رسول ہے صداقت کی دلائل کھل چکیں - تو اب تم اس سے ایسے سوال کرتے ہو - جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیئے گئے - جیسا کہ یسئلک اھل الکتاب ان تنزل علیھم کتابا من السماء فقد سألوا موسیٰ اکبر من ذٰلک سے ظاہر ہے - من یتبدل الکفر بالایمان کے معنے یہ ہوئے کہ جو شخص اب ایسی صورت میں ایمان کو چھوڑ کر کفر اختیار کرتا ہے - وہ درحقیقت ایک حاصل شدہ ایمان کو جو ایک یقینی علم تک پہنچ چکا ہے - کفر سے تبدیل کر رہا ہے +

۱۰۹

۱۷۶ - لو یردونکم من بعد ایمانکم کفارا - یہ بھی یہودیوں کی صد درجہ کی عداوت کا اظہار تھا - کہ گو اُن کا مذہب کتاب الٰہی میں توحید تھا - لیکن مسلمانوں کو وہ مشرکوں سے بُرا سمجھتے تھے - دوسری جگہ اُن کا یہ قول مذکور ہے - ھٰؤلاء اھدیٰ من الذین اٰمنوا سبیلا - یعنی مشرک مسلمانوں سے زیادہ سیدھی راہ پر ہیں - پس جس طرح پر اب مشرکین عرب اس بات پر تُلے ہوئے تھے - کہ مسلمانوں کو نہیں چھوڑیں گے - جب تک کہ انھیں دین اسلام سے لوٹا نہ دیں - ولا یزالون یقاتلونکم حتیٰ یردوکم عن دینکم ان استطاعوا -

کے لحاظ سے تھا جو پیش آئیں اور عفو کا حکم اپنی جگہ تھا۔ اس کو نسخ نہیں کہتے کہ قرآن کریم نے فرمایا۔ کہ نماز سے پہلے وضو کر لیا کرو۔ پھر فرمایا کہ پانی نہ ملے تو تیمم کر لیا کرو۔ وضو کا حکم اپنی جگہ ہے تیمم کا اپنی جگہ۔ اسی طرح قتال کا حکم اپنی جگہ ہے عفو کا اپنی جگہ۔ یہی وجہ ہے۔ کہ بعض نے سات سو آیات کو منسوخ کہہ دیا۔ جہاں تطبیق نہ ہو سکی بجائے اسکے کہ تطبیق دینے کی کوشش کرتے جھٹ ایک کو منسوخ کہہ دیا۔ حالانکہ اکثر حالتوں میں یہ بھی شہادت موجود نہیں۔ کہ آیا جسے منسوخ کہا جاتا ہے۔ اور حقیقت وہ آیت پہلے نازل ہوئی تھی۔ وہ پانچ آیتیں جن کی تطبیق بعض دوسری آیات کے ساتھ نہ ہو سکنے کی وجہ سے انہیں آخر بعض محققین کو بھی منسوخ قرار دینا پڑا ہے۔ خدا نے چاہا تو میں اُن کے موقعہ پر دکھلاؤں گا۔ کہ وہاں بھی تطبیق ہو سکتی ہے۔ اور قرآن کریم کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا۔ یعنی اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف تو تو ہوتا۔ کہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا۔ افسوس کہ ناسخ و منسوخ کے مسئلہ میں اس ارشاد الٰہی کو بھی بھلا کر اختلاف پہلے قائم کیا گیا۔ اور پھر اس کو نسخ آیات سے حل کیا۔ جو در اصل اختلاف کو مان لینے کے برابر ہے۔ کیونکہ مخالف تو یہی کہیگا۔ کہ اختلاف تو تم خود مانتے ہو۔ اور نسخ ایسا دعوے ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں +

قرآن کریم کی ایک اور آیت جو اسی نسخ کے مضمون پر پیش کیجاتی ہے سورت نحل کی یہ آیت ہے۔ واذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ واللہ اعلم بما ینزل قالوا انما انت مفتر۔ اس کی مفصل تشریح تو وہیں ہوگی۔ اس جگہ میں اس قدر بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ سورت نحل مکی ہے۔ اور مکہ میں کسی حکم کے منسوخ کیئے جانے کا ذکر بھی روایات میں نہیں ملتا۔ کیونکہ تفصیلی احکام تو در اصل نازل ہی مدینہ میں ہوئے۔ پس اس آیت سے نسخ کا استدلال کرنا۔ اور پھر نسخ بھی اُن آیات کا جو بین الدفتین اس وقت موجود ہیں سراسر غلط ہے +

آیت زیر بحث میں ننسھا کے لفظ میں اُن احکام کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ جو پہلے کبھی نبیوں پر نازل کیئے گئے تھے۔ مگر وہ لوگ جن کو وہ حکم دیئے گئے تھے انھیں بھول گئے۔ ورنہ قرآن کریم کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ ایک طرف تو وحی الٰہی نازل ہو رہی تھی۔ دوسری طرف کچھ ایسی آیات بھی تھیں جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نعوذ باللہ ساتھ ساتھ بھولتے جاتے تھے۔ اور نہ صرف آپ اکیلے ہی بھولجاتے

111

کوتاہی نہیں کرتا۔ تو پھر وہ خوف وحُزن کیحالت سے نکل جاتا ہے۔ اور یہی جنّت ہے۔ پس جو شخص اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اختیار کرتا ہے۔ اس کے قوانین سے باہر قدم نہیں رکھتا۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی وہ نہ صرف حقُوق العباد کو ادا کرتا ہے۔ بلکہ دوسری مخلُوق کے ساتھ احسان کرنیوالا ہو جاتا ہے۔ درحقیقت وہی شخص ہے۔ جو کامل طور پر نجات یافتہ ہے۔ پس یہ نجات کی راہ تو ایک کھُلی اور واضح راہ ہے۔ جو اسلام پیش کرتا ہے۔ اور باقی نرے دعوے ہی دعوے ہیں۔ وجہ کے معنے ذات اور نفس کے ہیں۔ کیونکہ مُنہ سب اعضاء میں اشرف اور کُل کے قائمقام ہو جاتا ہے۔ اور وجہ کے معنے مقصد اور توجّہ کے بھی ہیں۔ اسلم کے معنے ہیں فرمانبردار کیا۔ اور اس سے لفظ اسلام مشتق ہے۔ اور مذہب اسلام وہ مذہب ہے۔ جو اِنسان کو کامل فرمانبرداری کی راہوں پر چلاتا ہے +

رکوع 14/14

113

۱۷۹- وقالت الیھود لیست النصارٰی علٰی شیئ... ضد اور تعصّب میں اِنسان ترقی کرتا ہے۔ تو پھر ہر ایک خوُبی سے اِنکار کر دیتا ہے۔ جب حضرت مسیح علیہ السّلام ظاہر ہُوئے تو یہُودیوں نے کہا۔ یہ مسیح کے پیرو ہر ایک قسم کی خُوبی سے خالی ہیں۔ یہ جس چیز کے پیچھے چلتے ہیں وہ کوئی شے ہی نہیں۔ بالمقابل عیسائیوں نے کہدیا۔ کہ یہُودی جس کے پیچھے چلتے ہیں وہ کوئی چیز نہیں۔ وھم یتلون الکتاب۔ اور یہ دونوں قومیں لکھی پڑھی بلکہ ایک ہی کتاب کی پیرو ہیں۔ کیونکہ بہرحال حضرت مسیح تک تو تمام کتابوں پر دونوں کا اِتفاق ہے۔ اسلام دوسرے مذاہب میں خوُبی یا صداقت کے موجُود ہونے سے اِنکار نہیں کرتا۔ بلکہ خُود ایک کامل خوبیوں اور کامل صداقتوں کا مجمُوعہ پیش کرتا ہے۔ آج کل مُسلمانوں میں بھی وہی بیماری پھیلی ہُوئی ہے۔ تھوڑے تھوڑے اختلافات پر ایک دوسرے کو کافر اور خارج از اسلام قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کذٰلک قال الذین لا یعلمون مثل قولھم۔ ایسی باتیں تو جاہل لوگ کیا کرتے ہیں فاللہ یحکم۔ اور ان اختلافات کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہی ہو گا +

114

۱۸۰- ومن اظلم ممن منع مسٰجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہٗ۔ جب دوسروں کی ساری خُوبیوں سے اِنکار کیا۔ تو اب دوسرا ذکر الٰہی کرے وہ بھی اچھّا معلوم نہیں ہوتا۔ پس اہل کتاب کو مُخاطب کرکے فرمایا۔ کہ تُم اب مسجدوں میں ذکر الٰہی کو بھی روکتے ہو۔ اور اُن کو ویران کرنیکے درپے ہوتے ہو۔ یہُودی بالخصُوص مُشرکین کے ساتھ بلکہ مُسلمانوں کو ہر قسم کا دُکھ اور تکلیف پہُنچانے میں اور اُن کو مساجد سے روکنے میں شریک تھے +

۱۸۱- لھم فی الدنیا خزی۔ مساجد سے روکنے اور اُن کو ویران کرنے کی کوشش کرنے والوں کا

اِسی طرح پر اہل کتاب جن کو مُوحدین کے ایک گروہ کے پیدا ہو جانے سے اور بُت پرستی اور شرک کے کم ہونے پر خوش ہونا چاہئے تھا محض حسد کی وجہ سے (حسدًا من عند انفسھم) انہی مشرکوں کے ساتھ مِلکر مُسلمانوں کو نیست ونابُود کرنا چاہتے تھے +

۷۷۔ فاعفوا واصفحوا۔ باوجُود یہودیوں کی ان تمام زیادتیوں اور شرارتوں کے جو وہ مُسلمانوں کے خلاف کرتے تھے مُسلمانوں کو حُکم ہوتا ہے۔ کہ تم عفو اور درگُذر سے کام لو۔ کیونکہ جب اِنسان اپنے دشمن کے مُقابلہ میں عفو اور درگذر سے کام لیتا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ اس دشمن کو خود کسی نہ کسی رنگ میں سزا پہنچا دیتا ہے۔ یہی معنے ہیں حتّٰی یاتی اللہ بامرہٖ کے چُنانچہ آخران یہُود کو اُن کی شرارتوں کی سزا مِلگئی۔ ایسی آیات کو منسُوخ لکھ دینا گویا اسلام کی تعلیم کو ہی بیکار قرار دینا ہے۔ آج بھی ہمیں یہی حُکم ہے۔ کہ ہم عفو اور درگُذر سے کام لیں۔ ہاں اِس میں شُبہ نہیں کہ عفو اور درگُذر کی ایک حد ہوتی ہے۔ سو اُس کی حد دوسری جگہ بتادی۔ فمن عفی واصلح یعنی عفو کا نتیجہ اصلاح ہونا چاہئے۔ مَیں پُوچھتا ہُوں۔ کہ کیا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابیوں نے عین جنگوں کے اندر عفو اور درگُذر سے کام نہیں لیا۔ اس سے بڑی عفو اور درگُذر کی مثال دُنیا میں کوئی اَور نہیں دکھا سکتا۔ جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ میں دکھائی۔ پھر احکام جنگ کے اندر حکم ہوتا تھا۔ فان انتھوا فان اللہ غفور رحیم۔ یعنی اگر اب بھی یہ رُک جائیں۔ تو گو خطرناک جرائم کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ مگر تم مُعاف کردو کیونکہ تُم اُس اللہ کے بھیجے ہُوئے ہو جو غفُور اور رحیم ہے۔ سو یہ عفو اور درگذر کی تعلیم کبھی منسوخ نہیں ہُوئی۔ افسوس کہ مُسلمان اب اپنوں کے ساتھ بھی عفو اور درگُذر کا مُعاملہ نہیں کرتے دشمنوں سے کیا کرینگے +



۷۸۔ بلٰی من اسلم وجھہ للہ وھو محسن۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو مُحمّد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں قائم کرنے کیلئے مبعُوث ہُوئے۔ کہ نرے مُنہ کے دعوے کُچھ چیز نہیں جیسے یہُود اور نصارے کرتے ہیں۔ یہُود نے کہہ دیا یہُود ہی جنّت میں داخل ہونگے اور کوئی نہیں۔ عیسائیوں نے کہ دیا کفّارہ کے ماننے والے ہی جنّت میں داخل ہونگے اَور کوئی نہیں۔ اُن کے ان دعووں پر جو پچھلی آیت میں مذکُور ہیں فرمایا تھا۔ ھاتوا بُرھانکم۔ اس پر کوئی کُھلی دلیل لاؤ۔ جس سے یہ امر واضح ہو جائے۔ کہ کیوں یہُودیوں یا عیسائیوں کے لئے جنّت مخصُوص ہے۔ اب اس آیت میں وہ دلیل خُود بیان فرمائی کہ جنّت کیا ہے۔ اور وہ کس طرح مِل سکتی ہے۔ اِنسان کے ذمّے دو ہی قسم کے حقُوق ہیں ایک حقُوق اللہ اور دوسرے حقُوق العباد۔ سو جب ایک شخص اِن حقُوق کی ادائیگی میں

۱۱۵ کروگے۔ تو نصرت اُدھر ہی تمہارے ساتھ ہوگی۔ اور مغرب کا رُخ کروگے تو نصرت الٰہی اُدھر تمہارے ساتھ ہوگی۔ یہ درحقیقت ایک دوسری عظیم الشان پیشگوئی ہے۔ جو مُسلمانوں کو ایسے وقت میں بتائی گئی جب وہ نہایت کمزور اور دوسروں کے ظلموں کا تختۂ مشق اور تعداد میں نہایت قلیل تھے اور کوئی ظاہر سامان ان کے غلبہ کا نہ تھا بعض نے فاینما تولوا میں مساجد کے ویران کرنے والوں کو مخاطب لیکر یہ معنے کیئے ہیں کہ جدھر تم بھاگتے جاؤ گے اُدھر ہی اللہ تعالےٰ یہ سزا تمہیں پہنچائیگا۔ وجہ کے معنے کے لیئے دیکھو نوٹ ع۱۷۸ +

۱۱۶ ۱۸۳۔ وقالوا اتخذ اللہ ولدا۔ بجائے اس کے کہ کسی کی ساری خوبیوں کا اِنکار کیا جائے اُن کی ایک خطرناک غلطی کا ذکر کردیا۔ عیسائی تو مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں مُشرکینِ عرب بھی فرشتوں کو خُدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ مسیح کو ایک جگہ ابن اللہ بھی کہا ہے۔ ولد کا لفظ خود اس عقیدہ کی طرف اشارہ کرنے کو استعمال فرمایا۔ ولد اگر حقیقی رنگ میں مُراد ہے۔ تو اس صُورت میں اللہ تعالےٰ کا ولد کوئی نہیں۔ کیونکہ ایسا ولد ہونا ایک نقص پر دال ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ذات سب عیبوں سے پاک ہے۔ اِسی لیئے اس کے جواب میں فرمایا سُبحانہ۔ اور پھر فرمایا بل لہ ما فی السمٰوات والارض۔ زمین و آسمان کی سب چیزیں اُسی کے ہاتھ کی نکلی ہُوئی ہیں۔ اور کُل لہ قانتون سب اُس کے فرمانبردار بھی ہیں۔ پس جب ساری مخلوق اسی کی ہے۔ اور اُس کی فرمانبردار بھی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اور اُس کی مخلُوق میں باپ اور بیٹے کے تعلق سے بہت بڑھ کر تعلق موجود ہے۔ باپ بیٹے کا خالق نہیں ہوتا۔ نہ ہی بیٹا باپ کا کامل فرمانبردار ہوسکتا ہے۔ پس جب اللہ تعالےٰ کو اپنی ساری مخلُوق سے وہ تعلق حاصل ہے۔ جو کسی باپ کو بیٹے سے نہیں ہوسکتا تو بیٹا بنانا کیا معنے؟

۱۱۷ ۱۸۴۔ بدیع السمٰوات والارض۔ بدیع یا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اور بمعنی مبدع ہے۔ اور مبدع اُس مُوجد کو کہتے ہیں۔ کہ اُس سے پہلے اُس جیسی چیز کسی نے نہ بنائی ہو۔ المبدع المنشئ والمحدث مالم یسبقہ الی انشاء مثلہ واحداثہ احد۔ اور یا بدیع سماوات کی صفت ہے۔ بمعنی نادر یعنی اُس کے آسمان اور زمین بدیع ہیں +

۱۸۵۔ واذا قضی امرا۔ القضاء فصل الامر قولا کان ذٰلک او فعلا۔ یعنی قضاء کسی کام کے فیصلہ کردینے کو کہتے ہیں۔ قول سے ہو یا فعل سے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیئے کوئی بات اَن ہونی نہیں۔ جب ایک امر کا فیصلہ کردیا۔ کہ یہ یُوں ہوگا پھر وہ ٹل نہیں سکتا۔

آیت ۱۱۴

انجام بتایا۔ کہ دُنیا میں بھی اُن کے لیئے ذلت اور رسوائی ہوگی۔ سو اسی ذلت اور رسوائی کا مزا مُشرکین عرب کے ساتھ آخر یہودیوں کو اور عیسائیوں میں بھی ان لوگوں کو چکھنا پڑا جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے تھے۔ خالی اختلافِ مذاہب پر تو اللہ تعالےٰ اس دُنیا میں سزا نہیں بھیجتا۔ لیکن جب ایک قوم حق کی بیخکنی کرنے لگتی ہے۔ یا شرارت میں حد سے گذر جاتی ہے۔ تو اس دُنیا میں بھی آخرت کی سزا کیلئے پیش خیمہ کے طور پر کوئی سزا دیدی جاتی ہے۔ اسی لیئے لھم فی الاخرۃ عذاب عظیم سے پہلے فرمایا لھم فی الدنیا خزیٌ۔ گویا یہ ان کی شوخیوں اور گستاخیوں کی سزا بھی ہو جاتی ہے۔ اور آخرت کے عذاب کے لیئے ایک ثبوت بھی ہو جاتا ہے۔ یہود اور مُشرکین عرب کو جو سزائے ذلت اس دُنیا میں پہنچی۔ اُس کا آنا کبھی اُن کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ اُن کو تو ہر طرح سے غلبہ اور حکومت حاصل تھی۔ اور آخرت کا عذاب بھی محض دھمکیاں ہی ہوتیں۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کے لیئے آخرت کا عذاب بتاتے تھے مُسلمان ان کے لیئے بتاتے تھے۔ اس کا ایک روشن ثبوت لھم فی الدنیا خزی نے دیدیا۔ کہ وہ جن کو وہ ذلیل سمجھتے تھے اُنہی کے سامنے آخر ذلت اُٹھانی پڑی۔ قرآن کریم میں بہت موقعوں پر دُنیا اور آخرت کے عذاب یا ایک چھوٹے اور ایک بڑے عذاب کا ذکر اکٹھا کیا گیا ہے۔ تاکہ دُنیا کا عذاب آخرت کے عذاب کے لیئے بطور ثبوت ہو ولنذیقنھم من العذاب الادنیٰ دون العذاب الاکبر۔ یا فرمایا۔ کذالک العذاب ولعذاب الاخرۃ اکبر۔ اسی طرح کی بہت سی مثالیں ہیں اور بعض جگہ تصریح کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ذکر نہیں فرمایا۔ اور بعض جگہ مُطلق عذاب کے ذکر سے دونوں مُراد لے لیتا ہے ❊

۱۱۵ ۱۸۲۔ وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ اس آیت میں قبلہ کا کوئی ذکر نہیں۔ بلکہ پچھلی آیت میں چونکہ اعدا کے لیئے ذلت کی پیشگوئی کی تھی۔ کہ اُس دُنیا میں ان کو ذلیل کیا جائیگا۔ جو درحقیقت مُسلمانوں کے لیئے ایک پیشگوئی تھی۔ کہ اُن کو غالب کیا جائیگا۔ سو مُسلمانوں کے غلبہ کی پیشگوئی کو یہاں اور وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ کہ مسجد حرام اور ان مساجد پر جن سے تم کو آج روکا جاتا ہے۔ کیا بلکہ تم جس طرف کا رُخ کر لوگے۔ اُدھر ہی غلبہ تُمہارے لیئے ہوگا۔ کیونکہ مشرق اور مغرب تو اللہ کا ہی ہے۔ اور ان اللہ واسع علیم سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کے ہاں تنگی نہیں۔ وہ بہت وسعت کے ساتھ دینے والا ہے۔ سو اگر تم مشرق کا رُخ

۱۹۱ ۔ یٰبنی اسرائیل ۔ اس سورت میں یہ تیسری دفعہ بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا ہے ۔ پہلی دفعہ خطاب فرماکر انہیں یہ کہا تھا ۔ کہ اگر تم اپنے اقرار کے مطابق اس نبی کو قبول کرلو ۔ تو ہم بھی تم کو دُنیا میں معزز کر دینگے ۔ دوسری دفعہ پھر خطاب فرماکر بتایا ۔ کہ اگر تم قبول نہیں کرتے تو اُس کا نتیجہ غضب الٰہی کے نیچے رہوگے ۔ اور پھر وہاں سے لیکر یعنی چھٹے رکوع سے شروع کرکے چودھویں رکوع کے اخیر تک ان کو اُن پیشگوئیوں کی طرف توجّہ دلائی گئی ۔ جو حضرت موسےٰ علیہ السلام یا آپ سے پچھلے انبیاء کی معرفت کی گئی تھیں ۔ اور کیا کیا انعامات حضرت موسےٰ کے بعد ان پر نازل ہوئے ۔ اور کیسی کیسی سرکشیاں انھوں نے کیں ۔ اب تیسری دفعہ خطاب کرکے حضرت موسےٰ سے بھی پہلا زمانہ ان کو یاد دلاتا ہے یعنی حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ اور آپ کی دُعائیں اور پیشگوئیاں ۔ کہ اُن سب کا بھی ماحصل یہی ہے ۔ کہ تم اس نبی کو قبول کرو ۔

۱۲۴ ۱۹۲ ۔ واذ ابتلےٰ ابراھیم ربہ ۔ یہاں سے حضرت ابراہیمؑ کا ذکر شروع ہوتا ہے ۔ جو بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل کے مورثِ اعلےٰ ہیں ۔ اور مشرکینِ عرب اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک یکساں واجب الاحترام ہیں ۔ ابتلی کے معنے میں ۔ جیسا کہ مفرداتِ راغب میں ہی دو امر پائے جاتے ہیں ۔ ایک کسی شخص کے حال سے واقفیت حاصل کرنا دوسرے اُسکی خوبیوں اور نقصوں کا اظہار ۔ بعض وقت یہ دونوں امر اس کے معنے میں شامل ہوتے ہیں ۔ اور بعض وقت صرف دوسرا امر ہی ہوتا ہے ۔ فاذا قیل فی اللہ تعالیٰ بلی کذا وا بلاہ فلیس المراد منہ الا ظہور جودتہ وردائتہ دون التعرف لحالہ .... وعلیٰ ھذا قولہ واذا بتلی ابراھیم ربہ پس جملہ کے معنے ہوئے کہ جب اللہ تعالےٰ نے ابراہیم کے کمالات کو ظاہر کرنا چاہا ۔ کلمات سے مُراد احکام ہیں ۔

۱۹۳ ۔ فاتمھن ۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان احکام کو کمال کے ساتھ پورا کر دکھایا ۔ چنانچہ فرمایا ۔ ابراھیم الذی وفی ۔ اور اسی سورت میں فرمایا ۔ اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین ۔

۱۹۴ ۔ قال ومن ذریتی قال لا ینال عھدی الظّٰلمین ۔ عھد سے مُراد عہد نبوّت و امامت ہے ۔ اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے ۔ کہ یہ عہد صرف اسحاق سے نہیں تھا ۔ بلکہ اسمٰعیل سے بھی تھا ۔ بلکہ اسمٰعیل اس میں مقدّم ہے ۔ کیونکہ اسمٰعیل کے متعلق بار بار یہ عہد پایا جاتا ہے ۔ پس عہد ابراہیم کی رُو سے اگر نبوّت کا ایک سلسلہ بنی اسرائیل میں رہا ۔ تو ایسا ہی سلسلہ بنی اسمٰعیل میں بھی چلنا چاہیئے ۔ اور درحقیقت حضرت موسیٰ کی پیشگوئی جس میں اپنی مانند نبی

آیت ۱۱۷

پیشگوئیوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے یعنی جب اُس نے کہدیا ہے کہ ایسا ہوگا۔ کہ یہ مساجد کے ویران کرنے والے ذلیل اور مسلمان کامیاب ہونگے۔ اور جدھر رُخ کرینگے فتح اور نُصرت ان کے ساتھ ہوگی۔ تو سمجھ لو کہ یہ کام اب ہوگیا +

۱۸۶۔ یقول لہ کُن۔ آریوں کا اس پر بڑا اعتراض یہ ہے۔ کہ جب وہ چیز موجود ہی نہیں توکس کو کہتا ہے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تو وہ شے موجود ہوتی ہے۔ سو اس کو خارجی وجود میں آنے کا حکم دیتا ہے۔ اور قضی امرا کہکر تو صاف کر دیا۔ کہ پہلے اس کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ کہ ایسا ہوگا پھر اسی کو فعل میں لے آتا ہے +

۱۱۸ ۱۸۷۔ لولا یکلمنا اللہ او تاتینا اٰیۃ منکر دو باتوں میں سے ایک چاہتے ہیں۔ یا خود اللہ تعالےٰ اُن سے کلام کرے یا وہ عذاب یا نشان جس سے ڈرایا جاتا ہے وہ آجائے۔ اس کا جواب اگلی آیت میں دیا ہے۔ انا ارسلناك بالحق بشیرا و نذیرا۔ یعنی یہ تو بالکل حق امر ہے کہ تم دونوں پیغام پہنچاتے ہو مومنوں کے لیئے خوشخبری۔ اور جو مقابلہ پر آجائیں اُن کیلئے عذاب۔ مگر وہ خوشخبری یا مُبشّرات تو ان کے لیئے ہیں۔ جو پہلے اپنے آپ کو بدیوں سے پاک کرتے اور راہِ حق پر چلتے ہیں۔ سو وہ کلام جو بشارت کے رنگ میں ہوتا ہے۔ وہ تو مومن کو ملسکتا ہے لیکن مومن وہ بنتے نہیں۔ تو پھر دوسرا پہلو تو آکر رہیگا۔ اور عذاب جس سے تُم ڈراتے ہو وہ ٹل نہیں سکتا +

۱۲۰ ۱۸۸۔ ھدی اللہ ھو الھدیٰ۔ یعنی کامل ہدایت نامہ یہی ایک ہے۔ نہ یہودیوں کا مذہب کامل ہے نہ عیسائیوں کا +

۱۸۹۔ ولئن اتبعت اھواءھم۔ ہر ایک مخاطب مُراد ہوسکتا ہے یعنی یہود اور نصاریٰ کے مذہب میں گری ہوئی خواہشات کی پیروی ہے۔ پس اس کا پیرو نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی مخاطب ہیں۔ تو بھی صاف ہے۔ کیونکہ اُن کی خواہشات کی پیروی کا نتیجہ بتایا۔ مالک من اللہ من ولی ولا نصیر۔ یعنی پھر ولایت اور نصرت تجھے نہیں ملیگی۔ مگر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو چونکہ کامل طور پر ولایت اور نصرت ملی اسلیئے معلوم ہؤا۔ کہ آپ نے ان کے اھواء کی پیروی کبھی نہیں کی +

۱۲۱ ۱۹۰۔ یتلونہ حق تلاوتہ۔ شروع آیت میں الذین اٰتینٰھم الکتاب سے مُراد مومن ہیں اور تلا کے معنے اتباع اور پیروی کے بھی آتے ہیں۔ جیسے والقمر اذا تلاھا۔ اور مجاہد نے یتلونہ حق تلاوتہ کے معنے کیئے ہیں یعملون بہ حق عملہ یعنی اس پر عمل کرتے ہیں۔ جیسا کہ حق عمل کرنے کا ہے +

۱۲۴ اسی قوم کو عہد ابراہیم سے خارج کیا جاوے جو عملی رنگ میں اس عہد کو پُورا کر رہی ہے +
دوسرا عہد اللہ تعالےٰ کا ابراہیم کے ساتھ ہے۔ "اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان اُن کے پشت در پشت کے لیئے اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد ہو کرتا ہوں۔ کہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خُدا ہونگا۔ اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام مُلک جس میں تُو پردیسی ہے دیتا ہوں۔ کہ ہمیشہ کے لیئے مِلک ہو" (پیدائش ۱۷ : ۷ و ۸) اب وہ کنعان کا مُلک جو ازرُوئے عہد الٰہی ابراہیمؑ کو ملا ہے تیرہ سو سال (۱۳۰۰) سے جب سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم دُنیا میں پیدا ہُوئے کس کے پاس ہے۔ اس دوسرے عہد میں اللہ تعالےٰ نے محمدؐ عربی صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایک ایسی کھُلی اور بیّن شہادت رکھّی ہے۔ کہ کوئی عیسائی یا یہُودی آپ کی صداقت کا اِنکار نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ وہ حضرت ابراہیم کے ساتھ ان دونوں عہدوں کو جھُوٹا قرار دے۔ صلیبی جنگوں کا منشاء سوائے اسکے کیا تھا۔ مگر جو بات خُدا بطور نشان قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کو کون مٹا سکتا ہے۔ ایک طرف اگر حضرت موسیٰ کی مثیل موسیٰ والی پیشگوئی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایک بیّن شہادت ہے۔ تو دوسری طرف حضرت ابراہیمؑ کا یہ عہد ایک ایسا روشن ثبُوت ہے۔ کہ جس کا جواب کسی یہُودی یا عیسائی کے پاس کچھ نہیں۔ اِس لیئے انہی دونوں اُمُور کو اہل کتاب پر اتمام حجّت کیلیئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے شرُوع میں رکھّا ہے۔ اور ان پر اس قدر زور دیا ہے کہ بار بار اُن کا ذکر فرمایا۔ یہ دو باتیں ایک مُسلمان کے ہاتھ میں ایسے زبردست ہتھیار ہیں۔ کہ ان کے سامنے کوئی ڈھال کام نہیں دے سکتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسلام پر خاص احسانات ہیں۔ ذٰلك فضل اللہ یؤتیه من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم +

۱۲۵ ۱۹۵- اَلبیت۔ یعنی بیت اللہ یا خانہ کعبہ عرب میں اس پاک گھر کی شُہرت اور عزّت ایسے قدیم زمانہ سے چلی آتی تھی۔ کہ اس زمانہ کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ جب بیت اللہ کو لوگ نہ جانتے ہوں۔ چُنانچہ میور جس نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی لائف محض ایک مفسری کے رنگ میں لکھی ہے۔ اور اس طرح پر اس کی شہادت ایک مخالف کی شہادت ہے۔ اپنی کتاب میں لکھتا ہے "مکّہ کے مذہب کی نمایاں خصُوصیات کی ابتدا کے لیئے ایک نہایت ہی قدیم زمانہ تجویز کرنا پڑتا ہے۔ ڈائیڈ ورس سکولس سنہ عیسوی سے بھی نصف صدی پہلے لکھتا ہوا عرب کا ذکر کرتے ہُوئے جو بحیرۂ احمر پر واقع ہے لکھتا ہے۔ کہ اس مُلک میں ایک معبد ہے جس کی عرب لوگ بہت ہی عزّت کرتے ہیں۔ ان الفاظ میں یقیناً

کی خبر دی تھی۔ اسکی بنا بھی وہی عہد ابراہیمی ہے۔ کیونکہ جب ابراہیم کی اولاد کی ایک شاخ نے عہد ابراہیمی سے حصّہ پایا۔ تو یہ ضروری تھا کہ دوسری شاخ بھی اس سے حصّہ پاتی۔ سب سے پہلے ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اسمٰعیل صراحتاً اِس عہد میں شامل ہیں۔ اوّل اسمٰعیل اور اسحٰق دونوں کے پیدا ہونے سے پہلے فرمایا "میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤنگا۔ اور تجھ کو مُبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا۔ اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دونگا (پیدائش ۱۲: ۲ و ۳) اب یہاں برکت دینے کے لفظ قابل غور ہیں۔ کیونکہ سوائے مُسلمانوں کے کما بارکت علےٰ ابراھیم وعلیٰ اٰل ابراھیم کہنے والی اور کوئی قوم نہیں پس جو ابراہیمؑ کو برکت دیتے ہیں۔ وہ ضرور خدا تعالےٰ کی برکات سے حصّہ پاتے ہیں پھر پیدائش ۱۵: ۴ میں حضرت اسمٰعیل کی پیدائش سے پہلے فرمایا۔ "جو تیرے صُلب سے پیدا ہوگا وہی تیرا وارث ہوگا" کیا اسمٰعیل ابراہیم کے صلب سے تھا یا نہیں؟ پھر ہاجرہ کے ساتھ وہی وعدہ ہے جو ابراہیم کے ساتھ یعنی ہاجرہ کو فرشتے نے کہا "میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤنگا۔ کہ وہ کثرت سے نہ گنی جائے" (پیدائش ۱۶: ۱۰) اور حضرت ابراہیمؑ کو فرمایا "اب آسمان کی طرف نگاہ کر اور ستاروں کو گن اگر تُو انھیں گن سکے۔ اور اُسے کہا کہ تیری اولاد ایسی ہی ہوگی" (پیدائش ۱۵: ۵) پھر اسمٰعیل کا نام لیکر فرمایا۔ "اور اسمٰعیل کے حق میں مَیں نے تیری سُنی۔ دیکھ مَیں اسے برکت دُونگا اور اسے برومند کرونگا۔ اور اسے بہت بڑھاؤنگا۔ اور اس سے بارہ سردار پیدا ہونگے۔ اور میں اسے بڑی قوم بناؤنگا" (پیدائش ۱۷: ۲۰) اب برکت دینا وہی لفظ ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے کہا تھا +

دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا عہد جو ابراہیم سے تھا۔ اور ابراہیم کا عہد جو اللہ تعالیٰ سے تھا۔ وہ بھی بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں پر صادق آتا ہے۔ چُنانچہ ابراہیمؑ کے عہد کو تو ان الفاظ میں بیان کیا۔ "اور میرا عہد جو میرے اور تُمھارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے۔ جسے تُم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جاوے .... اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا۔ جو میرے اور تُمھارے درمیان ہے" اب اس عہد کو دیکھ لو کہ اوّل تو بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل نے اسے یکساں پُورا کیا۔ مگر حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کی ایک رُوحانی اولاد ایسی پیدا ہُوئی۔ کہ اُس نے اس عہد کو پُورا کرکے دکھایا۔ مسلمانوں کے سوائے کونسی قوم ہے جو ختنہ کرتی ہے۔ اور اس عہد کو یاد رکھتی ہے۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ

خود بخود ہی کسی طرح ہلاک ہوگیا۔ جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں یہ ایک نشان رکھا ہے۔ اور یہ وہ کھلا اور بیّن نشان ہے۔ جس کی مثل کوئی دوسرا مذہب پیش نہیں کرسکتا۔ کہ خانہ کعبہ ہمیشہ امن کی جگہ اور خود دشمنوں سے امن میں رہیگا۔ اپنی عزّت کرنے والوں کے سوائے دوسروں کے ہاتھ میں نہ جائیگا۔ حدیث میں یہ بھی آیا ہے۔ کہ یہ مقام دجّال کے فتن اور طاعون سے بھی امن میں رہیگا +

۱۹۸۔ واتخذوا من مقام ابراھیم مصلّی۔ مقام ابراہیم خانہ کعبہ کے اندر ایک معروف مقام ہے۔ مُصلّی کے معنے نماز کی جگہ اور بعض نے قبلہ بھی کیئے ہیں۔ میرے نزدیک اس میں خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم ہے۔ اور یہاں وہ وجوہات دیگئی ہیں۔ کہ کیوں خانہ کعبہ کو قبلہ مُسلمانوں کے لیئے مقرّر کیا گیا۔ اور سیقول السّفھاء سے مخالفین کے اعتراضوں کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ دو وجوہ کا ذکر تو پہلے ہوچکا۔ تیسری وجہ خود مقام ابراہیم کے لفظ کے اندر رکھدی ہے۔ کیونکہ ابراہیمؑ کے ساتھ جو وعدے اُسکی اولاد میں سے بنی اسمٰعیل کے متعلق تھے۔ اُن کے پورا ہونے کے لیئے یہ ضروری تھا۔ کہ یہی مقدس گھر آیندہ کے لیئے قبلہ قرار دیا جاتا۔ خانہ کعبہ سے حضرت ابراہیمؑ کا تعلق خود اس امر سے ظاہر ہے۔ کہ نبی کریم صلے اللہ وسلم سے پہلے اس کے اندر وہ مقام موجود تھا جس کو مقام ابراہیم کہتے ہیں۔ اور خود خانہ کعبہ بھی مقام ابراہیم تھا۔ کیونکہ یہیں آکر حضرت ابراہیمؑ ٹھیرے تھے +

۱۹۹۔ وعھدنا الی ابراھیم واسمعیل ان طھرا بیتی۔ جیسا کہ نوٹ ۱۹۵ میں دکھایا گیا ہے۔ خانہ کعبہ نہایت قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے۔ یہاں تک کہ میور نے یہ اعتراض کیا ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ اسقدر قدیم نہیں جسقدر قدامت کا پتہ خانہ کعبہ کا چلتا ہے۔ اور درحقیقت یہ کوئی اعتراض نہیں بلکہ امر حق ہے۔ کہ خانہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ سے بھی پہلے موجود تھا۔ قرآن کریم نے ایک جگہ خانہ کعبہ کے متعلق فرمایا۔ بیت العتیق جس کے معنے نہایت قدیم گھر کے ہیں۔ اور دوسری جگہ اس سے بڑھ کر یہ صراحت فرمائی۔ کہ اسے اوّل بیت وضع للناس کہا جس کے یہ معنے ہیں۔ کہ سب سے پہلا معبد دُنیا میں یہی گھر تھا۔ اب چونکہ حضرت ابراہیمؑ سب سے پہلے نبی نہیں ہیں۔ اس لیئے خانہ کعبہ یقیناً حضرت ابراہیم سے پہلے کا ثابت ہوتا ہے۔ اور اس طرح پر تاریخ جو خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ سے پہلے کا ثابت کرتی ہے۔ وہ قرآن کریم کے اسکو اوّل بیت قرار دینے کے بالکل مُطابق ہے +

خانہ کعبہ کا جو مکّہ میں ہے ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ اور کسی معبد کا عرب میں نام بھی نہیں۔ جس کی عزّت عرب میں عام طور پر ہوتی ہو۔ زبانی روایات سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ قدیم ترین زمانہ سے خانہ کعبہ کا حج عرب کے ہر گوشہ کے لوگ کرتے رہے ہیں۔ یمن اور حضرموت سے۔ خلیج فارس کے کنارے سے۔ شام کے جنگلوں سے حیرہ اور عراق عرب سے لوگ ہر سال مکّہ میں جمع ہوتے ہُوئے پائے جاتے ہیں۔ اس قدر عام طور پر سارے مُلک کے اندر اس عزّت کا حاصل ہونا یقیناً ایک ایسے قدیم زمانہ سے ہونا چاہئے۔ جس کے پرے کوئی اَور قدیم زمانہ تجویز نہیں ہوسکتا"۔

۱۹۶۔ مثابۃ للنّاس۔ مثابۃ جو ثاب یثوب سے مشتق ہے۔ جس کے معنے لوٹ کر آنے کے ہیں۔ وہ جگہ ہے جہاں بار بار لوگ کثرت کے ساتھ لوٹ کر آئیں۔ اس لفظ میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ یہ مقام ہمیشہ کیلئے ایک زیارت گاہ رہیگا۔ اور جب تک دُنیا میں انسان ہیں۔ اُس وقت تک وہاں ہر سال لوگ جمع ہوتے رہینگے۔ یہ خانہ کعبہ کے لئے پہلی پیشگوئی ہے۔ کہ یہ کبھی متروک نہ ہوگا نہ ہی برباد ہوگا۔ نہ ہی یہاں آنے والوں کو دُنیا کی کوئی طاقت روک سکیگی۔

۱۹۷۔ امنا۔ یہ خانہ کعبہ کی دوسری خصُوصیّت ہے۔ کہ یہ ہمیشہ امن کی جگہ رہیگا۔ چُنانچہ اس کا نام ہی حرم ہے۔ جس کے اندر ہر ایک قسم کی حفاظت حاصل ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا حرماً امنا۔ وہ ملک عرب جس کی ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ ہمیشہ برسرِ پیکار رہتی تھی۔ اور جن کی خانہ جنگیاں کبھی ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ ان خونخوار طبائع کو اللہ تعالےٰ نے اس مقدّس گھر کے سامنے ایسا جُھکا یا ہُوا تھا۔ کہ خطرناک سے خطرناک دُشمن سے بھی جب وہ حرم کے اندر آجائے بدلہ نہیں لے سکتے تھے۔ نہ اُس کے اندر کبھی کوئی جنگ ہوتا تھا۔ مگر اس لفظ امن میں ایک یہ بھی پیشگوئی موجود ہے۔ کہ کوئی دشمن اس پر کبھی غالب نہ آسکیگا۔ اور یہ گھر ہمیشہ ان لوگوں کی حفاظت میں رہیگا۔ جو اُس کی سچے دل سے عزّت کرنے والے اور اُسے مُقدّس اور پاک گھر سمجھتے ہیں۔ جب عربوں میں مقابلہ کی کوئی طاقت نہ تھی۔ اس وقت ایک عیسائی بادشاہ نے خانۂ کعبہ کے انہدام کی نیّت سے اُس پر چڑھائی کی۔ اور ایک جرّار لشکر کے ساتھ چڑھ آیا۔ گو اُس وقت عرب بُت پرست تھے۔ مگر اس گھر کا سچے دِل سے احترام کرتے تھے۔ اِس لئے اللہ تعالےٰ نے اپنا نشان دکھانے کے لئے اس وقت اسے دوسرے کے ہاتھ میں جانے نہیں دیا۔ اور نہ ہی اُس لشکر کو خانہ کعبہ تک پہنچنے دیا۔ بلکہ وہ لشکر بالکل قریب پہنچکر

آیت ۱۲۹

۲۰۳-ربنا وابعث فیھم رسولا منھم-حضرت ابراہیم کی دُعائیں جوخانہ کعبہ کے بنانے کے وقت کی ہیں اُنہی میں سے یہ دُعا بھی ہے-کہ اسکے اندر ایک ایسا کامل رسُول پیدا ہو جو کامل طور پر اس کا تزکیہ کردے-ان تمام دُعاؤں کی صداقت کا ثبُوت خود اُن کا پُورا ہونا ہے-جب قرآن میں ان دُعاؤں کا ذکر ہؤا-اس وقت نہ تو کوئی اُمّت مُسلمہ پیدا ہُوئی تھی صرف چند مسلمان تھے-اور اُن کی زندگیاں بھی خطرہ میں تھیں-نہ ہی ابھی ان عربوں کا وہ کامل تزکیہ ہؤا تھا جن کا ذکر دُعا میں ہے-کیونکہ سوائے معدودے چند آدمیوں کے کُل کے کُل بُت پرستی شرک اوہام اور ہر قسم کے رذائل میں ابھی مُبتلا تھے-پس یہ دُعائیں ابھی تک خود ایک پیشگوئی کا رنگ اپنے اندر رکھتی تھیں-اور کس شان سے یہ پیشگوئی پُوری ہُوئی-کہ جن پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالےٰ کی آیات کو پڑھا-وہ خود دُنیا کے دوسرے لوگوں پر ان کے پڑھنے والے ہوگئے-جن کا آپ نے تزکیہ کیا وہ دُنیا کی مُزکّی بنے-جن کو آپ نے کتاب اور حکمت سکھائی-وہ دُنیا کے مُعلّم بن گئے-اسی کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں-لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا-حضرت ابراہیم کی اسی دُعا کی طرف اشارہ کرکے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا-انا دعوۃ ابی ابراھیم+

رکوع ۱۶/۱۶

آیت ۱۳۰

۲۰۴-ومن یرغب عن ملۃ ابراھیم الا من سفہ نفسہ-حضرت ابراہیم کے ساتھ وعدوں اور حضرت ابراہیم کی دُعاؤں کی طرف توجّہ دلاکر درحقیقت قرآن کریم نے تینوں قوموں یعنی یہودیوں عیسائیوں اور مُشرکین عرب پر اتمام حُجّت کردیا-کیونکہ تینوں کے نزدیک ابراہیم کا تقدّس مُسلّمہ تھا-پس اس اتمام حُجّت کے بعد جو ابراہیم کی ملّت کو ترک کرتا ہے-وہ درحقیقت اپنے آپ کو احمق بناتا ہے-سفہ کے اصل معنے خفت کے ہیں سفہ نفسہ میں بعض نے سفہ کو متعدّی کہا ہے-مگر اکثر کے نزدیک نفسہ بطور تمیز کے واقع ہؤا ہے-جیسے الم راسہ میں یا اس کی تقدیر سفہ فی نفسہ ہے+

آیت ۱۳۵

۲۰۵-بل ملۃ ابراھیم حنیفا-حنیف کے معنے مستقیم کے ہیں-یعنی جو استقامت کی حالت میں ہو-نہ ایک طرف جھکا ہو اور نہ دوسری طرف-کونوا ھودا او نصارٰی کا جواب دیا ہے-بل ملۃ ابراھیم حنیفا-اسلیئے کہ یہود تفریط کی طرف مائل ہوئے اور نصارےٰ افراط کی طرف-فرمایا کہ ہدایت نہ تو افراط کی طرف جانے سے ملتی ہے نہ تفریط کی طرف-بلکہ حنیف یا مستقیم رہنے کی حالت کا نام ہی ہدایت ہے-پس ہدایت کا مذہب وہ ہے جو افراط و تفریط دونوں سے خالی ہو-یہود کی مثال ہمیشہ تفریط کے لیئے دیجاتی ہے-کیونکہ اُنھوں نے مسیح کے مرتبہ کا انکار کیا-اور نصارےٰ کی مثال افراط کیلیئے دی جاتی ہے کیونکہ انھوں نے اسی مسیح کے مرتبہ میں غلو کیا

آیت ۱۳۶

۲۰۶-قولوا اٰمنا باللہ....اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مذہب اسلام کی جامعیت کو بیان فرمایا ہے

آیت ۱۲۵

یہاں جو حکم حضرت ابراہیمؑ اور اسمعیلؑ کو بیت اللہ کے پاک کرنے کا دیا گیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ بیت اللہ موجود تھا۔ مگر جس طرح نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کیلئے ضروری ہؤا۔ کہ اسے بتوں سے ہمیشہ کے لیئے پاک کردیں۔ اور شرک کو کامل طور پر اس گھر سے مٹا کر دُنیا سے شرک کی بیخ کنی کی بُنیا د رکھ دیں۔ اسی طرح پر اس وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل علیہم السلام کو کسی ویسی ہی تطہیر کا حکم ہوا ہوگا۔ مگر اس کی آخری تطہیر بطور نشان اس نبی کے لیئے مُقدّر تھی۔ جس نے توحید کا کامل مُعلّم دُنیا میں بن کر آنا تھا +

۱۲۶

۲۰۰- ربِّ اجعل ھذا بلداً امناً۔ حضرت ابراہیمؑ کی دُعا میں دو امُور ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ جگہ ایک شہر بن جائے۔ اور دوسرے وہ شہر بھی امن والا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمعیلؑ کو یہاں چھوڑا۔ اس وقت وہاں کوئی شہر نہ تھا +

۲۰۱- وارزق اھلہ من الثمرات۔ حضرت ابراہیم کا اپنی ذُرّیت کو بواد غیر ذی زرع رکھکر پھر اُس کے لیئے یہ دُعا کرنا۔ کہ وہاں ہر قسم کے پھل پہنچ جائیں۔ اور اس دُعا کا آج یہ نقشہ نظر آتا کہ دُنیا کا کوئی پھل نہیں جو مکّہ معظمہ میں نہیں پہنچ جاتا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے کامل علم اور قدُرت کے نشانات میں سے ہے +

حضرت ابراہیم کی دُعا کا مقصد یہ معلُوم ہوتا ہے۔ کہ اس میں صرف مومن ہی آباد رہیں۔ کیونکہ آپ کہتے ہیں۔ کہ تُو ثمرات ان لوگوں کو عطا فرما جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ کافر بھی ہونگے۔ تو بھی دُنیا کے سامان ان کو دیئے جائیں گے۔ ہاں یہ سامان یا متاع چند روزہ ہوگا۔ آخرت میں اُن کے لیئے کوئی حصّہ نہ ہوگا۔ یا یہ مُراد ہے کہ کُفر ہمیشہ کیلئے یہاں سرسبز نہیں ہوگا۔ تھوڑے دنوں بعد اس کا خاتمہ ہوجائیگا۔ سو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے آنے سے واقعی مُلک عرب میں کُفر کا خاتمہ ہوگیا +

۱۲۷

۲۰۲- واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسمعیل۔ قواعد قاعدۃ کی جمع ہے۔ جس کے معنے بُنیادوں کے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اور اسمعیل بُنیادوں کو اُٹھاتے تھے۔ یعنے اسے دوبارہ بنا رہے تھے۔ نوٹ ع۱۹۵ و ع۱۹۹ میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اسی کی مؤید ابی ذر کی روایت سے ایک حدیث ہے۔ قلت یا رسُول اللہ ای مسجد وضع علی الارض اولا قال المسجد الحرام یعنی میں نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ کہ کون سی مسجد سب سے پہلے دُنیا میں قائم کی گئی۔ تو آپ نے فرمایا۔ مسجد الحرام +

# الجزء الثانی

۱۴۲

۲۱۲- سیقول السفھاء - یہاں سے وہ مضمون شروع ہوتا ہے - جو تحویل قبلہ کے نام سے مشہور ہے - پچھلے رکوع کے شروع میں فرمایا تھا - ومن یرغب عن ملۃ ابراھیم الا من سفہ نفسہ - تو چونکہ ملّت ابراہیم تو یہی چاہتی تھی - کہ بیت اللہ قبلہ ہو - اور اسی لیئے ارشاد بھی ہُوا تھا - واتخذوا من مقام ابراھیم مُصلّی - تو اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ کو اختیار کرنے پر یہودیوں کا معترض ہونا باوجُود ان وعدوں کے جنکا ان کو علم تھا - کہ حضرت ابراہیم کے ساتھ ہو چکے ہیں - سفاہت اور کم عقلی کے سوائے اور کیا تھا +

۲۱۲- ما ولّٰھم عن قبلتھم التی کانوا علیھا - قبلہ مقابلۃ سے ہے - بعض کے نزدیک اس سمت کا نام ہے - جس کی طرف اِنسان مُنہ کرے - اور بعض کے نزدیک اِنسان کی اس حالت کا نام ہے - جس میں وہ کسی کی طرف مُتوجہ ہو - اور مُفسّرین نے لکھا ہے - کہ بیت اللہ تو ایک مقام ہے - پس مکان پر اس لفظ کا اطلاق کرنا جو اِنسان کی حالت کو ظاہر کرنیوالا ہے - اس غرض کے لئے ہے - کہ تا معلوم ہو کہ اصل غرض اس مکان کی عبادت نہیں - بلکہ اِنسان کے اندر ایک حالت کا پیدا کرنا ہے +

قبلتھم اور کانوا میں ضمیر یا تو مسلمانوں کی طرف جاتی ہے - اور یا بنی اسرائیل کے ان انبیاء علیہم السلام کی طرف جن کا ذکر پچھلی آیات میں ہے - یعنی یہودیوں کا اعتراض یا تو یہ تھا - کہ جب یہ سارے نبیوں کو سچّا مانتے ہیں - تو ان بنی اسرائیلی نبیوں کا قبلہ تو بیت المقدس تھا - اس کی طرف سے مُنہ کیوں پھیر لیا - اگر یہ اُن پر ایمان لاتے ہیں - تو قبلہ بھی وہی ہونا چاہئیے - اور یا یہ کہ یہ مسلمان جو اب تک بیت المقدس کی طرف مُنہ کرتے تھے - اب انہوں نے اپنا قبلہ کیوں بدل لیا - بُخاری میں تحویل قبلہ کے مُتعلّق مُتعدّد روایات ہیں - اور چونکہ یہ ایک تاریخی رنگ کا واقعہ ہے - جس پر معتبر شہادت ملتی ہے - اور تحویل قبلہ قرآن کریم کی کسی آیت کے خلاف نہیں - اسلیئے اس واقعہ کو صحیح تسلیم کرنا پڑتا ہے - میں ان میں سے صرف ایک روایت کا یہاں ذکر کرتا ہوں عن البراء ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صلی الی بیت المقدس ستۃ عشر شھرا او سبعۃ عشر شھرا وکان یعجبہ ان تکون قبلتہ قبل البیت وانہ صلی او صلاھا صلوۃ العصر

آیت ۱۳۶

فرمایا کہ مسلمان تو اس سب پر ایمان لاتے ہیں جو نبیوں پر اُتارا گیا۔ جو وحی یہود کے نبیوں کی طرف اُتاری گئی اُس پر بھی۔ جو عیسائیوں کے نبی کی طرف اُتاری گئی اس پر بھی۔ بلکہ حضرت موسےٰ اور عیسےٰ کا ذکر فرما کر ما اوتی النبیون من ربھم میں یہ بتا دیا۔ کہ دُنیا کے کسی نبی کی طرف جو کچھ اُتارا گیا۔ ہم اس سب پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ گویا ما انزل من قبلك کی تفسیر ہے۔ اور ما انزل من قبلك اس کی تفسیر ہے۔ یعنی ایک مسلمان ان تمام نبیوں پر ایمان لاتا ہے۔ جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ خواہ وہ کسی قوم میں اور کسی مُلک میں ہوئے ہوں۔ لا نفرق بین احد منھم میں مُراد ایسا تفرقہ ہے کہ بعض نبیوں کو مانا جاوے اور بعض کا انکار کیا جائے۔ چونکہ مسلمان سب نبیوں کو مانتا ہے۔ اِس لیئے وہ تفرقہ کسی میں نہیں کرتا +

۲۰۷۔ الاسباط۔ سبط بنی اسرائیلیوں میں عرب میں قبیلہ کے قائمقام ہے۔ حضرت یعقوبؑ کی اولاد کو اسباط کہتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک شخص ایک قوم کا جد بنا۔ اور انہی بارہ پر بنی اسرائیل کی بارہ قومیں ہوگئیں +

آیت ۱۳۷

۲۰۸۔ فی شقاق۔ شقاق سے مُراد مخالفت ہے۔ یعنی اب بھی اگر نہ مانیں تو گویا درحقیقت سوائے مخالفت اور عداوت کے اور کچھ نہیں۔ اسی لیئے آگے فرمایا فسیکفیکھم اللہ جس کے معنے ہیں کفاك اللہ شرھم۔ یعنی اُن کی شر سے اللہ تعالیٰ تم کو محفوظ رکھیگا۔ اور اُن کی مخالفت کچھ بگاڑ نہیں سکیگی۔ یہ بھی ایک پیشگوئی ہے +

آیت ۱۳۸

۲۰۹۔ صبغۃ اللہ۔ صبغۃ کے معنے رنگ کے ہیں یہاں مُراد دین ہے کیونکہ جس طرح رنگ کا اثر کپڑے پر ہوتا ہے اسیطرح دین کا اثر انسان پر ہوتا ہے۔ اصطباغ (بپتسمہ) اسی سے مشتق ہے۔ خُدائی بپتسمہ تو یہ ہے کہ انسان تمام نبیوں کو مان لیتا ہے۔ اور اس سے بہتر اور کونسا دین ہوسکتا ہے جسمیں کُل انبیاء کی صداقت کو مان لیا جائے۔ ہاں ایک انسانوں کا تجویز کردہ بپتسمہ بھی ہے جس کو اختیار کر کے انسان سب نبیوں کو نعوذ باللہ جھوٹا ٹھیراتا ہے مگر یہ عقیدہ آخر دُنیا میں گر جائیگا۔ اور الٰہی دین قائم ہوگا +

آیت ۱۳۹

۲۱۰۔ ھو ربنا و ربکم۔ ہر ایک قوم اللہ تعالیٰ کی رُوحانی رُبوبیت کو اپنے تک محدُود کر کے اُسے صرف اپنا ہی ربّ قرار دیتی ہے مگر اسلام کہتا ہے۔ کہ اس نے تمہاری رُبوبیت بھی کی ہماری بھی کرتا ہے پھر اس امر میں کے ساتھ جھگڑنے والا کیسا احمق ہے +

۲۱۱۔ ولنا اعمالنا ولکم اعمالکم۔ ہر ایک قوم اپنے اپنے اعمال کا بدلہ پائیگی۔ ہاں جن کے اعمال خالص اللہ تعالےٰ کے لیئے ہیں ونحن لہ مخلصون۔ وہ مُسلم ہی ہیں۔ اور اللہ تعالےٰ اُنکے اخلاص کو اسی دُنیا میں اعمال کے نتائج دکھا کر ظاہر کر دیگا۔ کچھ نہ کچھ نیکی تو سب میں ہوتی ہے۔ مگر اسلام کامل نیکی کی راہ سکھاتا ہے۔ وہ راہ جسمیں نیکی خالص ہے۔ بدی کی ملاوٹ نہیں یہی اسلام کا خاص امتیاز ہے +

وصلی معہ قوم فخرج رجل ممن کان صلی معہ فمر علی اهل المسجد وهم راکعون قال اشهد بالله لقد صلیت مع النبی صلی الله علیه وسلم قبل مکة فداروا کما هم قبل البیت - براء سے روایت ہے - کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف سولہ یا سترہ مہینے نماز پڑھی - اور آپ کو یہ اچھا معلوم ہوتا تھا - کہ آپ کا قبلہ بیت اللہ کی طرف ہو - اور کہ آپ نے اس قبلہ کی طرف عصر کی نماز پڑھی (یعنی بیت اللہ کیطرف) پس ایک آدمی ان لوگوں میں سے جنہوں نے آپ کے ساتھ نماز پڑھی تھی نکلا - اور ایک مسجد میں نمازیوں پر گزرا جو رکوع کی حالت میں تھے - اور کہا کہ میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ میں نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھی ہے - پس ان لوگوں نے بھی اسی حالت میں بیت اللہ کی طرف منہ پھیر لیا ؎

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے - کہ مدینہ تشریف آوری کے بعد سولہ یا سترہ مہینے تک نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے - اور اس کے بعد خانہ کعبہ کی طرف - اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے - کہ مدینہ تشریف آوری سے پہلے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کس طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے - بعض لوگوں کا خیال ہے - کہ مکہ میں آپ بیت اللہ کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے - اور مدینہ میں آکر بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنی شروع کی - اور صرف سولہ مہینہ بعد دوسری تحویل قبلہ ہوئی - مگر اس کا کوئی ثبوت قرآن کریم سے قطعاً نہیں ملتا - اور نہ ہی صحیح حدیث سے ملتا ہے - اسی بے ثبوت بات کی بنیاد پر عیسائیوں نے یہ اعتراض بھی کیا ہے - کہ مکہ میں مشرکوں کو خوش کرنے کیلئے خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے - مدینہ میں آکر یہودیوں کو خوش کرنے کیلئے بیت المقدس کی طرف منہ کیا - اور آخر جب دیکھا کہ یہودیوں کو اس طرح سے وہ اسلام میں نہیں لا سکتے - تو پھر خانہ کعبہ کی طرف قبلہ تبدیل کر لیا - مگر یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے - کہ قرآن شریف میں دو تحویلوں کا ذکر کہیں نہیں ہے - صرف ایک ہی تحویل کا ذکر ہے - بات صرف یہ تھی کہ جب تک آپ مکہ معظمہ میں تھے - اس وقت تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے میں خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ نہ ہوتی تھی - لیکن مدینہ منورہ چونکہ مکہ اور بیت المقدس کے درمیان تھا - اور خانہ کعبہ کی طرف منہ کرنے میں بیت المقدس کی طرف پیٹھ ہوتی تھی - اور بیت المقدس کی طرف منہ کرنے میں خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ ہوتی تھی - اسلئے یہ دقت وہاں آکر محسوس ہوئی ؎

شریعت کے سارے احکام چونکہ بتدریج نازل ہوئے ہیں - جب تک کوئی حکم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ

# نکات القرآن

## حصۂ دوئم

(ڈیڑھ پارہ)

از ابتدائے پارۂ دوئم

تا

آخر سورۂ بقرہ


مرتبہ

مولوی **محمد علی** صاحب ایم اے



سنہ ۱۹۱۵ء

طبع اوّل　　تعداد اشاعت ایکہزار　　قیمت فی جلد ۶ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

## نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

جب سے قرآن کریم کے درس کا سلسلہ میں نے لاہور میں شروع کیا۔ اکثر احباب یہ خواہش ظاہر کرتے رہے کہ اس درس کے نوٹ ساتھ ساتھ اخبار میں شائع ہوتے رہیں۔ اِس کیلئے یہ ضرورت تھی۔ کہ ہمارے احباب میں سے کوئی اس قدر ہمت کرتا۔ کہ روزانہ ان نوٹوں کو لکھ کر وہ مجھے دکھا لیتا۔ لیکن اوّل تو اس کام کو مستقل طور پر ذمہ لینا مشکل تھا۔ اور دوسرے یہ طریق قرآن کریم کی تفسیر کی اشاعت کا مجھے پسند بھی نہیں۔ بسا اوقات ہو جاتا ہے۔ کہ کہنے والے کا کچھ منشاء ہوتا ہے۔ سننے والا کچھ سمجھ لیتا ہے۔ یا بعض ضروری امور رہجاتے ہیں غیر ضروری امور درج ہو جاتے ہیں پھر اگر خیال کیا جائے۔ کہ تحریر کو دیکھ کر اپنے حسب منشاء کر دیا جائے۔ تو یہ بھی مشکلات سے خالی نہیں ہوتا بعض وقت ایک لکھی ہوئی تحریر کو درست کرنے پر اصل تحریر لکھنے سے بھی زیادہ وقت خرچ آجاتا ہے۔ اور پھر بھی وہ اطمینان نہیں ہوتا جو اپنی تحریر پر انسان کر سکتا ہے بالخصوص قرآن کریم کی تفسیر کے نازک معاملہ میں۔ اور پھر اخباروں کی جو اکثر حالت دیکھی جاتی ہے اُسے مدّنظر رکھ کر بھی مجھے یہ پسند نہ تھا۔ کہ قرآن کریم پر خواہ نوٹ ہی ہوں۔ مگر اخبار کے ساتھ اُن کی بے ادبی کا احتمال ہے۔ لہذا ان جملہ امور کو ایک طرف اور احباب کی خواہش کو دوسری طرف مدّنظر رکھ کر میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ سر دست ایک پارہ کے نوٹ خود لکھ کر شائع کردوں۔ یہ نوٹ بعینہ تو وہی نہیں ہوسکتے۔ جو میں نے درس میں بیان کئے ہونگے۔ مگر اکثر وہی باتیں ہیں۔ ہاں جہاں زبانی بعض جگہ مضمون کو کھولنا پڑتا ہے۔ تو تحریر میں اس کو تھوڑی جگہ میں لانے کی ضرورت ہوتی ہے حتّے الوسع میں نے ان میں یہ کوشش کی ہے۔ کہ یا تو ان موٹے موٹے امور کے جوابات کا ذکر کردیا جائے جو آج کل بطور اعتراض کے قرآن پر پیش کئے جاتے ہیں۔ یا مشکل مقامات کو کھول دیا جائے۔ اور یا بعض وہ باتیں جن سے قرآن مجید اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا اظہار ہوتا ہے۔ اُن کو بیان کردیا جائے۔ اور یہی باتیں بالخصوص میں نے اپنے درس قرآن میں مدّنظر رکھی ہیں۔ درس میں بعض اور پہلوؤں پر بھی بحث ہوتی ہے۔ مگر بخوفِ طوالت میں نے اُن کو چھوڑ دیا ہے +

آیندہ یہ سلسلہ جاری رہ سکیگا یا نہیں۔ اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پارۂ اول کے ختم ہونے پر چونکہ کچھ جگہ بچی تھی اس لئے میں نے وہاں دوسرے پارے کے کچھ نوٹ دیدیئے ہیں۔ اگر آیندہ یہ سلسلہ جاری رہا بھی تو غالبًا نوٹ اور مختصر ہو جائیں گے۔ کیونکہ پہلے دو ایک پاروں میں بہت سی باتیں آجائینگی جن کو پھر دوہرانے کی بجائے حوالہ دیدینا کافی ہوگا +

یہ بھی ظاہر کردینا ضروری ہے۔ کہ ان نوٹوں میں میں نے اکثر جگہ حوالجات نہیں دیئے۔ حوالجات کا پورا التزام انگریزی ترجمہ کے نوٹوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اگر کوئی صاحب کسی امر کے متعلق حوالہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس کریں۔ تو میں دے سکتا ہوں۔ اِس مختصر نوٹ میں یہ ظاہر کرنا مشکل ہے۔ کہ کن اصول کو میں نے مدّنظر رکھا ہے۔ ہاں مختصرًا اتنا کہہ سکتا ہوں۔ کہ میں نے زیادہ تر قرآن کریم کو قرآن کریم کے ہی دوسرے مقامات سے حل کرنے کی کوشش کی ہے پھر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم یا صحابہ سے جو معنے مل گئے ہیں۔ ان کو مقدّم کیا ہے۔ اور ان کے علاوہ اپنی رائے کو لغت کے بھی ماتحت کیا ہے +

قرآن کریم کی خدمت میں جہاں سے کوئی مفید بات مل سکے میں اس کے لینے کے لئے تیار ہوں۔ اسلئے جو صاحب کسی قسم کا مشورہ اس کے متعلق دیں گے میں اُن کا ممنون ہونگا۔ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ہے۔ کہ وہ میری محنت کو کسی کی بھلائی کا موجب کرے قبولیت وہی ہے جو اس کی نگاہ میں ہو۔ لوگوں کے قبول کرنے یا رد کرنے کی میں چنداں پرواہ نہیں کرتا۔ نعم المولیٰ و نعم النصیر +

لاہور۔ میکلوڈ روڈ۔ اشاعت اسلام آفس
مارچ ۱۹۱۵

خاکسار محمد علی

آیت ۱۴۲

نازل نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت تک نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم خود کچھ نہ کرتے تھے۔ چُنانچہ اس حدیث سے جو اُوپر نقل کی گئی ہے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت معلوم ہوتی ہے۔ کہ آپ کا دِل تو یہ چاہتا تھا۔ کہ بیت اللہ کی طرف مُنہ ہو۔ لیکن حُکم الٰہی کے اِنتظار میں تھے۔ جِس سے معلُوم ہُوا۔ کہ وحی الٰہی آپ کے دِل کی خواہشات کا نام نہ تھا۔ بلکہ وہ کوئی علیحدہ امر تھا۔ پس آپ اس وقت تک کہ خانہ کعبہ کی طرف مُنہ کرنے کا حُکم ہُوا۔ بیت المقدّس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اب مکّہ مُعظمہ میں جہاں بُت پرستوں کا زور ہے آپ بیتُ المُقدّس کی طرف مُنہ کرتے ہیں۔ اور مدینہ میں جہاں یہُودیوں کا زور ہے۔ اور یہُودیوں کی مُخالفت کا خطرہ ہے حکم آتا ہے۔ کہ مکّہ کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھو۔ پس تحویل قبلہ درحقیقت اسلام کی صداقت کا ایک نشان ہے۔ کیونکہ اس کے احکام اسبابات پر مبنی نہ تھے۔ کہ فلاں حُکم کی وجہ سے کیا خوف و خطر پیش آسکتا ہے۔ بلکہ کبھی مُخالفت کی پرواہ نہ کی جاتی تھی۔ اور جہاں جن کی مخالفت سے زیادہ خطرہ تھا وہاں اُنہی کی مُخالفت زیادہ ہُوئی۔ مکّہ مُعظمہ میں مُشرکین کی۔ اور مدینہ مُنورہ میں یہُود و نصاریٰ کی +

۲۱۴ - للہ المشرق والمغرب - خانہ کعبہ چُونکہ وہ توحید کا گھر تھا۔ جو سب سے پہلے دُنیا پر قائم ہُوا۔ اِسلئے یہ ضروری ہُوا۔ کہ آخری نبی کا قبلہ وہی مُقرر ہو۔ اور اس کو اس طرح پر صراط مُستقیم پر قائم کیا جائے۔ پس بدحر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اُدھر ہی مُنہ کر دیا۔ علاوہ ازیں یہُودیوں کا یہ اعتراض ہوگا۔ کہ خانہ کعبہ کے اندر تو بُت ہیں۔ یہ کیسے مُوحّد ہیں۔ کہ ایک بُت خانہ کو اپنا قبلہ بنالیا۔ سو اُس کا جواب بھی دیا ہے کہ یہ کبھی بُت خانہ نہیں رہ سکتا۔ جب مشرق و مغرب اللہ تعالیٰ کے تصرف میں ہے۔ اور وہ مسلمانوں کو مشرق و مغرب میں فتُوحات دینے کا وعدہ کر چکا ہے (دیکھو نوٹ ۸۳) تو خانہ کعبہ بُت پرستوں کے تصرّف میں نہیں رہ سکتا +

۱۴۳

۲۱۵ - کذٰلک - اسی طرح یعنی خانہ کعبہ کو جو توحید کا سب سے پہلا گھر ہے تُمہارا مرکز مقرر کر کے تُمہیں دُنیا میں توحید کا مُعلّم بنانے کا ارادہ فرمایا ہے +

۲۱۶ - اُمّۃ وسطاً - بُخاری میں ہے - الوسط العدل - اور ابن جریر نے کہا ہے۔ الوسط فی کلام العرب الخیار یعنی بہترین اور سب سے اعلیٰ کو عرب الوسط کہتے ہیں۔ جیسا کہ اُن کے کلام میں ہے۔ ھم وسط ترضی الانام بحکمھم پس امۃ وسط کے معنے بہترین اُمّت یعنی گروہ کے ہیں +

۲۱۷ - لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیدا - بُخاری میں ہے۔ کہ

ہیں ۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے ۔ کہ علم کے معمولی معنے لینے میں بھی کوئی ہرج نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم دو طرح پر ہے ۔ ایک آئندہ کا علم کہ ایسا ہوگا ۔ اور دوسرے ان واقعات کا علم جو ہوتے رہتے ہیں ۔ پس دوسری قسم کا علم حاصل ہونے سے پہلی قسم کے علم کا انکار لازم نہیں آتا ۔ اللہ تعالیٰ کو یہ علم تو وقوع سے پہلے حاصل تھا کہ کون کمزور ہیں ۔ اور کون پختہ پھر جب کمزوروں کی کمزوری ظاہر ہوئی تو یہ علم بھی ہوگیا کہ کن لوگوں نے کمزوری دکھائی ہے +

تحویل قبلہ منجملہ اُن امور کے ہے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً صادق اور ثابت قدم لوگوں کو کمزور لوگوں سے الگ کرتا رہا ۔ ع

تا گریزد ہر کہ بیرونی بُود

مسلمانوں کو چونکہ اللہ تعالیٰ دُنیا کے مُعلّم اور ہادی بنانا چاہتا تھا ۔ پس یہ ضروری تھا ۔ کہ جو خود کمزور اور کچے ہیں وہ الگ ہوتے رہیں ۔ اور وہی لوگ رہ جائیں جو پختہ اور ثابت قدم ہیں ۔ کیونکہ ثابت قدمی اِس میدان کی پہلی شرط ہے +

۲۲۰ ۔ لیضیع ایمانکم ۔ ایمان کے معنے اِس مقام پر حضرت ابن عباسؓ سے صلوٰۃ مروی ہیں ۔ یعنی یہ منشاء ہے کہ جو نمازیں بیت المقدس کی طرف پڑھی ہیں ۔ وہ ضائع نہیں ہونگی ۔ مگر اپنے عام معنوں کے لحاظ سے بھی درست ہے ۔ مُسلمانوں نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر جس اِستقامت اور کمال کا نمونہ دکھایا تھا ۔ اُس پر ضروری تھا ۔ کہ بڑے بڑے اجر مُترتب ہوتے ۔ اِسلیئے کمزوروں کو اُن سے الگ کر دیا جاتا تھا ۔ بہت سے یہودی جیسا کہ پہلے پارہ میں ذکر آچکا ہے ۔ محض منافقت سے ساتھ ملجاتے تھے ۔ واذا لقوا الذین اٰمنوا قالوا اٰمنا واذا خلا بعضھم الیٰ بعض قالوا اتحدثونھم بما فتح اللہ علیکم ۔ اور بیت المقدس کے قبلہ رہنے کی صُورت میں اُن لوگوں کو اپنے مُنافقانہ خیالات کے چھپانے کی بڑی گنجائش تھی ۔ اور اُن کا ساتھ ملا رہنا مُسلمانوں کے لیئے مُضر تھا ۔ پس تحویل قبلہ سے یہ مُنافق الگ ہوگئے ۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے ۔ کہ یہ مُراد ہو کہ اب اگر تمہارا قبلہ وہ مُقرر نہ کیا جاتا جس کے لیئے حضرت ابراہیمؑ نے دُعائیں کی تھیں ۔ تو گویا اُن وعدوں کی مستحق جو حضرت ابراہیمؑ سے کیئے گئے تھے کوئی اور قوم ہوتی ۔ اور وہ امۃ مسلمۃ جس نے دُنیا میں توحید اور نیکی کا حقیقی مُعلّم بننا تھا ۔ وہ بھی کوئی اَور ہی قوم ہوتی ۔ مگر اللہ تعالیٰ نہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں نے جو ثابت قدمی اپنے ایمان میں دکھائی ہے ۔ وہ اِس طرح پر ضائع ہو

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمّت قیامت کے دِن اِس بات کی شہادت دے گی - کہ پہلے رسولوں نے اپنی اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا تھا - اور حق تو یہ ہے - کہ اِسی زندگی میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمّت نے یہ شہادت ادا کر دی ہے - تو قیامت کو کیوں نہ کریگی - دُنیا کی تمام قوموں میں سے مسلمان ہی ایک قوم ہے جس نے یہ شہادت دی ہے - اور اس بات کو اپنا جُزوِ ایمان ٹھیرایا ہے - کہ سب قوموں کی طرف رسُول بھیجے گئے +

شہید امام و پیشرو کے معنے میں بھی آیا ہے - (دیکھو نوٹ ع۱۶۰) یعنی توحید کے سب سے پہلے گھر کو تمہارا مرکز قرار دے کر ہم نے تم کو دُنیا کی تمام قوموں کا پیشرو بنا دیا ہے جس طرح پر یہ رسُول تمہارا پیشرو ہے کیونکہ یہ ضروری ہے - کہ توحید الٰہی کو پھیلانے والے ہی دُنیا کے پیشرو ہوں - یہاں بعض نے شہید کے معنے مُزکّی بھی لئے ہیں یعنی جس طرح رسُول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تمہارا تزکیہ کیا ہے - اور تُم کو بُت پرستی اور ہر قسم کی اِعتقادی اور عملی ناپاکیوں سے نجات دی ہے - اسی طرح تم اب اِس توحید کے عالی مقصد کو ہاتھ میں لیکر دُنیا کے مُزکّی بن جاؤ - گویا یہ فرمایا ہے کہ دُنیا کے حقیقی پیشرو وہی ہیں جو توحید الٰہی قائم کرنیوالے اور پاکیزگی کے خیالات قلوب میں پیدا کرنے والے ہیں - اور حق یہی ہے نیز دیکھو نوٹ ۲۰۳ +

۲۱۸ - وما جعلنا القبلۃ التی کُنت علیھا - جعلنا کے دو مفعُول چاہئیں - جن میں سے ایک مفعُول القبلۃ اور دوسرا التی کنت علیھا ہے - کُنت علیھا کے دو معنے ہوسکتے ہیں - اوّل کنت - معتقدا لا سنقبالھا اور دوسرے کنت بمعنی صرت بھی ہوسکتا ہے - اس طرح پر آیت کے معنے یہ ہوئے - کہ ہم نے اُسکو جسے تم اپنا قبلہ چاہتے تھے قبلہ نہیں بنایا مگر اسلئے الخ یا ہم نے اُسکو جس پر تُم ہو گئے ہو قبلہ نہیں بنایا - مگر اسلئے الخ گویا اِس طرح پر اشارہ بیت اللہ کی طرف ہی ہے +

۲۱۹ - لنعلم - بعض مُفسّرین نے علم کو یہاں بمعنی رویت لیا ہے - یعنی تاکہ ہم دیکھیں کہ کون اِستقلال دکھاتا ہے - اور بعض کے نزدیک علم کا اطلاق تمیز پر جائز ہے - اور اِس صُورت میں یہ معنے ہونگے - کہ تا ہم پیروی کرنے والوں کی پھر جانے والوں سے تمیز کرکے دکھا دیں - اور اس طرح پر آنیوالی مُشکلات کے مقابلہ کے لئے خالص اور پُختہ آدمیوں کی جماعت رہ جائے - اور وہ کمزور دِل کے اور کچے لوگ نکل جائیں - جو وقت پر کام کے ناقابل ثابت ہوتے ہیں - بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے گرتے

۱۴۵ علیہ وسلم) ایک ہی شریعت کے پیرو ہوکر قبلہ کا اِس قدر اختلاف تعجب کی بات تھی۔ مگر اس میں بھی اسلام کی صداقت کا ایک نشان ہے۔ کہ اہلِ اسلام میں قبلہ کا کوئی اختلاف نہیں ہُوا۔ اور یہ درحقیقت اس بات کی شہادت ہے۔ کہ اہلِ اسلام اصُول میں مُتحدّ رہینگے۔ اور یہ ایک خاص اِمتیاز ہے جو اسلام کو دُنیا کے سب مذاہب پر حاصل ہے +

۱۴۶ ۲۲۵۔ یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت بوجہ اُن پیشگوئیوں اور وعدوں کے جو اہل کتاب کو دیئے گئے تھے اظہر من الشمس تھی۔ اِسی سُورت کی آیت ۸۹ میں فرمایا تھا فلما جاء ھم ما عرفوا۔ جس طرح بیٹا ایک اِنتظار کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اُسی طرح اہل کتاب کو ایک مُدّت اُس موعود نبی کے اِنتظار میں گُذر گئی تھی۔ اور شناخت کرنے کی یقینی علامات اس حد تک پہنچ چُکی تھیں۔ کہ کوئی مشتبہ امر باقی نہ رہگیا تھا۔ مگر محض اِس حسد کی وجہ سے قبول نہ کیا۔ کہ بنی اسرائیل سے نکل کر بنی اسمٰعیل میں نبوّت کیوں چلی گئی۔ یہ ایسی نادانی تھی جیسے ایک باپ اپنے بیٹے کا اِس لئے اِنکار کردے۔ کہ یہ میرا قائم مقام ہو جائیگا +

یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ ابناء ھم سے مُراد بنی اسرائیلی نبی ہوں۔ اور مُراد یہ ہو کہ وہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح شناخت کرتے ہیں۔ جس طرح اپنے انبیاء کو شناخت کرتے تھے۔ کیونکہ جن دلائل سے ان کا نبی ہونا ثابت ہوتا تھا وہ دلائل ظاہر ہوچکے تھے اور ابراہیمی وعدہ کے ماتحت اب تک جس قدر انبیاء آئے تھے۔ وہ سب بنی اسرائیل میں سے تھے۔ اور اس لئے بھی ایک اسمٰعیلی نبی کا آنا ضروری تھا +

رکوع ۱۸/۲ ۱۴۸ ۲۲۶۔ ولکل وجھۃ ھو مولیھا۔ اِس رکوع میں ایک قبلہ اور پھر خانہ کعبہ کو وہ قبلہ مُقرر کرنے کی وجُوہات بیان فرمائی ہیں۔ وجھۃ کے معنے جہت ہے۔ پس جب ہر شخص کسی نہ کسی طرف اپنا مُنہ کرتا ہے۔ اور الگ الگ اطراف میں مُنہ کرنے سے سب کی توجّہ ایک طرف نہیں ہوسکتی۔ تو پس نیکی یہی ہے کہ سب کا مُنہ ایک طرف ہو اور سب کی ایک ہی جہت ہو۔ گویا اس میں اصُولاً یکجہتی پیدا کرنی مقصُود تھی۔ اور درحقیقت ایک قبلہ پر اِتفاق اسلام کا ایک خاص نشان ہے۔ اور اہلِ قبلہ ہونا ایک بُنیاد ہے جس پر اسلام کی عالمگیر اخوت کا مدار ہے۔ یہاں تک کہ حدیث میں آیا ہے کہ لا تکفروا اھل قبلتکم۔ یعنی اپنے اہلِ قبلہ کو کافر مت کہو۔ پس ایک قبلہ پر اِتفاق ہونا ایک ظاہری علامت اس عظیم الشان اصُولی اِتحاد کی ہے۔ جس کو اسلام ایک خاص مقصد کے لئے جو اسلام کا اصل مقصد ہے۔ اپنے سب پیرووں میں پیدا کرنا چاہتا ہے +

پس انہی کو اُن تمام وعدوں کا مستحق بنایا +

۱۴۴ ۲۲۱ - تقلب وجهك فى السماء - اِس سے معلوم ہوتا ہے - کہ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے دِل کے اندر جو خیالات اور خواہشات تھے - وہ وحی کی صُورت اختیار نہیں کرتے تھے - بلکہ یہ کوئی خارجی امر تھا - آپ کا دِل تو یہ چاہتا تھا - کہ آپ کا قبلہ بیتُ اللہ ہو لیکن اپنے آپ کو اِس قدر حُکم الٰہی کے ماتحت آپ رکھتے تھے - کہ وحی کے بغیر کوئی حُکم نہ دیتے تھے - اور وحی الٰہی کے اِنتظار میں سولہ سترہ مہینے گُذار دیئے - اگر وحی آپ کے اپنے ہی خیالات کا عکس ہوتا - تو پھر وہ اِنتظار بےمعنی تھا جِس کا ذکر قرآن کریم نے ان الفاظ میں کیا ہے - فی السماء کے معنے نحو السماء ہیں - یعنی آسمان کی طرف اور آسمان کی طرف مُنّہ پھیرنے سے اِنتظار کی حالت کو ظاہر کرنا مُراد ہے +

۲۲۲ - فلنولينّك قبلة ترضها - ولّی کے معنے پھیرنے کے بھی ہیں - اور والی بنانے کے بھی - ہوسکتا ہے - کہ یہاں دوسرے معنے ہی مُراد ہوں - یعنی یہ کہ کفّار کے ہاتھ سے بیتُ اللہ کو نکال کر اب تم کو اس کا والی بنا دیں گے - مکّہ ملکِ عرب کا دارُالخلافہ ہی نہ تھا - بلکہ اس کا مذہبی صدر مقام اور رُوحانی مرکز بھی تھا - پس اس کی فتح کا وعدہ درحقیقت اپنے اندر اس عظیم الشان وعدہ کو لیئے ہُوئے تھا - کہ یہ سارا مُلک نہ مُلکی رنگ میں بلکہ مذہب میں بھی محمّد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مُطیع ہو جائیگا +

۲۲۳ - انه الحق من ربهم - نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - انا دعوة ابی ابراھیم تو چُونکہ ابراہیمؑ کی دُعا جِس طرح اس امر کے لیئے تھی - کہ اسمعیلؑ کی اولاد میں سے ایک نبی پیدا ہو جو کامل تزکیہ کر کے دکھائے - اِسی طرح بیت اللہ کے لئے بھی دُعا تھی - کہ وہ ساری دُنیا کا مرجع اور ساری دُنیا میں مُمتاز طور پر امن کی جگہ ہو - پس یہ لازمی امر تھا - کہ یہ عظیم الشان مقام اس نبی کا قبلہ قرار دیا جاتا - اور درحقیقت اہل کتاب ان پیشگوئیوں اور ان وعدوں سے واقف تھے - اور وہ نہ صرف نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو ہی جان چکے تھے - بلکہ یہ امر بھی ان پر واضح ہو چُکا تھا - کہ خانہ کعبہ ہی اب قبلہ رہ سکتا ہے - اور اسی جگہ سے وہ توحید کا چشمہ پُھوٹنا ضروری ہے - جِس کیلئے حضرت ابراہیمؑ کا دل تڑپا تھا +

۱۴۵ ۲۲۴ - وما بعضهم بتابع قبلة بعض - اہل کتاب میں خُود قبلہ کا اختلاف چلا آتا تھا خُود حضرت موسےٰ کی شریعت کے پیرودَں میں سے سامریوں کا قبلہ اَور تھا - یہُودیوں کا اَور - پھر عیسائیوں نے اپنا قبلہ مشرق کی سمت مُقرر کیا - دیکھو میور کی لائف آف محمّدؐ (صلے اللہ

۱۴۸ بوسہ دینا بیشک شعارِ حج میں سے ایک تھا۔ مگر اُس کی پرستش کبھی نہیں کی گئی۔ وہ پتّھر محض ایک نشان ہے۔ یہی وہ پتّھر ہے۔ جس کی طرف حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی زبور میں بھی اشارہ کیا ہے "وہ پتّھر جسے معماروں نے رد کیا کونے کا سرا ہوگیا ہے۔ یہ خُداوند سے ہؤا جو ہماری نظروں میں عجیب ہے" (زبور ۱۱۸ : ۲۲ و ۲۳) یہی وہ پتّھر ہے جس کو کسی نے تراشا نہیں "جیسا کہ تو نے دیکھا کہ وہ پتّھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے اس کو پہاڑ سے کاٹ نکالے۔ آپ سے آپ نکلا" (دانیال ۲ : ۴۵) اب یہ ردّ کیا ہؤا پتّھر جو کونے کا سرا ہو گیا ہے۔ ساری مُقدّس تاریخ کو تلاش کرو۔ تو سوائے اس کے کہ حضرت اسمعیل علیہ السلام کے لیئے ایک نشان ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں۔ اسمعیل ہی تھا جس کو رد کیا گیا۔ اور اسی کی اولاد کو اللہ تعالےٰ نے اپنی توحید پھیلانے کے لیئے چُنا اور سب انبیاء پر محمّد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبُوت فوقیت لے گئی۔ اسی کی طرف مسیح علیہ السلام نے اپنی انگورستان والی تمثیل میں اشارہ کیا ہے جہاں یہ کہا ہے۔ کہ انگورستان کا مالک جب آویگا تو انگورستان کو اور باغبانوں کو سونپیگا۔ یہ انگورستان کیا ہے وہی خدا کی بادشاہت ہے۔ جس کا ذکر خود حضرت مسیح نے تمثیل کو واضح کرنے کے لیئے ان الفاظ میں کیا ہے "یسُوع نے اُنہیں کہا۔ کہ تم نے نوشتوں میں کبھی نہیں پڑھا۔ کہ جس پتّھر کو راج گیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہُؤا۔ یہ خُداوند کی طرف سے ہے۔ اور ہماری نظروں میں عجیب۔ اِسلیئے میں تم سے کہتا ہوں۔ کہ خُدا کی بادشاہت تم سے لیجائیگی۔ اور ایک قوم کو جو اس کے پھل لائے دیجائیگی۔ جو اس پتّھر پر گریگا چُور ہو جائیگا۔ پر جس پر وہ گرے اُسے پیس ڈالیگا" (متی ۲۱ : ۴۲ و ۴۳) پس سنگ اسود کو بوسہ دینا اسی کا ظاہری نشان ہے۔ اور بوسہ محض اظہار محبت کے لیئے ہوتا ہے۔ نہ عبادت یا پرستش کے لیئے۔ کسی بُت پرست قوم نے اپنے بُت کو چُومنا کبھی بھی عبادت کا حصّہ نہیں سمجھا +

۲۲۷۔ اینما تکونوا یات بکم اللہ جمیعا۔ یعنی جہاں کہیں بھی تم مُختلف جہات میں ہو تمہاری نماز ایک ہی جہت کی طرف ہوگی۔ اور یہ ظاہری اِجتماع ایک عظیم الشان رُوحانی اِجتماع کا نشان قرار دیا گیا +

۱۵۰ ۲۲۸۔ لئلا یکون للنّاس علیکم حجۃ۔ تاکہ لوگوں کی کوئی حُجت تم پر باقی نہ رہے۔ کیونکہ اگر وہ رسُول دُنیا میں آگیا تھا جس کے لیئے حضرت ابراہیمؑ نے دُعائیں کی تھیں تو یہ لازمی تھا۔ کہ اس کا قبلہ وہی گھر ہو جہاں حضرت اسمعیل علیہ السلام کو بطور نشان کے چھوڑا گیا تھا +

یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے۔ کہ اسلام کے بعض مخالفین نے نہایت کوتہ اندیشی سے یہ اعتراض کیا ہے۔ کہ مسلمان خانہ کعبہ کی طرف مُنّہ کرنے میں درحقیقت اس گھر کی پرستش کرتے ہیں۔ پرستش یا عبادت کے مفہوم میں تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ اول یہ کہ جس چیز کی پرستش کی جائے۔ اس کی طرف انسان کی توجہ تام ہو۔ اور اُسکی عظمت اُس کے خیالات پر غالب اور اس کے دل میں بس رہی ہو۔ دوسرے یہ کہ اُس چیز کی حمد اور تعریف کی جائے۔ کیونکہ جس چیز کی دِل میں عظمت ہے۔ اس کی زبان سے بھی تعریف کیجاتی ہے تیسرے یہ کہ اس سے کوئی دُعا یا اِلتجا کی جائے۔ کیونکہ پرستش یا عبادت کی اصل غرض یہی ہے۔ اب خانہ کعبہ کی طرف مُنّہ کرنے سے ان تینوں باتوں میں سے کوئی بات بھی حاصل نہیں ہوتی۔ نہ خانہ کعبہ کی کوئی خاص عظمت اُس وقت اِنسان کے دل پر غالب ہوتی ہے۔ نہ ہی اس کی طرف کوئی توجہ تام ہوتی ہے۔ نہ ہی خانہ کعبہ کی حمد کرنا نماز کا کوئی جُزو ہے۔ اور نہ ہی اس گھر سے کوئی دُعا یا اِلتجا کیجاتی ہے۔ بلکہ ساری نماز کے اندر اللہ تعالےٰ کی طرف ہی توجّہ تام ہوتی ہے۔ اُسی کی عظمت دِل میں ہوتی ہے۔ اُسی کی حمد کی جاتی ہے۔ اسی سے دُعائیں اور التجائیں کیجاتی ہیں پس جب نماز کے وقت پرستش کی ساری شرائط خانہ کعبہ کے حق میں مفقود اور عین اُس وقت میں اللہ تعالیٰ کے لیئے پائی جاتی ہیں۔ تو معلوم ہُوا کہ خانہ کعبہ کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھنے کو خانہ کعبہ کی پرستش قرار دینا محض ایک جاہلانہ اور متعصبانہ خیال ہے۔ اور نہ صرف مُسلمانوں نے ہی خانہ کعبہ کی پرستش نہیں کی۔ بلکہ وہ مُشرک جو خانہ کعبہ کی سچّے دِل سے عظمت کرتے تھے۔ اُنھوں نے بھی اس گھر کی پرستش کبھی نہیں کی۔ ہاں اُنھوں نے اس کے اندر کچھ بُت رکھ دیئے تھے۔ اُن بُتوں کی پرستش وہ ضرور کرتے تھے۔ مگر خانہ کعبہ کی اُنھوں نے کبھی پرستش نہیں کی۔ پس خانہ کعبہ کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھنے کو ایامِ جاہلیت عرب کی مُشرکانہ رسُوم کا بقیہ کہنا محض نادانی ہے۔ خانہ کعبہ کی پرستش کبھی نہیں ہُوئی۔ ہاں مُشرک عرب اُس کے اندر بُت رکھ کر بُتوں کی پرستش کرتے تھے۔ سو ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بُتوں سے اُس گھر کو بکُلّی پاک کر دیا۔ اور بُت پرستی میں سے کچھ باقی نہ رہنے دیا +

اور اگر یہ کہا جائے۔ کہ سنگ اسود کو بوسہ دینا قدیم بُت پرستی کا بقیہ ہے۔ تو یہ بھی محض جہالت کا اعتراض ہے۔ سنگ اسود کبھی بھی عرب کے بُتوں میں سے ایک بُت نہ تھا۔ جس کی وہ پُوجا کرتے ہوں۔ یا جس سے کبھی وہ اپنی مُرادیں مانگتے ہوں۔ ہاں اُس کو

۱۵۴ پیش آنے والی تھیں ۔ اور جن میں مُسلمانوں نے شہید بھی ہونا تھا ۔ جو شخص حق کے لئے اپنی زندگی کو قُربان کر دیتا ہے ۔ اور اپنے آپ کو اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے وقف کر دیتا ہے تو وہ ایک ابدی زندگی کا وارث ہو جاتا ہے ۔ جیسے حق پر موت کبھی نہیں آتی ۔ اسی طرح حق کی راہ میں اپنے آپ کو قُربان کرنے والے پر بھی کبھی موت نہیں آتی ۔ اور نہ اُس کے اعمال کے ثمرات مُنقطع ہوتے ہیں ۔ اور موت سے مُراد حُزن اور غم بھی لیا گیا ہے جیسا کہ مُفردات میں ایک قول اِن الفاظ کے ان معنوں کی تائید میں ہے ۔ وقیل نفی عنھم الحزن المذکور فی قولہ و یاتیہ الموت من کل مکان ۔ یعنی یہاں مرنے سے مُراد اس حُزن اور غم کا نہ آنا ہے ۔ جس کا ذِکر اس آیت میں ہے ۔ و یاتیہ الموت الخ ۔ اور مومنوں کا اکثر ذکر قرآن شریف میں اِنہی الفاظ میں ہے ۔ لا خوف علیھم و لا ھم یحزنون ۔ اِس طرح پر گویا کامیابیوں کی طرف اشارہ ہے ۔

۱۵۵ ۲۳۴ ۔ و لنبلونکم بشئ من الخوف .... یہاں صراحت سے فرمایا ۔ کہ تُمہارے اندرُونی کمالات کو اب ہم بعض مصائب کے ذریعہ سے ظاہر کرینگے ۔ بلی کے معنے کے لئے دیکھو نوٹ ۱۲۴ یہ مصائب کچھ خوف کے ذریعہ سے کچھ بُھوک کے ذریعہ سے کچھ مالوں جانوں اور پھلوں کے نقصان کے ذریعہ سے پیش آنے والے تھے ۔ خوف تو دُشمنوں کا ظاہر تھا ۔ جنہوں نے اب تلوار سے اسلام کو نیست و نابُود کرنے کا مُصمّم ارادہ کر لیا تھا ۔ اور بُھوک اِس لحاظ سے کہ جنگوں کے اندر تو بُھوک کی بڑی بڑی شدّت برداشت کرنی پڑتی ہے ۔ پھر اس کے علاوہ کُل حرام چیزوں کو ترک کرنا ہے ۔ بلکہ روزہ میں حلال چیزوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری کے لئے ترک کرنا پڑتا ہے ۔ مالوں کا نقصان ایک تو اِس لئے کہ جنگوں کے شرُوع ہو جانے کے ساتھ تجارت کا خاتمہ ہُوا پھر ہر قسم کے حرام مال سے بچنا ہُوا پھر اپنے کمائے ہُوئے حلال مال کو خُدا کی راہ میں خرچ بھی کرنا ہُوا ۔ اسی طرح جانوں کا نقصان جنگوں میں ظاہر تھا ۔ ثمرات کے نقصان میں کھیتوں پھلوں کے نقصان کے علاوہ اولاد کا نقصان بھی شامل ہے ۔ پس معلُوم ہُوا کہ اللہ تعالیٰ اِنسان کو کمال عطا کرنا چاہتا ہے ۔ تو اس کے لئے ضرُوری ہوتا ہے ۔ کہ وہ خُدا کی راہ میں واقعی کچھ دُکھ بھی اُٹھائے ۔

۱۵۶ ۲۳۵ ۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون ۔ یہ وہ کلمہ ہے ۔ جو ایک مُسلمان کو ہدایت ہے ۔ کہ جب اُس پر کوئی مُصیبت آئے اُس وقت پڑھے ۔ یہ اسلئے کہ تا اُسے یاد آجائے ۔ کہ مال میں جان میں اولاد میں اگر کوئی نقصان ہُوا ہے ۔ تو یہ چیزیں اس کی زندگی کا اصلی مقصُود تو نہیں ۔ کہ اِنسان اُن کے غم میں ہلاک ہو ۔ بلکہ اِنسان کی زندگی کا اصل مقصد تو اللہ کی راہ

آیت

۱۵۰ ۲۲۹۔ الا الذین ظلموا منھم ۔ یعنی ظالم تو کبھی کٹ حُجتی کو چھوڑیں گے ہی نہیں جیسا کہ اب تک عیسائی ابراہیمی عہد کو تسلیم کرنے کے باوجود کٹتے چلے آتے ہیں ۔ کہ عربوں کو ساتھ ملانے کے لیئے ایسا کیا ۔ حالانکہ اتنا غور نہیں کرتے کہ جس شخص نے ہزاروں برس کی بُت پرستی کو صاف کر دیا تھا ۔ اس کو کون سی ضرورت تھی ۔ کہ اپنی قوم کو خوش کرنے کے لیئے کچھ ان کے دین کا جزو اپنے ساتھ رکھ لے +

۲۳۰۔ ولاتم نعمتی علیکم ۔ اصل غرض تو یہ تھی ۔ کہ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ اتمام نعمت کرے ۔ اور اُنہیں وہ امۃ مسلمۃ بنائے جس کے لیئے حضرت ابراہیمؑ نے دُعائیں کی تھیں ۔ پس ضروری تھا کہ وہ دنیا پر توحید کا سب سے پہلا گھر اُن کا قبلہ قرار پاتا ۔ کیونکہ اوّل را آخر نسیتے است +

۱۵۱ ۲۳۱۔ کما ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلوا علیکم ایاتنا و یزکیکم و یعلمکم الکتاب والحکمۃ ۔ یہاں اس غرض کی اور بھی وضاحت کر دی ۔ کہ تمہارا قبلہ ہم نے خانۂ کعبہ کو اسی طرح قرار دیا ہے ۔ جیسے کہ تم میں وہ ابراہیمؑ کی دُعا والا رسُول بھیجدیا ہے ۔ حضرت ابراہیمؑ نے بعینہ انہی الفاظ میں حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے رسُول پیدا ہونے کے لیئے دُعا کی تھی ۔ دیکھو نوٹ ۱۲۹ ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم ایاتک و یعلمھم الکتاب والحکمۃ و یزکیھم اِس لیئے یہاں صفائی سے فرما دیا ۔ کہ جس طرح پر ہم نے وہ ابراہیمی دُعا کا رسُول بھیجدیا ہے ۔ اور انہی صفات کے ساتھ بھیج دیا ہے ۔ اِسی طرح پر یہ بھی ضروری ہوا ۔ کہ وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا والا گھر تمہارا قبلہ مقرر ہو ۔ تاکہ تم دُنیا میں کامل توحید کے مُعلّم بنو +

رکوع ۱۹/۳ ۱۵۲ ۲۳۲۔ استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ۔ خانہ کعبہ کو قبلہ تو مقرر فرمایا ۔ مگر خانہ کعبہ میں اس وقت بُت بھرے ہُوئے تھے ۔ اور بُت پرستوں کے ہی قبضہ میں تھا ۔ پس ایک کامل توحید کے مذہب کا قبلہ مُقرر کر کے درحقیقت یہ وعدہ بھی ساتھ ہی دیدیا ۔ کہ وہ بُت پرستی سے صاف کیا جائیگا ۔ پس اس رکوع میں ذکر کیا ۔ کہ اس عظیم الشان مقصد کے حصُول کے لیئے بہت کچھ قربانیاں مسلمانوں کو کرنی پڑینگی ۔ اس کے لیئے فرمایا کہ پھر صبر اور دُعا سے اللہ تعالیٰ کی مدد مانگتے رہو +

۱۵۴ ۲۳۳۔ ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ۔ فی سبیل اللہ کا لفظ عرف قرآن میں جہاد سے مختص ہے ۔ پس یہاں اُن جنگوں کی طرف اشارہ ہے جو آیندہ

۱۵۸ کرتے ہوں تو فرمایا۔ کہ ان کے طواف میں کوئی گناہ نہیں +

۱۵۹ ۲۴۰ ۔ یلعنھم اللہ و یلعنھم اللاعنون ۔ لعنۃ کے معنے کے لئے دیکھو نوٹ ۱۵۰
توریت میں اُن لعنتوں کا مفصّل ذکر ہے ۔ جن سے یہُود کو ڈرایا گیا تھا ۔ مگر انہوں نے بیّنات اور ہدایت کا کتمان کیا ۔ اور اس لئے اُن لعنتوں کے مستحق ہُوئے ۔ چنانچہ استثناء ۲۸ : ۱۵ ۔ ۲۰ میں بالخصوص لعنتوں کا ذکر کرکے اُن کی تفصیل بتائی ہے ۔ کہ ان لعنتوں سے کیا مُراد ہے ۔ اور اُن لعنتوں کی وجہ یہ فرمائی کہ خُدا تعالےٰ کے حکموں پر عمل نہیں کیا" لیکن اگر تُو خداوند اپنے خُدا کی آواز کا شنوا نہ ہوگا کہ اُس کی ساری شرعوں اور حکموں پر جو آج کے دِن میں تجھے بتاتا ہوں دھیان رکھ کے عمل نہ کرے ۔ تو ایسا ہوگا کہ یہ ساری لعنتیں تجھ پر اُتریں گی ۔ اور تجھ تک پہنچینگی ۔ تُو شہر میں لعنتی ہوگا ۔ اور تُو کھیت میں بھی لعنتی ہوگا ... تیرے بدن کا پھل تیری زمین کا پھل تیری گائے بیل کی بڑھتی اور تیرے بھیڑ بکری کے گلے لعنتی ہوجائینگے ۔ تُو بھیتر آنے کے وقت لعنتی ہوگا ۔ اور تُو باہر جانے کے وقت لعنتی ہوگا ۔ خُداوند اُن سارے کاموں میں جن میں تُو کرنے کے لئے ہاتھ لگاوے تجھ پر لعنت اور ملامت نازل کریگا ۔ یہاں تک کہ تُو ہلاک ہوگا ۔ اور جلد نابُود ہوجائیگا"
آیت ۱۶۱ میں پھر انہی لعنتوں کی طرف اشارہ ہے +

رکوع ۲۰
۱۶۴ ۲۴۱ ۔ ان فی خلق السموات والارض ... یعقلون ۔ اس رکوع میں توحید الٰہی اور اس کے آخری غلبہ کا ذکر ہے ۔ محمّد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ تعالیٰ کا وجُود ایک ایک پتّہ میں نظر آتا ہے ۔ اور ہر غور کرنے والے عقل سے کام لینے والے کو زمین و آسمان کی مخلوق اور قدرت کے مختلف مناظر میں جہاں باوجود اختلاف کے ایک اتّحاد اور ایک ہی قانون سب میں کام کرتا ہُوا نظر آتا ہے ۔ ایک ہی مُدبّر بالارادہ ہستی کا ہاتھ کام کرتا ہُوا دکھائی دیتا ہے +
یہاں ارض کے احیاء سے مُراد اُس کی آبادی اور سبزیوں کی روئیدگی ہے ۔ اور اُس کی موت سے مُراد اُس کی ویرانی اور اس کی روئیدگی کا جاتے رہنا ہے دابۃ کا لفظ ہر ذی رُوح پر بولا جاتا ہے +

۱۶۵ ۲۴۲ ۔ انداداً یحبونھم کحب اللہ ۔ انداد سے مُراد وہ جُملہ اشیاء ہیں ۔ جن کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر بنایا جاتا ہے ۔ خواہ وہ بُت ہوں خواہ انسان ۔ بلکہ اگلی آیت سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ یہاں بالخصوص اُن لوگوں کا ذکر ہے ۔ جن کی پیروی کیجاتی

آیت

۱۵۶ میں اپنے آپ کو لگانا ہے۔ پس اس اصل مقصد کو فوت نہیں ہونے دینا چاہئیے۔ اور پھر وہ تمام چیزیں جن سے ہم دنیا میں فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ہی عطا ہیں۔ اور ہمارے پاس بطور امانت ہیں۔ پس اگر وہ اپنی امانت کو واپس لیلے تو اس میں واویلا کیسا۔ رضا بالقضا کی یہ کامل تعلیم اور کس مذہب نے دی +

۱۵۷ ۲۳۶۔ صلوٰت من ربھم و رحمۃ۔ صلوٰت صلوٰۃ کی جمع ہے۔ جس کے معنے دعا ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلوٰۃ مغفرت یعنی حفاظت کے قائم مقام ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا میں ہے۔ اللھم صل علی ال ابی اوفی۔ اور رحمۃ سے مراد لطف و احسان ہے +

۱۵۸ ۲۳۷۔ ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ۔ گو بظاہر یہ آیت بے ربط معلوم ہوتی ہے مگر اس کا تعلق آیت ماقبل سے نہایت لطیف ہے۔ پہلی آیت میں بتایا گیا ہے۔ کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں دکھ اُٹھاتے ہیں۔ اُن کے لئے بڑے بڑے اجر ہوتے ہیں۔ اُسی کی یہ ایک مثال دی ہے۔ کہ یہ صفا اور مروہ بظاہر دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ مگر خدا کی ایک صابر بندہ یعنی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی تکالیف کا مقام ہونیکی وجہ سے اس کے لئے بطور یادگار ہوگئی ہیں۔ پس صفا اور مروہ کا نام ہی درحقیقت صبر کے اجر کو ظاہر کرنیوالا ہے +

الصفا۔ صفاۃ کی جمع ہے۔ جس کے معنے نرم پتھر کے ہیں۔ مروۃ چھوٹی کنکریوں کو کہتے ہیں۔ شعائر شعیرۃ کی جمع ہے۔ جس کے معنے علامت کے ہیں +

۲۳۸۔ فمن حج البیت او اعتمر۔ حج کے لغوی معنی قصد کے ہیں۔ اور اعتمار کے معنے زیارت کے ہیں۔ حج اور عمرہ میں بڑا فرق یہ ہے۔ کہ حج خاص مہینوں میں ہوتا ہے۔ اور عمرہ کسی وقت ہوسکتا ہے۔ اور عمرہ میں منیٰ اور عرفات کے میدان میں جانا نہیں ہوتا +

۲۳۹۔ فلاجناح علیہ ان یطوف بھما۔ بخاری میں دو روائتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایام جاہلیت میں انصار صفا اور مروہ کا طواف نہ کیا کرتے تھے۔ اسلئے یہ فرمایا۔ کہ ان کا طواف کرلیا کرو۔ اس میں کوئی گناہ نہیں۔ اور یہ بھی لکھا ہے۔ کہ صفا پر ایک بت تھا جس کا نام اساف تھا۔ اور مروہ پر ایک بت تھا جس کا نام نائلہ تھا۔ اور ایام جاہلیت میں جب صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتے تھے۔ تو ان دونوں بتوں کو چھوا کرتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے مسلمان سعی بین الصفا والمروۃ میں مضائقہ

۱۶۸ کھانا ممنوع قرار نہ دیا ہو - بلکہ اُس کے حصُول میں کوئی ناجائز ذریعہ بھی استعمال نہیں ہونا چاہیئے - طیب کے معنے ہیں ستھری چیز کے - پس صرف اس لفظ کو لاکر بہت سی تفصیلات سے مستغنی کر دیا - ہر شخص جس چیز کو طیب نہیں سمجھتا اُسے خُود ہی ترک کرے گا +

۲۴۷ - و لا تتبعوا خطوات الشیطٰن - خطوات خطوۃ کی جمع ہے - اور یہ وہ فاصلہ ہے - جو چلنے والے کے دو قدموں کے درمیان ہوتا ہے - شیطان کے قدموں کی پیروی کرنے سے روکنے میں ظاہری طہارت سے باطنی طہارت کی طرف توجہ دلائی ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے - کہ قرآن کریم انسان کی جسمانی اور رُوحانی حالتوں میں ایک تعلق کی طرف اشارہ کرتا ہے - اور اس میں کوئی شبہ معلوم نہیں ہوتا - کہ غذاؤں کا اثر نہ صرف اِنسان کے جسم پر بلکہ اس کے اخلاق اور اُس کی رُوحانی حالتوں پر بھی پڑتا ہے - علاوہ ازیں چُونکہ قرآن کریم کی تعلیم سب دُنیا کے لیئے یکساں ہے - اِسلیئے ہر قسم کی ہدایات اس پاک کتاب کے اندر جمع کر دیگئی ہیں +

۲۴۸ - و مثل الذین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یسمع الا دعاء و نداء - نعق کے معنے صوت یعنی آوازے ہیں - یہاں جو تمثیل بیان فرمائی ہے - اُس کا ماحصل یہ ہے - کہ اِن کافروں کی مثال ایسی ہے - جیسے ایک چروا ہا چارپایوں کو آواز دے رہا ہو - وہ چارپائے اس کے اصل مفہوم کو تو سمجھتے نہیں صرف آواز اور پُکار کو سُنتے ہیں - یہاں چروا ہا یا آواز دینے والا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہیں اور کُفار کو چارپایوں سے تشبیہ دی ہے - کیونکہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے - چنانچہ اس سے پہلی آیت میں بھی اُن کو اندھا دھند تقلید کرنے پر ملزم کیا تھا - اور اس تمثیل کے بعد بھی اُن کو صم بکم عمی کہا ہے - اور پھر فرمایا فہم لا یعقلون یعنے عقل سے کام نہیں لیتے - پس اُن کی مثال چارپاؤں کی ہے - اِسی لیئے دوسری جگہ فرمایا - ان ھم الا کالانعام بل ھم اضل سبیلا +

۱۷۳ ۲۴۹ - انما حرم علیکم المیتۃ و الدم و لحم الخنزیر و ما اھل بہ لغیر اللہ - کھانے میں چار چیزوں کو جنہیں لوگ کھاتے تھے تصریح کے ساتھ منع فرمایا - اور ان چار چیزوں کی تحریم کا حکم مُدت پہلے مکہ میں سُورت الانعام میں اور سُورت النحل میں نازل ہوچکا تھا - اور آخر میں سُورت المائدہ میں پھر نازل ہُوا ہے - جہاں میتۃ اور ما اُھل بہ لغیر اللہ کی کچھ مزید تصریح بھی فرمائی ہے - مگر چُونکہ یہاں یہودیوں سے مباحثہ ہے - اسلیئے اس حکم کو پھر یہاں لایا گیا ہے

۱۶۵ ہے۔ اور یحبونھم کحب اللہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبّت میں عموماً انسانوں کو ہی شریک کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس ذات پاک کے اُن احسانات کا جن کا ذکر پچھلی آیت میں ہے تقاضا تھا۔ کہ اس کی محبّت کے سامنے سب محبّتیں ہیچ ہوتیں۔ اور عشق اور محبت کا انتہائی مرتبہ صرف تعلق باللہ میں ہی ظاہر ہوتا۔ کیونکہ حُسن اور احسان میں دُنیا کی کسی چیز کو اس سے کوئی نسبت نہیں ہے +

۲۴۳ - و الذین امنوا اشد حبا للہ - اگر اللہ تعالیٰ کی انسان کے لئے بے پایاں محبّت اور رحم کے ذکر سے قرآن کریم بھرا پڑا ہے۔ تو ایسی آیات بھی تھوڑی نہیں ہیں جن میں انسان کی محبت کا اللہ تعالیٰ سے ذکر ہے۔ اور درحقیقت یہی محبت ہی اسلام یعنی انسان کی اللہ کے حضور کامل فرمانبرداری کی بُنیاد ہے۔ بلکہ مومن کی وہ محبت جو اللہ تعالیٰ کے لیئے وہ رکھتا ہے۔ اُسے تمام دوسری محبّتوں سے بڑھ کر قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ جو نسبت ایک مُشرک کو اپنے جھوٹے معبود سے ہو سکتی ہے۔ اس کو بھی مومن کی اس کامل محبّت سے جو وہ اللہ تعالیٰ سے رکھتا ہے کوئی نسبت نہیں +

۱۶۶ ۲۴۴ - اذ تبرأ الذین اتبعوا من الذین اتبعوا - قیامت کے دن جو نظارہ اِن انقطاع وسائل کا ہوگا۔ وہ تو یہاں نہیں دیکھا جا سکتا۔ مگر اس زندگی میں بھی بسا اوقات انسان جن پر جھوٹے طور پر بھروسہ کرکے اُن کے پیچھے آنکھیں بند کرکے چلتا ہے مصیبت کے وقت وہ اس کے کسی کام نہیں آتے۔ اور اس وقت انسان افسوس کرتا ہے۔ کہ میں نے کیوں اپنے آپ کو اس راہ پر ڈالا۔ تقطعت بھم الاسباب سے مُراد اُن وسائل کا کٹ جانا ہے۔ جن کو جھوٹی آرزوؤں نے کچھ کا کچھ بنا کر دکھایا ہُوا تھا +

۱۶۷ ۲۴۵ - حسرات علیھم - حسرۃ سخت ترین ندامت کو کہتے ہیں۔ یہی حسرتیں اور نامُرادیاں آخر کار جلتی ہُوئی آگ کی صُورت بھی اختیار کر لیتی ہیں۔ جو بعض وقت انسان کو اس دُنیا میں بھی نظر آ جاتی ہے۔ مگر جس کا کامل ظہور قیامت کے دن ہی ہوگا +

رکوع ۲۱/۵

۱۶۸ ۲۴۶ - یایھا الناس کلوا مما فی الارض حللا طیبا - یہاں تک اصل اصُول دین یعنی توحید الٰہی کا ذکر فرما کر اب چند تفصیلات شریعت کی طرف توجّہ فرماتا ہے۔ اور یہی قدرتی تقسیم ہے۔ کہ اصُول کو فروع پر مُقدم کیا جائے۔ اِن تفصیلات میں سب سے پہلے غذاؤں کا ذکر ہے۔ ان سب پر پہلے تو یہ شرط لگادی ہے۔ کہ چیز حلال ہو۔ اور دوسرے یہ کہ وہ طیب ہو۔ حلال ایک چیز صرف اِس لحاظ سے ہی نہیں کہلاتی کہ شریعت نے اُس کا

۱۷۴ باطن سے ظاہر کی طرف لیجاتا ہے۔ توحید کے ذکر کے بعد غذاؤں کا ذکر کیا۔ تا معلوم ہو کہ غذائیں بھی انسان کے خیالات پر اثر ڈالتی ہیں۔ غذاؤں کا ذکر کرتے ہُوئے جن کا تعلق جسم سے ہے۔ پھر کلام کا انتقال باطن کی طرف کیا۔ اور آگ کھانیوالوں کا ذکر کیا۔ یہ اِس لیئے تا مُسلمان قوم یہُودیوں کی طرح ظاہر پرست نہ ہو جائے۔ اور حقیقی نیکی اور تقوے کو صرف چند ظاہری اُمور کی پابندی پر محدُود نہ کر دے۔ یہُودیوں نے اپنی شریعت کی بعض ظاہری پابندیوں پر بیشک بہت زور دیا۔ مگر اندرونی پاکیزگی اور تقوے کی راہوں کی طرف سے غفلت کی۔ اِسلیئے قرآن کریم کی تعلیم میں ہمیشہ جب کبھی کسی جسمانی قانون کا ذکر ہوگا۔ تو اُس کے ساتھ ہی رُوحانیت اور حقیقی پاکیزگی کی طرف بھی توجہ دلائیگا۔ آگ کے کھانے کا محاورہ اِسی مُناسبت سے اختیار کیا گیا ہے۔ کہ تا جسمانی غذاؤں کی حُرمت کو ہی کافی نہ سمجھ لیا جائے۔ بلکہ اصل غرض تو یہ ہے۔ کہ آگ کے کھانے سے روکا جائے + یہاں آگ کے کھانے کو ایک فعل کا نتیجہ بتایا ہے۔ اور وہ فعل یہ ہے۔ کہ جو اللہ تعالیٰ نے کتاب یعنی احکام اُتارے ہیں اُن کو چھپایا جائے۔ اور اُس کے عوض تھوڑی سی قیمت لے لیجائے۔ یعنی اس دُنیا کی زندگی کے قلیل فوائد کی خاطر اصل غرض اور مقصد کو انسان ترک کر دے۔ کتاب یا احکام کا چُھپانا یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ انسان اس پر عمل نہ کرے کیونکہ اصل تعلیم کا ظہور عمل سے ہوتا ہے +

۱۷۵ ۲۵۲۔ فما اصبرھم علی النار۔ ما تعجب کا ہے۔ اور مُراد یہ ہے کہ آگ پر کیسی جُرات کرنے والے ہیں۔ یا یہ کہ ایسے افعال کرتے ہیں جو اُنکو آگ میں لیجانیوالے ہیں +

۱۷۶ ۲۵۳۔ اختلفوا فی الکتٰب۔ کتاب میں اختلاف کرنے کے معنے بعض نے تو صرف اِس قدر لیئے ہیں۔ کہ ایک حصہ تو مانتے ہیں۔ اور ایک کا اِنکار کرتے ہیں۔ اور مُفردات میں یہاں اختلفوا کے معنے خلفوا لکھے ہیں۔ اور اسی میں ایک قول یہ بھی ہے۔ اتوا فیہ بخلاف ما انزل اللہ۔ یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا۔ اس کے خلاف اس میں باتیں داخل کیں۔ اور ایک معنے یہ بھی کیئے گئے ہیں۔ کہ اُنھوں نے ان کے معنے کرنے میں واضح اور مستقیم طریق کو چھوڑ دیا۔ بہرحال اس کے معنے کسی نہ کسی رنگ میں خلاف ورزی کے ہیں +

الربع رکوع ۲۲ ۱۷۷ ۲۵۴۔ لیس البر ان تولوا وجوھکم... عام طور پر تو یہاں یہی معنے لیئے گئے ہیں۔ کہ کسی طرف مُنہ کر لینا وہ حقیقی اور کامل نیکی نہیں ہے۔ جس کو انسان اپنا مُنتہٰی باشقان

آیت ۱۷۳

ان چاروں چیزوں میں سے اوّل الذکر تین چیزوں کی حرمت کا ذکر یہود کی شریعت میں بھی ہے۔ چنانچہ مُردار کی حرمت احبار ۱۷: ۱۵ میں خُون کی حرمت احبار ۷: ۲۶ میں سُؤر کی حرمت احبار ۱۱: ۷ میں ہے۔ بعض چیزیں خصوصیت سے یہود پر حرام کی گئی تھیں اُن کو مسلمانوں پر حرام نہیں کیا۔ کیونکہ اُن کی حرمت ایک سزا کے رنگ میں تھی۔ ان کا ذکر سُورت الانعام آیت ۱۴۶ میں ہے۔ یہود سُؤر کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کا نام بھی نہ لیتے تھے۔ اور گو عیسائیوں نے سُؤر کو حلال کر لیا ہے۔ بلکہ اس کو اپنی محبوب ترین غذا بنا لیا ہے۔ مگر حضرت مسیحؑ کے کلام میں سؤر سے ایسی ہی نفرت کا اِظہار پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ یہودیوں میں عام طور پر اس سے نفرت کی جاتی تھی۔ اور یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے کبھی سُؤر کے گوشت کے استعمال کو جائز قرار دیا ہو۔ پس اِس صُورت میں ان کا مذہب وہی تسلیم کیا جائیگا جو یہودیوں کا مذہب تھا +

ان اشیاء کی حرمت کی وجہ بھی سُورت الانعام میں ہی دی ہے۔ اوّل الذکر تینوں کی حرمت کی وجہ اُن کی پلیدی ہے۔ مردار خُون سُؤر کا گوشت ان تینوں میں زہریں بھی ہیں۔ اور طرح طرح کی جسمانی بیماریاں پیدا کرنے کے علاوہ اخلاق پر اُن تینوں کا اثر نہایت بُرا پڑتا ہے۔ لحم کے لفظ میں چربی وغیرہ سب اجزا آجاتے ہیں جن کو لوگ کھاتے ہیں۔ کیونکہ بڑی چیز کے نام میں چھوٹی چیزیں بھی داخل ہیں۔ ما اھل بہٖ لغیر اللہ کے کھانے میں شرک کا رنگ ہے۔ اس سے مُراد وہ جانور ہیں۔ جو بُت پرست اپنے بُتوں کے نام پر ذبح کیا کرتے تھے۔ یا جن پر ذبح کے وقت بُت کا نام لیا جائے۔ لہٰذا اس کو ایک مُشرکانہ فعل ہونے کی وجہ سے حرام کیا۔ اُھِلَّ اھلال سے مُشتق ہے۔ جس کے معنے آواز بلند کرنے کے ہیں۔ کیونکہ نیا چاند (ہلال) دیکھنے پر آوازیں بلند کی جاتی تھیں +

۲۵۰۔ غیر باغ ولا عاد۔ لفظی معنے ان الفاظ کے صرف اِس قدر ہیں نہ خواہش کرنے والا نہ حد سے بڑھنے والا۔ حالتِ اضطرار میں ممنُوع غذاؤں کا استعمال جائز کر دیا ہے۔ مگر دو شرطوں کے ساتھ یعنی ایک تو یہ کہ انسان خُود اُس کی خواہش کرنیوالا نہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ اس کے استعمال میں اضطرار کی حالت سے تجاوز نہ کرے یعنی اسی حد تک استعمال کرے جس حد تک اضطرار باقی ہو +

۲۵۱۔ ما یاکلون فی بطونھم الا النار۔ قرآن کریم اکثر کلام کو ظاہر سے باطن اور

۱۷۴

۱۷۷ اِس قدر نیکی کر سکے - کہ جن دشمنوں کو جنگ میں قید کر لیا ہے - ان کو آزاد کرنے کے لیئے اپنا مال خرچ کیا جائے - یہ ہے دشمنوں سے پیار کا عملی ثبوت اور یہ صرف اسلام سے ہی خاص ہے - عیسائیوں کو اس بات پر بہت فخر ہے کہ انجیل میں دشمنوں سے محبّت کرنے کی ہدایت ہے - وہاں تو وہ ہدایت صرف لفظوں تک اور خیال میں ہی محدود ہے - یہاں اس کی عملی راہ بتا دی - کہ تم یہاں تک دشمنوں سے نیکی کرو - کہ ان کے آزاد کرنے پر اپنے مالوں کو صرف کر دو - اور یہ کس لئے ہو محض اللہ تعالیٰ کی محبّت کے لیئے - کیونکہ کامل محبّت انسان کی اللہ تعالیٰ سے یہ چاہتی ہے - کہ اُس کی مخلوق میں سے اُس کے ساتھ بھی اِنسان نیکی کرے - جہاں خواہشات بالکل اس کے خلاف لیجانے والی ہوں - یعنی دل تو انسان کا یہ چاہتا ہے - کہ دشمن کو ہر طرح سے کمزور کرے - مگر اسلام کی تعلیم یہ ہے - کہ اسے آزاد کر دے - چنانچہ یہی وجہ ہے - کہ اسلامی بیت المال کے مصارف میں سے بھی یہ ایک مصرف رکھ دیا گیا ہے - کہ جنگی قیدیوں کے آزاد کرنے پر روپیہ خرچ کیا جائے +

انفاق مال کے بعد نماز اور زکوٰۃ کی طرف توجّہ دلائی - کہ یہ دو فرائض اِنسان کے ذمّہ ہیں - تا کہ اس کے توئے کا میلان نیکیوں کی طرف زیادہ رہے - اس کے بعد ایفائے عہد کی طرف توجّہ دلائی - خواہ اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد کیا ہو یا اس کے بندوں میں سے کسی کے ساتھ - اور خواہ وہ شخص جس کے ساتھ عہد کیا ہے مومن ہو یا مُشرک عہد کا ایفا ضروری قرار دیا ہے - اس کے بعد صبر یعنی مصائب کے نیچے برداشت کی طرف توجّہ دلائی ہے - اور اُنہیں تین قسم کے مصائب کا خصوصیّت سے ذکر فرمایا - الباساء مالی مصائب جیسے تنگدستی - الضراء جسمانی مصائب جیسے بیماری - حین البأس جنگ اور مقابلہ کے وقت اور اس طرح پر آنے والے جنگوں کی طرف پھر اشارہ فرمایا - الصابرین کو الموفون کی طرح مرفوع نہیں رکھا - یہ نصب علی المدح ہے - یعنی باقی چیزوں میں سے صبر کی فضیلت کو ظاہر کرنے اور اُس کو مُمتاز کرنے کے لیئے الصابرین کو منصوب رکھا ہے +

۱۷۸ ۲۵۶ - کُتب علیکم القصاص فی القتلیٰ - غذاؤں کی حِلّت وحُرمت کے بعد اب قصاص کا قانون بیان فرماتا ہے جس طرح غذاؤں کی حُرمت میں بھوک کے مصائب برداشت کرنے کی تیاری کی طرف اشارہ تھا جو آب جنگوں میں پیش آنے والی تھیں اسی طرح قصاص کے مضمون میں بھی جنگوں کی طرف اشارہ ہے - جیسا کہ اگلی آیت میں ولکم فی القصاص حیوٰۃ میں اُس کی کچھ وضاحت کی ہے - مسلمانوں پر کُفار نے جس بیدردی سے مظالم کا دروازہ کھول رکھا تھا - اس کا ایک وقت تک اور ایک حد تک

مقصد قرار دے لے۔ اور بعض نے مشرق و مغرب سے بالخصوص نصاریٰ اور یہودیوں کے قبلوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ مگر چونکہ اس سے پہلے آیت ۱۱۵ میں مسلمانوں کو یہ وعدہ دیا گیا تھا۔ کہ مشرق و مغرب اللہ کا ہی ہے۔ جدھر تم منہ کرو گے اُدھر ہی تمہارے لئے فتوحات کے دروازے کھول دیئے جائیں گے (دیکھو نوٹ ۱۸۲) اور چونکہ اس سے پہلے بھی قبلہ کا ذکر لا کر فتوحات کا اور ان فتوحات کے لئے مالی اور جانی قربانیوں کا ذکر کیا ہے۔ اسلئے ہوسکتا ہے۔ کہ یہاں بھی یہی مُراد ہو کہ گو ہم نے تم کو مشرق و مغرب میں فتوحات کے وعدے دیئے ہیں۔ مگر ہم تم کو دُنیا میں صرف ایک فاتح قوم بنانا نہیں چاہتے۔ اور نہ ہی صرف فتوحات سے انسان حقیقی نیکی کو حاصل کرسکتا ہے۔ فتوحات بھی بیشک مسلمانوں کو ملیں گی لیکن فتوحات کا حاصل کرنا اُنکی زندگیوں کا وہ اصل مقصد نہیں جسے تم بالشان مقصد یا حقیقی بِر کہا جاسکے ؛

۲۵۵۔ والکن البر من امن باللہ ۔ عربی زبان میں بعض وقت ایک صفت کو موصُوف کی جگہ اس کے اندر اس صفت کا کمال ظاہر کرنے کے لئے رکھ دیا جاتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں بھی حضرت نوحؑ کے بیٹے کے متعلق ہے۔ انه عمل غیر صالح۔ اسی طرح ایک بڑے سخی کو الجود کہہ دیتے ہیں۔ یہاں بھی بر سے مُراد ذوالبر ہے۔ یا یُوں معنے کرسکتے ہیں۔ کہ نیکی اس شخص کی ہے۔ جو ایسا ایسا کرتا ہے۔ حقیقی اور کامل نیکی کے لئے یہاں پہلے تو ایمان کو ضروری قرار دیا اور پانچ چیزوں پر وہ ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ یوم آخر۔ فرشتے۔ کتابیں۔ نبی۔ اور عملی حصّہ میں سب سے مُقدم انفاق مال کو کیا۔ جس کے لئے شرط ہے۔ کہ علیٰ حُبّہٖ ہو۔ یعنی محض اللہ تعالیٰ کی کامل مُحبّت کے لئے اِنسان دوسرے اِنسانوں کے ساتھ نیکی کرے۔ اور اس میں کسی قسم کی ملونی نہ ہو۔ بعض وقت لوگ خاص اغراض کو مدِّنظر رکھ کر دوسروں سے نیکی کرتے ہیں۔ مگر تقوے کا آخری مرتبہ اِنسان کو اس ناقص مرتبہ پر چھوڑنا نہیں چاہتا۔ کیسی پاک اور کامل تعلیم دی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے بھلائی کرو۔ بعض لوگوں نے علیٰ حُبّہٖ کے معنے یہ بھی کئے ہیں۔ کہ مال کی محبّت کے باوجود مال خرچ کرے۔ مگر مجھے پہلے معنے پسند ہیں۔ اور انہی معنوں کی تائید فی الرقاب کے لفظ سے ہوتی ہے۔ لفظی معنے فی الرقاب کے گردنوں کے آزاد کرنے کے ہیں۔ عرب میں غلاموں یعنی جنگی قیدیوں کے آزاد کرنے پر یہ لفظ بولا جاتا تھا۔ پس یہ صرف اللہ تعالےٰ کی کامل محبّت کا تقاضا ہی ہوسکتا ہے۔ کہ انسان اپنے دشمنوں کے ساتھ

۱۷۸
قصاص میں پائی جاتی ہے۔ کہ گو قانون تو یہی ہے کہ قاتل کو قتل کیا جائے لیکن یہ ہو سکتا ہے۔ کہ خود مقتول کے وارث یا وارث کوئی نہ ہو تو حاکم کسی وجہ سے جس کا ذکر قرآن کریم نے بیان نہیں فرمایا۔ ایک حد تک قاتل کو قابل معافی سمجھے یا اس کے جُرم کو خفیف سمجھے اور بجائے قصاص کے کسی فدیہ پر راضی ہو جائے۔ تو اسے اسلام نے جائز رکھا ہے۔ اور درحقیقت ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ پس ایک ایسے مذہب کے لئے جس کے قوانین ہر ملک اور ہر زمانہ پر حاوی ہونے تھے ضروری تھا۔ کہ اپنے قوانین میں ہر قسم کے حالات کے لئے جو پیش آنے والے ہوں گنجائش رکھتا۔ ایسی رقم کو جو بطور فدیہ قاتل سے لیجائے دیت یعنی خُون بہا کہتے ہیں۔ مگر اس کے مُتعلق بھی تاکید فرمائی۔ کہ اُس کا مطالبہ معرُوف طور پر کیا جائے۔ اور حد سے زیادہ تشدّد نہ کیا جائے۔ اور قاتل کو بھی واجب ہے۔ کہ نیکی کے ساتھ اس رقم کو ادا کرے۔ ذلك تخفيف من ربكم کے لفظ میں تخفیف جُرم کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے +

۱۸۰
۲۵۹۔ كتب عليكم اذا حضر احدكم الموت ان ترك خيرا الوصية للوالدين والاقربين بالمعروف ۔ یہ آیت ان آیات میں سے ہے جن پر منسُوخ ہونے کا حکم یقینی اور قطعی طور پر لگایا گیا ہے۔ یعنی یہ کہا جاتا ہے۔ کہ اس آیت میں تو یہ حکم ہے۔ کہ والدین اور قریبیوں کے لئے وصیّت کرنا ضروری ہے۔ اور اسکے بعد سُورت النساء میں اللہ تعالیٰ نے خُود والدین اور قریبیوں کے حصّے مقرر فرما دیئے پس جو حق ازرُوئے وصیّت حصے کرنے کا یا جو حکم وصیّت کرنے کا تھا وہ منسُوخ ہو گیا۔ مگر یہ آیت منسُوخ نہیں۔ اور اس کے مُتعلق چند باتیں یاد رکھنی ضروری ہیں +

اوّل۔ آیت توریث میں جہاں ورثائے مُتوفّی کے حصّے مقرر کیئے ہیں۔ ہر بار من بعد وصيّة کا لفظ بڑھایا ہے۔ جس سے معلُوم ہُوا۔ کہ وصیّت کو وہاں بھی جائز قرار دیا ہے۔ پھر سُورت المائدہ جو کہ آخری سُورتوں میں سے ایک سُورت ہے۔ اس میں بھی وصیّت کا تذکرہ موجُود ہے۔ اور ایسے الفاظ میں موجُود ہے۔ جن سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسی حکم وصیّت کی طرف اشارہ ہے۔ يا ايها الذين امنوا شهادة بينكم اذا حضر احدكم الموت حين الوصية اثنن ذوا عدل منكم ... یعنی جب موت آ موجُود ہو۔ اور وصیّت کرنے لگو تو وصیّت کے وقت دو عادل گواہوں کی گواہی ہونی چاہئیے جو تم میں سے ہوں الخ۔ جس سے صاف پتہ لگتا ہے۔ کہ قرآن کریم نے سُورۃ البقرۃ والے حکم وصیّت کو منسُوخ قرار نہیں دیا +

جہاں تک عفو سے کام لیا جاسکتا ہے۔ درگذر سے جواب دینے کی تاکید تھی۔لیکن جہاں ایک ظالم گروہ ایک خاص قوم کو تباہ کرنے کے ہی درپے ہو جائے۔اور خدا یتعالیٰ اس قوم کو تباہ کرنا نہ چاہتا ہو۔ وہاں عفو اور درگذر کی حُجّت ان پر پُوری کر کے آخر قصاص کا وقت بھی آنا تھا سو گو قانُون تو مُسلمانوں کے لئے بیان فرمایا۔مگر اشارہ اسمیں بھی یہی ہے۔کہ اب بدون قصاص تمہاری زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ کتب علیکم القصاص فے القتلیٰ میں وہ عالمگیر قانُون قصاص کا بیان فرمایا ہے۔جس پر آخر تجربہ نے بھی نوعِ انسانی کو مجبُور کیا ہے۔قصاص قص سے مشتق ہے۔جس کے معنے پیچھا کرنے کے یا پیروی کرنے کے ہیں۔یہاں مقتُولین کے بارے میں قصاص کو فرض کیا ہے۔یعنی جو شخص قتل کرے۔اس کو قتل کیا جائے۔قصاص کا قانون تو صرف اسی قدر ہے اس کے بعد دو خاص باتوں کا ذکر فرمایا ہے +

۲۵۷۔ الحر بالحر والعبد بالعبد والانثیٰ بالانثیٰ۔اس سے پہلے کہا گیا تھا کہ مقتُولین کے بارے میں قصاص کا حکم دیا جاتا ہے یعنی قاتل کو قتل کیا جائے۔اس کے بعد جو یہ لفظ آتے ہیں۔ ان کے معنے یُوں کرنے چاہئیں۔آزاد ہو تو آزاد۔غلام ہو تو غُلام۔عورت ہو تو عورت۔یعنی اگر قاتل آزاد ہو تو اس سے قصاص لیا جائے۔ غُلام قاتل ہو تو وہی غلام ہی قتل کیا جائے۔عورت نے کسی کو مار ڈالا ہے۔تو وہی عورت ہی اس کی سزا پائے۔اس تصریح کی ضرورت اِسلیئے پیش آئی کہ ایام جاہلیّت میں مُلک عرب کا قانُون تو جس کی لاٹھی اُس کی بھینس والا ہی تھا۔جو قوم زیادہ طاقتور ہوتی۔وہ کمزور قوم سے معمولی قصاص پر راضی نہ ہوتی تھی۔اور نہ ہی جب قصاص دینا پڑے تو معمُولی رنگ میں قصاص دینے کے لیئے تیار ہوتے تھے۔ مثلاً اگر غلام نے اُن کے حُر کو قتل کر دیا تو وہ اس پر غُلام کی بجائے کسی حُر کو مارنا چاہتے تھے۔اور اگر عورت نے کسی مرد کو قتل کر دیا تو وہ کہتے تھے کہ عورت کو قتل کرنے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوتا بلکہ جس طرح ہمارا ایک مرد میدان جنگ میں نکلنے والا مارا گیا ہے۔اسی طرح ہم بھی راضی نہیں ہونگے جب تک کہ ایک مرد کو قتل نہ کر لیں۔ان سب تفریقوں کو اسلام نے مٹا دیا۔اور فرمایا کہ قصاص کے معنے تو قاتل کو مارنے کے ہیں۔پس حُر قاتل ہو تو حر کو مارو۔غلام قاتل ہو تو غلام کو مارو۔عورت قاتل ہو تو عورت کو مارو نہ یہ کہ قاتل کوئی ہو اور قصاص کسی سے لیا جائے +

۲۵۸۔ فمن عفی لہ من اخیہ شئی۔یہ دوسری ایک خاص بات ہے۔جو اسلام کے قانُون

ہے منسوخ نہ سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اس کے ماتحت وصیت کی جاتی تھی۔ اگر آیت منسوخ سمجھی جاتی تو سعد بن ابی وقاص دریافت ہی کیوں کرتے۔ اور گو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کی اجازت نہیں دی۔ مگر سعد بن ابی وقاص کا یہ ارادہ کہ وہ سارے مال کی وصیت کرنا چاہتے تھے صاف بتاتا ہے۔ کہ اس آیت پر بلا کسی حد بندی کے عملدر آمد کیا جاتا تھا۔ اور خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو جواب اس موقعہ پر دیا ہے۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ نے سعد بن ابی وقاص کو یہ جواب نہیں دیا۔ کہ تم سارا مال کس طرح وصیت کر سکتے ہو۔ جب آیت توریث کی رُو سے آدھا مال بیٹی کیلئے چھوڑنا ضروری ہے۔ بلکہ یہ فرمایا۔ کہ سارا مال وصیت کر دینے سے تمہارے ورثاء فقیر رہجائینگے اور ورثاء کے لئے مال چھوڑنا بھی ایک طرح اِنفاق کا حُکم رکھتا ہے۔ سو یہ ارشاد اس سے اگلی آیت فمن خاف من موص جنفا او اثما فاصلح بينهم کے ماتحت آسکتا ہے پس معلوم ہُوا صحابہ اس آیت کو قابل عملدر آمد سمجھتے تھے۔ اور خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے باوجود ایک موقعہ پیش آنے کے جب اُس کی منسوخی کا اگر یہ منسوخ تھی ظاہر کیا جانا ضروری تھا۔ اُسے منسوخ نہیں فرمایا۔ نہ اس پر کسی قسم کی حد بندی کی +

**چھارم**۔ اس آیت میں ان ترک خیرا کی شرط لگائی گئی ہے۔ اور خیر کے معنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مال کثیر مروی ہیں۔ پس اس آیت کا حُکم صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو مال کثیر چھوڑیں۔ چنانچہ ذیل کی دو روایتیں قابل غور ہیں۔ روی عن علی ان مولی له اراد ان یوصی وله سبع مائة درهم فمنعه و قال قال الله تعالی ان ترک خیرا والخیر هو المال الکثیر۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مُتعلق روایت کی جاتی ہے۔ کہ آپ کے ایک آزاد کردہ غلام نے ارادہ کیا۔ کہ وصیت کرے۔ اور اس کے پاس سات سو درہم تھے۔ تو آپ نے اسے روک دیا۔ اور فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ان ترک خیرا۔ اور خیر مال کثیر کو کہتے ہیں۔ دوسری روایت یہ ہے۔ عن عائشہؓ ان رجلا اراد ان یوصی فسالته کم مالک فقال ثلاثة آلاف فقالت کم عیالک قال اربعة قالت انما قال الله تعالی ان ترک خیرا فان هذا الشیٔ یسیر فاترک لعیالک۔ یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مُتعلق روایت کی گئی ہے۔ کہ ایک شخص نے وصیت کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے اس سے دریافت فرمایا۔ کہ تمہارا مال کس قدر ہے۔ اس نے کہا تین ہزار۔ آپ نے دریافت فرمایا تمہارا اعیال کس قدر ہے۔ کہا چار۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے۔

**دوسرے۔** اگر حکم بعض حالات میں قابل تعمیل ہو اور بعض میں نہ ہو تو اسے منسوخ نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً تیمم پانی کی عدم موجودگی میں ہو سکتا ہے۔ مگر تاہم یہ نہیں کہا جائیگا۔ کہ تیمم کا حکم منسوخ ہے۔ بلکہ وہ محکم بعض خاص حالات کے ماتحت نفاذ پاتا ہے۔ اسی طرح بڑ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ حکم وصیت بعض حالات میں یا خاص خاص ورثاء کی صورت میں نفاذ نہیں پا سکتا۔ مگر صرف اتنی بات سے یہ حکم منسوخ نہیں ہو جاتا۔ اور اس لیئے آیت بھی منسوخ نہیں کہلا سکتی +

**سوئم۔** بخاری اور مسلم کی متفق علیہ حدیث حسب ذیل ہے:۔ عن سعد بن ابی وقاص قال مرضت عام الفتح مرضا اشفیت علی الموت فاتانی رسول الله صلے الله علیه وسلم یعودنی فقلت یا رسول الله ان لی مالا کثیرا ولیس یرثنی الا ابنتی افاوصی مالی کلّه قال لا قلت فثلثی مالی قال لا قلت فالنصف قال لا قلت فالثلث قال الثلث والثلث کثیر انک ان تذر ورثتک اغنیاء خیرمن ان تذرهم عالة یتکففون النّاس وانک لن تنفق نفقة تبتغی بها وجه الله الا اجرت بها حتی اللقمة ترفعها الی فی امرأتک۔ یعنی سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں۔ کہ میں فتح مکّہ کے سال ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ جس سے میری حالت موت تک پہنچ گئی۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیئے تشریف لائے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ میرے پاس مال بہت ہے۔ اور میرا وارث سوائے میری بیٹی کے کوئی نہیں۔ تو کیا میں اپنا سارا مال وصیت کردوں۔ فرمایا نہیں۔ میں نے کہا پھر دو تہائی۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کیا۔ پھر نصف آپ نے فرمایا نہیں۔ میں نے کہا ایک تہائی۔ آپ نے فرمایا اچھا ایک تہائی کر دو۔ اور ایک تہائی بھی بہت ہے۔ کیونکہ اگر تم اپنے ورثاء کو دولتمند چھوڑو تو اس سے بہتر ہے۔ کہ تم اُن کو مفلسی کیحالت میں چھوڑو۔ کہ لوگوں سے مانگتے پھرتے ہوں۔ اور تم کوئی خرچ نہیں کرتے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی چاہی گئی ہو۔ مگر کہ اس کا اجر تم کو دیا جاتا ہے یہانتک کہ اس لقمہ کا بھی جس کو تم اپنی بی بی کے مُنہ کی طرف اُٹھاتے ہو۔ اب اس حدیث کا زمانہ فتح مکّہ کا ہے۔ یعنی ہجرت کا آٹھواں سال اور یقیناً یہ آیت جو زیر بحث ہے۔ اور سورت النّساء کی آیت توریث دونوں آٹھویں سال ہجرت سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔ اور یہ حدیث ہے بھی متفق علیہ۔ پس اس سے اِس آیت کے معنے صاف ہو جاتے ہیں سب سے پہلی بات جو معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس آیت زیر بحث کو جس میں وصیت کا حکم

۱۸۰ مال کثیر چھوڑتا ہے۔ اس کے لیئے ضروری ہے۔ کہ وہ کچھ وصیّت بھی کر جائے۔
بلکہ یہ معنی لے کر ہم اسی آیت پر اس حکم کو بھی مبنی قرار دے سکتے ہیں۔ جو صحیحین کی حدیث
مذکورہ بالا میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دیا۔ کہ ایک ثلث کی وصیّت کرو۔ کیونکہ ان
معنوں کی رو سے اصل حکم تو یہ ہُوا۔ کہ جو شخص اپنے ورثا کے لیئے مال کو چھوڑتا ہے۔
وہ کچھ وصیّت بھی کر جائے۔ تو سعد بن ابی وقاص نے جب کُل مال کی وصیّت کا ارادہ
کیا۔ تو ورثا کے لئے تو باقی کچھ نہ رہا۔ اور وصیّت اسی صُورت میں ہو سکتی ہے۔ جب ورثا
کے لئے کچھ چھوڑا جائے۔ اس کے لیئے نبی کریم صلے اللہ وسلم کا یہ حکم کہ ایک تہائی کی
وصیّت کرو۔ اور باقی اپنے ورثاء کے لیئے چھوڑ دو بالکل آیت کے ان معنوں کے مطابق
ہوا۔ ہاں بعض نے للوالدین والاقربین میں وصیّت کو عملدر آمد میں لانے والے
مُراد لیئے ہیں۔ اس طرح پر بھی کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ اور آیت کو منسوخ کرنا نہیں پڑتا
حقًّا علی المتقین کا فقرہ بھی جس پر یہ آیت ختم ہوتی ہے اِنہی معنوں کا موئید ہے
جو میں نے اُوپر کیئے ہیں۔ کیونکہ مُتقی پر یہ واجب ہے۔ کہ جب اپنے ورثاء کے لیئے بہت سا
مال چھوڑتا ہے۔ تو کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں بھی دے جائے +

۱۸۲ ۲۶۰۔ فمن خاف من موص جنفا او اثما۔ وصیّت کُنندہ کو اس حالت میں جب خطرہ ہو
کہ وہ ایک طرف ہی مائل ہو جائیگا۔ یا اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کوئی کام کر بیٹھیگا۔
مشورہ دیدینا اور صلاح کرا دینا تبدیل وصیّت میں داخل نہیں۔ جس پر پچھلی آیت میں
وعید آچکا ہے +

رکوع ۲۳/۷
۱۸۳ ۲۶۱۔ کُتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم۔ روزے قریبًا دُنیا کی
ہر ایک قوم میں پائے جاتے ہیں۔ اور اسی کی طرف الذین من قبلکم میں اشارہ ہے۔
اور اسلام کے چار ارکان میں سے یہ ایک رُکن ہے۔ جس پر عمل کرنا ہر ایک مسلمان کیلئے
ضروری ہے۔ باقی تین ارکان نماز زکوٰۃ اور حج ہیں۔ اور ان سب کا ذکر اسی سُورت
البقرۃ میں آجاتا ہے۔ دُنیا کی مختلف قوموں میں سے صرف عیسائی ایک ایسی قوم ہے جس نے
شریعت کو جواب دے کر ہر ایک قسم کی عبادت سے آزادی حاصل کر لی ہے۔ مگر جب ہم
مُروّجہ اناجیل میں ہی حضرت مسیح علیہ السلام کے حالات کو پڑھتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا
ہے۔ کہ آپ نے نہ صرف خود روزے رکھے۔ بلکہ اپنے پیرووں کو بھی روزے رکھنے کی ہدایت
کی۔ مگر جب پولوس نے ایک سہل راہ نجات کی کفارہ کی شکل میں بتادی۔ جس میں کوئی
تکلیف اُٹھانی ہی نہ پڑے۔ تو ان مصائب میں اپنے آپ کو ڈالنے کی کیا ضرورت تھی

ان ترک خیرا۔ اور یہ تو بہت تھوڑی سی چیز ہے۔ اسے اپنے عیال کے لیئے چھوڑ دو۔
پس معلوم ہؤا۔ کہ آیت زیرِ بحث میں وصیّت کا حکم ان لوگوں کے لیئے ہے جو مال کثیر چھوڑیں +

**پنجم**۔ قرآن کریم میں مال کثیر کی شرط لگانے سے اور تینوں متذکرہ بالا روایات سے جن میں سے ایک نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور صحیحین میں مذکور ہے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس آیت کی وصیّت کا اصل حکم انفاق فی سبیل اللہ کے لیئے تھا۔ ورنہ مال کثیر کی شرط اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ اپنے ورثا کو غنی چھوڑنا اُن کو فقیر چھوڑنے کی نسبت بہتر ہے بے معنی ہو جاتا ہے۔ ہاں جب ایک شخص کے پاس مال کثیر ہو۔ تو اس میں سے وہ کچھ ورثا کے لیئے چھوڑ سکتا ہے۔ اور یہی معنی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس آیت کے سمجھے اور اُنہی کے مُطابق تینوں حالتوں میں عملدر آمد کرایا۔ اس طرح پر اس آیت کا حکم آیت توریث کے حکم سے بالکل علیحدہ ہؤا۔ اور آیت توریث کی وحی سے اس پر قطعاً کچھ اثر نہ پڑا۔ پس آیت توریث سے اس کو منسوخ قرار دینا غلطی ہے۔ اور جس شخص نے ایسا کیا۔ اس نے درحقیقت آیت کے اصل مطلب کو نہیں سمجھا +

**ششم**۔ اس پر ایک شُبہ وارد ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ اگر واقعی یہ وصیّت کا حکم محض خیراتی کاموں کے لیئے تھا۔ اور مال کثیر سے مشروط تھا تو للوالدین والاقربین کے لفظ کیوں بڑھائے۔ سو اوّل تو یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ والدین اور اقربا بھی انفاق فی سبیل اللہ کے ماتحت آجاتے ہیں۔ اور اقربا تو بہت سے ایسے ہو سکتے ہیں جنہیں بذریعہ تقسیم وراثت کوئی حصہ نہیں پُہنچتا۔ اُن کے لیئے وصیّت انفاق فی سبیل اللہ میں آجاتی ہے باقی رہے والدین سو ہو سکتا ہے کہ بعض صُورتوں میں باوجُود وراثت کا حصہ پانے کے ایک بُوڑھا باپ یا بُوڑھی ماں جن کے لیئے اور کوئی سبیل گذارہ کی نہیں ہے ایسے حقدار سمجھے جائیں۔ دوسرے بعض مخصُوص حالات میں ہو سکتا ہے۔ کہ والدین ورثہ سے حصہ نہ پائیں۔ جیسے مثلاً ان کے کافر ہونے کی صُورت میں (ان میں سے پہلی صُورت کے خلاف بیشک حدیث لا وصیۃ لوارث ہے۔ لیکن اگر آیت قُرآنی اور حدیث میں کسی طرح تطبیق نہ ہو سکے تو حدیث کو ناقابل اعتبار یا منسوخ قرار دینا پڑیگا نہ کہ آیت قرآنی کو) پھر ایک صُورت یہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ للوالدین والاقربین کا فقرہ ان ترک خیرا کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔ یعنی جو شخص والدین اور اقربین یعنی اپنے ورثاء کے لیئے

۱۸۳

پرہوتا ہے - کہ جب اِنسان محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیئے ان چیزوں کو ترک کر دیتا ہے - جن کا استعمال اس کے لیئے بالکل جائز تھا - تو اُس کی وہ قوتیں نشوونُما پاتی ہیں - جو اِنسان کو بدی کی گرفت سے چھڑا کر پاکیزگی کے مقام پر پُہنچاتی ہیں - کیونکہ اِنسان کی ہر ایک قوت اپنے کمال تک پہنچنے کے لیئے اسباب کی محتاج ہے - کہ اُسے کام میں لگایا جائے - یہی وجہ ہے کہ اسلام نے نماز سے اور روزوں سے اِنسان کے اندر جو نیکی کی قوت ہے - اس کو ہر وقت کام پر لگایا ہے - اور جس طرح پر نماز اِنسان کو حقیقی پاکیزگی کے مقام تک پُہنچاتی ہے - ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر - اِسی طرح پر روزوں کی اصل غرض یہ ہے کہ اِنسان کو سکھایا جائے - کہ تقوے کے مقام تک وہ کیونکر پُہنچ سکتا ہے - اور اِس طرح پر اسلام کے روزوں کی غرض وہ نہیں جو دوسری قوموں کے اندر تھی +

۱۸۴

۲۶۳ - ایاماً معدودات - گنتی کے دن یعنی معلوم دن یا تھوڑے دن اسکی وضاحت شہر رمضان سے فرمائی جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے +

۲۶۴ - فمن کان منکم مریضاً او علی سفر فعدۃ من ایام اخر - اس آیت میں مریض اور مسافر کے لیئے عدۃ من ایام اخر یعنی مقررہ ایام کو چھوڑ کر پچھلے دنوں میں گنتی پُورا کرنے کا ارشاد ہے - اس بات پر بہت بحث ہوئی ہے - کہ آیا یہ برسبیل رُخصت ہے - یا وُجوب کے طور پر - بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے - کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے سفر میں روزے رکھنے کو منع فرمایا - اسلیئے محتاط مذہب یہی معلوم ہوتا ہے - کہ بیماری اور سفر میں روزہ ترک کر دے - اور اُتنے دِن بعد میں روزہ رکھ لے - کیونکہ اگر رُخصت کے طور پر بھی ہو تو اللہ تعالیٰ کی رُخصت سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے - اور دوسرے بعض وقت اِنسان کو بیماری اور سفر میں نااندیشیدہ تکالیف پیش آجاتی ہیں +

۲۶۵ - وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین - عموماً اُس کے معنے یہ لیئے گئے ہیں کہ جو شخص روزہ کی طاقت رکھتے ہوں - اور پھر روزہ نہ رکھیں - وہ ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دیدیا کریں - اور اس کو اگلی آیت میں الفاظ من شھد منکم الشھر فلیصمہ سے منسُوخ قرار دیا گیا ہے - مگر بُخاری میں دونوں قسم کی روائتیں موجود ہیں - یعنی ابن عمرؓ کی روایت کہ یہ منسُوخ ہے - اور ابن عباسؓ کی روایت کہ منسُوخ نہیں - ہاں ابن عبّاسؓ کی قرأت یطوقونہٗ ہے - مگر سب سے بڑی مشکل یہ ہے - کہ منسُوخ کرنے کے لیئے جو الفاظ بڑھانے پڑتے ہیں - وہ قرآن کریم میں نہیں ہیں - بلکہ الفاظ کے معنے تو صرف اس قدر ہیں - کہ جو شخص اسکی طاقت رکھتے ہیں - وہ ایک مسکین

حضرت مسیحؑ نے خود روزے رکھے - دیکھو متی ۴: ۲" اور جب چالیس دن اور چالیس رات روزہ رکھ چکا آخر کو بھوکا ہُوا"۔ پھر مشہور پہاڑی تعلیم میں روزے رکھنے کا حُکم موجود ہے - "پھر جب تُم روزہ رکھو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اُداس نہ بناؤ.... تاکہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے آشکارا تجھے بدلہ دے" متی ۶: ۱۶ و ۱۷ (اِس سے مسیحیوں کا کفّارہ کا عقیدہ بھی باطل ثابت ہوتا ہے - کیونکہ یہاں روزوں کا بدلہ دیا جانے کا ذکر ہے - پس اگر نماز اور روزہ پر نیک بدلہ ملتا ہے - تو کفّارہ کا عقیدہ باطل ہُوا)- ایسا ہی لوقا ۵: ۳۳ - ۳۵ میں ہے" اور اُنھوں نے اس سے کہا - کہ یوحنّا کے شاگرد کیوں اکثر روزہ رکھتے اور دُعا مانگتے ہیں - اور اسی طرح فریسیوں کے شاگرد بھی پر تیرے شاگرد کھاتے پیتے ہیں - اس نے ان سے کہا کیا تُم براتیوں کو جب تک دلہا اُن کے ساتھ ہے روزہ رکھوا سکتے ہو - پر وے دن آویں گے - کہ دُلہا اُن سے جُدا کیا جائیگا - اُن دنوں میں البتہ روزہ رکھیں گے"- مگر افسوس کہ دُلہا کے جُدا ہونے کی دیر تھی کہ رہی سہی پابندیاں بھی اُٹھ گئیں - اور مسیح کے اس حکم پر عمل نہ ہُوا - کہ جب دُلہا جُدا کیا جائیگا - تو پھر یہ بہت روزے رکھیں گے - اس سے معلوم ہوتا ہے - کہ حضرت مسیحؑ علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کے لئے روزہ ضروری ٹھیرایا تھا - پس کتب علی الذین من قبلکم بالکل صحیح ارشاد الٰہی ہے +

۱۶۲- لعلّکم تتّقون - اِن دو لفظوں میں روزے کی علّت غائی بیان فرمائی ہے - شریعت کے احکام بیشک پہلے بھی پائے جاتے تھے - نماز اور دُعا کا بھی کوئی نہ کوئی طریق ہر قوم میں تھا - روزوں اور زکوٰۃ کا بھی کوئی نہ کوئی رنگ موجود تھا - مگر اسلام نے ان تمام عبادات کو اپنے کمال تک پہنچایا - اور کمال انسانی کے حصول کو اُن کی اصل غرض قرار دیا - بائبل کی نجوم میں روزوں کا ذکر کرتے ہُوئے پادری کروڈن لکھتا ہے - کہ روزے ہر قوم میں غموں اور رنجوں اور مصائب کے وقت میں رکھے جاتے تھے جس کی غرض غالباً یہ ہوگی - کہ انسان ظاہر میں اپنے آپ کو ایک مصیبت میں مُبتلا کر کے ان غموں اور رنجوں سے نجات پائے - مگر اسلام نے جب روزوں کا حُکم دیا تو ایک اعلےٰ غرض بلکہ اِنسانی زندگی کے اعلےٰ ترین مقصد کو سامنے رکھا - وہ مُہتم بالشان مقصد اِنسانی زندگی کا کیا ہے - لعلکم تتقون - یعنی تاکہ تم ہر ایک قسم کی مُضر چیز اور ہر ایک بدی سے بچ کر حقیقی نیکی اور پاکیزگی کے اعلےٰ مقام پر پہنچ سکو - اور یہ اس طرح

حین یلقاہ جبریل۔ یعنی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے بڑھ کر سخی تھے۔ اور رمضان میں جب جبرئیل آپ کو ملتے آپ کی جُود انتہا کو پُہنچ جاتی تھی + حضرت ابنِ عبّاسؓ نے بھی آیت کو غیر منسُوخ کہا ہے۔ اسلیئے جو معنے اُنہوں نے لیئے ہیں۔ وہ لیکر بھی ہمیں آیت کو منسُوخ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ہاں اس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے۔ کہ حضرت ابنِ عبّاسؓ کی قرات عامہ قرات سے الگ ہے مگر در اصل دوسری قراتیں توضیح معنے کا کام بھی دے دیتی ہیں۔ یعنی بعض وقت دوسری قرأت سے ایک لفظ کے غیر معمُولی معنوں کا اظہار بھی مقصود ہوتا ہے۔ پس ہوسکتا ہے۔ کہ یطیقون کے معنے وہی لے لیئے جائیں۔ جو یطوقون کے معنے ہیں گو لُغت میں اس کے وہ معنے مذکُور نہ ہوں۔ تو اُس صُورت میں یہ معنے ہونگے۔ کہ جن شخصوں کی طاقت روزہ رکھنے کی برداشت نہ کرتی ہو۔ وہ بجائے روزہ کے فدیہ طعامِ مسکین دیدیا کریں۔ چنانچہ حضرت ابنِ عباسؓ نے یہی معنے مُراد لے کر بہت بُوڑھے مرد اور بہت بُوڑھی عورت اور حاملہ اور دُودھ پلانے والی عورت کے لیئے یہی فتوے دیا ہے۔ کہ وہ ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دیدیا کریں۔ چنانچہ ابُوداؤد میں ایک روایت ہے۔ عن ابن عباس قال اثبتت للحبلی والمرضع۔ وقال۔ کانت رُخصۃ للشیخ الکبیر والمرأۃ الکبیرۃ وھما یطیقان الصیام ان یفطرا ویطعما مکان کل یوم مسکینا والحبلی والمرضع اذا خافتا قال ابوداؤد یعنی علی اولادھما۔ یعنی ابن عبّاسؓ کہتے ہیں۔ کہ یہ آیت حاملہ عورت اور دُودھ پلانے والی عورت کے حق میں ثابت ہے۔ اور یہ بھی کہا۔ کہ بُوڑھے مرد اور بُوڑھی عورت کے لیئے یہ رُخصت تھی درانحالیکہ وہ روزے کی برداشت (نہ) کرسکتے ہوں کہ وہ افطار کرلیا کریں۔ اور ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلادیا کریں۔ اور حاملہ عورت اور دُودھ پلانے والی عورت بھی (ایسا ہی کریں) اگر اُن کو خوف ہو۔ ابُوداؤد نے خوف کی تفسیر یہ کی ہے۔ کہ اُن کی اپنی اولاد پر خوف ہو یعنی بچّہ یا جنین کو نقصان پُہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ آیت بہت بُوڑھوں اور حاملہ اور دُودھ پلانے والوں عورتوں کے لیئے سمجھی جاتی تھی۔ اور چُونکہ وہ حُکم اب تک قائم ہے۔ اسلیئے ان معنوں کے لحاظ سے بھی یہ آیت منسُوخ نہیں + یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ان تصوموا خیر لکم سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔ کہ اجازت ہے۔ کہ کوئی شخص چاہے تو روزہ رکھ لے اور چاہے تو افطار کرلے۔ یہ تو روزہ رکھنے کی

کا کھانا بطور فدیہ دیں۔ اب اگر یطیقونہ میں ضمیر صیام کی طرف ہو تو صاف معنے الفاظ کے صرف اس قدر ہونگے۔ کہ جو شخص روزہ کی طاقت رکھتے ہیں وہ مسکین کا کھانا بطور فدیہ دیں۔ اور جب تک اصل الفاظ میں یہ فقرہ نہ بڑھایا جائے "اگر وہ روزہ نہ رکھیں" تو منسوخ کرنے کی ضرورت کوئی باقی نہیں رہتی۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ایک آیت کو منسوخ کرنے کیلئے اپنی طرف سے اس میں کچھ زاید بڑھایا جائے +

اب باقی یہ سوال رہ جاتا ہے کہ جو شخص روزہ کی طاقت رکھتے ہیں اُن پر فدیہ کیسا؟ لفظ فدیۃ کے معنے راغب نے یُوں کیئے ہیں۔ وما یقی بہ الانسان نفسہ من مال یبذلہ فی عبادۃ قصر فیھا یقال لہ فدیۃ۔ یعنی کسی عبادت کی کمی کو پُورا کرنے کے لیئے جو مال اِنسان خرچ کرے۔ تاکہ اس کو تاہی کے نتیجہ سے بچا رہے اُسے فدیہ کہتے ہیں۔ اب چونکہ روزہ ایک عبادت ہے۔ اور اس میں باوجود ادائیگی کے بھی کوتاہی ہوجاتی ہے۔ اِسلیئے اگر طعام مسکین محض اِس قسم کی کوتاہی کو پُورا کرنے کے لیئے فدیہ سمجھ لیا جائے۔ تو کوئی ہرج نہیں۔ اور طعام مسکین کا رمضان کے بعد بطور صدقہ دیا جانا حدیث سے بھی فرض معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ وہی صدقہ ہے جسے صدقۃ الفطر کہتے ہیں۔ چنانچہ بُخاری میں فرض صدقۃ الفطر کا باب باندھا ہے۔ اور ابن عمرؓ کی روایت موجُود ہے۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرض زکوۃ الفطر صاعا من تمر او صاعا من شعیر علی کل حر او عبد ذکر او انثی من المسلمین۔ یعنی رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر ایک صاع کھجُور یا جَو کا ہر ایک مُسلمان پر شریف ہو یا غُلام مرد ہو یا عورت فرض کیا۔ پس ایک معنی تو اِس طرح ہوسکتے ہیں۔ اور ان معنوں کی رُو سے یہ حکم منسُوخ قرار نہیں پاتا + اور اگر یطیقونہ میں ضمیر بجائے صیام کے طعام کی طرف لیجائے۔ تو اس صُورت میں بھی اوّل الذکر صُورت کے قریب معنے ہونگے۔ مگر اس صُورت میں صدقہ فطر نہیں۔ بلکہ عام طور پر جن لوگوں میں طاقت ہو رمضان کے اندر صدقات کی تاکید سمجھی جائیگی۔ اور اسکے بعد جو الفاظ فمن تطوع خیرا آتے ہیں۔ وہ یقیناً ان معنوں کے مُویّد ہیں۔ یعنی صدقہ یا فدیہ بطور تطوع یعنی نفل کے رنگ میں ہے فرض نہیں۔ کیونکہ تطوع کے معنے کسی کام کو برضا و رغبت کرنے کے ہیں۔ اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت ثابت ہے۔ کہ آپ رمضان کے مہینے میں بہت سخاوت کیا کرتے تھے۔ چُنانچہ بُخاری میں ہے۔ عن ابن عباس قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجود الناس بالخیر وکان اجود ما یکون فی رمضان

جب کوئی پکارنے والا اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو قبول فرماتا ہے
اِس مسئلہ میں افراط اور تفریط کے پہلوؤں سے بچنا لازمی ہے۔ اوّل یاد رکھنا چاہیئے
کہ دُعا کا منشاء یہ نہیں ہے۔ کہ انسان اسباب سے کام لینا چھوڑ دے۔ بلکہ یُوں
سمجھنا چاہئے۔ کہ دعا بھی درحقیقت منجُملہ اسباب کے ایک سبب ہے۔ اور اس کے ذریعہ
سے اللہ تعالیٰ انسان کو بعض وقت دوسرے اسباب پر بھی مطلع فرما دیتا ہے۔ اور
بعض وقت اس کے لیئے اور کسی طرح پر راہ کھول دیتا ہے۔ دوم۔ ہر ایک مانگی ہُوئی
چیز کا مل جانا لازمی امر نہیں۔ کیونکہ اِنسان دُعا میں جو کچھ مانگتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ
کو مالک یقین کر کے مانگتا ہے۔ اگر ہر ایک دُعا کا قبول ہونا لازمی امر ہو تو گویا اللہ
تعالیٰ حاکم نہیں بلکہ بندہ کا محکوم ہو گیا۔ اِسی لیئے دوسری جگہ فرماتا ہے۔ فیکشف
ما تدعون الیہ ان شاء۔ یعنی جب مصیبت کے وقت تم اسے بُلاتے ہو تو جس مصیبت
کو چاہے دُور بھی کر دیتا ہے۔ ایسا ہی اپنے خاص بندوں کو مخاطب کر کے صاف طور پر فرماتا
ہے۔ ولنبلونکم بشئی من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس
والثمرات۔ حالانکہ یہ تو ایک فطری امر ہے۔ کہ جب کبھی اِنسان کے سامنے کسی مصیبت
یا خوف یا دُکھ یا مال و جان کے ضائع ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ تو وہ اُس کے لیئے دُعا
بھی کرتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ خوف کا آنا بھُوک کی مُصیبت کا دیکھنا مالوں
اور جانوں اور پھلوں کا نقصان اُٹھانا یہ بھی تمہارے لیئے ضرُوری ہے۔ اور اسی لیئے
ضرور ضرور ہم تُم کو ان چیزوں کا مزا چکھائیں گے۔ سوئم بعض دعاؤں کے قبول نہ ہونے
سے یہ خیال کرنا کہ پھر دُعا کا فائدہ ہی کیا ہے نہایت غلط ہے۔ دُنیا میں جس قدر اسباب
ہیں وہ سب ایک حد تک ہی فائدہ پُہنچاتے ہیں۔ کیونکہ انسان ان پر کامل طور پر متصرّف
نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اسباب مثلاً دوا کو ہی لے لو ہر حال میں ایسے مُوثر نہیں
ہو سکتے۔ کہ وہ نتائج پیدا کر دیں جو انسان چاہتا ہے۔ مگر با ایں اس وجہ سے اِنسان
اُن کے مُوثر ہونے کے یقین کو ترک نہیں کرتا۔ بلکہ انہی اسباب سے کام لیتا ہے۔ اسی طرح
پر اگر بعض دُعائیں قبُول نہ کیجائیں تو اس کا یہ نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ کہ دُعا کوئی فائدہ نہیں دیتی
یا محض عبادت کے طور پر ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہر ملک اور ہر قوم ہر زمانہ کے
راستبازوں نے دُعا سے کام لیا ہے۔ اور بڑے بڑے مقاصد جن کے حصُول سے ظاہری
اسباب عاجز آ گئے۔ وہ دُعاؤں کے ذریعہ سے حاصل ہوئے ہیں۔ خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم
کی زندگی دُعاؤں کی قبولیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے ﴿

آیت ۱۸۴

ترغیب دینے کے لئے فرمایا۔ کہ روزہ رکھنا بیشک ایک مشکل امر ہے۔ مگر تمہاری بھلائی اسی میں ہے +

۱۸۵ ۲۶۶۔ شھر رمضان۔ یعنی وہ روزے جو تُم پر فرض کئے گئے ہیں۔ جیسا کہ کتب علیکم الصیام میں فرمایا۔ وہ شہر رمضان ہے۔ رمضان رمض سے مشتق ہے جس کے معنے شدّت گرمی کے ہیں +

۲۶۷۔ انزل فیہ القراٰن یعنی اس مہینے میں نزُول قرآن کریم کا ابتدا ہُوا۔ اور انا انزلنٰہ فی لیلۃ القدر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابتدائے نزُول رمضان کے مہینے میں لیلۃ القدر کی رات میں ہُوا +

القراٰن قرء سے مشتق ہے۔ جس کے معنے جمع کرنے کے ہیں۔ چونکہ پڑھنے میں حروف اور کلمات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ اسلیئے قرء کے معنے پڑھنے کے بھی ہیں۔ قرآن اس پاک کتاب کا نام اسلیئے رکھا گیا۔ کہ اس کے اندر کُل پاک کتابوں کی بلکہ ساری پاک تعلیم جمع کر دیگئی ہے۔ اور اگر قرء بمعنی تلاوت سے لیا جائے۔ تو یہ اس پاک کتاب کا گویا اعجازی نام ہے۔ کیونکہ یہ امر مسلم ہے۔ کہ دُنیا میں کوئی کتاب قرآن کے برابر پڑھی نہیں جاتی۔ بائبل کی اگر کثرت اشاعت مان بھی لی جائے تو بھی پڑھنے میں قرآن کریم کے برابر وہ نہیں پہنچتی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہر ایک مسلمان دن میں پانچ دفعہ تو لازماً اس کو نمازوں میں پڑھتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ اُسکی تلاوت ویسے بھی کیجاتی ہے۔ اور ہر ایک نماز میں کئی کئی رکعت ہیں۔ اور اَور کوئی کتاب اِس طرح پر نہیں پڑھی جاتی۔ پھر لاکھوں اِنسان اس کے حافظ ہیں۔ جو دن رات اس کی تلاوت کرتے ہیں +

۲۶۸۔ ھدی للناس و بینٰت من الھدیٰ والفرقان۔ ان الفاظ میں قرآن کریم کے تین کمالات کا ذکر فرمایا۔ اوّل یہ کہ یہ ہدایت ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں ہدایت کے بینات یعنی واضح دلائل بھی ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ فرقان ہے یعنی حق و باطل میں امتیاز بھی کرتی ہے۔ فرقان کے معنے کے لئے دیکھو نوٹ ۱۰۰۔ غزوہ بدر بھی رمضان کے مہینے میں ہُوا تھا +

۱۸۶ ۲۶۹۔ و اذا سألك عبادی عنی فانی قریب۔ اس آیت کو رمضان کے ذکر میں لانے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے۔ کہ تا اس طرف اشارہ ہو۔ کہ رمضان میں قُرب الٰہی کی راہیں کھلجاتی ہیں۔ اور بوجہ تزکیہ نفس کے جو اس مہینے میں حاصل ہوتا ہے دُعائیں بھی زیادہ سُنی جاتی ہیں +

۲۷۰۔ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔ ان الفاظ میں دُعا کے مسئلہ کو بیان فرمایا ہے۔

ہے۔ اور اپنی جانوں کے حقوق میں کمی کرنے سے یہی مُراد ہوسکتی ہے۔ گویا اپنے نفس کے حقوق کو پُورا ادا نہ کرنا اُس پر ظلم تھا۔ بعض نے اپنی جانوں کے حقوق کی کمی مُراد نہیں لی۔ بلکہ اپنے لیئے ثواب حاصل کرنے میں کمی مُراد لی ہے۔ لیکن جس صُورت میں کوئی حُکم الٰہی نازل نہیں ہُوا تھا۔ جس کی رُو سے بیوی کے پاس جانا ناجائز ہوتا۔ تو اگر بالفرض کسی شخص نے اس پُرانی رسم کی خلاف ورزی بھی کی ہو تو وہ ثواب میں کمی کے نام سے موسُوم نہیں ہوسکتی۔ تاب علیکم کے معنے صرف اس قدر ہیں۔ کہ تم پر رجُوع برحمت کیا۔ یعنی رحمت کا معاملہ تم سے کیا۔ اور عفا عنکم کے معنے ہیں۔ تم سے درگذر کی۔ سو یہ اس سختی کا دور کرنا ہے۔ جو پہلے لوگوں نے خُود اپنے لیئے کر رکھی تھی۔ کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کھول کر فرما دیا۔ کہ تمہارے لیئے رات کو کھانا پینا اور بیویوں کے پاس جانا منع نہیں ہے +

۲۷۵۔ حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر۔ اس میں بتایا کہ کھانے پینے وغیرہ سے کس وقت اِنسان رُکے۔ خیط کے معنے دھاگا ہے۔ اور خیط من الصبح کے معنے صبح کی سفید دھاری ہیں۔ اور مُطلق خیط کے لفظ سے بھی یہ مُراد لے لی جاتی ہے۔ جیسا تاج العروس میں ہے۔ کہ دن کے رات سے الگ ہونے پر جس کو پو پھٹنا کہتے ہیں۔ تبین الخیط من الخیط کا محاورہ بولتے ہیں۔ اور مُفردات میں اس کے معنے لکھے ہیں۔ ای بیاض النھار من سواد اللیل۔ یعنی دن کی سفیدی رات کی سیاہی سے الگ ہو جائے۔ اور عدی بن حاتم کی ایک روایت لکھی ہے۔ کہ اس نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا۔ کہ میں نے دو رسیاں لیکر دیکھ لیا تھا جب سفید اور سیاہ رسیاں الگ الگ نظر آنے لگیں تو سمجھ لیا کہ اب وقت ہوگیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔ انما ذلک بیاض النھار وسواد اللیل۔ پس ابتدائی وقت روزے کا وہ ہے جسے ہماری زبان میں پو پھٹنا کہتے ہیں۔ یا صبح صادق جب دن کی روشنی پھیلنی شروع ہو جاتی ہے اور فجر کی نماز کا وقت ہو جاتا ہے۔ اور انتہائی وقت اس کا اتموا الصیام الی اللیل میں فرمایا یعنی رات کے شروع ہونے تک روزہ کو پُورا کرو۔ چُونکہ لیل غروب آفتاب سے شروع ہو جاتی ہے۔ اِسلیئے غروب آفتاب تک روزہ کا اتمام ہو جاتا ہے۔ اور جو لوگ ستاروں کے نکلنے کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ لیل کے اصلی معنے کو نہیں سمجھتے +

۲۷۶۔ انتم عاکفون فی المساجد۔ اعتکاف کی حالت ایک خاص حالت ہے جس میں معمُولی تعلقات سے بالکل علیحدگی اختیار کر لی جاتی ہے۔ اِس حالت میں بی بی کے پاس جانا منع

۱۸۶ ۲۷۱- فلیستجیبوا لی ولیومنوا بی -جو شخص دُعا کی زیادہ قبولیت چاہتا ہے-اور اُمورِ خفیہ میں اُس کی قبولیت کا خواستگار ہے اُسے چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اختیار کرے-اور کامل ایمان اللہ تعالیٰ پر لائے -لعلھم یرشدون فرماکر بتا دیا- کہ یہی کامیابی کی راہ ہے +

۱۸۷ ۲۷۲-احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الیٰ نساءکم-جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم نازل نہیں ہوتا تھا-خواہ عرب کے اندر یا پچھلے مذاہب کے اندر جو اچھی باتیں پائی جاتی تھیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ ان پر عمل کرتے تھے -چنانچہ رمضان کا حکم نازل ہونے سے پہلے مسلمان عام طور پر یوم عاشورہ کا روزہ رکھ لیا کرتے تھے یہود اور نصاریٰ کا روزہ تو غالباً آٹھ پہر کا تھا- اسی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے یہ معلوم ہوتا ہے- کہ مسلمان بھی جب روزہ رکھتے تھے تو صرف عشاء کی نماز تک کھانا پینا اور جماع جائز سمجھتے تھے جیسا کہ اکثر تفاسیر میں لکھا ہے لیکن اس میں کچھ بھی شک نہیں کہ ایسا کوئی حکم منجانب اللہ ان پر نازل نہ ہوا تھا-اور ان الفاظ میں کہ احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الیٰ نساءکم-اس پہلے طریق کو منسوخ کیا گیا ہے - نہ کہ کسی حکم الٰہی کو جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہو-اس طرح پر مسلمانوں کا روزہ جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے-صبح صادق سے غروب آفتاب تک قرار پایا- اور ایک امر الرفث الیٰ نساءکم کا ذکر یہاں کر دیا- اور دوسرے امر یعنی کھانے پینے کے متعلق آگے ذکر فرما دیا- رفث کے معنے عموماً اس کلام کے لئے گئے ہیں -جس میں ایسے امر کا ذکر ہو- جس کا کھلے طور پر ذکر کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا-اور یہاں رفث سے کنایہ مرد اور عورت کا تعلق ہے +

۲۷۳- ھن لباس لکم و انتم لباس لھن -لباس کی دوسرے مقام پر دو اغراض ظاہری بیان کی گئی ہیں -یعنی اوّل یہ کہ شرمگاہوں کو ڈھانپتا ہے-اور دوسرے انسان کی زینت کا کام دیتا ہے-پس مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا لباس کہہ کر مرد اور عورت کے تعلّقات کی اصل حقیقت کو ظاہر فرمایا ہے-اور یہ نکاح کے لئے ایک تحریص بھی ہے +

۲۷۴- تختانون انفسکم-اس کے اصل معنی تو صرف اس قدر ہیں- ظلموھا و تنقصون حظھا یعنی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے -چونکہ پرانی رسم کے ماتحت عشاء کے بعد کھانا پینا یا بیوی کے پاس جانا جائز نہ سمجھتے تھے- حالانکہ خدا تعالےٰ نے اُسے ناجائز نہیں فرمایا تھا-تو اس شدّت کا جو اپنے نفس پر کرتے تھے - اختیان نام رکھا-

ظاہر ہوتا ہے - کہ حلت و حرمت کا سوال تھا - ایسا ہی یسئلونک کے ماتحت یہاں بہت سے سوال ہیں جن میں سے اکثر میں جواب سے ہی سوال کا منشاء معلوم ہوتا ہے مثلاً یسئلونک عن الیتمٰی - اور یسئلونک عن المحیض وغیرہ دیکھو اگلا نوٹ +

۲۸۱ - قل ھی مواقیت للناس والحج - مواقیت میقات کی جمع ہے - جس کے معنے وقت مقرر کے ہیں - پس جواب یہ ہے - کہ ہلال لوگوں کے لیئے (یا لوگوں کے فائدہ کے لئے کیونکہ ل انتفاع کے لیئے آتا ہے) مُقرر وقت ہیں - اور حج کے لیئے (مُقرر وقت ہیں) اس جواب سے معلوم ہوتا ہے - کہ اھلۃ میں کچھ مخصوص ہلالوں یعنی مہینوں کا سوال تھا - حج کے لیئے جو مہینے مُقرر ہیں - ان کا قرآن کریم میں ایک جگہ اور بھی ذکر ہے - الحج اشھر معلومات - یہ معروف مہینے شوال ذیقعد اور ذی الحج کے پہلے دس دن ہیں - لیکن لوگوں کے فائدہ کے لیئے کون سے وقت خاص طور پر مُقرر ہیں جن کا ذکر لفظ مواقیت میں کیا ہے - یُوں تو شبہ نہیں کہ بارہ مہینے ہی لوگوں کے فائدہ کیلیئے مُقرر ہیں مگر یہاں مقرر وقت قرار دینے میں خاص غرض معلوم ہوتی ہے - اور چونکہ یہاں سے قتال کا حکم کھلے الفاظ میں شروع ہو جاتا ہے - جو اس سے پہلے صرف اشارات کے رنگ میں ذکر ہوتا رہا ہے - اور چونکہ عرب کے اندر چار مہینے خاص طور پر لوگوں کے فائدہ کے لیئے مُقرر تھے - کہ ان ایام میں جنگ بالکل بند ہو جاتی تھی - راستے کُھل جاتے تھے تجارتیں شروع ہو جاتی تھیں - اور ان چار مہینوں کی سارے مُلک کے اندر ایسی عزت تھی - کہ کوئی شخص اُن کی حُرمت کو توڑنے کی جُرأت نہ کر سکتا تھا - اور انہی چار مہینوں کے اندر حج کے ایام بھی آجاتے تھے - پس درحقیقت یہاں ھی مواقیت للناس میں انہی چار مہینوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جنگوں کے شروع ہو جانے کے ساتھ یہ اعلان بھی ضروری تھا - کہ آیا ان ایام کے اندر مسلمان بھی جنگ کرینگے یا نہیں - تو فرمایا کہ یہ چار مہینے تو تجارت کے لیئے جو جسمانی فائدہ ہے اور حج کے لیئے جو رُوحانی فائدہ ہے مخصُوص ہیں - اور اسی غرض کے لیئے مخصُوص رہیں گے - پس یسئلونک عن الاھلۃ میں انہی مخصوص ہلالوں کے متعلق سوال تھا - اس کی تصریح اسی رکُوع میں آگے چلکر خوب کر دی ہے +

۲۸۲ - ولیس البر بان تاتوا البیوت من ظھورھا ولکن البر من اتقی واتوا البیوت من ابوابھا - ظھور ظھر کی جمع ہے - جس کے معنے پیٹھ ہیں - ان الفاظ کے معنے کئی طرح پر کیئے جا سکتے ہیں - سب سے پہلے حسنؓ اور اصم کا قول ہے - کان الرجل فی الجاھلیۃ اذا ھم بشیء فتعسر علیہ مطلوبہ لم یدخل

آیت ۱۸۷

ہے اعتکاف عکوف سے ہے جس کے معنے ہیں ۔ الاقبال علی الشئ وملازمتہ علی سبیل التعظیم لہ ۔ یعنی کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا یا جھکنا اور اس کے ساتھ لگ جاتا یا اس پر ٹھیر جانا اور اعتکاف شریعت میں آخری عشرہ رمضان میں مسجد میں ٹھیرنے کا نام ہے جس میں سوائے ضروری حاجات کے مسجد سے باہر نہیں نکلنا چاہیئے +

۲۷۷ ۔ تلک حدود اللہ فلا تقربوھا ۔ ایک تو حدود کا توڑنا ہوتا ہے ۔ مگر یہاں ان حدود کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا ۔ جیسا کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ ان لکل ملک حمی وان حمی اللہ محارمہ فمن رتع حول الحمی یوشک ان یقع فیہ ہر ایک بادشاہ کی ایک رکھ ہوتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی رکھ وہ چیزیں ہیں جن کو اس نے حرام کیا ہے ۔ پس جو شخص اس رکھ کے اردگرد پھرتا ہے قریب ہے کہ اس کے اندر داخل ہو جائے +

۱۸۸

۲۷۸ ۔ ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل ۔ اس حکم کو رمضان کے حکم کے ساتھ لانے کا یہ منشاء ہے کہ جب تم میں یہ قوت پیدا ہوگئی ہے ۔ کہ تم اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیئے حلال چیزوں کو بھی جب وہ ترک کرنے کا حکم دے تو ترک کر دیتے ہو ۔ تو اب حرام طور پر یا باطل طریق پر ایکدوسرے کے مال کو کھانا ترک کرنا تمہارے لیئے آسان ہے ۔ درحقیقت دنیا میں مال کا گناہ ہی سب سے زیادہ پایا جاتا ہے ۔ یعنی مال کی محبت انسان پر ایسی غالب ہے ۔ کہ ناجائز طور پر جب انسان کو مال حاصل ہو تو وہ اس کو لینے میں بہت ہی کم مضائقہ کرتا ہے ۔ اور روزے درحقیقت انسان کے اندر وہ قوت پیدا کرتے ہیں جس سے وہ مال کے ناجائز کھانے کو ترک کر سکتا ہے +

۲۷۹ ۔ تدلوا بھا الی الحکام ۔ ادلاء کے معنے القاء ہیں ۔ اور اصل کنوئیں میں ڈول کے ڈالنے کو کہتے ہیں ۔ پس ادلاء سے مراد ذریعہ بنانا ہے ۔ یعنی اپنے مال سے حکام کو رشوت دے کر دوسروں کے مالوں کو نہ کھاؤ ۔ یا جھوٹی مقدمہ بازیوں پر روپیہ نہ لگاؤ +

رکوع ۲۴/۸ ۱۸۹

۲۸۰ ۔ یسئلونک عن الاھلۃ ۔ اھلۃ ھلال کی جمع ہے ۔ اور پہلی دو راتوں کے چاند پر ہلال کا لفظ بولا جاتا ہے ۔ اس کے بعد قمر کہلاتا ہے ۔ اور بعض کے نزدیک آخری دو راتوں کے چاند پر بھی ہلال کا لفظ بولا جاتا ہے +

ہلالوں کے متعلق کیا سوال تھا ۔ عموماً یہ خیال کیا گیا ہے ۔ کہ چاند کے بڑھنے گھٹنے کا سوال تھا ۔ مگر درحقیقت سوال کی نوعیت کا پتہ جواب سے لگتا ہے ۔ یوں تو قرآن میں فرمایا ۔ یسئلونک عن الخمر والمیسر تو اب اس کے یہ معنے نہیں کر سکتے ۔ کہ یہ پوچھتے تھے ۔ کہ شراب کس طرح بنائی جاتی ہے ۔ یا جوا کس طرح کھیلا جاتا ہے بلکہ جواب سے

کی اجازت دیگئی - مگر سورت الحج میں بھی چُونکہ یہ اجازت نازل ہو چکی تھی - اور الحج کا نزُول مکّہ میں ہُوا - اِس لیئے قتال کی اجازت پر سب سے پہلی وحی سُورت الحج کی یہ آیت ہے - اذن للذین یقتلون باھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر۔ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ لیکن اِس آیت میں محض اجازت ہے - اور آیت زیرِ بحث میں مُحکم کا رنگ ہے - اس سے بھی معلوم ہوتا ہے - کہ قتال کے بارے میں پہلی وحی سُورت الحج کی وہ آیت ہے جو اُوپر لکھی گئی ہے - اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے - کہ آیت زیرِ بحث جنگ کے شرُوع ہو جانے پر دلالت کرتی ہے اِس آیت میں تین شرطیں جنگ کرنے پر لگائی گئی ہیں - اوّل یہ کہ قتال فی سبیل اللہ ہو - دُوسرے یہ کہ صرف اُن لوگوں سے جنگ ہو جو مُسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں تیسرے یہ کہ جنگ میں زیادتی نہ ہو +

سب سے پہلے فی سبیل اللہ کا لفظ قابلِ غور ہے مُعترضین خصُوصاً عیسائیوں نے فی سبیل اللہ کے معنے لوگوں کو بجبر مُسلمان کرنے کے لیئے ہیں - مگر یہ صرف اُن کے اپنے دماغوں کی اِختراع ہے - قرآن کریم میں الفاظ فی سبیل اللہ ان معنوں میں ہرگز نہیں آئے - صدقات کے ذکر میں اِس سُورت کے اخیر پر بار بار فی سبیل اللہ فرمایا - تو کیا اس سے یہ مُراد ہوسکتی ہے - کہ لوگوں کو بجبر مسلمان کرنے کے لیئے اپنے مالوں کو خرچ کرو - اوّل تو خود ان الفاظ سے ہی کہ تُم ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں صاف معلوم ہوتا ہے - کہ فی سبیل اللہ کے معنے وہ نہیں جو عیسائی معترض کہتے ہیں یہاں تو جنگ کی ابتدا دُشمن کی طرف سے ہے مُسلمانوں کو بڑے بڑے دُکھ اور مصیبتیں پُہنچائی گئیں - اُن پر انھوں نے صبر کیا - اور آخر جب دُشمن تلوار سے بالکل اُن کو نیست و نابُود کرنے پر تُل گیا - اور خُود اسلام کی زندگی معرضِ خطر میں آگئی - تو تب فی سبیل اللہ جنگ کرنے کا حُکم ہُوا - جس سے معلُوم ہُوا - کہ فی سبیل اللہ سے مُراد حفاظتِ اسلام ہے - بلکہ جب تک محض مسلمانوں پر ظلم تھے - اور گو مسلمان مارے جاتے تھے - مگر ایسی حالت نہ تھی کہ خُود اسلام کو نیست و نابُود کرنے کا دُشمن نے عزم کرلیا ہو اُس وقت تک جنگ کا حُکم نہیں دیا - گویا درحقیقت یہ جنگ حفاظت مال واملاک یا حفاظتِ مُلک - یا حفاظت جان یا حفاظت قوم کے لیئے بھی نہ تھے - بلکہ محض اسلیئے کہ اللہ تعالیٰ کا نام دُنیا سے نہ مٹایا جائے - اسی لیئے اسکو فی سبیل اللہ کرنا کہا - دفاعی جنگ اس کا نام نہیں رکھا - ہاں ایک جگہ کمزور ایمان والوں کو سمجھانے کے لیئے کہا -

آیت ۱۸۹

بیتہ من بابہ بل یاتیہ من خلفہ و یبقی علی ھذہ الحالۃ حولا کاملا۔ یعنی ایام جاہلیت میں عرب میں یہ رواج تھا۔ کہ جب کوئی شخص کسی اہم مقصد کو سامنے رکھ کر اس کے پورا کرنے کا مصمم ارادہ کر لیتا تھا۔ تو وہ اپنے گھر میں دروازہ کی راہ سے داخل نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ گھر کے پچھواڑے کی طرف سے داخل ہوتا تھا۔ اور پورا ایک سال اسی طرح کرتا۔ بت پرستی کے ساتھ توہم پرستی ایک لازمی امر ہے پس یہاں اس قوم کے بعض توہمات کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے۔ کہ تم چونکہ موحد اور ایک خدا کے پرستار ہو۔ پس تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ تمہاری کامیابی کا مدار توہم پرستیوں پر نہیں بلکہ اتقا پر ہے۔ جیسا کہ ولکن البر من اتقی سے ظاہر ہے۔ اور اس موقعہ پر اس توہم پرستی کا ذکر اسلیئے کیا گیا ہے۔ کہ مسلمانوں کے سامنے بھی ایک عظیم الشان مقصد کا حصول تھا۔ کیونکہ کفار کے ساتھ جنگیں در پیش تھیں۔ اور پھر خانہ کعبہ کا مسلمانوں کے ہاتھ میں آنا ضروری تھا۔ تو اسلیئے فرمایا کہ تمہاری کامیابی کا مدار جہلاء کی طرح توہم پرستیوں پر نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کو کیسی مشکلات کا سامنا تھا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت موسےٰ یا عیسےٰ علیہما السّلام کی قوموں کی طرح کوئی تیار قوم نہ تھی۔ جو بہت باتوں کو پہلے سے ہی مانتی ہو۔ بلکہ ایک ایسی قوم کو ترقی کے معراج پر پہنچانا تھا جو ادنےٰ سے ادنےٰ حالت تک گری ہوئی تھی۔ پس ہر ایک قسم کے ذلیل خیالات نکال کر ایک بلند مقصد پر پہنچانا یہ قرآن کریم کا ہی کمال تھا۔ اسی لیئے آیت کے آخر پر فرمایا۔ واتقوا اللہ لعلّکم تفلحون۔ پس جہاں توہم پرستیوں کی جھوٹی عمارتوں کو گرایا۔ تقوے اللہ کی حقیقی عمارت کی بنیاد ڈالی۔ اور ایک خدا کے خوف کے سوا ہر خوف کو ہیچ قرار دیا۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے۔ کہ عرب لوگ جب احرام باندھتے تھے تو سوائے چند مخصوص قوموں کے جن کو اُن کی شہرت اور عظمت کی وجہ سے حمس کہتے تھے۔ باقی کُل قومیں اپنے گھروں میں پچھواڑے کی طرف سے داخل ہؤا کرتی تھیں۔ تو چونکہ یہاں حج کا ذکر تھا۔ اسلیئے اس غلط رسم کو روکا۔ اور بعض نے اس کلام سے مجاز مُراد لیا ہے۔ یعنی گھر میں پیٹھ کی طرف سے داخل ہونا کنایہ ہے صراط مستقیم سے ایک طرف ہونے پر اور دروازہ سے داخل ہونا کنایہ ہے طریق مستقیم کو اختیار کرنے پر +

آیت ۱۹۰

۲۸۳۔ وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا۔ قرآن کریم کی ترتیب میں یہ سب سے پہلی آیت ہے۔ جس میں قتال فی سبیل اللہ کی اجازت یا حکم دیا گیا ہے۔ اور ربیع اور ابن زید کا قول ہے۔ کہ بلحاظ نزول بھی یہ سب سے پہلی آیت ہے جس میں قتال

۱۹۰

اِن تینوں شرطوں نے اگر ایک طرف اسلامی جنگوں کو معمولی مُلکی جنگوں سے الگ کر دیا - تو دوسری طرف اِس سے پہلے جس قسم کے مذہبی جنگ ہوتے تھے اُن کی سختی کو بھی بالکُل دُور کر دیا - یہُودیوں کے مذہبی جنگوں کے مقابلہ میں اسلام کے یہ مذہبی جنگ نری رحمت ہی رحمت تھے - کیونکہ یہُودیوں کے جنگوں میں دُشمن کے بچّے عورتیں بُوڑھے تہ تیغ کر دیئے جاتے تھے - اور ایک مُتنفس بھی زندہ نہ چھوڑا جاتا تھا - بلکہ مویشیوں تک فنا کر دیئے جاتے - اور کھیتوں اور باغوں اور گھروں کے مال و اسباب بلکہ خُود مکانات کو آگ کے سپُرد کیا جاتا - سو یہُودیوں کے جنگ دُشمن کے قطعی استیصال کے لیئے اور اُس کو دُنیا سے نیست و نابُود کرنے کے لیئے ہوتے تھے - مگر اسلام کے جنگ صرف اُس دُشمن کی حد اعتدال کے اندر سزا کے لیئے تھے جس نے اسلام کی بیخ کنی اور اسلام کو نیست و نابُود کرنے کے لیئے کمر باندھ لی تھی - افسوس ہے کہ اس تہذیب کے زمانے میں بھی یُورپ کے مُلکی جنگ یہُودیوں کے مذہبی جنگوں سے زیادہ قریب ہیں - گو قوانین بین الاقوام میں اسلامی جنگوں کے اعتدال کی طرف میلان پایا جاتا ہے - ہاں اُن قوانین پر جنگ کے وقت میں جو انتہائی جوش و غضب کا وقت ہوتا ہے عمل کر کے دِکھانا ہر ایک شخص کا کام نہیں - نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے اُس اعتدال کا کمال بین جنگوں کے اندر دکھایا ہے - اور یہی وجہ ہے - کہ جنگوں کے احکام کے اندر بار بار تقوےٰ اور اعتدال اور انصاف اور عفو اور درگُذر کی تعلیم دی جاتی تھی +

۱۹۱

۲۸۴ - واقتلوھم حیث ثقفتموھم - اور جہاں کہیں اُن کو پاؤ قتل کر دو - اِن الفاظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جہاں کوئی غیر مُسلم ملے اُسے قتل کر دینا چاہیئے سراسر حماقت ہے - ہر ایک غیر مُسلم سے تو جنگ کرنے کا بھی حکم نہیں بلکہ جیسا کہ پچھلی آیت اور اُس کے نوٹ سے ظاہر ہے صرف ان لوگوں کے ساتھ جنگ کرنے کا حُکم ہے جو پہلے مُسلمانوں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں - اور اقتلوھم میں ھم کی ضمیر الذین یقاتلونکم کی طرف جاتی ہے - اس آیت میں غیر مُسلموں کا تو نام نہیں - نہ اس سے پہلی آیت میں ہے - بلکہ شروع رکُوع سے کُفّار یا غیر مسلموں کا تو ذکر تک نہیں آیا - پس اقتلوھم میں ھُم سے مُراد کُفّار نہیں - بلکہ وہی ہیں جن کا ذکر پچھلی آیت میں ہے - یعنی الذین یقاتلونکم یا وہ لوگ جو تم سے جنگ کرتے ہیں - یا جنگ کرنے میں ابتدا کر چکے ہیں - پس انہی کو جہاں پائے جائیں قتل کرنے کا حُکم ہے - اور اس میں کیا شک ہے

تعالوا قاتلوا فی سبیل اللہ اوادفعوا (آل عمران ۶۶) یعنی آؤ اللہ کی راہ میں یعنی اللہ کے نام کو مٹائے جانے سے بچانے کے لئے جنگ کرو۔ اور اگر یُوں نہیں سمجھتے توکم ازکم یُوں ہی سمجھ لو۔ کہ دفاع کے لئے تو یہ جنگ کرنا اب امر مجبُوری ہوگیا ہے۔ چُنانچہ یہی وجہ ہے کہ بدر کے دِن جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم رو روکر دُعائیں کر رہے تھے۔ تو آپ کے مُنہ سے یہی الفاظ نکلے۔ اللھم ان اھلکت ھذہٖ العصابۃ فلن تعبد فی الارض ابدا۔ اے خُدا اگر تُو نے اِن مُٹھی بھر مُسلمانوں کو ہلاک کر دیا۔ تو پھر زمین میں تیری عبادت کبھی نہ ہوگی۔ اس سے بھی فی سبیل اللہ کے معنوں پر روشنی پڑتی ہے۔ پس اسلامی جنگوں یعنی اُن جنگوں کی جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کرنی پڑیں۔ یہ ایک خصُوصیّت ہے۔ کہ وہ نہ تو مُلک اور قوم کے لیئے اور نہ ہی مال اور سلطنت کے لئے تھیں۔ بلکہ محض اِس غرض کے لیئے کہ تاکُفّار اسلام کا نام ونشان دُنیا سے نہ مٹادیں +

دوسری شرط جو لگائی گئی وہ یہ ہے۔ کہ تُم صرف ان لوگوں سے جنگ کرو جو تُمہارے ساتھ کرتے ہیں۔ اس میں اگر ایک طرف یہ بتادیا کہ ابتدا پھر بھی کسی صُورت میں تُمہاری طرف سے نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ دُشمن جنگ میں ابتدا کرے۔ تو پھر تُم بھی کرو۔ تو دوسری طرف یہ بھی واضح کردیا۔ کہ ہر ایک مُتنفس دُشمن نہیں۔ اسی بناء پر اسلام کی جنگوں میں یہ حُکم تھا۔ کہ کسی بُوڑھے یا بچے یا عورت کو قتل نہ کیا جائے۔ مگر چُونکہ اُس وقت ان تین قسموں کو چھوڑ کر باقی ساری قوم دراصل جنگ میں شامل ہوتی تھی۔ اور سب لوگ جو ہتھیار اُٹھانے کے قابل ہوں۔ جنگ میں شامل ہوتے تھے۔ فوج معمُولی آبادی سے علٰحدہ نہ ہوتی تھی۔ اس لیئے آج ہم اسی بناء پر اس نتیجہ پر بھی پُہنچتے ہیں۔ کہ اِس زمانہ میں الذین یقاتلونکم میں صرف افواج شامل ہونگی۔ اور عام مُلکی آبادی مستثنٰے رہیگی۔ چنانچہ خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اِس آیت کے ماتحت راہبوں کو خواہ وہ ہتھیار اُٹھانے کے قابل ہوں مستثنٰے کر دیا۔ کیونکہ اُن کا کام جنگ کرنا نہ تھا +

تیسری شرط یہ ہے۔ کہ جنگ کے اندر ضرورتِ جنگ سے تجاوز نہ کیا جائے۔ جنگ کی اصل غرض تو دُشمن کو کمزور کرنا ہے۔ پس جب وہ حاصل ہوجائے۔ تو خواہ مخواہ جان ومال کا اتلاف جائز نہیں۔ اسی لیئے یہ بھی حکم تھا۔ کہ دُشمن کے مکانات کو اُن کے کھیتوں کو خواہ مخواہ تباہ نہ کیا جائے +

۱۹۱ بڑھ کر ہے۔ لفظ فتنہ کی مزید تشریح کے لیئے دیکھو نوٹ ۲۸۹ +

۲۸۷۔ ولا تقتلوھم عند المسجد الحرام حتیٰ یقاتلوکم فیہ۔ مسجد حرام کی حُدود میں جنگ کرنا عرب کے اندر جائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ تم بھی اس پاک گھر کی حُرمت کا پُورا لحاظ رکھو۔ حتّٰی کہ اُس کی حُدود کے قریب بھی جنگ نہ کرو یہانتک کہ وہ ان حدُود کے اندر جنگ کی ابتدا کریں +

۱۹۲ ۲۸۸۔ فان انتھوا فان اللہ غفور رحیم۔ انتھوا کے معنے ہیں رُک جائیں یا باز آجائیں یعنی اگر مُسلمانوں کو دُکھ دینے سے رک جائیں جس کا ذکر لفظ فتنہ میں کیا ہے۔ تو تم مُعاف کردو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی غفُور اور رحیم ہے۔ وہ خطا کاروں سے غفر اور رحم کا معاملہ کرتا ہے اور اصل غرض تو فتنہ کو روکنا ہے +

۲۸۹۔ وقتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ۔ اسی آیت کے معنوں پر اس ساری بحث کا آخری دارومدار رکھا گیا ہے۔ جو اسلامی جنگوں کی اِنتہائی غرض سمجھی گئی ہے۔ لفظی معنے تو ان الفاظ کے صرف اس قدر ہیں۔ کہ تم ان سے جنگ کرتے رہو یہانتک کہ فتنہ نہ رہے۔ اور دین اللہ کے لیئے ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ ان الفاظ سے کیا مطلب ہے۔ معترضین اسلام کا یہ خیال ہے۔ کہ اس سے مُراد یہ ہے۔ کہ اس وقت تک جنگ کرتے رہو جب تک کُفر اور شرک باقی نہ رہے۔ اور سب لوگ مسلمان ہوجائیں۔ اس بات کی شہادت کہ یہ معنے درست نہیں اسی قدر کافی ہے۔ کہ سب سے پہلے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسکے خلاف کیا۔ کیونکہ آپ نے تو مُتعدد موقعوں پر کُفار کے ساتھ صلح کی۔ اور بالخصوص صلح حدیبیہ کا واقعہ تو ہر ایک شخص کو معلوم ہے جس میں آپ نے ایسی شرائط کے ساتھ جو مسلمانوں کیلیئے بظاہر مفید نہ تھیں کُفار مکہ کے ساتھ صلح کی۔ اگر اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہوتا۔ کہ جب تک سب مسلمان نہ ہوجائیں اس وقت تک جنگ کرتے جاؤ۔ تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کیوں بار بار کُفار سے صلح کرتے ہیں۔ جن مُتواتر عہدناموں کو کفار توڑ ڈالتے تھے۔ جیسا کہ ینقضون عھدھم فی کل مرۃ سے ظاہر ہے۔ اور کیوں آپ کو قرآن کریم میں یہ حکم ہوتا فان جنحوا للسلم فاجنح لھا۔ کہ اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کی طرف مائل ہو جاؤ۔ اس طرح پر نہ صرف نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل ہی قرآن کے خلاف نہیں ٹھیرتا۔ بلکہ خود قرآن کا ایک حکم دوسرے کے مخالف ہو جائیگا۔ کیونکہ ایک جگہ تو گویا یہ حکم دیتا ہے۔ کہ لڑائی بند نہ کرو جب تک سارے کافر مسلمان نہ ہوجائیں جیسا کہ معترضین کا خیال ہے۔ اور دوسری جگہ یہ حکم دیتا ہے۔ کہ اگر کافر صلح کی طرف

کہ جب ایک دُشمن مُسلمانوں کے اِستیصال کے لیئے کمر بستہ ہو رہا تھا۔ تو کیا اب اس کے بالمقابل یہ کہا جاتا کہ وہ تو جہاں تم کو پائیگا قتل کرنے کی کوشش کریگا۔ مگر تم کو اس کے قتل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ آخر جب دُشمن سے جنگ چھڑ چکی ہے۔ تو اب وہ دُشمن خواہ کہیں ہو ضروری ہے۔ کہ اُس کو قتل کیا جائے +

۲۸۵۔ واخرجوھم من حیث اخرجوکم۔ جہاں سے اُنھوں نے تم کو نکالا وہاں سے تُم ان کو نکال دو۔ اس میں گویا یہ بتایا ہے۔ کہ جنگ کب تک جاری رہے۔ اس میں جنگ کا جاری رہنا قصاص کی حد تک جائز رکھا ہے۔ وہ جگہ جہاں سے ان لوگوں نے جواب مُسلمانوں سے جنگ کر رہے تھے نکالا تھا تک تھی۔ اور گو ان کی طرف سے جنگ کی ابتدا کیئے بغیر اسلام نے جنگ کا حُکم نہیں دیا۔ مگر اب جب جنگ شروع ہو گئی تو یہ بالکل حق تھا۔ کہ جہاں سے مسلمان بجبر نکالے گئے تھے وہ جگہ واپس لے لیجائے۔ اِس میں جنگوں کے اندر آخری کامیابی کی پیشگوئی بھی ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن اسلامی جنگوں کی غرض دشمن کو نیست و نابود کرنا یا مُسلمان کرنا نہ تھی۔ بلکہ صرف اپنے جائز حقوق کو قائم کرنا اور اُن چیزوں اور حقوق کو واپس لینا تھا۔ جن سے وہ ظُلم سے اور ناحق محروم کیئے گئے تھے +

۲۸۶۔ والفتنۃ اشدُّ من القتل۔ فتنۃ کے معنوں میں لکھا ہے۔ اصلھا عرض الذھب علی النار لاستخلاصہ من الغش۔ یعنی اصل اس کا سونے کا آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ اس غرض کے لیئے کہ تا کھوٹ اور میل بالکل الگ ہو جائے۔ اور فتنۃ اور فتن کے الفاظ قرآن کریم میں ان اذیتوں کے مُتعلق استعمال ہوئے ہیں۔ جو کُفّار کی طرف سے مُسلمانوں کو پہنچتی تھیں۔ جیسا کہ آیت ان الذین فتنوا المومنین والمومنات ثم لم یتوبوا فلھم عذاب جھنم سے ظاہر ہے۔ ایسا ہی فرمایا۔ ومن الناس من یقول امنا باللہ فاذا اوذی فی اللہ جعل فتنۃ النّاس کعذاب اللہ۔ یہاں اس ایذا کا نام جو اللہ کی راہ میں دی جائے فتنۃ رکھا ہے۔ ایسا ہی ایک جگہ فرمایا ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا۔ یعنی کفّار کی طرف سے ایذا پہنچنے کا خطرہ ہو اور یہاں تو خُود اخرجوھم من حیث اخرجوکم کہکر ظاہر کر دیا ہے۔ کہ یہاں فتنۃ سے مُراد مُسلمانوں کا اُن کے گھروں سے نکالا جانا ہے۔ یعنی یہ حُکم کہ جنگ کو اس وقت تک جاری رکھو جب تک ان کُفّار سے مسلمانوں کے وہ حقوق مل جائیں۔ جن سے اُنہیں بجبر محروم کیا گیا ہے۔ اسلیئے ہے کہ بلا قصُور وطن سے بیوطن کر دینا اور مال و املاک کا چھین لینا قتل سے بھی

کہ اللہ تعالےٰ نے میرے بھائی کا خُون حرام کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا۔ کیا اللہ تعالےٰ نے نہیں فرمایا۔ وقاتلوھم حتّٰی لا تکون فتنۃ۔ آپ نے جواب دیا ہم نے جنگ کیا یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہا اور دین اللہ کے لیئے ہوگیا۔ اور تم چاہتے ہو کہ جنگ کرو یہانتک کہ فتنہ ہو جائے اور دین غیر اللہ کے لیئے ہو جائے۔ اب اس روایت سے نہایت صفائی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ فتنہ کے لفظ کے کیا معنے سمجھتے تھے۔ وہ فتنہ سے مُراد کُفر و شرک نہیں لیتے تھے۔ بلکہ ظلم اور فساد اور دُکھ دینا یہی معنی فتنہ کے اُن کے نزدیک تھے۔ انہی معنوں میں حضرت ابن عمرؓ نے فتنہ کا لفظ استعمال فرمایا۔ اور انہی معنوں میں دونوں سائلوں نے۔ اور حضرت ابن عمرؓ نے آخری الفاظ میں کہ تم اب اسلیئے جنگ کرتے ہو کہ ایک فتنہ کھڑا ہو جائے اور دین غیر اللہ کے لیئے ہو جائے یہ بھی بتا دیا کہ اللہ کے لیئے یا غیر اللہ کے لیئے دین کے ہونے کے کیا معنے ہیں۔ گویا درحقیقت فتنہ کا ہونا دین کا غیر اللہ کے لیئے ہونا ہے۔ اور فتنہ باقی نہ رہنا یہی دین کا اللہ کے لیئے ہونا ہے۔ ورنہ حضرت ابن عمرؓ کا یہ منشاء نہ تھا۔ کہ تم اب اسلیئے جنگ کرتے ہو کہ خدائے واحد کی پرستش کو مٹا کر یا دین اسلام کا خاتمہ کر کے پھر کُفر اور شرک کو پھیلاؤ۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ جب ایک فتنہ برپا ہوگا تو پھر لوگوں کی دین کے مُعاملہ میں وہ آزادی نہ رہیگی جو اللہ تعالےٰ چاہتا ہے کہ ہو +

اِنہی معنوں کی تائید میں قرآن کریم کی سُورت حج کی وہ آیت ہے۔ جس میں جنگ کی اجازت دے کر جنگ کی اصل غرض کو بیان کیا ہے۔ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوٰت ومسجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا۔ یعنی اگر اب ان لوگوں کی شرارتوں کا مُسلمانوں کے ہاتھوں سے دفعیہ نہ کر دیا جائے تو پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ راہبوں کے خلوتخانے اور گرجے اور عبادتگاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے برباد ہو جائیں۔ تو گویا درحقیقت اسلامی جنگوں کی غرض یہ تھی کہ مذہبی خلوتخانوں کو۔ گرجوں کو۔ ہر مذہب کی عبادتگاہوں کو مسجدوں کو بچایا جائے۔ یا بالفاظ دیگر سب مذاہب کی حفاظت کیجائے۔ اور اِسی غرض کو بالفاظ دیگر یہاں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے ویکون الدین للہ۔ دین اللہ کے لیئے ہو جائے۔ زید و بکر کا جبر اس میں کوئی نہ رہے +

۲۹۰- فان انتھوا فلا عدوان الا علی الظلمین۔ یعنی اگر یہ اب بھی فتنہ سے رُک جائیں مُسلمانوں کو دُکھ دینا چھوڑ دیں دین کے مُعاملہ میں جبر نہ کریں تو پھر ہم بھی سزا اُن سے اُٹھا لیں گے کیونکہ سزا تو ظالموں کے لیئے ہے۔ اگر یہ ظلم ترک کر دیں تو سزا بھی موقوف کر دیجائیگی

مائل ہوں تو صلح کرلو۔ پس اِن معنوں کے جو معترضین پیش کرتے ہیں غلط ہونے پر یہ قطعی اور کافی شہادت ہے +

اب سوال یہ ہے۔ کہ پھر ان الفاظ کے کیا معنے ہونگے۔ سب سے پہلے ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ لفظ فتنۃ کے کیا معنے مراد لیئے جاسکتے ہیں۔ اس لفظ کے اصلی معنے اور پھر قرآن کریم کی آیات سے بعض شہادتیں کہ اس پاک کتاب میں یہ لفظ کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ نوٹ ۲۸۶ میں دیگئی ہیں جہاں یہ دکھایا گیا ہے۔ کہ کفار کی طرف سے جو ایذا مسلمانوں کو پہنچائی جاتی تھی۔ اُن کو گھروں سے نکالا جاتا تھا۔ ان کو مارڈالا جاتا تھا۔ اسی کا نام قرآن کریم نے فتنۃ رکھا ہے۔ صحیح بُخاری میں یہی معنے لفظ فتنۃ کے کیئے ہیں۔ جہاں حضرت ابن عمر کی ذیل کی روایت موجود ہے۔ کان الاسلام قلیلا فکان الرجل یفتن فی دینہ اما قتلوہ واما یعذبوہ حتی کثر الاسلام فلم تکن فتنۃ۔ مُسلمان تھوڑے تھے۔ سو ایک شخص کو اس کے دین کی وجہ سے دُکھ دیا جاتا تھا (یفتن) یا اُسے قتل کردیتے یا ویسے دُکھ پہنچاتے یہاں تک کہ اسلام بڑھ گیا۔ سو پھر فتنہ یعنی دُکھ دیا جانا باقی نہ رہا۔ اس روایت سے نہ صرف لفظ فتنۃ کے معنے ہی صاف ہوجاتے ہیں۔ بلکہ سارے فقرہ لا تکون فتنۃ کے معنے واضح ہوجاتے ہیں +

اِسی طرح یہ تو دکھایا جاچکا ہے۔ کہ یکون الدین للہ کے یہ معنے نہیں ہوسکتے۔ کہ کل لوگ مسلمان ہو جائیں۔ بلکہ درحقیقت ان الفاظ میں اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔ جس کا ذکر لا تکون فتنۃ میں ہے۔ کیونکہ جب دین کی وجہ سے دُکھ نہ دیا جائیگا۔ تو پھر دین محض اللہ کے لیئے ہوگا۔ اور دین کا اللہ کے لیئے ہونا یہی ہے۔ کہ اس میں جبر باقی نہ رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے لا اکراہ فی الدین۔ علاوہ ازیں بُخاری کی ایک روایت سے ان الفاظ کے معنے خوب واضح ہوتے ہیں۔ عن ابن عمر اتاہ رجلان فی فتنۃ ابن الزبیر فقالا ان الناس صنعوا وانت ابن عمر وصاحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فما یمنعک ان تخرج فقال یمنعنی ان اللہ حرم دم اخی فقال الم یقل اللہ فقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ فقال قاتلنا حتی لم تکن فتنۃ وکان الدین للہ وانتم تریدون ان تقاتلوا حتی تکون فتنۃ ویکون الدین لغیر اللہ۔ یعنی ابن زبیرؓ کے فتنہ میں دو شخص حضرت ابن عمرؓ کے پاس آئے۔ اور انہوں نے کہا۔ کہ لوگوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ اور آپ حضرت عمرؓ کے بیٹے اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ آپ کیوں نہیں نکلتے۔ آپ نے جواب دیا۔ مجھے یہ بات روکتی ہے۔

۱۹۴ لیکن اِن الفاظ کے معنے ہم یُوں نہیں کر سکتے کہ جو تم پر زیادتی کرے۔ تم بھی اُس پر ویسی زیادتی کرو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہے۔ کیونکہ زیادتی کرنے والے کو درحقیقت سزا دی جاتی ہے یا اسکی زیادتی کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ وہ فعل خود زیادتی نہیں بلکہ عین حق ہے پس زیادتی کرنے والے کا مقابلہ کرنا اپنے حق سے تجاوز نہیں۔ اور اِس لیئے فاعتدوا علیہ کے معنے یُوں نہیں کیئے جائیں گے کہ تُم اس پر زیادتی کرو۔ بلکہ ترجمہ یُوں ہوگا۔ کہ تُم اُسکی زیادتی کا مُقابلہ کرو یا جواب دو۔ یہی معنے مُفسّرین اور اہلِ لغت نے کیئے ہیں۔ چُنانچہ مُفردات میں ہے۔ اے قابلوہ بحسب اعتدائہ۔ یعنی اُس کی زیادتی کے مطابق اس کا مقابلہ کرو۔ بدی کی سزا کا ذکر انہی الفاظ میں کیا جاتا ہے دیکھو نوٹ ۲۳ ع ❖

۱۹۵ ۲۹۳۔ وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور اپنے ہاتھوں سے اپنے تئیں ہلاکت میں نہ ڈالو۔ بُخاری میں اس کے متعلق ہے۔ نزلت فی النفقۃ یعنے یہ آیت خرچ کرنے کے بارے میں اُتری۔ اور خُود سیاق وسباق عبارت چاہتا ہے۔ کہ اس آیت میں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور چُونکہ فی سبیل اللہ کا لفظ قرآن کریم میں جہاد پر بولا گیا ہے۔ اسلیئے ظاہر اور صاف معنے اِس آیت کے یہی ہیں۔ کہ چُونکہ تم کو جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ اور جہاد کے لیئے اموال کی ضرورت ہے۔ اِس لئے اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کروگے تو اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والے ہوگے۔ جب دشمن اِس بات پر تُلا ہُوا تھا۔ کہ وہ مسلمانوں کا نام ونشان دُنیا سے مٹادے۔ تو اب اُس کے بالمقابل تیاری نہ کرنا اور روپیہ اور مال صرف کرنے سے بچنا درحقیقت خود ہلاکت کو اپنے اُوپر لانا تھا۔ چُنانچہ تفسیر کبیر میں ہے۔ کہ جب قتال کی اجازت نازل ہُوئی تو ایک شخص نے عرض کیا۔ کہ یا رسُول اللہ ہمارے پاس زاد نہیں۔ فامر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان ینفقوا فی سبیل اللہ وان یتصدقوا وان لا یکفوا ایدیھم عن الصدقۃ ولو بشق تمرۃ تحمل فی سبیل اللہ فیھلکوا فنزلت ھذہ الایۃ علی وفق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی اس شخص کی عرض پر رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ اپنے اموال کو اللہ کی راہ میں خرچ کریں اور صدقہ کریں اور اپنے ہاتھوں کو صدقہ سے نہ روکیں خواہ کھجُور کا ٹکڑا ہی ہو جو اللہ کی راہ میں دیا جائے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کرینگے تو ہلاک ہوجائیں گے۔ اسی کے مطابق آیت نازل ہُوئی احسان کا حکم جو اس کے بعد ہے اسی

آیت ۱۹۳

یہ اسی کے ہم معنے ہے جو آیت ۱۹۲ میں فرمایا فان انتھوا فان اللہ غفور رحیم اگر یہ رک جائیں تو اللہ تعالےٰ بھی غفر اور رحم کا معاملہ اُن سے کرنے کے لئے تیار ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب کبھی کفار ان شرائط پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے صلح کرنے پر راضی ہوتے تھے کہ وہ مسلمانوں کو دکھ نہیں دیں گے اُن پر چڑھائی نہیں کریں گے تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے الفور صلح کر لیتے تھے۔ اسی کے مطابق قرآن کریم کی یہ آیت ہے۔ فان جنحوا للسلم فاجنح لھا جب یہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کر لو۔ کیونکہ اصل غرض تو فتنہ کا دُور کرنا تھا۔ اور جب ذرا صلح ہوتی تھی تو کثرت سے کفار اسلام میں داخل ہونے لگ جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ کفار کو فکر پڑ جاتی تھی۔ اور وہ پھر معاہدات توڑ کر اسلام کی ترقی کو تلوار کے ذریعہ سے روکنا چاہتے تھے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ ان الفاظ میں الذین ینقضون عھدھم فی کل مرۃ +

۱۹۴

۲۹۱- الشھر الحرام بالشھر الحرام والحرمٰت قصاص۔ حُرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے بدلہ میں اور تمام حرمت والی اشیاء میں قصاص ہوگا۔ جیسا کہ اس سے پہلے نوٹ ۲۸۱ میں ذکر ہو چکا ہے۔ عرب میں چار مہینے حُرمت والے تھے جن میں تمام قومی جنگیں رُک جاتی تھیں تجارتیں کھل جاتی تھیں۔ اور لوگ امن وامان سے سفر کر سکتے تھے کوئی شخص سخت سے سخت دشمن کو کچھ نہ کہ سکتا تھا۔ جب اسلامی جنگوں کے احکام نازل ہوئے تو حرمت والے مہینوں میں جنگوں کے حکم کا ذکر ہونا بھی ضروری تھا۔ اسلام چونکہ ہر ایک پہلو میں رحمت ہی رحمت تھا اسلیئے ان مہینوں کی حرمت کو اسی طرح برقرار رکھا۔ ہاں چونکہ کفار نے تو مسلمانوں کے دُکھ دینے میں حرمت والی چیزوں کی بھی پرواہ نہ کی تھی۔ یہانتک کہ خود مسجد الحرام میں مسلمانوں کو دُکھ دیئے گئے اسلئے فرمایا کہ اگر یہ کافر حُرمت والے مہینوں میں جنگ کریں تو قصاص کے رنگ میں مسلمان بھی مجبُور ہونگے۔ کہ ان مہینوں کے اندر جنگ کریں۔ اور یہی صُورت باقی حرمت والی چیزوں میں ہوگی۔ یعنی یہی شہر الحرام والاحکم بلد الحرام اور حالت احرام کے لئے ہوگا یہی حرمات ہیں۔ یعنے نہ حرمت والے مقام کے اندر جنگ ہوگی نہ حالت احرام میں جنگ ہوگی۔ حرمت والے مہینے چار ہیں یعنی ذیقعدہ- ذی الحجہ- محرم- رجب +

۲۹۲- فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم۔ جو شخص تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہے۔ ویسا ہی جواب اس کی زیادتی کا تم اُسکو دو+ اعتدیٰ کے معنے لُغت میں مجاوزۃ الحق کے ہیں۔ یعنی حق سے یا حد سے تجاوز کرنا۔

ہیں۔ کہ قربانی کو کسی شخص کے ہاتھ حرم میں بھیج دے اور قربانی کے دن سر منڈوا دے یا عمرہ
کی صورت میں کوئی خاص دن مقرر کرلے۔ کہ اس دن قربانی کر دی جائیگی۔ مگر یہ مشکلات سے
خالی نہیں +

۲۹۷۔ فمن کان منکم مریضا او بہ اذی من راسہ ففدیۃ من صیام او
صدقۃ او نسک۔ سر کا منڈوانا تو قربانی کے ذبح کرنے کے بعد ہے لیکن اگر کوئی شخص
بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی دُکھ ہو تو پہلے بھی سر منڈوا سکتا ہے یا حالت احرام کی کسی خصوصیت
سے مستثنیٰ ہو سکتا ہے جیسے بیماری کی صورت میں لباس کے معاملہ میں لیکن اس صورت میں
فدیہ کے طور پر یا (تین دن کے) روزے رکھے یا (چھ) مسکینوں کو کھانا کھلائے یا
کوئی قربانی دیدے +

۲۹۸۔ فاذا امنتم۔ جب تم امن کی حالت میں ہو جاؤ۔ ان الفاظ سے بھی احصرتم کا
منشاء زیادہ تر دشمن کی روک ہی معلوم ہوتی ہے۔ اور ان الفاظ میں ایک پیشگوئی بھی ہے
کہ گو اس وقت خوف کی حالت ہے اور دشمن کی طرف سے رُکاوٹیں پیش آ رہی ہیں۔ لیکن
وہ وقت بھی آ جائیگا۔ کہ جب خوف کی حالت بدل کر امن ہو جائیگا +

۲۹۹۔ فمن تمتع بالعمرۃ الی الحج۔ جو عمرہ کی وجہ سے حج کے لئے فائدہ اُٹھائے۔ ان
الفاظ کا مطلب سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے۔ کہ تمتع حج میں کیا چیز ہے۔ سو حج تین قسم
پر ہے۔ افراد۔ قران۔ تمتع۔ افراد تو یہ ہے کہ حج اور عمرہ دونوں علیحدہ علیحدہ ہوں یعنی
حج کرنے کے بعد عمرہ کے لئے احرام باندھے۔ یا حج کے مہینوں سے پہلے عمرہ کرلے۔ اور پھر
اسی سال میں حج کے مہینوں میں حج کرے۔ قران یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں حج اور
عمرہ کی اکٹھی نیت کرے۔ اور دونوں کے لئے احرام باندھے۔ یا حج کے مہینوں میں صرف عمرہ کے
لئے احرام باندھے لیکن عمرہ کا احرام کھولنے سے پہلے حج کو ساتھ ملالے۔ اور تمتع یہ ہے۔ کہ
حج کے مہینوں میں عمرہ کے لئے احرام باندھے اور عمرہ کے سارے ارکان کو پورا کرے۔ پھر اسی
سال حج کرے۔ اور اسے تمتع اسلئے کہتے ہیں کہ تمتع کے معنے ہیں فائدہ اُٹھانے کے۔ اور جو
شخص عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد احرام کھول دیتا ہے اور پھر اپنے وقت پر حج کرتا ہے۔ وہ
درمیانی وقت میں بوجہ حالت احرام میں نہ ہونیکے اُن چیزوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے جو حالت احرام
میں ممنوع ہیں۔ پس اس طرح ایک شخص عمرہ کی وجہ سے حج کے لئے فائدہ اُٹھا لیتا ہے لیکن اس
فائدہ کے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے۔ کہ یا تو کوئی قربانی کرے جو اُسے میسر آئے۔ اور اگر قربانی
میسر نہ آئے تو تین دن کے روزے حج میں اور سات دن کے روزے واپس آ کر رکھے۔ گویا دس

۱۹۵ معنی کا مؤید ہے +

آج بھی مسلمانوں کو غور کرنا چاہیئے۔ کہ اُن کے مذہب پر کس قدر حملے ہو رہے ہیں۔ اور اگر وہ اپنے اموال کو اشاعتِ اسلام کے لیئے اللہ کی راہ میں نہ لگا دینگے۔ تو وہ خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والے ہونگے۔ اور درحقیقت ہلاکت تو صاف نظر آتی ہے۔ کاش اب بھی مسلمان اپنی ذاتی مصائب کو دین کی مصیبت عظمےٰ کے سامنے ہیچ سمجھیں اور اپنے آرام اور آسائش کو خدا کے دین کے لیئے قربان کر دیں +

۱۹۶ ۲۹۴- و اتموا الحج و العمرۃ للہ - حج اور عمرہ کا اللہ کے لیئے اتمام کرو۔ یعنی ان کے سارے ارکان اور سُنن کو پورا ادا کرو۔ قتال کے ذکر میں حج اور عمرہ کا ذکر ان مشکلات کی وجہ سے ہے جو اس وقت دُشمنوں کی طرف سے پیش آرہی تھیں۔ کہ وہ مسلمانوں کو بعض وقت حج سے بھی روک دیتے تھے۔ چنانچہ اسی کی طرف اشارہ اس سے اگلے الفاظ فان احصرتم میں ہے اور منجملہ اغراضِ قتال کے ان مذہبی رُکاوٹوں کا دُور کرنا بھی تھا +

حج اور عمرہ کے معنوں اور ان میں فرق کے لیئے دیکھو نوٹ ع۲۳۸۔ حج کے ارکان پانچ ہیں۔ احرام۔ عرفات میں ٹھیرنا۔ بیت اللہ کا طواف۔ سعی بین الصّفا والمروہ۔ سر کا منڈوانا +

۲۹۵- فان احصرتم فما استیسر من الھدی - اگر تم روک دیئے جاؤ تو قربانی جیسی کچھ میسر آئے کر دو۔ اس وقت کی بڑی رُکاوٹ تو دُشمنوں کی طرف سے تھی۔ مگر چونکہ لفظ عام ہیں اسلیئے بیماری کے سبب سے اگر رُکاوٹ پیش آجائے تو وہ بھی اسی میں شامل ہے۔ گو بعض مفسّرین اور اہلِ لغت کا خیال ہے۔ کہ محصور سے مُراد صرف وہی ہو سکتا ہے۔ جس کو دُشمن نے روک دیا ہو۔ جیسا کہ احصروا فی سبیل اللہ میں مُراد ہے +

الھدی - ہدیہ کی جمع ہے۔ اور اس سے مُراد وہ جانور ہیں۔ اُونٹ ہو۔ گائے بکری ہو یا بھیڑ۔ جن کو حاجی قربانی کے لیئے بیت اللہ کو لیجاتے ہیں۔ کیونکہ وہ بمنزلہ اس ہدیہ کے ہے جو کسی شخص کا قرب حاصل کرنے کے لیئے اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ پس یہ قربانیاں درحقیقت تقرب الے اللہ کی غرض سے کیجاتی ہیں۔ اور یہی اُن کی اصل غرض ہے۔ اس سے قربانی کی اصل حقیقت بھی واضح ہوتی ہے۔ مگر اس مضمون پر بحث انشاء اللہ تعالیٰ آیت لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا کے ماتحت کی جائیگی +

۲۹۶- ولا تحلقوا رؤسکم حتّی یبلغ الھدی محلّہ - قربانی کا محل وہ مقام ہے جہاں اسکو ذبح کرنا چاہیئے۔ اب عموماً تو ذبح ہونے کی جگہ حرم ہی ہے لیکن روک دیئے جانے کی صورت میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں جہاں رُکاوٹ واقع ہو وہیں ذبح کر کے سر منڈائے بعض کہتے

۱۹۷ مقصد ہے۔ کیونکہ اسلام کی ساری عبادات میں آخری غرض صرف تقویٰ ہی تقوےٰ ہے۔ بلکہ دوسرے احکام میں بھی تقوےٰ ہی کو مُقدّم کیا ہے +

۱۹۸ ۳۰۳۔ لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم۔ فضل سے مُراد یہاں تجارت کو لیا ہے۔ یعنی اگر حج سے فراغت کے بعد تجارت کر لو تو اس میں کوئی گناہ تم پر نہیں ہے۔ فضل بمعنی تجارت قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی آیا ہے۔ واخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ۔ ولتبتغوا من فضلہ۔ اور بُخاری میں ابن عباس کی روایت ہے کہ عکاظ اور مجنہ اور ذوالمجاز جاہلیت کی منڈیاں تھیں۔ اور یہ آیت اسی لیئے نازل ہوئی۔ کہ مسلمان بھی موسم حج میں تجارت کو گناہ نہ سمجھیں +

۳۰۴۔ فاذا افضتم من عرفات فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام۔ الافاضۃ الاندفاع فی السیر بکثرۃ۔ یعنی ایک گروہ کثیر کے چلنے کو افاضہ کہتے ہیں جس کے اصل معنی پانی بہانے کے اور اُوپر سے نیچے گرانے کے ہیں۔ عرفات عرفۃ کی جمع ہے۔ اور اس میدان کا نام ہے جس میں حاجی نویں ذی الحج کو یعنی حج کے دن ٹھیرتے ہیں۔ عرفات بعض کے نزدیک اس میدان کا نام اسی لیئے ہے کہ حضرت ابراہیم نے اُسے شناخت کر لیا۔ کیونکہ عرف کے معنے پہچاننے کے ہیں۔ مشعر الحرام مزدلفہ کے قریب ایک پہاڑی ہے۔ بعض نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ مشعر الحرام مُزدلفہ کا ہی نام ہے۔ مگر مُحقّق یہی ہے کہ وہ مزدلفہ کی آخری حد ہے +

۱۹۹ ۳۰۵۔ ثم افیضوا من حیث افاض الناس۔ پھر جہاں سے لوگ اُترتے ہیں وہیں سے تُم اُترو بُخاری میں ہے کہ قریش اور جو ان کے دین پر تھے حمس کہلاتے تھے۔ اور وہ میدان عرفات میں نہ جایا کرتے تھے۔ بلکہ مزدلفہ میں ٹھیر کر وہیں سے واپس آجایا کرتے تھے۔ اور باقی عرب عرفات میں جاتے تھے۔ چونکہ اسلام کی بڑی اغراض میں سے یہ بھی ایک مُقدم غرض تھی کہ اللہ تعالیٰ کے حضُور میں سب بندے اپنے آپ کو یکساں سمجھیں اور اس طرح نسل اِنسانی میں حقیقی مساوات قائم ہو۔ اِسلیئے اِس قسم کے تمام امتیازات قومی کو مٹانا ضروری تھا +

۲۰۰ ۳۰۶۔ فاذکروا اللہ کذکرکم اباءکم او اشد ذکرا۔ پھر اللہ کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادوں کو یاد کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ زمانہ جاہلیّت میں جب عرب لوگ حج سے فارغ ہوتے تو اُن کے میلے اور مجمعے لگا کرتے تھے جن میں وہ اپنے باپ دادوں کی فضیلتیں ایک سے ایک بڑھ کر بیان کیا کرتے تھے۔ پس اس بیہودہ اور لغو رسم کی اصلاح فرمائی۔

آیت ۱۹۶

روزے پُورے کرے لیکن یہ تمتّع یا ہدیہ اور اس کے عوض روزے رکھنا صرف ان لوگوں کیلئے ہے جن کے اہل وعیال مسجد حرام میں موجود نہ ہوں یعنی جو باہر سے آئے ہُوئے ہوں +

رکوع ۲۵/۹ ۱۹۷

۲۰۰- الحج اشھر معلومات - اشھر شھر کی جمع ہے - جس کے معنے مہینہ ہیں لفظی ترجمہ ہوگا حج معلوم مہینے ہیں - مُراد یہ ہے کہ حج کے مہینے معلوم مہینے ہیں یعنی شوال - ذیقعد - اور دس دن ذی الحج کے +

۲۰۱- فمن فرض فیھن الحج فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج - جو شخص اِن مہینوں کے اندر حج مُقرّر کرے تو حج میں نہ کوئی ناشائستہ بات ہونی چاہئیے نہ گالی دینا نہ جھگڑنا - حج چُونکہ اِنسان کی آخری رُوحانی منزل ہے - جس میں ایک مُسلم صرف جذبۂ عشق الٰہی میں محو ہو کر اپنے وطن سے بیوطن ہوتا اور ہر ایک قسم کی آسائش کو چھوڑ کر نہایت عاجزی کیحالت میں اپنے مولےٰ کے سامنے جانے کیلئے تیّار ہوتا ہے - اِسلئے حج کے اندر ہر ایک قسم کی نامناسب باتوں سے بھی روکا ہے - رفث کے معنے الفحاش یعنی ناشائستہ کلام یا بیحیائی کے بھی ہیں - اور اللغو من الکلام بھی رفث کے معنے بعض اہل لغت نے لکھے ہیں - رفث ایسے کلام کو بھی کہتے ہیں جس میں مرد وعورت کے تعلّقات کی طرف اشارہ ہو - غرض ہر ایک ایسی نامناسب یا ناشائستہ بات جو اِنسان کو کھُلی مجلس میں نہ کرنی چاہئیے - فسوق سے مُراد عام حُکم عدولی بھی ہوسکتی ہے - مگر حدیث میں سباب مسلم یعنی گالی دینے کو بھی فسوق فرمایا ہے - پس پہلے ہر ایک ناشائستہ بات سے روکا - پھر اپنے بھائیوں کو ناشائستہ الفاظ میں مخاطب کرنے سے روکا - اور آخر جدال سے یعنی اپنے بھائیوں سے جھگڑا کرنے سے روکا اور یہی اِس حالت کے شایان ہے جو حج کرنے والا اپنے لیئے اختیار کرتا ہے +

۲۰۲- وتزودوا فان خیر الزاد التقوی - لکھا ہے - کہ ایام جاہلیت میں بعض لوگ حج کے لیئے چلتے تو خالی ہاتھ چلتے تھے - اور وہ اپنے آپ کو مُتوکّل کہتے تھے - پھر حج میں یا تو لوگوں سے مانگ کر گُزارہ کرتے تھے یا چُرا کر یا غصب کر کے دوسروں کا مال لے لیتے تھے - اسلئے فرمایا کہ تزودوا یعنی زادراہ لے لیا کرو - اسلیئے کہ زادراہ لے لینے میں یہ بھلائی ہے کہ اِنسان سوال سے یا اور گُناہوں سے بچ جاتا ہے - اور اِس طرح تقوےٰ کے حصُول میں زادراہ کا لے لینا معاون ہوتا ہے - ان ظاہری معنوں کے ساتھ ایک اَور معنی بھی ان الفاظ کے ہوسکتے ہیں - اور وہ یہ کہ عاقبت کے لیئے زادراہ جمع کرلو - اور پھر فرمایا کہ سب سے بہتر زادراہ تقوےٰ ہے - جو اِنسان اختیار کرتا - اور جو اس کی عاقبت کے لئے اصل زادِراہ ہے - اور اِس کے بعد الفاظ واتقون یاولی الالباب کہہ کر اسی تقوی اللہ کی طرف اشارہ کیا ہے - جو اِنسان کی زندگی کا اصل

مُراد اس کے امر کا آنا اور امر سے مُراد وہ سزا ہے۔ جو قطعی طور پر دشمن کی بیخکنی کر دے۔ اور اُسکو پھر سر اُٹھانے کے قابل نہ رہنے دے۔ بالفاظ دیگر اسلام کا کامل غلبہ۔ اسی لیئے اُسے امر اللہ یعنی اللہ کا حُکم یا اللہ کی حکومت کہا گیا ہے۔ اسی طرح پر سُورۃ الحشر میں ہے۔ فاتھم اللہ من حیث لم یحتسبوا۔ یعنی اللہ ان پر ایسی طرف سے آیا جدھر سے اُن کو گُمان بھی نہ تھا۔ یہاں بھی اللہ کے آنے سے مُراد اللہ تعالیٰ کے حکم یا اُس کی سزا کا آنا ہے کیونکہ سُورۃ حشر میں یہودیوں کی سزا کا ذکر ہے۔ کہ وہ اپنی طاقت پر نازاں تھے۔ اور کہا کرتے تھے۔ کہ محمدؐ (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم) نے قریش کی طاقت کو ہی توڑ دیا ہے ہم سے واسطہ پڑیگا تو ہم بتائیں گے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کی طاقت کو بھی اس طرح پر تباہ کیا جس کا اُن کو کبھی گُمان بھی نہ تھا۔ ملائکہ کے آنے سے کیا مُراد ہے۔ اسکی وضاحت سُورۃ الفرقان سے ہوتی ہے۔ جہاں فرمایا۔ یوم یرون الملئکۃ لا بشری یومئذ للمجرمین۔ یعنی فرشتوں کا آنا تو مجرموں کی سزا کے لیئے ہُوا کرتا ہے پس یہ جو فرشتوں کے بار بار آنے کی درخواست کرتے ہیں تو وہ فرشتوں کے آنے کا دن تو اُن کی مصائب کا دن ہے کوئی خُوشی کا دن نہیں۔ کفّار نے جو لڑائیاں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیں۔ اُن میں نزُول ملائکہ کا ذکر بھی ہے پس درحقیقت یہ نزُول ملائکہ اُن کی سزا کیلیئے ہی ہُوا تھا۔ خاص جنگوں میں جن میں کفّار کی طاقت کو بڑے بڑے صدمات پہنچے اگر نزُول ملائکہ ہو کر کسی قدر سزا اُن کو ملگئی تو فتح مکّہ میں اسلام کا کامل غلبہ ہو کر کفّار کی ساری طاقت نیست و نابود ہوگئی۔ اور یہی گویا درحقیقت امر اللہ کا آنا تھا۔ کیونکہ اس سے جاء الحق وزھق الباطل کا کُھلا کُھلا نشان پُورا ہُوا۔ اور اللہ تعالیٰ کے پیارے بندوں کی حکومت جو درحقیقت خُدا کی بادشاہت تھی مُلک عرب پر قائم ہوگئی۔ پس پیشگوئیوں میں امر اللہ کے آنے یا خود اللہ کے آنے سے اسلام کا کامل غلبہ مراد ہے۔ اور چونکہ جنگوں کا ذکر شروع ہُوا تھا۔ اسلیئے یہ بھی بتانا مقصُود تھا کہ اگر کچھ جنگوں میں کفّار کو تھوڑی تھوڑی سزا ملیگی تو آخر ایک نظّارہ اسلام کے کامل غلبہ اور کُفر کی کامل شکست کا بھی دکھایا جائیگا۔ جس کے بعد کُفر اس جزیرہ نمائے عرب کے اندر سر نہ اُٹھا سکیگا +

ظلل من الغمام یا بادلوں کے سایوں سے کیا مُراد ہے؟ اسی کے مُطابق اللہ تعالیٰ نے سُورۃ الفُرقان میں فرماتا ہے۔ یوم تشقق السماء بالغمام ونزل الملئکۃ تنزیلا۔ اور جنگ بدر میں جہاں سب سے پہلے نزُول ملائکہ ہُوا۔ بادل کا آنا اور مینہ کا برسنا خاص طور پر مسلمانوں کی تقویت کا موجب ہُوا جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے۔ وینزل علیکم من السما

آیت ۲۰۰

کہ باپ دادوں کے مفاخر کے ذکر سے کیا فائدہ ہے اس کی بجائے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو۔ جو ساری بڑائیوں کا سرچشمہ ہے۔ پس جو اسکی بڑائی کرتا ہے وہ خود بھی بڑا بنایا جاتا ہے۔ آج بھی مسلمان اللہ کے ذکر کی بجائے اور اس کی تمجید اور تکبیر کی بجائے اپنے باپ دادوں کی بڑائی کے بہت راگ گاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کہاں تک انہوں نے قرآن کریم کو چھوڑا ہوا ہے +

۲۰۳

۳۰۷۔ واذکروا اللہ فی ایام معدودات ۔ گنتی کے دنوں میں اللہ کا ذکر کرو۔ یہ گنتی کے دن ایام تشریق کہلاتے ہیں۔ جو یوم النحر کے بعد کے تین دن ہیں۔ ان ایّام میں حاجی میدان منیٰ میں ٹھیرتے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر یہاں سے اگر کوئی دو دن میں چلا جائے تو بھی کوئی ہرج نہیں جیسا کہ فمن تعجل فی یومین سے ظاہر ہے۔ لکھا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے حج کے متعلق لوگ چھوٹے چھوٹے امور دریافت کیا کرتے تھے کہ میں نے یوں کیا ہے یا یُوں نہیں کیا تو آپ یہی جواب دیا کرتے کہ کوئی ہرج نہیں +

۲۰۴

۳۰۸۔ من یعجبک قولہ فی الحیوٰۃ الدنیا ۔ یہاں بعض مفسّرین اخنس بن شریق کا نام لیتے ہیں۔ کہ وہ مُراد ہے۔ لیکن ایسے عام الفاظ میں ایک شخص کی تخصیص کرنا کہ وہی مُراد ہے صحیح راہ نہیں۔ بہتیرے لوگ اس کے مصداق ہوسکتے ہیں +

۳۰۹۔ اذا تولّی ۔ تولّی کے دونوں معنے ہوسکتے ہیں یعنی لوٹ کر آتا ہے۔ یا جب والی اور با اختیار ہوتا ہے۔ تو پھر لوگوں کی بھلائی اس کے مدنظر نہیں ہوتی۔ بلکہ زمین میں فساد پھیلاتا اور کھیتی اور نسل کو تباہ کرتا ہے +

۲۱۰

۳۱۰۔ ھل ینظرون الا ان یاتیھم اللہ فی ظلل من الغمام والملئکۃ وقضی الامر لفظی ترجمہ یُوں ہوگا۔ کہ یہ لوگ سوائے اس کے کسی اور بات کا انتظار کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ اُن کے پاس بادلوں کے سایوں میں آئے اور فرشتے (آئیں) اور معاملہ کا فیصلہ تو کیا جاچکا ہے اللہ اور ملائکہ کے آنے سے کیا مُراد ہے۔ اسکو سمجھنے کے لیئے ہم قرآن کریم کے دوسرے مقامات کی طرف رجُوع کرتے ہیں۔ سُورۃ النحل میں فرمایا۔ ھل ینظرون الا ان تاتیھم الملئکۃ او یاتی امر ربک کذالک فعل الذین من قبلھم یہاں ملائکہ کا آنا تو اسی طرح لکھا ہے۔ جیسے آیت زیر بحث میں۔ مگر آیت زیر بحث کے یاتیھم اللہ کے بجائے النحل میں یاتی امر ربک فرمایا۔ جس سے معلوم ہؤا کہ اللہ کے آنے سے مُراد اللہ تعالےٰ کے امر یعنی اس کے حکم کا آنا ہے۔ اور کذالک فعل الذین من قبلھم۔ اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی کیا۔ فرما کر اور بھی وضاحت کردی ہے۔ کیونکہ پہلے لوگ بھی عذاب الٰہی کو ہی مانگتے تھے۔ اور کفار قریش بھی یہی کہتے تھے۔ کہ وہ عذاب کیوں نہیں آتا۔ پس اللہ کے آنے سے

معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ ۔ اس کے معنے بعض
نے تو یُوں کیئے ہیں ۔ کہ پہلے لوگ ایک ہی گروہ ہوتے ہیں یعنی نیکی پر ۔ پھر ان میں اختلاف
شروع ہوتے ہیں ۔ تب ان اختلافوں کو مٹانے کے لیئے نبی آتے ہیں ۔ اور بعض نے
یُوں کیئے ہیں ۔ کہ جب لوگ گمراہی کی حالت پر جمع ہوتے ہیں اور باطل کے پرستار ہوتے ہیں
تب اللہ تعالیٰ اُن میں نبی بھیج کر نیکوں کو بدوں سے الگ کر دیتا ہے ۔ مگر درحقیقت نہ دنیا پر کبھی
وہ زمانہ آتا ہے ۔ کہ کُل کے کُل لوگ حق پر جمع ہو جائیں ۔ اور نہ وہ کہ کُل کے کُل باطل کے
پرستار ہو جائیں اور کوئی بھی نیک نہ رہے ۔ بلکہ کثرت اور قلت نیکی اور بدی میں ہوتی ہے ۔
میرے نزدیک اس کے معنے یہ ہیں ۔ کہ لوگ ایک ہی گروہ ہیں ۔ یعنی ہمیشہ قوموں کی حالت
ایک سی ہی رہی ہے ۔ کان کا استعمال اس طرح پر خود قرآن کریم میں بکثرت موجود ہے ۔ اور
یہاں مُراد درحقیقت ایک عام اصول کو بیان کر کے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت
کا اظہار ہے یعنی ہر زمانہ اور ہر ملک کے لوگ ایک ہی حالت میں ہُوا کرتے ہیں ۔ سو اللہ تعالیٰ
بھی سب ہی میں اپنے نبی بھیجتا رہا جو حق قبول کرنیوالوں کو کامیابیوں کی بشارات دیتے
اور حق کی مخالفت کرنیوالوں کو دُکھ اور عذاب سے ڈراتے تھے ۔ اور ہر ایک نبی کو اللہ تعالےٰ
ایک کتاب بھی دیتا رہا ہے ۔ تاکہ اس کتاب کے ذریعہ سے وہ لوگوں کے باہمی اختلافات
کا فیصلہ کرے ۔ یہاں تک تو عام اصول انبیاء کی بعثت کا سب قوموں میں بیان فرمایا پھر
اس کے بعد فرمایا ۔ وما اختلف فیہ الا الذین اوتوہ من بعد ما جاء تھم
البینٰت بغیا بینھم ۔ یعنی ان نبیوں کی بعثت کی غرض تو علم کا دینا اور اختلاف کا
مٹانا تھا ۔ مگر جن لوگوں کو علم دیا گیا اور اُن میں نبی بھیجے گئے اُن میں بھی اختلاف ہُوا ۔ یہ
ان اختلافات کی طرف اشارہ ہے جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے
سب قوموں میں ظاہر ہو چکے تھے ۔ حالانکہ نبی بھی سبھی قوموں میں آ چکے تھے ۔ پس ان جملہ
اختلافات کو مٹانے کے لیئے اور اُن میں فیصلہ کرنے کے لیئے اللہ تعالےٰ نے اس نبی
آخر الزمان کو بھیجا ۔ اور یہ اشارہ ان الفاظ میں پایا جاتا ہے ۔ فھدی اللہ الذین
امنوا لما اختلفوا فیہ من الحق باذنہ ۔ یعنی ان مومنوں کو جو نبی کریم صلے اللہ
علیہ وسلم کے پیرو ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے ان اختلافات میں سیدھی اور حق راہ پر
چلایا ہے ۔ پس خلاصہ اس آیت کا یہ ہُوا ۔ کہ سب قوموں میں ان کے اختلافوں کو مٹانے
کے لیئے نبی آتے رہے ۔ پھر ان نبیوں کے آنے کے بعد پھر ان میں اختلاف ہوئے ۔ ان
اختلافات میں راہ حق دکھانے کے لیئے اللہ تعالےٰ نے اس نبی کو اور اس کے ذریعے سے اسکے

۲۱۰ ماءً لیطھرکم بہٖ و یذھب عنکم رجز الشیطان ولیربط علیٰ قلوبکم و یثبت بہ الاقدام +
وقضی الامر یعنی جن باتوں کا یہ انتظار کرتے ہیں ان کا تو فیصلہ اللہ تعالےٰ کی
طرف سے ہوچکا ہے - کیونکہ فیصلہ نہ ہوتا تو پیشگوئی کیوں کی جاتی - پس یہ سب باتیں
اب اپنے وقت پر ہو کر رہینگی +

رکوع ۲۶/۱۰ ۲۱۱

۲۱۱ - سل بنی اسرائیل کم اٰتینٰھم من اٰیۃٍ بیّنۃ - بنی اسرائیل سے پوچھو کہ ہم نے اُن کو
کس قدر کھلے کھلے نشان دیئے - یہ کھلے نشان وہ بھی ہوسکتے ہیں - جو بنی اسرائیل کو اپنے
انبیاء کے ذریعہ سے دیئے گئے - اور وہ کھلے نشان بھی مُراد ہوسکتے ہیں جو نبی کریم صلے اللہ
علیہ وسلم کے ذریعہ سے آپ کے مخالفین کو دکھائے گئے - اور صورت ثانی میں بنی اسرائیل
سے دریافت کرنے کا یہ منشاء ہے کہ یہ لوگ انبیاء کی تاریخ سے واقف ہیں - اور جانتے
ہیں - کہ نبیوں کے لئے کن نشانوں کا ہونا ضروری ہے - پس اُسی معیار کی رُو سے محمد رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم کو کیوں پرکھ کر نہیں دیکھتے +

اسی طرح پر من یبدل نعمت اللہ سے مُراد وہ نعمتِ الٰہی بھی ہوسکتی ہے جو پہلے
بنی اسرائیل کو دیگئی - اور وہ نئی نعمت الٰہی بھی ہوسکتی ہے جو اب ان کے سامنے رکھی جارہی تھی
مگر جس کو وہ رد کررہے تھے - اِسی لئے اس پر لفظ تبدیل کا بولا ہے +

۲۱۲ ۲۱۲ - و یسخرون من الذین اٰمنوا - مومنوں سے تمسخر کرتے ہیں - اس تمسخر کی وجہ یہ تھی کہ
مسلمان اپنے گھر بار عزیز و اقربا جائدادوں وغیرہ کو چھوڑ کر مدینہ میں آگئے تھے - اور اُن کی
تجارتیں اور کاروبار فنا ہوگئے تھے - اسلیئے اُن کی حالت بڑی غربت کی حالت تھی - ادھر
یہودی ایک سُود خوار قوم تھی اور جہاں وہ رہے ہیں سُود خواری کی وجہ سے دُنیا کی محبت میں
غرق ہوکر مال و زر اُن کے پاس زیادہ رہا ہے - پس وہ مسلمانوں پر ہنستے تھے - کہ اُن کے ساتھ
تو بڑے بڑے وعدے تھے - مگر یہ تو پہلے سے بھی تنگدست ہوگئے - نادان انسان صبر نہیں
کرتا اور عاقبت کو نہیں دیکھتا - وہی تنگدست قوم جن پر اُن کی غربت کی وجہ سے تمسخر کیا جاتا تھا
تھوڑے ہی دنوں میں ایسی مالدار قوم بن گئی - کہ قیصر و کسرےٰ کے خزانوں کی مالک بھی وہی ہوگئی -
اسی کی طرف آیت کے آخری الفاظ میں اشارہ ہے - و یرزق من یشاء بغیر حساب
کہ اللہ تعالےٰ ان کو بیحساب رزق عطا فرمائے گا - عربوں کے ہاں گنتی بھی صرف ہزار تک
ہی تھی - جب ان میں سے ایک ایک لاکھوں اور کروڑوں کا مالک بن گیا - تو اس کا حساب
لگانا ان کے لئے بھلا کہاں ممکن تھا +

۲۱۳ ۲۱۳ - کان الناس اُمّۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیّٖن مبشرین و منذرین و انزل

۲۱۵
تھے - یا اسلام قبول نہ کر سکتے تھے +

۲۱۶
۲۱۶ - کُتب علیکم القتال وھو کرہ لکم - درحقیقت یہ سارا مضمون جنگ سے ہی تعلّق رکھتا ہے - گو بعض وقت اصل مضمون کی طرف اشارہ لطیفہ ہوتا ہے - اور بعض وقت اس کا ذکر صریح الفاظ میں ہوتا ہے - یہاں فرمایا کہ تمہارے لیئے جنگ کرنا مُقرر کیا گیا - اور وہ تم کو ناپسند ہے - قرآن کریم کی شہادت سے بڑھ کر کوئی شہادت اِس امر کی نہیں ہو سکتی - کہ مسلمانوں نے جنگ کس غرض کے لیئے شرُوع کیا تھا - اس پر بہت سی شہادت تو پہلے آ چکی لیکن یہ آیت بھی اسلام کے اُن سیہ دل دشمنوں کے لیئے بجائے خود ایک کافی جواب ہے جن کو اسلام کی خوبیاں بھی اس کے عیب ہی معلوم ہوتے ہیں - کیونکہ یہاں سے صاف معلوم ہوتا ہے - کہ جنگ کو مسلمان اس کمزوری اس غربت اس بے سروسامانی اور بالمقابل دشمن کی طاقت اور جتھے اور ہر قسم کی تیاری کو دیکھ کر کبھی پسند نہ کر سکتے تھے - حالانکہ اسلام کے دشمن کہتے ہیں - کہ مُسلمانوں نے لُوٹ مار کے لیئے جنگ شروع کیئے - اگر مُسلمانوں کی غرض لوٹ مار ہوتی تو جنگ کے حُکم پر اُنہیں خوش ہونا چاہیئے تھا نہ یہ کہ اُسے ناپسند کرتے - اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مُسلمانوں کو ارشاد فرمایا - کہ بیشک بعض کام دشوار معلوم ہوتے ہیں - اور اسلیئے انسان ان کو پسند نہیں کرتا - مگر اس کی بھلائی ایسے ہی کام میں ہوتی ہے - اور بعض وقت ایک بات کو اپنے لیئے پسند کرتا ہے - مگر وہ اس کے دُکھ کا مُوجب ہوتی ہے - عسیٰ ان تکرھوا شیئًا وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئًا وھو شر لکم +

رکوع ۲۷ / ۱۱
۲۱۷
۲۱۷ - یسئلونك عن الشھر الحرام قتال فیه قل قتال فیه کبیر - حُرمت والے مہینوں میں جنگ کی ممنُوعیّت کو یہاں کھولکر بیان فرمایا گو اِس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے - مسلمانوں کو تو اللہ تعالیٰ حکم دے چکا تھا کہ الحرمات قصاص - یعنی تمام حرمت والے اُمور میں ابتداء تمہاری طرف سے نہ ہو - ہاں اگر وہ لوگ ابتدا کریں تو مقابلہ اور بدلے کے طور پر تم بھی بیشک ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو - یہاں معلوم ہوتا ہے سوال کفار کی طرف سے ہے - جیسا کہ جواب کے دوسرے حصّہ سے ظاہر ہے - پہلا جواب تو صرف اسی قدر ہے - کہ ان دنوں مہینوں میں جنگ کرنا بڑے گناہ کی بات ہے - دوسرے حصہ جواب میں رُوئے سخن صاف کفّار کی طرف ہے - کہ تم جواب حُرمت کے مہینوں میں جنگ کے مسائل دریافت کرتے ہو - تم نے خود کس حُرمت کا پاس کیا - چنانچہ فرمایا - وصد عن سبیل اللہ وکفر به والمسجد الحرام واخراج اھله منه اکبر عند اللہ - یعنی اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکنا - اللہ تعالےٰ کا اِنکار کیا - اور لوگوں کو مسجد حرام سے روکنا - پھر مسجد حرام کے رہنے والوں کو وہاں سے

ساتھی مومنوں کو چن لیا +

۲۱۴ ۳۱۴- ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم الباساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین اٰمنوا معہ متی نصر اللہ - اب ان مومنوں کو جنھیں ساری دُنیا کے اختلافات کے اندر راہ حق پر چلایا مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ بیشک نبی اپنے ساتھیوں کے لیئے کامیابیوں کی بشارتیں لاتا ہے مگر وہ کامیابیاں یُوں بیٹھے بٹھائے حاصل نہیں ہو جاتیں اور اس کے لیئے انبیاء کی تاریخ شاہد ہے - بلکہ وہ چاہتی ہیں - کہ مومن جماعت بڑے بڑے مصائب میں ڈالکر پختہ کیجائے - چنانچہ فرمایا کیا تم سمجھتے ہو کہ یونہی جنّت میں داخل ہو جاؤ گے - اور ابھی تم پر ان لوگوں کی سی حالت وارد نہیں ہوئی جو تم سے پہلے گذر چکے اُن پر بڑے بڑے دُکھ اور مصائب آئے اور وہ خوب ہلائے گئے یہاں تک کہ رسُول اللہ اور اس کے ساتھی بول اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئیگی - آخرت کی جنت کا حال تو آخرت کو ہی معلوم ہوگا لیکن اس دُنیا میں کامیابی بھی ایک جنت ہے - اور بشارت کا تعلق اس دُنیا میں کامیابی کے ساتھ اور آخرت میں اسی حقیقی جنت کے ساتھ ہے - جس کی کیفیت وہیں جاکر پُورے طور سے کھُلیگی - اب تک جس قدر مصائب مسلمان اللہ کی راہ میں اُٹھا چکے تھے - وہ کچھ تھوڑے مصائب نہ تھے - مگر اس پر بھی اللہ تعالےٰ انہیں نصیحت فرماتا ہے - کہ اپنے آپ کو خوب مضبُوط کریں اور استقامت دکھائیں - کہ اس سے بھی بڑھ کر مصائب آنے والے ہیں - اور ان مصائب کے اندر استقامت ہی کامیابی کی جڑھ ہے - پس مومن کو نہیں چاہیئے - کہ وہ مصائب میں گھبرائے - بلکہ یہی مصائب ہی درحقیقت کامیابی کی کُنجی ہوتے ہیں -

۲۱۵ ۳۱۵- یسئلونک ماذا ینفقون - ایک طرف مسلمانوں کی وہ غربت کہ کفّار جن کو دُنیا کے مال کا حصّہ اس وقت خوب ملا ہُوا تھا ان پر تمسخر کرتے - کیونکہ وہ اپنے اموال اور جائدادوں کو چھوڑ آئے تھے - دوسری طرف الٰہی ارشاد کا یہ منشاء انہوں نے سمجھا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بڑی بڑی قربانیاں چاہتا ہے - اسلیئے سوال کیا کہ کیا خرچ کریں حکم ہُوا - قل ما انفقتم من خیر بھلائی سے اور اچھے مال سے ہی خرچ کرو جو کچھ کرو - اور یہ تمہارا خرچ کرنا والدین قریبوں یتیموں مسکینوں مسافروں کے لیئے ہے - یہ بھی مُراد ہو سکتی ہے - کہ مال خرچ کرنے میں یہ لوگ بھی حقدار ہیں - کہ اُن پر اموال خرچ کیئے جائیں - اور یہ بھی کہ جو کچھ اموال جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرو گے - وہ تمہارے اپنے لوگوں کی بہتری کے لیئے ہی ہونگے - کیونکہ بہت سارے ضعفاء مسلمانوں میں سے تھے - جو کفّار کے غلبہ کی وجہ سے اور اپنے ضُعف کی وجہ سے مکّہ سے نکل نہ سکتے

اگر وہ حالت کفر پر ہی مرگیا۔ نہ اس نے وہ دنیوی فوائد اٹھائے جو اسلام کے غلبہ کے ساتھ وہ اٹھا سکتا تھا۔ اور نہ وہ اخروی فوائد اٹھائے جو وہ اس صورت میں اٹھاتا جب اس کی موت اسلام پر ہوتی +

ایک بڑی غلط فہمی جس کا شکار نہ صرف غیر مسلم اور معترضین اسلام بلکہ خود مسلمان بھی ہورہے ہیں یہ ہے کہ اسلام میں ہر مرتد کو قتل کردینے کا حکم ہے۔ قرآن کریم میں ارتداد کا ذکر ایک تو لفظ ارتداد کے ماتحت یہاں اور سورۃ مائدہ کی آیت ۵۴ میں ہے۔ اور دوسرے عام طور پر کئی باران لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جو پہلے ایمان لاتے پھر کافر ہو جاتے ہیں۔ یا بعض ایسے لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جو بار بار مسلمان ہوتے پھر کفر کی طرف لوٹ جاتے ایسے لوگوں کا ذکر منافقین کے اندر بھی کیا ہے۔ مگر ان تمام مقامات میں ایک مقام بھی ایسا نہیں جہاں مرتد کی سزا قتل لکھی ہو۔ یا یہ فرمایا ہو کہ مرتدین کو سزائے موت یا کوئی اور سزا دی جائے۔ بلکہ یہاں تو ارتداد کا صریح ذکر کرکے اگر کچھ کہا ہے تو یہی کہا ہے۔ کہ جو شخص مرتد ہو کر پھر کفر کی حالت میں وفات پا جائے۔ جس سے اس کا اپنی موت مرنا معلوم ہوتا ہے۔ نہ اس کا قتل کیا جانا۔ باقی رہیں احادیث سو ان میں بھی کسی حدیث کے صریح الفاظ ایسے نہیں ملتے جن سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حکم تھا کہ مرتد کو قتل کردیا جائے۔ البتہ ایک دو واقعات ایسے ہیں جن سے غلط طور پر یہ نتیجہ نکال لیا گیا ہے۔ عکل کے چند آدمی مدینہ آئے اور اسلام کا اظہار کیا۔ پھر بیماری کا عذر کیا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت دی کہ باہر رہیں جہاں بیت المال کے اونٹ رکھے جاتے تھے۔ ان لوگوں نے اونٹوں کے محافظوں کو قتل کردیا۔ اور خود اونٹ لے کر چلتے ہوئے آخر پکڑے گئے اور ان کو سزائے موت دیگئی لیکن اس واقعہ سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ سزائے موت ارتداد کی وجہ سے تھی۔ بلکہ وہ تو خود قاتل تھے۔ اور سزائے موت قصاص کے حکم کے ماتحت اُن کو دی جانی ضروری تھی۔ علاوہ ازیں اگر کوئی ایسا واقعہ بھی ہو جس میں کسی شخص کو محض مرتد ہونے کی وجہ سے سزائے موت دیگئی ہو تو یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ چونکہ ان ایام میں مسلمان اور کفار دو فریق جنگ تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص مرتد ہوگا وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر انکے دشمنوں کے ساتھ جا ملیگا پس ایسے حالات میں اگر اسے سزائے موت دی جائے تو اس کی وجہ ارتداد نہیں۔ بلکہ اپنی فوج کو چھوڑ کر دشمن کے ساتھ جا ملنا ہے۔ مرتد کے لئے سزائے موت کا فتوے دینے کے لئے نہ کوئی صریح حکم قرآن کریم میں اور نہ کسی صحیح حدیث میں ہے۔ اسلئے وہ فتوے جو کسی وقت مسلمان علماء نے غالباً ملکی حالات کی بنا پر دیا تھا۔ آج صحیح نہیں ہے +

باہر نکال دیا۔ تو ساری حرمتوں کی بےعزتی خود کر کے اب حرمت والے مہینوں میں جنگ کا سوال کرتے ہو۔ پس ایک طرف اگر حرمت والے مہینوں میں جنگ سے روکا تو دوسری طرف ساتھ ہی کفار کو ملزم بھی کیا +

عبداللہ بن حجش الاسدی کا جو قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ استدلال کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ کہ حرمت والے مہینوں میں جنگ کو جائز کر دیا گیا تھا۔ بلکہ عبداللہ بن حجش کا اپنا بیان اس کے خلاف ہے۔ جب رسول اللہ صلعم نے اُسے کہا۔ انی ما امرتکم بالقتال فی الشہر الحرام۔ میں نے تم کو حرمت والے مہینوں میں جنگ کا حکم نہیں دیا تھا۔ تو عبداللہ نے کہا۔ یا رسول اللہ انا قتلنا ابن الحضرمی ثم امسینا فنظرنا الی ہلال رجب فلا ندری افی رجب اصبناہ ام فی جمادی یعنی ہم ابن حضرمی کو قتل کر چکے تو شام ہوئی اور تب ہم نے رجب کے مہینہ کا ہلال دیکھا۔ پس ہم نہیں جانتے۔ کہ ہم نے اسے رجب میں مارا یا جمادی میں +

۲۱۸۔ ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا۔ اور وہ ہمیشہ تم سے جنگ کرتے رہینگے۔ یہاں تک کہ ان کا زور چلے تو تم کو اپنے دین سے لوٹا دیں یہاں سے معلوم ہؤا کہ کفار کی غرض مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے میں یہ تھی۔ کہ ان کو اُن کے دین سے لوٹا دیں۔ گویا یہ ان کا انتہائی مقصد تھا۔ اور درحقیقت اگر مسلمانوں کے دین کو تباہ کرنا کفار کی اصل غرض نہ ہوتی تو مسلمانوں کو بالمقابل تلوار اُٹھانے کا حکم نہ دیا جاتا۔ اسلام کے جنگوں پر اعتراض کرنے والے ان واقعات پر غور کریں تو اُن کو معلوم ہو۔ کہ جس انتہائی مجبوری کی حالت میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جنگ کیئے۔ ایسی مجبوری کسی قوم کو جنگ کے لیئے پیش نہیں آئی۔ اگر اس قدر صبر جنگ کے متعلق آج مہذب اقوام اختیار کریں جس قدر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے کیا تو جنگ کا وجود ہی دُنیا سے معدوم ہو جائے +

۲۱۹۔ ومن یرتدد منکم عن دینہ فیمت وھو کافر فاولئک حبطت اعمالھم فی الدنیا والاخرۃ۔ اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے مرتد ہو جائے۔ پھر وہ کافر ہونے کی حالت میں ہی مر جائے۔ تو ان لوگوں کے کام دُنیا میں اور آخرت میں بھی اکارت گئے۔ جب یہ فرمایا کہ کفار کی اصل غرض جنگ کرنے میں مسلمانوں کو ان پر قابو پا کر دین اسلام سے مرتد کرنا اور پھر کفر و شرک کی طرف لوٹانا ہے تو ساتھ ہی فرمایا۔ کہ اگر فی الواقع کوئی شخص مرتد ہو جائے تو اس کا سب کیا کرایا جو اس نے اسلام کی حالت میں کیا تھا ضائع ہؤا اور بے نتیجہ رہا

۲۱۹ نقصان اُن کے نفع سے بہت بڑھ کر ہے۔ اس بات کو سُن کر کون مسلمان تھا جو شراب کی طرف نظر اُٹھا کر بھی دیکھتا۔ مگر آج ہم تعجب سے دیکھتے ہیں۔ کہ بعض مُسلمان کہلانیوالے اسبات کو لے بیٹھتے ہیں۔ کہ قرآن میں شراب کی ممانعت کا کہاں ذکر ہے۔ کیا ایک عقلمند انسان کے لئے یہ ممانعت کافی نہیں کہ اس کے نقصان کو اس کے نفع سے بڑھ کر بتایا؟ کون عقلمند انسان ہے۔ کہ جس کو یہ سمجھ آجائے کہ فلاں کام میں اسکو نقصان بہت زیادہ ہوگا اور نفع بہت کم تو وہ اس کام کو اختیار کرے۔ مگر بایں اور مزید تصریح بھی فرمائی۔ کہ ان چیزوں کو رجس کہا جس طرح شرک کو رجس کہا۔ اور پھر ان کو شیطان کا کام قرار دیا۔ پس کیا کوئی شخص ہے جو اپنے آپ کو ان امُور کا مُرتکب کرکے شیطان بننا چاہتا ہو +

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کمال معجزات میں سے یہ معجزہ بھی ہے۔ کہ شرابنوشی کو جس کے انسداد کے لیئے آج تک انسانی عقلیں متحیر ہو رہی ہیں۔ ایک لفظ میں ملک عرب سے کیا بلکہ کُل مُسلمان دُنیا سے نیست و نابود کر دیا۔ یہ وہ تبدیلی ہے جس کی نظیر دُنیا کے کسی نبی یا کسی مصلح کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایک ہی شرابخور سے شراب چھڑانا بھی انسان کی طاقت سے بڑھ کر ہے۔ چہ جائیکہ ایک قوم کی قوم بلکہ ملک کے ملک کو جو شراب نوشی کی بیماری میں خطرناک طور پر مبتلا تھا۔ ایک ہی لفظ بول کر اس بیماری سے ایسا پاک کر دیا جائے۔ کہ شراب کے ایک قطرہ تک کا نام و نشان وہاں باقی نہ رہ جائے۔ اور پھر آپ کی قوت قُدسی کا یہ معجزانہ اثر انہی لوگوں پر نہیں ہُوا جو آپ کے سامنے موجود تھے۔ بلکہ آج تیرہ سو اتیرہ سو سال تک برابر وہ اثر مسلمانوں کی ہر نئی نسل پر اسی طرح پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اُن پہلے لوگوں پر تھا +

۲۲۰ ۳۲۱- یسئلونک عن الیتمیٰ۔ گو یتامی کی خبرگیری کے لیئے تو ابتدا سے ہی قرآن کریم بڑے پرزور الفاظ میں تاکید فرماتا رہا۔ مگر جنگوں سے بھی اِس مضمون کا خاص تعلق ہے کیونکہ بڑے بڑے جنگوں میں قوم کے اندر بہت سے یتیم بچے رہ جاتے ہیں۔ اِسلیئے ان کے مُتعلق خاص طور پر سوال پیدا ہوتا ہے۔ تو اُن کی اصلاح کے لیئے تاکید فرمائی۔ مگر یہ بھی فرمایا۔ کہ ان تخالطوھم فاخوانکم۔ یعنی اگر اُن کو ساتھ ملالو۔ تو کوئی حرج نہیں تمہارے بھائی ہی ہیں کھانے پینے میں ان کو شریک کر لینا یا تجارت میں ان کے اموال میں شراکت کر لینا جائز ہے +

۲۲۱ ۳۲۲- ولا تنکحوا المشرکت حتیٰ یؤمن۔ اِس آیت میں مومن مردوں کا نکاح مشرک عورتوں سے اور مشرک مردوں کا نکاح مومن عورتوں سے ناجائز قرار دیا ہے۔ ابتدائے اسلام میں ایسے نکاح ہوتے رہے۔ مگر مدینہ میں آکر چونکہ حالت تبدیل ہوگئی۔ اور مسلمانوں اور کُفّار میں دو دُشمن

۲۱۹

۲۲۰۔ یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر ومنافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما ۔ تم سے شراب اور جُوئے کی نسبت دریافت کرتے ہیں۔ کہدو ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔ اور لوگوں کے لیئے کچھ فائدے بھی ہیں۔ مگر ان کا گناہ اُن کے فائدہ سے بُہت بڑھ کر ہے +

خمر کے اصل معنی ستر الشئی یعنی کسی چیز کو ڈھانپ لینے کے ہیں۔ اور شراب کو خمر اسلیئے کہتے ہیں۔ کہ وہ انسان کی عقل کو ڈھانپ دیتی ہے (مفردات) اِس لیئے ہر ایک نشہ دینے والی چیز پر اس کا اطلاق جائز ہے۔ چنانچہ راغب کہتا ہے۔ وھو عند بعض الناس اسم لکل مسکر۔ اور جن لوگوں نے اِس حدیث کی بنا پر کہ الخمر من ھاتین الشجرتین النخلۃ والعنبۃ۔ یعنی شراب ان دو درختوں سے ہے کھجور اور انگور سے خمر کے لفظ کو صرف کھجور اور انگور کی شراب پر محدود کرنا چاہا ہے اُنہوں نے حدیث کے معنے کو نہیں سمجھا۔ کیونکہ حدیث کے الفاظ میں کوئی حصر نہیں کہ ان کے سوا اور خمر کوئی نہیں۔ جو دو قسم کی شراب زیادہ مُروّج تھی۔ اُس کا ذکر کر دیا +

یہاں شراب یعنی مُسکرات اور جُوئے کی ممانعت کا ذکر فرمایا۔ ان دونوں باتوں کا تعلق جنگ سے بھی ہے۔ اور انسان کی عامہ بہبُودی میں بھی اس کا بڑا تعلق ہے۔ عموماً جنگوں میں سپاہی لوگ بکثرت شراب پیتے ہیں۔ اور شراب سے اندھے ہو کر دُشمن پر ٹُوٹ پڑتے ہیں۔ اسلام نے اسبات کو پسند نہیں کیا۔ کہ اِس قسم کی جھُوٹی دلیری پیدا کی جائے۔ وہ اِنسان کے اندر شجاعت کا سچّا جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ شراب کا نشہ جب اُترتا ہے تو اِنسان کی طبیعت اپنی اصلی حالت سے بھی بہت کمزور ہو جاتی ہے۔ اور شراب کا استعمال اصل جوہر شجاعت کو بالکل نکمّا کر دیتا ہے اسلیئے شراب کو ترک کرنے کا حکم دیا۔ اور دوسرے جو لوگ جنگوں میں شراب کا استعمال کرتے ہیں وہ بدمست ہونے کی وجہ سے جائز حدود جنگ سے بہت دُور نکل جاتے ہیں۔ جُوا بھی لوگ عرب میں بالخصوص جنگوں کے لیئے روپیہ جمع کرنے کے لئے کھیلتے تھے۔ اِسی لیئے جُوئے کی ممانعت کا ذکر ہوُا تو سوال ہوتا ہے۔ ماذا ینفقون پھر کیا خرچ کریں جس کا جواب فرمایا۔ العفو جو کچھ تمھاری جائز ضرورِیات سے تمھارے پاس بڑھ رہے وہ سب کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کر دو +

یہاں شراب اور جُوئے میں بعض فوائد کا ہونا بھی مانا ہے۔ یہ قرآن کریم کی صداقت کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو یہاں تک بھی شراب اور جُوئے کو گندی اور ناپاک چیزیں کہا ہے۔ کہ فرمایا۔ انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطٰن۔ مگر دوسری طرف ان میں کچھ فائدہ ہونے سے بھی اُنکار نہیں کیا۔ اور اِس وجہ پر حرام قرار دیا کہ اُن کا

۲۲۲

اور نکاح کے بھی ہیں۔ اسلیئے ساتھ ہی طلاق کا ذکر بھی کر دیا۔ اور طلاق کے مسئلہ کا تعلق عورتوں کے ماہواری ایّام سے بھی ہے۔ اسلیئے ابتدا اس مضمون کی اس ذکر سے کی چنانچہ یہی ترتیب ان چار رکوعوں میں ملحوظ رکھی ہے یعنی اوّل مسئلہ حیض کے متعلق یہود و نصارٰے اور عربوں کی افراط و تفریط میں صحیح راہ بتایا۔ پھر طلاق کے متعلق عدّت اور نکاح ثانی کا ذکر کیا اور آخر بیوہ عورتوں کی عدّت اور نکاح ثانی کے ساتھ اس مضمون کو ختم کیا +

۳۲۴۔ قُل هو اذی فاعتزلوا النساء فی المحیض ولا تقربوهن حتی یطهرن کہو یہ ایک مُضر بات ہے۔ سو ایّام حیض میں عورتوں سے الگ رہو۔ اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اُن کے قریب نہ جاؤ۔ مفسّرین نے لکھا ہے۔ کہ یہود اور مجوس ماہواری ایّام میں عورتوں سے دُور رہتے تھے۔ اور عیسائی ماہواری ایّام کی کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اور عرب اُن سے مُواکلت اور مجالست بھی درست نہ سمجھتے تھے۔ تو ان افراط اور تفریط کے پہلوؤں میں اسلام نے ایک اعتدال کی راہ بتائی۔ ایام حیض میں زنا شوئی کے تعلّقات ضرر اور دُکھ کا مُوجب بھی ہو سکتے ہیں۔ اِسلیئے ایسے تعلقات سے تو منع فرمایا۔ البتہ اس کے سوائے جس قدر ان سے اِجتناب کیا جاتا تھا اس کو بھی پسند نہیں فرمایا۔ جس حد تک ضرر کی بات تھی اُس حد تک روک دیا۔ باقی تعلقات میں چُونکہ ہرج کوئی نہ تھا۔ اِس لئے اُن سے نہیں روکا۔ عورتوں کے قریب جانے یا اُن کو چھونے کے محاورات قرآن کریم نے تعلّقات زنا شوئی کی طرف اشارہ کرنے کیلیئے استعمال کیئے ہیں +

محیض کے اصلی معنے بہنے کے ہیں۔ یہاں پر اس سے مُراد عورتوں کے ایام ماہواری ہیں

۲۲۳

۳۲۵۔ نساؤکم حرث لکم فاتوا حرثکم انّٰی شئتم تُمہاری عورتیں تُمہارے لیئے کھیتی ہیں۔ سو اپنی کھیتی میں آؤ جب چاہو۔ یا جس طرح چاہو۔ لفظ انّٰی دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ متی یعنی جب اور کیف یعنی جس طرح۔ نا اہلوں نے اِس آیت پر بیہُودہ اور لغو اعتراض کیئے ہیں۔ قرآن کریم ایک ایسی پاک کتاب ہے۔ کہ جس کا ایک ایک حرف ایک باپ اپنی بیٹی کو اور ایک بھائی اپنی بہن کو پڑھا سکتا ہے۔ حالانکہ بہت سی مُقدّس کہلانے والی کتابوں میں ایسے فحش مضامین ہیں۔ کہ جن کو تنہائی میں پڑھتے ہُوئے بھی ایک شخص شرم سے پسینہ پسینہ ہو جاتا ہے۔ بائبل کو تو کہا جائیگا کہ یہ ایک پُرانے زمانے کی کتاب ہے مگر اس تہذیب کے زمانے میں سوامی دیانندجی نے جو کچھ نیوگ کے بارے میں اپنی کتاب کے چوتھے باب میں لکھا ہے اس کو چھوڑ کر بھی اسی باب کی دفعہ ۳۴ میں جن خیالات کا اظہار گربھادان سنسکار کے نیچے سوامی جی نے کیا ہے۔ وہ ایسے الفاظ ہیں کہ اس سے بڑھ کر ننگے الفاظ مرد اور عورت

قوموں کا معاملہ ہو گیا۔ اس لیئے اب یہ نہ ہو سکتا تھا۔ کہ ایک دشمن قوم کے ساتھ نکاحوں کے تعلقات قائم ہوں۔ گویہ ایک وجہ اس وقت کے لیئے تھی۔ مگر چونکہ وہ الفاظ جن میں ممانعت کی گئی ہے عام ہیں اور چونکہ اسلام کے احکام تدریجاً ہی نازل ہوتے رہے ہیں۔ جیسے جیسے ضرورت پیش آتی گئی۔ اسلیئے کسی خاص حکم کے کسی خاص موقعہ پر دیا جانے کا یہ منشاء نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ حکم صرف اس موقعہ کے لیئے ہے جب تک کوئی اور قرینہ نہ ہو۔ شرک سے اسلام اسقدر بیزاری ظاہر کرتا ہے۔ کہ کھانے کی چیزوں میں بھی ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ جو دیوتاؤں کے نام پر مخصوص کی گئی ہوں اور تعلقات معاشرت میں بھی مشرک عورت کا مومن مرد کے گھر ہونا یا مومن عورت کا مشرک مرد کے گھر میں ہونا منع فرمایا۔ حالانکہ محض کفار سے جو اہل کتاب ہوں ایک حد تک نکاح کے تعلق کو جائز قرار دیا ہے۔ یعنی ایک مومن مرد ایک غیر مسلم اہل کتاب عورت سے نکاح کر سکتا ہے کس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہ مذہب جس نے شرک سے ایسی کامل بیزاری سکھائی تھی۔ آج اس کے پیرو بتوں کو نہیں تو عملاً اپنے پیروں اور سجادہ نشینوں اور علماء اور رؤساء کو خدا کے ساتھ شریک ٹھیرا رہے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی نہ پرواہے نہ جرأت۔ اور جو کچھ وہ کہدیں وہ بغیر اپنی عقل و تمیز کو کام میں لانے کے مانتے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہی شرک ہے جس پر قرآن کریم نے یہود اور نصارے کو ملزم کیا ہے۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ ۔

رکوع ۲۸ ۱۲ ۲۲۲

۳۲۳۔ یسئلونک عن المحیض ۔ تم سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ یہاں سے لے کر اکتیسویں رکوع کے آخر تک حیض۔ طلاق اور بیوہ عورتوں کے متعلق مسائل کا ذکر ہے اور اس مضمون کا بظاہر سابقہ مضمون سے تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ مگر جیسا کہ پہلے نوٹ ۲۳۶ میں واضح کیا گیا ہے۔ اصولی بحث کے بعد بعض فروعی مسائل پر ضروری تھا۔ کہ روشنی ڈالی جاتی۔ چنانچہ پچھلے چند رکوعوں میں غذاؤں وصایا قصاص روزوں جنگوں شراب قمار بازی وغیرہ امور سے متعلق مسلمانوں کو ہدایات فرمائیں۔ اور پچھلے رکوع کے اخیر پر جنگوں کے ذکر میں ہی مشرکوں کے ساتھ تعلقات نکاح کو منع کیا۔ تو چونکہ نکاح کا مضمون شروع ہو گیا اس لیئے اسکے متعلق چند مزید مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے جس طرح یتامے کی خبر گیری کا سوال جنگوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح بیوہ عورتوں کی عدت اور نکاح کے سوالات بھی جنگوں سے متعلق ہیں۔ کیونکہ جنگوں میں بیوہ عورتیں بکثرت رہ جاتی ہیں۔ اب جب بیوہ عورتوں کی عدت اور نکاح کا ذکر ہوا تو اس سے ملتے جلتے ہی احکام چونکہ مطلقہ عورتوں کی عدت

۲۲۴
بین النّاس - اور اللہ تعالیٰ کو اپنے قسموں کی وجہ سے اسبات کے لیئے آڑ نہ بنالو کہ تم نیکی کرو اور تقوےٰ اختیار کرو - اور لوگوں کے درمیان صلاح کرو - چونکہ اب طلاق کا ذکر شروع ہونیوالا ہے - اور طلاق کی ایک قسم وہ تھی جو عرب میں ایلاء کے نام سے مشہور تھی جسمیں مرد قسم کھالیتا تھا - کہ وہ اپنی عورت کے قریب نہیں جائیگا - اور اس طرح پر وہ بظاہر مطلقہ کے حکم میں پڑی رہتی تھی - مگر حقیقی طلاق اس پر وارد نہ ہوتی تھی - اور سب سے پہلے اسی طلاق کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے - تو اس لیئے بطور تمہید اس مضمون کے پہلے ایسی قسموں سے ہی روکا ہے جو انسان کے نیکی کرنے میں روک ہوجائیں - کیونکہ ایلاء بھی ایک ایسی قسم ہے جو نیکی کرنے میں یا اصلاح بین النّاس میں یا حقیقی تقوے کی راہ پر چلنے میں روک ہوجاتی ہے - بہت لوگوں کی عادت ہے - کہ بات بات میں قسم کھالیتے ہیں - کہ میں فلاں کام نہیں کرونگا - یا فلاں کام نہیں کروں گا - حالانکہ وہ نیکی کے کام ہوتے ہیں - تو اس طرح پر وہ اللہ تعالیٰ کے نام کو بعض نیکیوں کے ترک کرنے کے لیئے ایک حیلہ بنالیتے ہیں - حالانکہ اللہ تعالیٰ تو نیکیوں کا حکم دیتا ہے - اور کسی نیکی سے روکتا نہیں - عرضۃ ہر اس چیز کو کہتے ہیں - جو سامنے آجائے - اور اس طرح پر ہر روک یا آڑ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے - اور ڈھال کو بھی عرضۃ کہتے ہیں +

۲۲۵
۳۲۷ - لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم - اللہ تعالیٰ تمہاری لغو قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرتا لیکن ان پر مواخذہ کرتا ہے جو تمہارے دلوں نے کھائی ہیں لغو قسموں سے مراد وہ قسمیں ہیں ا جو انسان بلا سوچ سمجھے معمولی گفتگو میں عادت کے طور پر قسم اٹھالیتا ہے - اور بما کسبت قلوبکم سے مراد وہ قسمیں ہیں جو دل میں ایک بات کو ٹھان کر اور قصد اور ارادہ سے انسان کھاتا ہے - اس کے یہ معنے نہیں کہ لغو طور پر انسان بیشک قسمیں کھاتا رہے - کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے - والذین ھم عن اللغو معرضون - ہاں لغو قسم کو قسم قرار دیکر اس پر مواخذہ نہیں - ایلاء میں بھی بعض وقت انسان بغیر قصد اور ارادہ کے قسم کھالیتا ہے - اسلیئے لغو قسم کا ذکر یہاں فرمایا +

۲۲۶
۳۲۸ - الذین یؤلون من نسائھم تربص اربعۃ اشھر - ان لوگوں کے لیئے جو اپنی عورتوں کے قریب جانے سے قسم کھالیتے ہیں چار مہینے انتظار کرنا ہے - ایلاء کے معنی میں کمی اور قسم کے مفہوم پائے جاتے ہیں - چنانچہ مفردات میں ہے - الایلاء الحلف المقتضی لتقصیر فی الامر الذی یحلف علیہ یعنی ایلاء اس قسم کو کہتے

کے تعلّقات کے متعلق ایک بیباک سے بیباک آدمی بھی استعمال نہیں کر سکتا۔ میں چونکہ اُن الفاظ کو نقل کر کے قرآن کریم کے پاک مضامین میں گند کو ملانا نہیں چاہتا۔ اسلیئے ناظرین خُود ان الفاظ کو اور نیوگ کے ذکر کو پڑھ کر پھر مقابلہ کر کے دیکھیں۔ کہ زمین عرب کے ایک اُمّی کا یہ مُعجزہ ہے یا نہیں کہ انہی نازک تعلّقات کو کیسے پاک اور کیسے شائستہ الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔ قرآن کریم باوجود اِس کمال کے کہ انسان کے ہر ایک قسم کے تعلّقات پر ہدایات سے مملُو ہے۔ اور مرد و عورت کے تعلّقات پر بھی بہتر ین ہدایات اس کے اندر جمع کر دیگئی ہیں۔ مگر ایسے پاک الفاظ میں ایسے اشاروں اور کنایوں میں ان باتوں کا ذکر کرتا ہے۔ کہ نازک سے نازک طبیعت پر بھی وہ گراں نہیں گُذرتے۔ حالانکہ اگر اُسی زمانہ کے عربی اشعار کو دیکھا جائے تو مرد اور عورت کے عشقیہ تعلّقات کا ذکر ایسے فحش اور ننگے الفاظ میں پایا جاتا ہے۔ کہ کوئی شخص ان اشعار کو کھلی مجلس میں پڑھ بھی نہیں سکتا۔ پس یہ بھی قرآن کریم کا معجزہ ہے۔ کہ نہ صرف ان تمام گندے محاورات سے یہ پاک کتاب بالکل خالی ہے۔ بلکہ ان نازک تعلّقات کے ادا کرنے کے لیئے نہایت شُستہ اور پاک الفاظ استعمال کیئے ہیں مگر گندی طبائع والے اِنسان پھر بھی اعتراض سے باز نہیں آتے +

آیت زیر بحث میں کیسے پاک الفاظ میں مرد اور عورت کے تعلّقات کا ذکر کیا ہے کہ عورت بمنزلہ کھیتی کے ہے۔ گویا مرد اور عورت کے تعلّقات کا حقیقی مقصود نسل اِنسانی کا بڑھنا اور نشوونُما ہے۔ تو چُونکہ ایّام حیض میں علاوہ بیماری اور ضرر کے اندیشہ کے یہ حقیقی مقصود بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسلیئے آیت ماقبل میں جو ایّام حیض میں عورتوں کے قریب جانے سے منع کیا تھا۔ کہ وہ ایک دُکھ اور ضرر کی بات ہے۔ اسی کی ایک دوسری وجہ بیان فرمائی۔ کہ جب اصلی غرض نسل اِنسانی کی نشوونُما ہے۔ جس طرح کھیتی میں اصل غرض بیج کی نشوونُما ہے۔ تو اسلیئے ایّام حیض میں عورت کے قریب جانا دُرست نہیں ہے۔ ہاں ان ایّام کو چھوڑ کر جب چاہو اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔ اور اگر انیٰ کے معنی جس طرح بھی کریں تو بھی معنے یہی ہونگے۔ کہ جس طرح کھیتی میں اِنسان لغو طور پر نہیں جاتا۔ بلکہ ایک قانون اور قاعدہ کے ماتحت جاتا ہے۔ اِسی طرح مرد اور عورت کے تعلّقات بھی ایک قاعدہ کے ماتحت ہونے چاہئیں۔ اس پر درحقیقت اِن الفاظ میں اُن تمام بیہودہ باتوں کا دفعیہ ہے۔ جو عیسائی اور آریہ جن کی اپنی مُقدّس کتابوں کے اندر درحقیقت ایسی ناشائستہ باتیں پائی جاتی ہیں قرآن کریم پر بطور اعتراض پیش کرتے ہیں +

۲۲۴ ۳۲۶۔ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا

۲۲۷

زنا کے سوائے کسی اور سبب سے چھوڑ دیوے اُس سے زنا کرواتا ہے۔ اور جو کوئی اُس چھوڑی ہُوئی سے بیاہ کرے زنا کرتا ہے" (متی ۵ : ۳۱ - ۳۲) اِس بُنیاد پر جو کچھ عمارت عیسائی اقوام نے قانون طلاق کی بنائی تھی آج اُسے زمانہ نے پاش پاش کر کے دکھا دیا۔ کہ حضرت مسیح کی یہ تعلیم ایک خاص قوم کی افراط کے بالمقابل اور مختص القوم اور مختص الزّمان تھی۔ اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ یہ لوگ ایک طرف تو مسیح کو خدا ٹھیرا تے ہیں اور دوسری طرف اس کے الفاظ کو ردّی میں پھینک کر اُنھیں نا قابلِ عمل قرار دیتے ہیں۔ بھلا انسان کی دی ہُوئی تعلیم تو حالات زمانہ سے قابل تبدیل ہو جائے تو ہو جائے پر خُدا نے خود جو تعلیم آکر دی اُس کا کیا حشر ہُوا۔ کہ آج ایک بھی عیسائی رُوئے زمین پر اس پر عامل نہیں پایا جاتا۔ غرض طلاق کے مُعاملہ میں اگر یہودیوں اور عربوں میں افراط ہے۔ تو عیسائیوں اور ہندوؤں میں تفریط موجُود ہے۔ مگر اسلام نے کیسی کامل اور درمیانی راہ بتائی جس کی صداقت کو زمانہ روز بروز خُود محسُوس کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک طرف اگر طلاق کی اجازت دی تو دوسری طرف بہت سی قیوُد اور شرائط کے ماتحت اُسے کر دیا۔ جن میں سے اکثر کا ذکر اِس رکُوع میں اور اگلے دو رکُوعوں میں آتا ہے۔ پھر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مُختصر الفاظ نے قرآن کریم کی اجازت کے اصل مطلب کو سمجھا دیا جب آپ نے فرمایا۔ ابغض الحلال الی اللّٰہ الطلاق۔ ان سب چیزوں میں سے جو حلال ہیں سب سے زیادہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے وہ طلاق ہے۔ ہاں بیشک اسلام نے ان وجوہ کو مخصوص اور مُعین نہیں کیا جن کی بنا پر طلاق دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اسلام کا قانون تو سب مُمالک اور سب زمانوں کے لیئے تھا۔ اور ہم دیکھتے ہیں۔ کہ عیسائی قومیں جو ایک ہی مذہب کی پیرو یکساں مُہذب ایک ہی درجہ تعلیم و ترقی پر۔ یکساں تمدّن اور معاشرت کے قوانین کی پیرو ہیں۔ اُن میں بھی کوئی دو قومیں اسباب پر مُتفق نہیں ہو سکیں کہ کون کونسی وہ وجُوہات ہیں جن پر طلاق دی جا سکتی ہے۔ پس اسلام نے ایک ایسی امن کی راہ اختیار کی ہے جو کوئی انسان اور پھر عرب کا ایک اُمّی آج سے تیرہ سو سال پیشتر تجویز نہ کر سکتا تھا۔ بلکہ اس قانون کی وسعت ہی خود اس بات پر گواہ ہے کہ یہ تعلیم منجانب اللہ ہے +

وہ پابندیاں جو قرآن کریم نے طلاق کے مُعاملہ میں ضرُوری قرار دی ہیں۔ اور جن کی غرض طلاق کی آزادی کو محدود کرنا ہے آگے درج ہیں +

۲۲۸

۲۳۰- والمطلقت یتربصن بانفسھن ثلثۃ قروٓء ۔ طلاق دی ہُوئی عورتیں تین قرء

۲۲۶
ہیں ۔جس کا اقتضاء یہ ہو کہ جس کام پر قسم کھائی گئی ہے ۔اس میں کسی قسم کی کوتاہی کرنی ہے ۔اسی لیئے عُرفِ شریعت میں ایلاء اُس قسم کو کہتے ہیں جو عورت کے حقوق کی ادائیگی میں کمی کرنے کے لیئے یعنی عورت کے قریب نہ جانے کے متعلق کھائی جاتی ہے ۔عرب میں یہ رواج تھا ۔کہ جب کوئی آدمی کسی عورت کو نہ چاہتا ۔اور یہ بھی پسند نہ کرتا کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح کرلے تو قسم کھا لیتا کہ میں اس کے قریب نہ جاؤنگا ۔اور اس طرح پر اسے چھوڑ دیتا نہ تو وہ دوسری جگہ نکاح کر سکتی تھی ۔ اور نہ ہی خاوند والی ہوتی ۔اور اس کی غرض صرف عورت کو دُکھ پہنچانا تھا ۔اِس لیئے طلاق کے مسائل میں سب سے پہلے اسی بد رسم کا علاج قرآن کریم نے فرمایا ۔یعنی اگر کوئی شخص ایسی قسم کھائے تو چار مہینے تک وہ انتظار کر سکتا ہے اگر چار مہینے کے اندر اندر رجُوع کرے تو کرلے ورنہ اس میعاد کے بعد طلاق دینا ضروری ہوگا ۔گویا ایلاء کی وجہ سے چار ماہ سے زائد عورت کو اس مُعلق حالت میں نہیں رکھا جا سکتا +

۲۲۷
۳۲۹ ۔ وان عزموا الطلاق فان اللہ سمیع علیم ۔ اگر ایلاء کے بعد طلاق کا پُختہ ارادہ کرلیں تو اللہ سُننے والا جاننے والا ہے ۔یہاں سے طلاق کا مضمُون شرُوع ہوتا ہے اور علاوہ اِس سُورت کے سُورت النساء میں اور پھر سُورت الطلاق میں بھی طلاق کے مُتعلقہ مسائل کا ذکر ہے ۔ طلاق کے اصل معنے صرف کھول دینے یا کسی قسم کی بندش سے آزاد کر دینے کے ہیں ۔ اور اِسلیئے قیدِ نکاح سے آزاد کرنے پر طلاق کا لفظ بولا جاتا ہے طلاق کے مُتعلق جیسے اسلام میں اس کی اجازت ہے بہت غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں ۔حالانکہ جو وسط کی راہ اسلام نے طلاق کے مسئلہ میں اختیار کی ہے ۔ وہ ایسی راہ ہے ۔کہ آج اس پر خود عقلمندوں کا اِتفاق ہوتا جاتا ہے ۔عربوں میں طلاق کے مُتعلق بہت آزادی تھی ۔ یہاں تک کہ عورت کی کوئی منزلت نہ سمجھی جاتی تھی ۔اور نہ ہی قیدِ نکاح کو کچھ وقعت دی جاتی تھی جب چاہا طلاق دیدی اور جب چاہا واپس لیلیا ۔یہُودیوں کی شریعت میں بھی نسبتاً طلاق میں زیادہ آزادی تھی ۔ بالمقابل بعض اقوام مثلاً ہندوؤں میں نکاح کو ایک ایسی رسم مانا گیا ہے ۔کہ اس کا فسخ ہونا ناممکن قرار دیا ہے ۔اِسی طرح عیسائی مذہب کی جو بُنیادی اینٹ طلاق کے مسئلہ میں ہے ۔ وہ ایسا تنگ قانوُن ہے کہ خود عیسائی اقوام کو اُسے ترک کرنا پڑا ۔چنانچہ عیسائیت کا یہ قانون جس میں معلوم ہوتا ہے ۔کہ ایک خاص وقت کے لیئے صرف یہودیوں کی افراط کی اِصلاح مدِ نظر تھی ۔اور یہ کوئی عام قانون نہ تھا جو ہمیشہ کیلئے کام آنیوالا ہوتا ۔ ذیل کے اِلفاظ میں اقوال مسیح میں درج ہے "۔ یہ بھی کہا گیا کہ جو کوئی اپنی جورُو کو چھوڑ دے اُسے طلاق نامہ لکھ دے ۔پر میں تمہیں کہتا ہوں ۔کہ جو کوئی اپنی جورُو کو

کیا وہ کتاب جو عورت کے حقوق کو قائم کرنے میں ایک ہی مذہبی کتاب دنیا کی ہے اس الزام کے نیچے آسکتی ہے۔ کہ اس نے عورت کے درجہ کو کم کیا +

۳۳۳- الطلاق مرتٰن - طلاق دو مرتبہ ہے - یہ طلاق کے متعلق تیسرا حکم ہے۔ الطلاق میں اشارہ اِس طلاق کی طرف ہے۔ جس کا ذکر آیت ماقبل میں ہے۔ جس کے متعلق فرمایا تھا۔ وبعولتھن احق بردھن فی ذٰلک ان ارادوا اصلاحا ۔ کہ طلاق کے بعد عدت کے اندر خاوند کی طرف عورت لوٹائی جاسکتی ہے۔ تو ایسی طلاق مطابق تشریح قرآن کریم دو مرتبہ ہوسکتی ہے یعنی ایک شخص عورت کو طلاق دے۔ اور پھر عدت کے اندر رجوع کرلے۔ پھر کسی وقت وہ طلاق دے تو پھر رجُوع کرلے۔ دو مرتبہ ایسی طلاق دی جاسکتی ہے۔ یہ بھی درحقیقت طلاق کو کم کرنے کا ایک ذریعہ ہے +

۳۳۴- فامساک بمعروف او تسریح باحسان -: پھر نیکی کے ساتھ روک رکھنا یا احسان کے ساتھ رُخصت کردینا ہے۔ یہ چوتھا حکم مسئلہ طلاق سے متعلق ہے۔ عرب میں یہ رواج تھا۔ کہ ایک آدمی چاہتا تو ہزار مرتبہ ایک عورت کو طلاق دیتا اور ہر مرتبہ عدت کے اندر رجُوع کرلیتا۔ اِس طرح پر عورتوں کو سخت تکلیف دی جاتی تھی اور طلاق کو محض ایک دُکھ دینے کا ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔ اسلام نے مرد کی اس آزادی پر یہ حدبندی کردی۔ کہ دو دفعہ طلاق دے کر تو عدت کے اندر رجُوع ہوسکتا ہے لیکن اس کے بعد اگر تیسری مرتبہ طلاق دیدی جائے۔ تو پھر یہ حق باقی نہیں رہتا۔ اور وہ طلاق قطعی ہوتی ہے۔ فامساک بمعروف سے یہ مُراد ہے۔ کہ دوسری طلاق کے بعد اگر عدت کے اندر رجوع کرلیا ہے تو اب نیکی کے ساتھ عورت کو اپنے گھر بسائے۔ یا اگر اسے پھر طلاق دیتا ہے یعنی تیسری مرتبہ طلاق دیدیتا ہے تو پھر تسریح باحسان ہو یعنی احسان کے ساتھ اُسے رُخصت کردے۔ اب رُجُوع کوئی نہیں +

یہاں یہ بحث مُفسّرین نے کی ہے۔ کہ اگر ایک ہی وقت میں طلاق طلاق طلاق تین دفعہ کہدے تو آیا یہ تین طلاقوں کی قائمقام ہوگی یا نہیں۔ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ مگر جہاں تک الفاظ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے۔ اگر تین کی جگہ کوئی سو دفعہ بھی طلاق کا لفظ کہدے۔ تو اس کا اثر ایک دفعہ کہنے سے زائد نہیں ہوسکتا۔ جس طلاق سے متعلق الطلاق مرتٰن کے الفاظ آئے ہیں۔ وہ تو وہی طلاق ہے جس کے بعد رجوع ہوتا ہے۔ پس اگر ایک دفعہ طلاق کہکر اس کے بعد رجُوع نہیں کیا۔ تو اس لفظ کے تین دفعہ کہدینے سے رجُوع کی شرط پُوری نہیں ہوجاتی۔ اِس لیئے تین دفعہ ایک لفظ کو دوہرا دینے سے اس کا وہی اثر رہیگا جو ایک دفعہ کہنے کا یُوں تو طلاق ایک دفعہ کہدینے سے بھی ہوجاتی ہے

تک انتظار کریں ۔ قرء کے معنے بعض کے نزدیک زمانہ طُہر ہے ۔ اور بعض کے نزدیک ایّام حیض ۔ اور چُونکہ عموماً حیض کے ایّام ماہواری ہوتے ہیں ۔ اِس لیئے یہ قریباً تین ماہ کا زمانہ ہوتا ہے ۔ یہ زمانۂ انتظار عدت کے نام سے موسُوم ہے ۔ لیکن اگر محض رسم نکاح ادا ہوئی ہے ۔ اور میاں بیوی میں خلوت صحیحہ نہیں ہوئی تو اس صُورت میں جیسا کہ الاحزاب : ۴۹ سے ظاہر ہے ۔ کوئی عدت نہیں ۔ اور حاملہ عورت کی عدّت مُطلقہ ہو یا بیوہ وضع حمل تک ہے پس عدّت کا ملحُوظ رکھنا طلاق کے احکام میں سے پہلا حکم ہے ۔ اور اس کا منشاء درحقیقت یہ معلوم ہوتا ہے ۔ کہ اس زمانۂ اِنتظار میں ممکن ہے کوئی اصلاح ہو جائے ۔ جس کی طرف آگے چلکر توجہ بھی دلائی ہے ۔ گو عدّت کی اہم غرض یہ بھی ہے ۔ کہ اگر عورت پہلے خاوند سے حاملہ ہو تو اس میعاد میں اس کا اظہار ہو جائے ۔ جیسا کہ فرمایا ۔ ولا یحل لھن ان یکتمن ما خلق اللہ فی ارحامھن +

۲۳۱ ۔ و بعولتھن احق بردھن فی ذٰلک ان ارادوا اصلاحا ۔ یہ دوسرا حُکم ہے ۔ کہ اِس میعاد اِنتظار میں جسے عدّت کہتے ہیں ۔ اُن کے خاوند زیادہ حقدار ہیں ۔ کہ وہ ان کی طرف لوٹائے جائیں ۔ اگر وہ یعنی دونوں فریق اصلاح چاہتے ہوں ۔ اس میں درحقیقت ہر ایک قسم کی جلد بازی کا جو طلاق کے مُعاملہ میں اختیار کی جا سکتی ہے علاج مُتصور ہے ۔ تین ماہ کے عرصہ میں اِنسان کو خوُب غور و فکر کا موقعہ مل سکتا ہے ۔ اور علیحدگی کی وجہ سے عارضی رنجشیں دُور ہو کر انسان ٹھنڈے دِل سے ایک مُعاملہ پر غور کر سکتا ہے ۔ اور اگر میاں بیوی میں حقیقی محبّت بھی ہے ۔ تو محبّت کی وہ چنگاری یقیناً تمام عارضی رنجشوں کو بُھلا کر پھر اصلی تعلق کو قائم کر دیگی +

۲۳۲ ۔ ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف ۔ اور ان کے بھی حقُوق ہیں دستُور کے مُطابق مثل ان حقُوق کے جو اُن کے اُوپر ( مردوں کو ) حاصل ہیں ۔ اس میں مردوں کو اس طرف توجہ دلائی ہے ۔ کہ اگر تم بوجہ نکاح کے اپنے بعض حقُوق عورتوں پر سمجھتے ہو ۔ تو یاد رکھو کہ ویسے ہی حقُوق اُن کے بھی تم پر ہیں ۔ یہ بھی درحقیقت طلاق کے ناجائز استعمال کو روکنے کے لیئے فرمایا ۔ کہ ان کو ایسا مت خیال کرو کہ گویا ان کے تُم پر کوئی حقُوق ہی نہیں بلکہ جیسے تمہارے حقُوق اُن پر ہیں ویسے ہی اُن کے حقُوق تم پر ہیں ۔ اِس چھوٹے سے فقرہ نے مُلک عرب کے اندر عورت کے لیئے ایک ایسی منزلت پیدا کر دی جو اس سے پہلے حاصل نہ تھی ۔ بلکہ عرب سے گُذر کر دُنیا کے اندر اُسے ایک ایسا مرتبہ دیا جو پہلے کسی مذہبی کتاب نے نہ دیا تھا ۔ تعجّب ہے ان لوگوں پر جو کہتے ہیں کہ اسلام نے عورت کی منزلت کو کم کیا ۔

۲۲۹ اس سے دریافت کیا۔ کہ کیا تم اس کا باغیچہ جو مہر میں دیا تھا واپس دیدوگی۔ اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ تو آپ نے قیس کو حکم دیا۔ کہ طلاق دیدو۔ افسوس ہے کہ ہندوستان میں عورت کے طلاق حاصل کرنیکے اختیار کو ایسا محدود کیا گیا ہے۔ کہ وہ قریباً معدوم ہے +

۲۳۰ ۲۳۷ - فان طلقها فلا تحل لہ من بعد حتی تنکح زوجاً غیرہٗ - سو اگر وہ اُسے طلاق دیدے تو تو اس کے بعد وہ اس کے لئے حلال نہیں جب تک کہ اس کے سوائے کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے۔ یہ احکام طلاق میں سے ساتواں حکم ہے۔ تیسری مرتبہ جب طلاق دیدی جائے تو اس صورت میں پھر وہ دونوں ایکدوسرے سے نکاح نہیں کرسکتے۔ سوائے ایک صورت کے کہ عورت نے کسی دوسری جگہ شادی کرلی ہو۔ اور اس شادی کے بعد اس دوسرے خاوند نے اسے طلاق دی ہو۔ تیسری طلاق کے بعد اس مشکل کو اسلئے ڈالا۔ کہ تا اس قطعی طلاق میں جلد بازی سے کوئی جُرات نہ کر بیٹھے۔ بلکہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ حلالہ کا نہ صرف قرآن کریم میں کوئی ذکر تک نہیں بلکہ یہ آیت حلالہ کو ناجائز ٹھیراتی ہے۔ کیونکہ اس آیت کا منشاء تو یہ ہے کہ ایک خاوند نے اپنی بی بی کو دو مرتبہ طلاق دے کر عدت کے اندر رجوع یا عدّت کے بعد نکاح ثانی کرلیا ہو تو تیسری مرتبہ طلاق کے بعد رجوع یا نکاح ثانی کا حق نہیں رہتا۔ ہاں صرف ایک ہی صورت ہے۔ کہ کسی دوسری جگہ عورت شادی کرلے۔ پھر وہ خاوند بھی اسے طلاق دیدے۔ اب ظاہر ہے۔ کہ اسلام میں نکاح ایک رات کیلئے یا ایک مُقررہ میعاد کے لئے حرام ہے۔ نکاح تو وہی ہوگا۔ جس میں فریقین کی نیت موت تک ایکدوسرے کو زوجیت میں رکھنے کی ہو۔ ایسے نکاح کے بعد طلاق ہو۔ تو اس صورت میں پھر پہلے خاوند سے نکاح ہوسکتا ہے۔ اور یہ ایک بہت مشکل امر ہے۔ حلالہ یا ایک رات کا نکاح اسلام جائز نہیں رکھتا۔ بلکہ مشکوٰۃ میں ابن ماجہ کی حدیث موجود ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ نے حلالہ کرنے کرانے والوں پر لعنت کی ہے۔ کیونکہ یہ بدرسم اسلام سے پہلے بھی تھی۔ اور آیت اور حدیث دونوں نے اسے باطل ٹھیرایا ہے +

۲۳۱ ۲۳۸ - ولا تمسکوھن ضراراً - ان کو دُکھ دینے کے لئے نہ روکو۔ یہ آٹھواں حکم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خاوند عورت کو دُکھ دینے کے لئے روکے تو قاضی یا مجسٹریٹ طلاق دلا سکتا ہے۔ مگر آج ہندوستان میں اس صریح حکم قرآن کے خلاف عورتوں کو دُکھ دینے کے لیئے روکا جاتا ہے۔ نہ ان کے حقوق زوجیت ادا کیئے جاتے ہیں۔ اور نہ ان کو طلاق دیجاتی ہے۔ قرآن کریم کے قوانین کی پابندی مسلمانوں میں محض برائے نام رہگئی ہے +

رکوع ۳۰ / ۱۴ ۲۳۲ ۲۳۹ - فلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن اذا تراضوا بینھم بالمعروف - پھر

لہٰذا اگر کوئی بیس دفعہ اس لفظ کو کہدے تو بھی طلاق ہو جاتی ہے۔ مگر تین دفعہ یا بیس دفعہ کہنے سے الطلاق مرتان کا مفہوم پورا نہیں ہوتا +

۳۳۵- ولا یحل لکم ان تاخذوا مما اٰتیتموھن شیئًا - اور تمہارے لیئے جائز نہیں کہ جو کچھ تم اُن کو دے چکے ہو اُس میں سے کچھ بھی واپس لو - یہ پانچواں حکم طلاق کے متعلق ہے مما اٰتیتموھن سے مراد مہر ہے۔ کیونکہ مہر ہمارے اس زمانہ کی طرح ایک فرضی رقم نہ تھی - بلکہ اصطلاح قرآنی میں مہر عورت کو دیدیا جاتا تھا - اِسلیئے اس کو ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ کہ جو کچھ تم ان کو دے چکے ہو - پس جب خاوند بی بی کو طلاق دے تو وہ اس مہر سے جو وہ اسے ادا کر چکا ہے - ایک پیسہ واپس نہیں لے سکتا - یا اگر مہر ادا نہیں ہؤا تو سارا مہر اسکو دینا چاہئیے یہ بھی طلاق کی آزادی پر ایک بڑی بھاری روک ہے - کیونکہ عموماً مہر کی رقم اس قدر ہوتی ہے - کہ خاوند کو بلا وجہ طلاق دینے میں مانع ہوتی ہے - ہاں مہر کا کوئی حصہ خاوند کو ایک صورت میں دیا جا سکتا ہے - الا ان یخافا الا یقیما حدود اللہ - اس کا ذکر اگلے نوٹ میں ہے +

۳۳۶- فان خفتم الا یقیما حدود اللہ فلا جناح علیھما فیما افتدت بہٖ - پھر اگر تم کو خوف ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکتے - تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اگر عورت آزادی حاصل کرنے کے لیئے کچھ بدلہ دیدے - یہ طلاق کے متعلق چھٹا حکم ہے - اور اس میں عورت کو طلاق حاصل کرنے کی اجازت دیگئی ہے - جس کو اصطلاح شرعی میں **خلع** کہتے ہیں - یہاں جو الفاظ آئے ہیں - کہ اگر تم کو خوف ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکتے - ان کی وضاحت سُورت النساء سے ہوتی ہے - جہاں ایسی صورتوں میں جہاں باہم رنجش ہے - صلاح یا طلاق کے لیئے ایک قاعدہ بنایا ہے - کہ ایک حَکم اس کے اہل سے اور ایک حَکم اس کے اہل سے ہو - اور وہ دونوں اوّل صلاح کی کوشش کریں - اور اگر اصلاح نہ ہو تو طلاق دلوادیں - یا یہاں حکّام مُراد ہیں - کیونکہ عورت بذریعہ عدالت خلع کرا سکتی ہے پس اگر حُکّام دیکھتے ہیں کہ باہم موافقت کی کوئی صُورت نہیں تو اگر عورت طلاق حاصل کرنا چاہتی ہے اور مرد اسے طلاق دینا نہیں چاہتا - تو عورت اپنا مہر یا اس کا کوئی جزو دے کر خلع کرا سکتی ہے - اور اس طرح پر عورت کو اسیطرح طلاق حاصل کرنے کا اختیار ہے جس طرح مرد کو طلاق دینے کا اختیار ہے - چنانچہ صحیح حدیثوں میں جمیلہ بنت عبد اللہ بن ابی اور اس کے خاوند ثابت بن قیس بن شماس کا ذکر موجود ہے - جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت اسیطرح طلاق حاصل کر سکتی ہے جس طرح مرد طلاق دے سکتا ہے - جمیلہ طلاق چاہتی تھی اور ثابت اسے طلاق دینا نہ چاہتا تھا - جمیلہ نے رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر طلاق چاہی - آپ نے

۲۳۳
مدّتِ حمل چھ ماہ ہے - اور دودھ پلانیکے دو سال ملا کر کُل میعاد دونونکی اڑھائی سال ہوگئی - اور دوسری وجہ یہ ہے - کہ وہاں ماں کی تکلیف کا ذکر ہے - جو وہ بچّہ کے اُٹھانے کے ایام میں محسُوس کرتی ہے - تو چُونکہ بچّہ کا بوجھ تین ماہ کے بعد ہی ہوتا ہے - اس طرح پر بھی نو ماہ مدت حمل میں سے یہ تین ماہ نکال دیئے جائیں تو حمل کی تکلیف کے اصل چھ مہینے ہی رہ جاتے ہیں - اور اس طرح پر بھی حمل اور دودھ پلانے کی میعاد اڑھائی سال ہی ہوئی +

۲۳۴
۳۴۱ - والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجاً یتربصن بانفسھن اربعۃ اشھر و عشراً - اور جن کو تم میں سے مَوت دیجاتی ہے - اور وہ بیبیاں پیچھے چھوڑتے ہیں - تو یہ بیبیاں چار مہینے دس دن تک انتظار کریں - اس آیت میں اب بیوہ عورتوں کے متعلق احکام کا ذکر فرمایا - اور یہ گویا اصل مضمون کی طرف رجُوع ہے - بیوہ عورت کی عدّت جب وہ حاملہ نہ ہو چار ماہ دس دن ہے - اور اس کے اندر نہ نکاح ہوسکتا ہے - نہ نکاح کے متعلق بات چیت پُختہ طور پر ہوسکتی ہے - ہاں جیسا کہ اگلی آیت سے معلوم ہوتا ہے اشارہ کنایہ کے طور پر ذکر کر دینا جائز ہے - اور اس جگہ یہ بھی فرمایا کہ بیوہ عورت جب عدّت گذرنے کے بعد اپنے نکاح کے لیئے کوئی امر کرے تو اُنہیں روکنا نہیں چاہیئے مسلمانوں کی بعض قوموں نے بیواؤں کے نکاح نہ کرنے کی رسم میں ہندوؤں کا تتبع کیا ہے +

رکوع ۳۱/۱۵
۲۳۶
۳۴۲ - لا جناح علیکم ان طلقتم النساء مالم تمسوھن او تفرضوا لھن فریضۃ - یہ طلاق کے احکام میں سے دسواں حکم ہے - اور یہ ایسی حالت کے متعلق ہے - جب نہ تو مہر ہی مُقرّر ہوا ہو اور نہ ہی زناشوئی کا تعلق پیدا ہوا ہو - سو ایسی صُورت میں طلاق جائز ہے - مگر چُونکہ مہر مُقرّر نہیں ہُوا - اِس لیئے خاوندوں کو حُکم ہے - ومتعوھن - یعنی ایسی صُورت میں کچُھ نہ کچُھ متاع یعنی سامان ایسی مُطلقہ بی بی کو بھی دیدیں - یہ احسان اور نیکی کی انتہا سکھائی ہے - کہ گو حق تو اس کا کوئی قائم نہیں ہُوا - مگر پھر بھی بطور احسان اُنہیں کچھ نہ کچھ دینا ضرُوری ہے - علی الموسع قدرہ و علی المقتر قدرہ - یہاں تک کہ جو شخص تنگدست ہے - وہ بھی ضرور کچھ نہ کچھ دے - اور وسعت والا اپنے حالات کے مطابق وسعت سے دے - اس میں انفاق فی سبیل اللہ کا ایک عظیم الشان سبق ہے - کیونکہ جب ایک ایسی عورت کیلئے بھی جس سے نہ کوئی تعلق پیدا ہوا نہ آئندہ پیدا ہونا ہے خرچ کرنے کا حکم ہے تو پھر کس قدر ضرُورت ہے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی جس کے لیئے تنگدستی کوئی عُذر نہیں +

۲۳۷
۳۴۳ - فنصف ما فرضتم الا ان یعفون او یعفوا الذی بیدہ عقدۃ النکاح - جس صُورت میں مہر مُقرّر ہو چُکا ہو مگر میاں بی بی اکٹھے نہ ہُوئے ہوں تو طلاق کی صُورت میں نصف مہر

آیت ۲۳۲

عورتوں کو اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے شادی کر لیں۔ جب دستور کے
مطابق آپس میں رضامند ہوں۔ یہ نواں حکم ہے۔ اس حکم کا تعلق درحقیقت آیت ع۲۲۸
سے ہے جو پچھلے سے پچھلے رکوع کی آخری آیت ہے۔ پچھلے رکوع میں ایک اور قسم کے
مسائل کا ذکر کر کے اب یہاں یہ بیان فرمایا ہے۔ کہ اس طلاق میں جس کے بعد وبعولتھن
احق بردھن فی ذلك میں یہ ارشاد ہے۔ کہ عدت کے اندر خاوند رجوع کر سکتا ہے۔ اور
یہ صرف دو طلاقوں تک ہوتا ہے۔ ایسی طلاق میں اگر عدت گذر جائے۔ اور عدت کے
اندر رجوع نہ کیا ہو تو پھر بھی اگر دونوں فریق آپس میں رضامند ہوں تو وہ نکاح کر سکتے
ہیں۔ اور ان کو روکنے کا اختیار نہیں۔ گویا ایک مرتبہ طلاق کے بعد عدت کے اندر رجوع
اور رجوع نہ کیا ہو تو عدت کے بعد نکاح اسی خاوند سے ہو سکتا ہے۔ پھر ایسی ایک طلاق کے
واقع ہونے کے بعد جس میں عدت کے اندر رجوع یا عدت کے بعد نکاح ہو چکا ہو دوسری مرتبہ
طلاق دے تو پھر بھی عدت کے اندر رجوع اور عدت کے اندر رجوع نہ کیا ہو تو عدت کے گذرنے کے
بعد نکاح ہو سکتا ہے۔ رجوع آیت ع۲۲۸ سے ثابت ہے۔ اور نکاح بعد گذرنے عدت کے
اس آیت سے ثابت ہے۔ ہاں تیسری طلاق کے بعد رجوع اور نکاح نہیں۔ جیسا کہ آیت ع۲۲۹
سے ثابت ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں اسی آیت کے ماتحت معقل بن یسار کا واقعہ موجود ہے
کہ اس نے اپنی بہن کی شادی جمیل بن عبداللہ سے کر دی۔ پھر جمیل نے اپنی بی بی کو
طلاق دیدی۔ تو جب عدت گذر چکی تو جمیل نادم ہوا۔ اور دوبارہ اپنے ساتھ اپنی مطلقہ
بی بی سے نکاح کی درخواست کی۔ وہ بی بی تو راضی ہو گئی۔ مگر معقل نے اسے روکا اور کہا
کہ اس نے تم کو طلاق دی۔ اور اب پھر تم اس سے نکاح کا ارادہ کرتی ہو۔ جب یہ آیت
نازل ہوئی۔ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے معقل کو بلا کر اسے یہ آیت سنائی تو
معقل نے کہا میں ذلیل ہو کر بھی خدا کے حکم پر راضی ہوتا ہوں۔ اور اس نے اپنی ہمشیرہ
کا نکاح جمیل سے کر دیا۔ اس سے صاف معلوم ہوا۔ کہ جس طلاق کے بعد عدت کے اندر
رجوع جائز ہے۔ اس کے بعد عدت کے گذرنے پر نکاح بھی جائز ہے +

آیت ۲۳۳

۲۴۰۔ والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعۃ
چونکہ طلاق کے مسائل میں اولاد کو دودھ پلانے کا سوال بالخصوص اٹھتا ہے۔ اسلئے اس کا
تصفیہ بھی یہیں فرمایا۔ اور دودھ پلانے کی پوری مدت دو سال فرمائی۔ دوسری جگہ قرآن
کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وحملہ و فصالہ ثلثون شھرا۔ جس میں حمل اور
دودھ چھڑانے کی میعاد اڑھائی سال قرار دی ہے۔ سو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے۔ کہ ادنے

۲۴۵ - فان خفتم فرجالا او رکبانا - حالت خوف میں جب ایک جگہ ٹھیر کر نماز پڑھنے کا موقعہ ہو تو چلتے ہوئے یا سواری کی حالت میں ہی نماز پڑھ لے - یا اگر خوف ہو کہ نماز فوت ہو جائیگی - اور اسے کھڑے ہو کر پڑھنے کا موقعہ نہ ہو جیسے ریل یا کشتی کی سواری میں تو اسی حالت میں نماز ادا کرلے - ایک مسلمان کے لیئے نماز کی پابندی کس قدر ضروری ہے - اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے مگر اس زمانہ کے بیہودہ اشغال اور گپ بازیوں میں گھنٹوں تباہ کردیں گے نماز کے لیئے وقت نہیں ملتا ✦ ۲۳۸ ۲۴۰

۲۴۶ - والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجاً وصیۃ لازواجھم متاعاً الی الحول غیر اخراج فان خرجن فلا جناح علیکم فی ما فعلن فی انفسھن من معروف - جن لوگوں کو تم میں سے وفات دی جائے اور وہ بیبیاں چھوڑیں - وصیت ہو اُن کی بیبیوں کے لئے سامان کی ایک سال کے لیئے بغیر نکالنے کے گھروں سے - تو ایسی صُورت میں اگر وہ خُود نکل جائیں تو اسبات میں جو وہ دستوُر کے مطابق اپنے حق میں کریں تُم پر کوئی گُناہ نہیں - اِس آیت کو منسُوخ کہا جاتا ہے - اور اس کی ناسخ ایک تو آیت ۲۳۴ کو قرار دیا جاتا ہے جسمیں بیوہ کے لیئے چار ماہ دس دن کی عدّت مُقرر کی گئی ہے - اور دوسری سُورت النّساء کی آیت توریث کو جو خاوند کی وفات پر بیوی کے لیئے ترکہ کا ایک حصّہ مُقرر کرتی ہے - گویا یُوں سمجھ لیا گیا ہے - کہ اس آیت میں ایک تو بیوہ کی عدت ایک سال مُقرر کی گئی ہے - اور پھر اس ایک سال کو چار ماہ دس یوم سے منسُوخ سمجھا گیا - اور دوسرے گویا اس آیت میں بیوہ کا حصہ صرف ایک سال کا سامان اور گھر میں رہنے دینا مُقرر کیا گیا ہے - اور پھر اس کو چوتھے یا آٹھویں حصّہ سے منسُوخ قرار دیا گیا - حالانکہ یہ دونو باتیں دُرست نہیں - اور ان کے درست نہ ہونے کا خود ہی ثبُوت ہے کہ اس آیت میں فان خرجن فلا جناح علیکم فی ما فعلن فی انفسھن من معروف کہکر یہ بتا دیا ہے - کہ اگر وہ ایک سال پُورا نہ کریں - اور عدت کے گذرنے کے بعد نکاح کرلیں تو تمہارے لیئے ضروری نہیں - کہ انہیں ایک سال تک متاع اور مکان رہائش کے لیئے دو - اس سے صاف معلوم ہوتا ہے - کہ عدّت کوئی علیحدہ چیز ہے جو پہلے مُقرر ہو چکی ہے - اس عدّت کے گذرنے پر عورت مجبُور نہیں کہ ایک سال تک رہے - نہ خاوند کے ورثا مجبُور ہیں - کہ اسے ایک سال تک متاع اور مکان دیں بشرطیکہ وہ عدّت کے گذُرنے پر نکاح کرلے - پس جو کچھ اس آیت کے معنے خیال کرکے اس کو منسُوخ قرار دیا جاتا ہے - وہ اس کے معنے نہیں - اور اُسکی شہادت خود آیت کے اندر موجود ہے - اصل بات صرف اس قدر ہے - کہ اس آیت میں خاوند کو وصیّت کرنے کا اختیار دیا گیا ہے - کہ وہ اپنی بیوی کے لیئے یہ وصیّت کر جائے - کہ ایک سال تک اسے خورونوش کا سامان اور رہنے کے لیئے مکان دیا جائیگا - اور یہ علاوہ اس کے حصّہ ترکہ کے ہے - جیسا کہ

آیت ۲۳۷

مُقرّرہ دینا ضروری ہے۔ ہاں اگر عورت مُعاف کر دے۔ اور نہ لے تو جائز ہے۔ یا مرد اگر سارا دے چکا ہے۔ اور نصف جو اس کو اس آیت کی رُو سے لینے کا حق ہے نہ لے تو بھی جائز ہے۔ بیدہٖ عقدۃ النکاح کے بہت سے معنے کئے گئے ہیں۔ مگر صحیح یہی ہے کہ چُونکہ نکاح کا عقدہ خاوند کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور طلاق بھی وہی دیتا ہے۔ اسلیئے مُراد خاوند ہی ہے۔ پھر اس کے بعد فرمایا۔ وان تعفوا اقرب للتقوی۔ اگر اے مردو تُم معاف کرو تو یہ تقوے سے زیادہ قریب ہے۔ یعنی اجازت تو دونوں طرف ہے۔ مگر تحریص مرد کو ہی دلائی ہے۔ کہ اس پر زیادہ حق ہے۔ کہ وہ معاف کرے۔ اِسی لیئے اس کے بعد فرمایا۔ ولا تنسوا الفضل بینکم۔ یعنی مردوں کو عورتوں پر فضیلت بھی تو حاصل ہے۔ پس اُسے بُھلانا نہیں چاہیئے +

آیت ۲۳۸

۳۴۴- حافظوا علے الصلوٰت والصلوۃ الوسطیٰ۔ طلاق کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے نماز کا ذکر اور اس کی محافظت کی تاکید شاید بعض لوگوں کو بے ربط معلوم ہو۔ اِس لیئے یہ بتا دینا ضروری ہے۔ کہ اس ذکر کے کئی وجُوہات ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اصل میں مسائل جنگ کا ذکر تھا۔ اور طلاق اور بیوہ عورتوں کے مسائل کو بھی چونکہ جنگ کے مضمون سے خاص تعلق تھا دیکھو نوٹ ۳۲۳ اور نماز کے احکام کا جنگ کے اندر بیان کرنا بھی ضروری تھا۔ جیسا کہ اس سے اگلی آیت میں الفاظ فان خفتم فرجالا او رکبانا میں صاف اشارہ ہے۔ تو اِس تعلق کے لحاظ سے نماز کا ذکر کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ طلاق کے مسائل میں بار بار تقوے کی ہدایت کی ہے کیونکہ صرف مُتقی اِنسان ہی ایسے مسائل میں احتیاط سے کام لے سکتا ہے۔ اور نماز چونکہ درحقیقت تقوی اللہ کی کُنجی ہے اسلیئے کامل تقوے سکھانے کو نماز کا ذکر فرما دیا۔ تیسری بات یہ ہے کہ طلاق نکاح وغیرہ کے مسائل تو سب فرُوعی مسائل ہیں۔ اور اصل جڑ تو نیکیوں کی نماز ہی ہے اور اسلام کو ایک مُسلم کے لیئے رُوحانی غذا کا اس سے بڑھ کر فکر ہے جتنا دنیا دار کو جِسمانی غذا کا۔ اِسلیئے بھی بظاہر ایک بے تعلق مُعاملہ میں نماز کا ذکر کر کے یہ بتا دیا کہ درحقیقت اوّل تو یہ نماز ہی ہے۔ اور سچ یہی ہے۔ کہ نماز چُونکہ اصل بُنیادی مسئلہ قرآن شریف کا ہے۔ جیسا کہ یؤمنون بالغیب سے دوسرے نمبر پر یقیمون الصلوۃ کو رکھ کر بتا دیا۔ اِسلیئے نماز کا ذکر کسی موقعہ پر بھی بے ربط نہیں۔ بلکہ یہ اصل مضمون ہے۔ جس کی طرف جب چاہے رجوع کرے +

صلوۃ الوسطیٰ کے متعلق بہت بحث ہوئی ہے بُخاری نے تو اسے عصر ہی سمجھا ہے۔ مگر بعض نے اسے ظُہر کسی نے شام۔ کسی نے عشاء کسی نے فجر۔ کسی نے پچھلی رات کی نماز۔ کسی نے چاشت کی نماز۔ کسی نے نماز جمعہ مُراد لیا ہے۔ حتےٰ کہ سترہ مختلف توجیہیں اِس لفظ کی کی گئی ہیں چونکہ اوسط کا لفظ بہترین پر بولا جاتا ہے۔ اس لیئے وسطیٰ سے مُراد بہترین نماز بھی لی جا سکتی ہے +

جنھوں نے کسی مُلک سے خرُوج کیا۔ اب اگر تاریخ کو ہم تلاش کریں تو ایک ہی واقعہ ساری مقدس تاریخ میں خروج کا نظر آتا ہے۔ اور وہ واقعہ ایسا ہے کہ بغیر اس کی تفصیلات کا ذکر کرنے کے محض لفظ خروج کے کہدینے سے اس کا پتہ لگ جاتا ہے۔ یہ وہی واقعہ ہے جس کا ذکر حضرت موسےٰ کی کتاب خروج میں ہے۔ اور یہ بنی اسرائیل قوم کا خرُوج ہے۔ جو مُلک مصر سے ہُوا۔ لفظ خروج سے جو یہ شہادت ملتی ہے۔ اسی کی تائید دوسرے الفاظ اور آیات سے ہوتی ہے مثلاً اس واقعہ کے بعد جس واقعہ کا ذکر ہے وہ آیت ۲۴۶ع میں یعنی دو آیتوں کے بعد بالفاظ ذیل ہے۔ الم تر الی الملاء من بنی اسرائیل من بعد موسیٰ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلی آیت میں خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے اسرائیلیوں کا ذکر ہے۔ گویا پہلے حضرت موسیٰ کے زمانہ کا ذکر کیا پھر اسکے بعد کا۔ اسی طرح الوف کا لفظ بھی اسبات پر شاہد ہے۔ الوف یا تو لفظ الف کی جمع ہے اور تعداد کی طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ ہزاروں تھے۔ کیونکہ بنی اسرائیل چھ لاکھ کی تعداد میں بائبل کی رُو سے مصر کی زمین سے نکلے۔ اور یا الف کی جمع ہے جس کے معنے متالفون یعنی جماعت کے ہیں۔ اور بحثیت جماعت خروج کرنے والے اور جماعت کے نام سے موسُوم یہی قوم بنی اسرائیل ہی ہے۔ جیسا کہ بائیبل میں اُن کو بار بار کانگریگیشن یا جماعت کے نام سے پُکارا گیا ہے +

باقی قابل تشریح الفاظ میں سے ایک تو من دیارھم ہے۔ سو مصر چُونکہ اُن کا گھر ہو گیا تھا۔ اور چارسو سال سے وہ برابر وہاں رہتے تھے اسلئے دیارھم کا لفظ اس پر بولا ہے۔ دوسرا لفظ قابل تشریح حذر الموت ہے۔ سو یہ بھی سچ ہے۔ کہ وہ موت کے ڈر سے نکلے تھے۔ فرعون اُن کی قوم کو ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ جس پر خود قرآن کریم شاہد ہے واذ نجینٰکم من اٰل فرعون یسومونکم سوء العذاب یذبحون ابناءکم ویستحیون نساءکم +

تیسرا امر قابل تشریح فقال لھم اللہ موتوا ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ نے ان پر موت کا حُکم وارد کیا۔ یہ ان کی نافرمانی کی وجہ سے ہُوا۔ کیُونکہ جب حضرت موسےٰ نے اُن کو کہا کہ چلو فلاں قوم سے جنگ کرو تو انھوں نے جواب دیا۔ فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون۔ تُو اور تیرا رب جاکر جنگ کرو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ اس کی سزا یہ ملی۔ کہ حکم ہُوا چالیس سال تک اُس وعدہ کی سرزمین سے محرُوم کر دیئے گئے۔ اور اسی جنگل میں بھٹکتے ہوئے ہلاک ہو جائیں گے۔ یتیھون فی الارض۔ چنانچہ بائبل

آیت ۲۴۰

مُطلقہ عورت کے لیئے بھی حکم ہے۔ کہ اُن کے مہر اُن کو دو۔ اور کچھ سامان اس کے علاوہ بھی دو جیسا اِس سے اگلی آیت میں صاف طور پر مذکور ہے۔ وللمطلقت متاع بالمعروف یہ درحقیقت ایک احسان ہے۔ جو اسلام عورتوں کے ساتھ بہر حال کرتا ہے۔ عورت کو طلاق دو تو علاوہ مہر کے کچھ سلوک اور بھی کر دو۔ عورت بیوہ ہو تو علاوہ ترکہ کے حصّہ کے ایک سال کے لیئے کھانے پینے اور رہائش کا اِنتظام کر دیا جائے۔ تو یہ بھی درست ہے۔ اِسی طرح ایک سال کی میعاد عورت کی عدّت نہیں۔ بلکہ یہ اس کے سامان دیا جانے کی میعاد ہے۔ ہاں اسے خود اختیار ہے۔ کہ وہ اپنی عدّت پُوری کر کے نکاح کرلے۔ تو چونکہ اصل غرض تو اس کو فائدہ پُہنچانا تھا۔ اور وہ دوسرے نکاح سے اب اسے حاصل ہو گیا۔ اِس لیئے اس کی ضرورت باقی نہ رہی بُخاری میں اگرچہ ایک طرف منسُوخی کا قول بھی ہے۔ مگر دوسری طرف مجاہد کا قول اِنہی معنوں کی تائید میں یُوں بھی مذکُور ہے۔ کہ منسُوخ نہیں۔ جعل الله لها تمام السنة سبعة و عشرين ليلة وصية ان شاءت سكنت وان شاءت خرجت وهو قول الله تعالى غير اخراج فان خرجن فلا جناح عليكم +

یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے۔ کہ ایّام جاہلیّت میں لوگ ایسی وصیّت کیا کرتے تھے۔ تو عورت پر یہ ضروری ہوتا تھا۔ کہ وہ ایک سال تک نکاح نہ کر سکے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے چار ماہ دس دن عورت کی عدّت رکھ کر اس کے بعد ٹھیرنے کو یا نکاح کر لینے کو عورت کے اختیار میں چھوڑا ہے +

رکوع ۳۲/۱۶ ۲۴۳

۲۴۷- الم تر الى الذين خرجوا من ديارهم وهم الوف حذر الموت فقال لهم الله موتوا ثم احياهم- کیا تُم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے نکلے۔ اور وہ ہزاروں (یا ایک جماعت) تھے سو اللہ نے ان کو کہا۔ مر جاؤ۔ پھر اُن کو زندہ کیا۔ جیسا کہ بار بار بیان ہو چکا ہے۔ اصل مضمون جنگ کی ضرورت پر ہی چلتا ہے یہاں ایک مثال اُسی کی بیان فرمائی۔ اور اس سے اگلی آیت میں وقاتلوا فی سبیل الله کہ کر اس مضمون کی وضاحت کر دی۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ وہ کون قوم تھی جو اپنے گھروں سے نکلی۔ قرآن کریم کا قاعدہ ہے کہ جہاں کوئی واقعہ بڑا مشہور ہو تو اس کا ذکر ایسے الفاظ میں فرماتا ہے۔ کہ بعض وقت ایک ہی لفظ سے اس سارے واقعہ کا پتہ بتا دیتا ہے۔ گو اس واقعہ کی تفصیلات کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ یہاں بھی نہایت مختصر اور عام الفاظ میں ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اور الم تر سے شروع کر کے یہ بتا دیا ہے۔ کہ وہ کوئی واقعہ ہے۔ جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کیا ہر مخاطب کو معلوم ہے۔ یہاں وہ ایک لفظ خرجوا ہے۔ یعنی یہاں کسی قوم کا ذکر ہے۔

کل امرئی سوف یجزی قرضہ حسناً - او سیئا و مدینا کالذی دانا لغت والوں نے بھی یہ معنے لکھے ہیں - چنانچہ تاج العروس میں ہے العرب تقول لکل من فعل الیہ خیرا قد احسنت قرضی وقد اقرضتنی قرضاً حسناً - یعنی عرب کے لوگ ہر اُس شخص کو جو دوسرے کے لئے کوئی بھلائی کا کام کرتا ہے - یہ محاورہ بولتے ہیں - اور قرض دینے کے معنوں میں بھی یہ لفظ اسلیئے بولا جاتا ہے - کہ قرض کے اصل معنے کاٹ دینے کے ہیں - سو جو شخص اپنے مال کا ایک حصّہ خدا کی راہ میں کاٹ دے - اس پر اقرض اللّٰہ کا لفظ بولا جاتا ہے +

۳۵۰- اذ قالوا لنبی لھم ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل اللّٰہ - اس نبی کا نام سموئیل ہے - چنانچہ اسموئیل ۸ : ۱۹ و ۲۰ میں اس امر کا ذکر موجود ہے +

۳۵۱- ان اللّٰہ قد بعث لکم طالوت ملکا - بائبل میں اس بادشاہ کا نام ساؤل لکھا ہے مگر قرآن کریم نے ایک ایسے لفظ کا استعمال کیا ہے - جو معنی بھی رکھتا ہے - چنانچہ یہ لفظ طول سے مشتق ہے - اور قد کی لمبائی پر دلالت کرتا ہے - بائبل سے بھی معلوم ہوتا ہے - کہ ساؤل قد میں سب سے لمبا تھا - دیکھو اسموئیل ۱۰ : ۲۳ ساؤل پر اعتراضات کا ہونا بھی بائبل سے معلوم ہوتا ہے دیکھو اسموئیل ۹ : ۲۱ اور ۱۰ : ۲۷ +

۳۵۲- ان یاتیکم التابوت فیہ سکینۃ من ربکم وبقیۃ مما ترک اٰل موسیٰ واٰل ھٰرون تحملہ الملئکۃ - لفظی ترجمہ ان الفاظ کا یوں ہوگا - کہ آئے تمہارے پاس تابوت اسمیں سکینت ہو تمہارے رب کی طرف سے اور بہترین جو چھوڑا موسےٰ اور ہارون کے پیرووں نے اُٹھائے ہوئے ہونگے اُسے فرشتے +

یہاں اوّل لفظ تابوت قابل غور ہے - ایک تابوت جو تابوت سکینہ کہلاتا ہے - بائبل کی رُو سے معلوم ہوتا ہے - کہ وہ کوئی ڈیڑھ سو سال ساؤل کے زمانہ سے پہلے بنی اسرائیل کے قبضہ میں آچکا تھا - اسلیئے یہ اعتراض کیا گیا ہے - کہ قرآن کریم نے یہاں تاریخ کو درست طور پر بیان نہیں کیا - سو اوّل تو خود بائبل کوئی ایسی صحیح اور تاریخی کتاب نہیں - کہ محض بائبل کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے کسی واقعہ کو تاریخی طور پر غلط قرار دیا جائے - کیونکہ کئی موقعہ پر جو قرآن کریم نے بائبل کے ساتھ اختلاف کیا ہے - وہاں حق قرآن کریم کی طرف ہے - اور ایسے موقعوں پر بائبل کی غلط بیانی یا ناقص بیان کو بعض وقت خود پیروان بائبل نے تسلیم کیا ہے - مثال کے لئے دیکھو نوٹ ۱۶۳ء دوسرے ہم کہتے ہیں - کہ ہو سکتا ہے - کہ یہاں تابوت سے مُراد وہ تابوت نہ ہو جو لکڑی کا صندوق تھا بلکہ لفظ تابوت کے دوسرے معنے بھی عربی زبان میں آئے ہیں - اور اس لفظ کا عام استعمال ان معنوں میں ہوا ہے - چنانچہ مُفردات میں ہے - قیل عبارۃ عن القلب وسمی القلب تابوت

۲۴۳
میں لکھا ہے۔ کہ وہ نسل ہلاک ہوگئی۔ دیکھو گنتی ۱۴: ۲۹ و ۳۰۔ اور پھر لکھا ہے۔ کہ تمہاری دوسری نسل یعنی تمہارے بچے اس زمین میں داخل ہوں گے دیکھو گنتی ۱۴: ۳۱ یہی معنی ہیں۔ ثم احیاھم کے یعنی پھر اُن کو زندہ کیا۔ قوم کی موت اور زندگی اِسی طرح پر ہؤا کرتی ہے۔ اس کا دُنیا میں ذلیل اور مقہور رہنا اُس کی موت ہے۔ اس کا فاتح اور حکمران ہونا اس کی زندگی ہے۔ پس ارض مقدس سے محروم کیا جانا اور اُس نسل کا تباہ ہوجانا اُن کی موت تھی۔ دوسری نسل کا پھر موعود سرزمین میں بحیثیت فاتح داخل ہونا اُن کی زندگی تھی +

یہ واقعہ خود قرآن کریم سے اور بائیبل سے مؤید ہے۔ مگر مفسرین نے جو بے سرو پا قصے یہاں لکھے ہیں اُن کی نہ کوئی سند قرآن کریم سے ملتی ہے نہ حدیث صحیح میں نہ بائیبل میں۔ پس وہ قصے کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہیں +

۲۴۴
۳۴۸۔ وقاتلوا فی سبیل اللّٰہ۔ اس میں نہ صرف مسلمانوں کو تعلیم دی گئی ہے کہ اب اُن کی زندگی بھی قتال فی سبیل اللّٰہ پر موقوف ہے۔ بلکہ اِس سے مزید تائید اس واقعہ کی ہوتی ہے۔ جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے کیونکہ بنی اسرائیل نے اللّٰہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرنے سے انکار کیا تو ان پر موتو | کا حکم صادر ہؤا۔ تو اب مسلمانوں کو حکم ہوتا ہے کہ تم نے ایسا نہ کرنا۔ سو ایسا ہی ہُؤا کہ بدر کے موقعہ میں جہاں مسلمان نہایت کمزور اور قلیل تعداد میں تھے صحابہ نے آنحضرت صلے اللّٰہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم حضرت موسےٰ کے ساتھیوں کی طرح نہیں کہتے فاذھب انت وربك فقاتلا۔ بلکہ ہم آپ کے حکم کے ماتحت چلیں گے۔ اسی لیئے وہ موت جو حضرت موسیٰ کی قوم پر وارد ہوئی تھی مسلمانوں کو اللّٰہ تعالےٰ نے اس سے محفوظ رکھا +

۲۴۵
۳۴۹۔ من ذاالذی یقرض اللّٰہ قرضاً حسنا۔ اس آیت پر مخالفین کا یہ اعتراض ہے کہ اللّٰہ کو قرض دیا جانے کے کیا معنے۔ سو واضح ہو کہ عربی زبان میں قرض کا لفظ اصل میں روپے کے قرض دینے پر نہیں بولا جاتا۔ چنانچہ زجاج کا قول تفسیر کبیر میں موجود ہے القرض ھو کل ما یفعل لیجازی علیہ تقول العرب لك عندی قرض حسن وسیئ والمراد منہ الفعل الذی یجازی علیہ۔ یعنی قرض ہر ایک اُس کام کو کہتے ہیں۔ جو اس پر جزا ملنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں۔ لك عندی قرض حسن وسیئ اور مُراد قرض سے ایسا فعل ہے جس پر اچھا یا بُرا بدلہ دیا جائے۔ اور اس پر امیۃ بن الصلت کا شعر بطور شہادت پیش کیا ہے ؎

سے مُراد بہتر ہے۔ اور مُراد یہ ہے کہ ایک طرف اگر اس کے قلب کو سکینت عطا فرمائی گئی تو دوسری طرف اُسے مُوسےٰ اور ہارُون علیہ السلام کے علم کا وارث بنایا گیا۔ یہاں بھی بائبل کی شہادت اس معنی کی مؤید ہے۔ چنانچہ لکھا ہے "اور جب وے جبعت کو آئے تو دیکھو کہ نبیوں کی ایک گروہ اس سے دو چار ہُوئی اور خدا کی رُوح اس پر نازل ہُوئی۔ اور اُس نے بھی ان کے درمیان نبُوّت کی۔ اور ایسا ہوُا کہ جب اس کے اگلے جان پہچانوں نے دیکھا۔ کہ وہ نبیوں کے درمیان نبُوّت کرتا ہے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ قیس کے بیٹے کو کیا ہوُا؟ کیا ساؤل بھی نبیوں میں شامل ہو گیا"۔ اسموئیل ۱۰: ۱۲ +

تحملہ الملٓئکة۔ اِس تابُوت یعنی قلب کے اُٹھانے والے فرشتے ہونگے۔ قرآن کریم کے ان الفاظ سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہاں مُراد تابُوت سے قلب ہے نہ کوئی لکڑی اور لوہے کا صندوق۔ کیونکہ یہ سُنت اللہ نہیں۔ کہ لکڑی کے صندُوق فرشتے کندھوں پر اُٹھائے لوگوں کے درمیان لایا کرتے ہوں۔ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تائید اور نصرت کے لئے جب فرشتوں کے آنے کا وعدہ دیا گیا اور ظاہر پرست کفار بار بار یہ اعتراض کرتے تھے۔ کہ وہ فرشتے کیوں نہیں آتے تو یہی جواب دیا جاتا تھا۔ یوم یرون الملٓئکة لا بشریٰ یومئذ للمجرمین۔ اور لسان العرب میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے۔ نزلت علیھم السکینة تحملھا الملٓئکة۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کے اُٹھانے کا تعلق قلوب اور سکینت سے ہے +



۳۵۳۔ فلمّا فصل طالوت بالجنود قال ان اللہ مبتلیکم بنھر۔ اِس آیت پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ قرآن شریف نے جدعُون کا واقعہ جس کا ذکر قاضیوں باب ۷ آیت ۱ سے ۶ میں ہے۔ ساؤل کی طرف منسُوب کر دیا ہے۔ بات تو سیدھی ہے۔ قرآن کریم نے جدعُون کا ذکر نہیں کیا۔ اور نہ اس واقعہ کا۔ لیکن اگر ساؤل نے بھی اسیطرح اپنے آدمیوں کو آزمایا ہو جس طرح جدعُون نے۔ اور بائبل نے اس واقعہ کا ذکر نہ کیا ہو۔ تو اس کے اِنکار کی کیا وجہ ہے۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ بائبل بنی اسرائیل کی ایک ایسی مُکمّل تاریخ ہے۔ کہ جس واقعہ کا ذکر بائبل نے نہ کیا ہو وہ واقعہ ہوُا ہی نہیں۔ تاریخوں میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ایک ہی رنگ کے بیسیوں واقعات ہوتے ہیں۔ اور ساؤل کے بذریعہ نہر اپنی فوج کو آزمانے کے اِنکار کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے جب یہ بھی ثابت ہے۔ کہ طالُوت کی جنگوں میں کسی ایسی نہر کا ذکر بھی ہے۔ دیکھو اسموئیل ۱۳: ۷ + ایسی آزمائشیں صادقوں اور کھوٹوں۔ بہادروں اور کمزوردلوں کو الگ کرنے کیلئے ضروری ہوتی ہیں۔ کیونکہ کمزوردل بعض وقت دوسروں کو بھی کمزور کرنے کا موجب ہو جاتے ہیں

العلم وعلی تسمیتہ بالتابوت قال عمر بن مسعود کیف ملئ علما - یعنی کہا گیا ہے - کہ تابوت سے مُراد قلب یعنی انسان کا دِل مُراد ہے - اور قلب کو تابوتِ علم کہا جاتا ہے - اور اسی معنے میں عمر بن مسعودؓ نے کہا - کس طرح یہ (تابوت) علم سے بھرا گیا ہے - اور لسان العرب میں ہے - ما اودعت تابوتی شیئاً ففقدتہ - یعنی میں نے کبھی کوئی چیز اپنے دل کے سپرد نہیں کی جو گُم کر دیا ہو - پس تابوت سے مُراد وہ دل ہے جو طالوت کو ملا - کیونکہ اصل بات یہ تھی جیسا کہ خُود قرآن کریم میں ذکر ہو چکا ہے - کہ بعض لوگ طالوت یعنے ساؤل کے بادشاہ مُقرر کیا جانے پر مُعترض تھے - سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا - کہ اسکو ہمنے ایک خاص قلب عطا فرمایا ہے چُنانچہ بائیبل بھی اِس بات کی گواہی دیتی ہے - کیونکہ اسموئیل ۱۰ : ۹ میں لکھا ہے " - اور ایسا ہوُا کہ جُونہی اس نے سموئیل سے رُخصت ہو کے پیٹھ پھیری وہیں خدا نے اُسے دوسری طرح کا دِل دیا - اور وے سب نشانیاں اُسی دِن وقوع میں آئیں " - پس قرآن کریم نے اسی .... دوسری طرح کے دل کی طرف ہی اشارہ کیا ہے - جیسا کہ اگلے الفاظ سے ظاہر ہے +

سکینتہ کیا چیز ہے - بعض مُفسرین نے یہاں سر یا معنے لکھ دیئے ہیں - لیکن یہ ایک ایسا عام لفظ ہے - اور قرآن کریم نے بھی کثرت سے اس کا استعمال کیا ہے - اور تعجب آتا ہے - کہ باوجود اس کے کہ لُغت میں اُس کے وہ معنے نہ تھے مُفسرین نے اسے ایک عجیب الخلقت جانور بنانے کی کوشش کی ہے - عربی زبان میں لفظ سکینت کے وہی معنی ہیں - جن معنوں میں یہ لفظ ہماری زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے - رازی نے بھی اسبات کو مانا ہے - کہ سکینتہ سے مُراد ثبات اور امن ہے - اور قرآن کریم میں آتا ہے - فانزل اللہ سکینتہ علی رسولہ - اور دوسری جگہ آتا ہے - ھوالذی انزل السکینتہ فے قلوب المومنین - پس لغت سے اور قرآن کریم کے اپنے استعمال سے جو اس لفظ کا کیا ہے - یہ صاف ثابت ہوتا ہے - کہ سکینت سے مُراد اطمینان قلب کی حالت ہے - پس اِس دل کی جو طالوت کو دیا گیا پہلی علامت یہ تھی کہ اسے سکینت دیگئی - اس وقت بنی اسرائیل سخت پریشانیوں کی حالت میں تھے - اور دشمن اُن کے مُلک کے ایک حصہ پر قابض ہو چکا تھا - ایسے ہی مشکلات میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بھی سکینت نازل فرمانے کا ذکر فرمایا ہے - اور انہی حالات میں طالوت کے دل پر سکینت کا نازل ہونا مُراد ہے +

بقیتہ کے معنے ہیں الحالتہ الباقیتہ من الخیر - یعنی وہ حالت جو خیر سے باقی رہنے والی ہو - قرآن کریم میں بھی دوسری جگہ فرمایا - اولوا بقیتہ جس سے مُراد اولوا الفضل والخیر ہیں - اور فلان من بقیتہ القوم کے معنے ہیں - کہ وہ شخص بہترین لوگوں میں سے ہے - بقیتہ

# الجزء الثالث

۲۵۳ ۳۵۷۔ تلك الرّسل فضلنا بعضھم علٰی بعض :۔ پچھلی آیت کے اخیر پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بدیں الفاظ ذکر فرماکر وانّك لمن المرسلین۔ اب رسُولوں کی ایکدوسرے پر فضیلت کا ذکر کرتا ہے جس میں درحقیقت اشارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب رسُولوں پر فضیلت کی طرف ہے۔ اِس ذکر سے پہلے حضرت داؤد علیہ السّلام کا ذکر کیا۔ اور آگے حضرت عیسٰے علیہ السلام کا ذکر ہے۔ اور یہ دونوں رسُول بنی اسرائیلی سلسلہ میں ایک نمایاں امتیاز رکھتے ہیں یعنی حضرت داؤد علیہ السّلام اس سلسلہ کی ظاہری شان وشوکت کے لحاظ سے کہ اس شان وشوکت کا اظہار آپ ہی کے ذریعہ سے ہوُا جب بنی اسرائیل ایک عظیم الشان سلطنت کے مالک بن گئے۔ اور حضرت عیسٰے علیہ السلام اسکی رُوحانی شوکت کے لحاظ سے۔ کیونکہ موسوی سلسلہ اپنے رُوحانی کمال کو آپ کے ذریعہ سے ہی پہنچا۔ اور وہ اخلاقی اور رُوحانی تعلیم جو حضرت مسیحؑ کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو دی گئی وہ سب انبیاء سابق کی تعلیم پر فوقیت لے گئی + اس طرح پر جہاں ان دونوں رسُولوں کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے بھی لطیف تر اشارہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کی طرف ہے۔ جو اصل مقصود ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے یہ دو عظیم الشان نبی جنھوں نے موسوی سلسلہ کو ظاہری اور رُوحانی ہر دو پہلوؤں میں کمال تک پہنچایا۔ انہی دونوں نے سب سے بڑھ کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مدح کے گیت پیشینگوئی کے رنگ میں گائے ہیں یہاں تک کہ حضرت داؤدؑ کے کلام میں اور حضرت مسیحؑ کے کلام میں آپ کی آمد کو خود خدا کی آمد کہا گیا ہے۔ گویا باوجود اپنے کمالات ظاہری و باطنی کے انہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے کمالات ظاہری و باطنی کو ایسے بلند مرتبہ پر پایا۔ کہ آپ کی ہر دو شانوں میں ان کو خدا کی شان نظر آئی۔ اور اس طرح پر اس آیت کے اندر ایک لطیف اشارہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کی طرف ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات آپ کی اِس فضیلت پر شاہد ہیں۔ اور خود قرآن کریم کو جو فضیلت دیگر کتب پر حاصل ہے۔ کہ وہ سب صداقتیں کامل طور پر اس کے اندر جمع کردی گئی ہیں۔ جو متفرق طور پر پہلی کتابوں میں تھیں۔ بلکہ ایسی تمام صداقتیں جن کی ضرورت قیامت تک ہوگی۔ وہی فضیلت درحقیقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو دیگر انبیاء پر ہے۔ آپ کا کافۃً للناس

۲۴۹ بالخصوص جب کمزوردلوں کی کثرت ہو۔ اسلئے تھوڑے مگر دل کے بہادران بہتوں سے الگ کر دیئے جاتے ہیں +

لیس منی یعنی وہ میرے فرمانبرداروں میں سے نہیں ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لیس منامن لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا ۔ یعنی ایسا شخص ہمارا کامل متبع نہیں ۔ جو چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کا ادب نہیں کرتا +

جالوت بھی طالوت کی طرح معنی رکھتا ہے۔ من جال فی الحرب یعنی جو لڑائی میں شدت سے حملہ کرے +

۳۵۴- کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ ۔ اصل غرض تو مسلمانوں کو تشفی دینا تھا۔ کہ دشمن کی کثرت دیکھ کر کچھ فکر نہ کرو۔ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے ۔ کہ تھوڑے بہتوں پر غالب آجاتے ہیں ۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ ہمیشہ تھوڑے ہی بہتوں پر غالب آتے رہے نہ صرف عرب کے بہتوں پر یہ تھوڑے سے غالب آگئے ۔ بلکہ ان کی ایران اور رُوم اور مصر پر جس قدر فوجکشی تھی اس میں ہمیشہ بڑی قلیل تعداد کثیر التعداد دشمنوں کو مغلوب کرتی رہی ہے ایک صداقت کو جس صفائی کے ساتھ اسلام اور اسلام کی تاریخ نے پورا کر کے دکھایا ہے ۔ اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی +

۲۵۱ ۳۵۵- وقتل داؤد جالوت واٰتٰہ اللہ الملک والحکمۃ ۔ جالوت کو حضرت داؤد نے ہی قتل کیا ۔ اور ساؤل کے بعد آپ ہی بنی اسرائیل میں بادشاہ ہُوئے ۔ حضرت داؤد کا ذکر بالخصوص یہاں کیوں لایا گیا ہے ۔ اس کے لئے دیکھو تیسرے پارے کی پہلی آیت پر نوٹ +

۳۵۶- ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض ۔ یہاں پھر اسلامی جنگوں کی اصل غرض کو بیان فرمایا۔ اور وہ یہ ہے ۔ کہ جب زمین میں کوئی قوم فساد پھیلانے لگتی ہے ۔ اور لوگوں پر ظلم اور تعدی کرتی ہے ۔ جیسے اُس وقت اہل مکہ غریب مسلمانوں پر کر رہے تھے ۔ تو پھر اللہ تعالےٰ ایسے مفسدوں کو کسی اور قوم کے ہاتھ سے سزا دلواتا ہے ۔ ولکن اللہ ذو فضل علی العالمین کہہ کر یہ بتا دیا ۔ کہ دنیا کا قیام ہی اسی طرح ہے ۔ جب کسی قوم پر جو اس کے فضل کی مستحق اپنے آپ کو بنائے ۔ وہ فضل کرنا چاہتا ہے ۔ تو اس کو ظالموں کے ہاتھ سے نجات دلوا دیتا ہے +

۲۵۵ ۳۶۱ - وسع کرسیہ السمٰوات والارض - یہاں کرسی کے معنے محققین نے علم کئے ہیں - (بخاری - راغب) یا قدرت اور ملک کے معنے بھی ہوسکتے ہیں +

۲۵۶ ۳۶۲ - لا اکراہ فی الدین - دین کے معاملہ میں جبر جائز نہیں - اس کی وجہ بھی ساتھ ہی بتا دی - قد تبین الرشد من الغی - ہدایت اور گمراہی کی راہیں بالکل کھل گئیں اور متمیز ہوگئی ہیں - جن لوگوں نے اسلام پر اعتراض کرنا اپنا پیشہ بنا رکھا ہے - وہ باوجود اس کھلی تعلیم کے بھی کہے جاتے ہیں - کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا - اس آیت میں ایک بشارت بھی مسلمانوں کو دی ہے - کہ ان کا دین تو پھیل کر رہیگا - اور ان کو جبر کی کوئی ضرورت نہیں - بلکہ ایسے وقت میں جب مسلمان ابھی کمزور تھے یہ ہدایت دے کر گویا ان کو بتایا جاتا ہے - کہ اب تم زمین میں حاکم ہونے والے ہو - سو تم نے جبر نہ کرنا کیونکہ جبر کرنا تو ان لوگوں کا کام ہے جن کے پاس دلائل نہ ہوں - اور دین حق کے دلائل تو خوب واضح ہو چکے +

۳۶۳ - فمن یکفر بالطاغوت - طاغوت طغی سے مشتق ہے - اس کے عام معنے کل ما یطغی ہیں - یعنی ہر ایک جو سرکشی کرے - پھر کسی نے کہا - اس سے مراد شیطان ہے - کسی نے اصنام یا بت مراد لئے ہیں - مگر حق یہی ہے - کہ طاغوت سے مراد ہر ایک سرکش ہے - انسان ہو یا جنوں میں سے ہو - کفر بالطاغوت کو یہاں ایمان باللہ کے مقابل رکھا ہے - پس جس طرح کفر بالطاغوت سے یہ مراد نہیں - کہ طاغوت یا شیطان کے وجود کا انکار کرے - بلکہ یہ مطلب ہے - کہ اس کی باتوں کو جو نافرمانی اور سرکشی کی طرف لیجانیوالی ہیں - نہ مانے اسی طرح ایمان باللہ سے مراد یہی ہے - کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرے +

رکوع ۳۵/۳
۲۵۸ ۳۶۴ - الم تر الی الذی حاج ابراھیم فی ربہ ان اتٰہ اللہ الملک - یہاں ایک شخص کا ذکر ہے - جس نے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اس بات پر جھگڑا کیا - کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ملک دیا - یہ امر کہ اتٰہ میں ضمیر کس کی طرف پھرتی ہے - بحث طلب ہے - عام طور پر اس سے مراد وہ شخص لیا گیا ہے - جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جھگڑا کیا مگر قرآن کریم کے دوسرے مقامات کے ساتھ مقابلہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے - کہ یہاں ضمیر درحقیقت حضرت ابراہیمؑ کی طرف پھرتی ہے - جیسا کہ سورۃ النساء میں فرمایا - فقد اتینا ال ابراھیم الکتاب والحکمۃ واتینٰھم ملکا عظیما - رہی یہ بات کہ حضرت ابراہیمؑ کو ملک نہیں دیا گیا - تو یہ محاورہ پیشگوئیوں میں عام طور پر پایا جاتا ہے - کہ ایک شخص کا نام لیا جاتا ہے - اور مراد اس کی آل ہوتی ہے - چنانچہ پیدائش ۱۵ : ۷

آیت

۲۵۳

مبعوث ہونا۔ آپ کا رحمۃ للعالمین کا خطاب پانا۔ آپ کی اُمت کا خیر اُمۃ اخرجت للناس قرار دیئے جانا۔ یہ سب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی فضیلت پرشاہد ہیں +

۳۵۸۔ منھم من کلم اللہ و رفع بعضھم درجت۔ ان میں سے وہ ہیں۔ کہ اللہ نے ان کے ساتھ کلام کیا۔ اور ان میں سے بعض کے درجات کو بلند کیا۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں۔ کہ کوئی ایسے بھی رسول ہوئے ہیں۔ کہ جن کے ساتھ کلام نہیں کیا۔ اور اُن کے درجات بلند کیئے ہیں۔ بلکہ یہ ترکیب ایسی ہے۔ جیسے رسولوں کی تکذیب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ ففریقاً کذبتم و فریقاً تقتلون۔ یعنی ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا اور ایک کو قتل کرنے لگے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ جن کو قتل کرنے لگے۔ ان کو جھٹلایا نہیں۔ بلکہ چونکہ قتل کرنا محض تکذیب سے بڑھ کر تھا۔ اسلیئے اس کا ذکر الگ کیا گیا۔ اِسی طرح جن کے درجات بلند کیئے کلام تو ان کے ساتھ بھی کیا۔ کیونکہ کلام تو پہلا مرتبہ ہے یہاں مقصود یہ ہے۔ کہ بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دے کر ان کے مرتبہ کو بہت بلند کیا +

رکوع ۳۴ / ۲

۲۵۴

۳۵۹۔ انفقوا مما رزقنکم۔ یہاں صاف طور پر قومی ہستی کی پہلی ضرورت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اِنفاق فی سبیل اللہ یعنی مال اور طاقت کا اللہ تعالیٰ کی راہ میں لگانا نہ صرف آخرت میں اِنسان کے لئے مُوجب فلاح ہے۔ بلکہ کسی قوم کی زندگی بدون اس کے محال ہے۔ کہ اس کے افراد اپنی قومی ہستی کو قائم رکھنے کے لئے ایک حصہ اپنے مال اور طاقت کا خرچ کریں۔ اس وقت جیسا کہ پچھلے رکوع میں اشارہ ہے مسلمانوں کو جنگیں درپیش تھیں اُن کے لیئے بھی مال کی ضرورت تھی۔ شفاعت کے لئے دیکھو نوٹ ۷۱ اور اِس سے اگلی ہی آیت میں من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ کہہ کر بتا دیا۔ کہ شفاعت فی نفسہٖ حق ہے جو اذنِ الٰہی سے ہوگی +

۲۵۵

۳۶۰۔ الحیّ القیّوم۔ الحیّ وہ ہے جو خود زندہ دوسروں کو زندگی عطا کرنیوالا ہے۔ اور القیوم جو خود قائم اور دوسروں کے قیام کا موجب ہے۔ اِن ہر دو اسماء کے ذکر میں اسلام کے احیاء اور قیام کی طرف اشارہ ہے۔ جس کا پتہ ایک روایت سے ملتا ہے۔ جس میں لکھا ہے۔ کہ بدر کے دن حضرت علی رضی نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ سجدہ میں گرے ہوئے صرف اسی قدر بار بار پُکار رہے ہیں یا حیّ یا قیّوم۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب ایک مُٹھی بھر مُسلمان بے سروسامانی کی حالت میں ایک لشکر جرار کے سامنے پڑے تھے۔ اور اُن کی ہلاکت کا خطرہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بیتاب کر رہا تھا۔ نہ اسلیئے کہ یہ چند آدمی فنا ہو جائیں گے۔ بلکہ اسلیئے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا نام مٹ جائیگا +

کا کوئی مفعول مذکور نہیں۔ اسلیئے قرینہ کے لحاظ سے ہم قوموں کا احیاء و اماتت ہی مُراد لیں گے۔ کیونکہ قوموں کے احیاء و اماتت پر ہی جھگڑا تھا +
مخالف کا یہ کہنا کہ انا احیی و امیت اس کے یہ معنے تو ہو نہیں سکتے کہ اُس نے مُردہ انسانوں کو زندہ کرنے کا دعوےٰ کیا تھا۔ بلکہ وہ اپنی قوّت اور شوکت کا اِس طرح پر اظہار کرتا ہے۔ کہ میری طاقت بھی تو اس قدر ہے۔ کہ میں ویران جگہ کو آباد اور آباد جگہ کو ویران کر سکتا ہوں۔ اِسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے اس کا جواب یُوں نہیں دیا کہ لاؤ پھر تم ایک مُردہ انسان کو زندہ کر کے دکھاؤ۔ اگر اس میں ایسی طاقت تھی کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دیتا تھا۔ تو حضرت ابراہیم کا اللہ تعالیٰ سے یہ سوال جو اس رکُوع کی آخر کی آیت میں مذکُور ہے۔ ربّ ارنی کیف تحی الموتیٰ لغو ٹھیرتا ہے۔ کیونکہ جب آپ نے ایک کافر کو بھی مردہ زندہ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تو اب اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کرنا۔ کہ مجھے دکھاؤ مُردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں بڑی بے ادبی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے انبیاءؑ کی شان سے یہ بات بہت بعید ہے +

۲۶۶۔ قال ابراھیم فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب فبھت الذی کفر۔ یہ نئی بحث نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت اس کافر کے اسی احیی و امیت والے دعوے کا جواب ہے۔ اور یہ جواب دو طرح پر ہو سکتا ہے۔ جن دونوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کافر کا مُنہ بند ہو جاتا ہے۔ اور بحث میں اسکو کوئی راہ نہیں سُوجھتی۔ صُورتِ اوّل تو یہ ہے۔ کہ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام نے یہاں ایک قانونِ الٰہی کا ذکر فرمایا ہے۔ اور اس سے دلیل یہ پکڑی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین اٹل ہیں۔ کوئی شخص اُن کو بدل نہیں سکتا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ قانُون ہے۔ کہ وہ سُورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ اب کوئی شخص اِس قانُون کو بدل نہیں سکتا۔ اور یہ کسی کی طاقت نہیں کہ وہ سُورج کو مخالف سمت سے نکال لے۔ پس یہ قوموں کا عرُوج اور تنزل بھی ایک قانُون کے ماتحت ہے اور اسی قانون کے ماتحت یہ انقلابات اور تغیرات دُنیا میں آتے رہتے ہیں۔ کہ جو آج حالتِ عروج میں ہیں۔ کل کو اُن کا نام دُنیا سے مٹا دیا جاتا ہے۔ اور جو آج گمنام یا حالت عدم میں ہیں۔ اُن کو اُن کی جگہ پر لاکر کھڑا کیا جاتا ہے۔ پس اُس بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ اگر تو سُورج کو مغرب سے نکال سکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین پر تیرا اس قدر تصرّف ہے تو پھر تیرے ہاتھ میں یہ طاقت بھی ہو سکتی ہے۔ کہ تُو اپنی طاقت کو ہمیشہ تک قائم رکھ سکے۔ ورنہ جیسے وہ قانُون اٹل ہے یہ بھی اٹل ہے۔ دوسری صُورت یہ ہے

ہیں کنعان کا وعدہ حضرت ابراہیم کو دیا جاتا ہے۔ کہ میں تجھے یہ دیدوں گا۔ حالانکہ اُسکی اولاد کو دیا گیا۔ علاوہ ازیں اٰتٰہُ کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیم کو مُلک دینے کا وعدہ کیا۔ جیسا کہ یہی معنے وعدہ کے اذا سلّمتم ما اٰتیتم بالمعروف میں ہیں۔ دیکھو آیت نمبر ۲۳۳ +

علاوہ بریں ضمیر کو حضرت ابراہیم کی طرف پھیرنے سے اِن آیات کا تعلق پہلے مضمون سے قائم ہوتا ہے۔ کیونکہ ذکر تو تھا مسلمان قوم کے احیاء کا اور اُن کو وعدہ دیا گیا تھا۔ کہ ہم تم کو ایک عظیم الشان قوم بنائیں گے۔ اور مُلک اور حکومت عطا فرمائیں گے۔ اُنھی کی تسلّی کے لیئے اب حضرت ابراہیم کے ساتھ جو وعدہ تھا۔ اس کا ذکر کرتا ہے۔ ایک تو اسلیئے کہ حضرت ابراہیم کے وعدہ میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ اور دوسرا یہ دکھانے کو کہ جس طرح آج اُنہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔ ایسا ہی وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی دیا گیا تھا۔ حالانکہ اس وقت اس وعدہ کے پُورا ہونے کے کوئی آثار نہ تھے۔ پس اگر اب بھی آثار وعدہ کے پُورا ہونے کے نظر نہیں آتے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ بلکہ یہی بات اللہ تعالیٰ کے زبردست تائیدی ہاتھ کا ثبوت ہوگی +

۳۶۵۔ اذ قال ابراھیم ربی الذی یحیی و یمیت قال انا احی و امیت ۔ حضرت ابراہیم کے ساتھ جو جھگڑا کیا گیا۔ اس کی بنا وہ وعدہ ابراہیمی تھا۔ کہ کنعان کی سرزمین حضرت ابراہیم کو دی جائیگی۔ اِس وعدہ کے مُتعلق جس کے پُورا ہونے کے اس وقت کوئی آثار نظر نہیں آتے ایک شخص جھگڑا کرتا ہے۔ گویا اس کا اعتراض یہ ہے۔ کہ وہ طاقتور قومیں جو اس وقت اس سرزمین کی مالک ہیں۔ وہ کس طرح برباد ہو جائیں گی۔ اور کس طرح ایک اکیلا آدمی ان کا جانشین ہو جائیگا۔ اور ملک کا مالک بن جائیگا۔ حضرت ابراہیم جواب دیتے ہیں۔ کہ یہ خدا کی قدرت سے کوئی بعید بات نہیں ہے۔ میرا ربّ ہی تو احیاء و اماتت کرتا ہے۔ یعنی وہی عدم سے وجُود میں لانے والا اور موجود کو معدُوم کرنیوالا ہے۔ پس کیا یہ بات اس کی طاقت میں نہیں۔ کہ ایک اکیلے آدمی سے ایک ایسی نسل پیدا کرے۔ جو اس زمین کی مالک ہو جاوے۔ اور ایک زبردست قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔ لفظ احیاء و اماتت ان معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی مُلکوں قوموں اور مقاموں کی آبادی اور ویرانی پر بھی ان کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسا اس سے اگلی ہی آیت میں ایک بستی کے مُتعلق فرمایا ہے۔ انی یحیی ھٰذہ اللہ بعد موتھا جہاں احیاء کا لفظ اِس بستی کی آبادی کے لئے اور موت کا لفظ اس کی ویرانی کے لیئے اِستعمال ہُوا ہے۔ اور چُونکہ احیاء اور امانت

جس طرح پہلا واقعہ حضرت ابراہیم کی پیشگوئی سے مُتعلق ہے۔ دوسرا واقعہ جس کا ذکر یہاں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ او کالذی مر علی قریۃ۔ حضرت حزقیل کے اُس رویا کے مُتعلق ہے۔ جس میں آپ کو بتایا گیا کہ یروشلم ایک سو سال کی تباہی کے بعد پھر آباد ہوگا۔ اس رویا کا ذکر حزقیل نبی کی کتاب میں موجود ہے۔ مُفصل وہاں دیکھا جائے۔ چھتیسویں باب کا آخری حصّہ اور سینتیسواں باب۔ یہاں چند آیات سینتیسویں باب کے شروع سے نقل کی جاتی ہیں جن کو پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسی مکاشفہ کا ذکر قرآن شریف نے کیا ہے:-

"خُداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا۔ اور اُس نے مُجھے خُداوند کی رُوح میں اُٹھا لیا۔ اور اُس وادی میں جو ہڈّیوں سے بھرپُور تھی مجھے اُتار دیا۔ اور مجھے اُس کے آس پاس چوگرد پھرایا۔ اور دیکھو وے وادی کے میدان میں بہت تھیں۔ اور دیکھ وے نہایت سُوکھی تھیں۔ اور اُس نے مجھے کہا۔ اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں میں نے جواب میں کہا۔ اے خداوند یہوواہ تو ہی جانتا ہے۔ پھر اُس نے مُجھے کہا۔ کہ تُو ان ہڈیوں کے اوپر نبُوّت کر۔ اور ان سے کہہ کہ اے سُوکھی ہڈیو تم خداوند کا کلام سُنو۔ خداوند یہوواہ ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے۔ کہ دیکھو تمہارے اندر میں رُوح داخل کرونگا۔ اور تُم جیوؤ گے اور تم پر نسیں بٹھلاؤنگا۔ اور گوشت چڑھاؤں گا۔ اور تمہیں چمڑے سے مڑھوں گا۔ اور تم میں رُوح ڈالوں گا۔ اور تُم جیوو گے اور جانو گے کہ میں خداوند ہوں۔ سو میں نے حکم کے بموجب نبُوّت کی۔ اور جب میں نبُوّت کرتا تھا۔ تو ایک شور ہوا۔ اور دیکھ ایک جنبش اور ہڈّیاں آپس میں مل گئیں۔ ہر ایک ہڈّی اپنی ہڈّی سے اور جو میں نگاہ کی تو دیکھ نسیں اور گوشت اُن پر چڑھ آئے۔ اور چمڑے کی اُن پر پوشش ہوگئی۔ پر اُن میں رُوح نہ تھی۔ تب اُس نے مجھے کہا کہ نبُوّت کر اے آدم زاد۔ اور ہَوا سے کہہ کہ خُداوند یہوواہ یُوں کہتا ہے۔ کہ اے سانس تُو چاروں ہَواؤں میں سے آ۔ اور ان مقتُولوں پر پھُونک کہ وے جئیں سو میں نے حکم کے بموجب نبُوّت کی۔ اور اُن میں رُوح آئی۔ اور وے جی اُٹھے۔ اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہُوئے۔ ایک نہایت بڑا لشکر۔ تب اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد یے ہڈیاں سارے اسرائیل ہیں۔ دیکھ یے کہتے ہیں۔ کہ ہماری ہڈیاں سُوکھ گئیں۔ اور ہماری اُمّید جاتی رہی۔ ہم تو بالکُل فنا ہوگئے۔ اِسلئے تُو نبُوّت کر اور ان سے کہو کہ خُداوند یہوواہ یُوں کہتا ہے۔ کہ دیکھ اے میرے لوگ میں تُمہاری قبروں کو کھولونگا۔ اور تمہیں تُمہاری قبروں سے باہر نکالونگا۔ اور اسرائیل کی سرزمین میں لاؤں گا"۔

اب اِس طویل عبارت سے یہ صاف ظاہر ہے۔ کہ حضرت حزقیل نے ایک کشف دیکھا تھا۔ اِس کشف میں اُنہوں نے ہڈیاں دیکھیں۔ اور اُن کو یہ دکھایا گیا۔ کہ ہڈیوں کو

۲۵۸

کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے۔ کہ جس شخص کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کی بحث تھی۔ وہ ایسی قوم میں سے تھا۔ جو سُورج کی پرستار تھی۔ اور تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے تو پس جب ایک سُورج کے پرستار نے یہ دعوےٰ کیا۔ کہ احیاء و اماتت میرا کام ہے حالانکہ اس کے عقیدہ کی رُو سے یہ اس کے دیوتا سُورج کا کام تھا۔ تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔ کہ جب تُو وہ کام بھی کر سکتا ہے جس کو تُو مانتا ہے۔ کہ وہ تیرے دیوتا کا کام ہے۔ تو پھر تُو اپنے دیوتا سُورج پر بھی حکمران ہؤا۔ پس اپنی اِس حکمرانی کا ثبوت اِس طرح پر دے۔ کہ سُورج کو مخالف سمت سے نکالکر دکھا جس کا جواب اس مخالف کو کوئی نہ سُوجھا اور وہ مبہوت ہو گیا۔ یا یُوں بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے عقیدہ کی رُو سے اگر سُورج اور چاند کو وہ وسائط مانا جائے جن کے ذریعہ سے احیا و اماتت ہوتی ہے تو پھر بھی اُن وسائط پر حکمران اِنسان تو نہیں جو احیاء و اماتت کا دعوےٰ کر سکے۔ پس اگر اُن کو وہ خدا تعالےٰ کا محکوم نہیں مانتا اور اپنا محکوم جانتا ہے۔ تو اِس حکومت کا ثبوت اِس طرح دے۔ کہ سُورج کو مخالف سمت سے نکال کر دکھائے +

۲۵۹

۲۶۷-۱ اوکالذی مر علی قریۃ وھی خاویۃ علی عروشھا۔ اس رکُوع میں کُل تین آیات ہیں۔ جن میں سے پہلی اور آخری آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا ذکر ہے۔ اور درمیانی آیت میں کسی اور واقعہ کا ذکر ہے۔ تینوں آیتوں کو غور سے پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ کہ اِن تینوں میں ایک امر مُشترک ہے۔ اور وہ احیاے موتےٰ ہے۔ پس درحقیقت اِس رکُوع میں اللہ تعالےٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے۔ کہ احیائے موتےٰ کس طرح ہؤا کرتا ہے احیاے موتےٰ سے یہاں مُراد کسی مرے ہُوئے اِنسان یا جاندار کا زندہ ہونا نہیں بلکہ کسی قوم کا حالتِ گمنامی یا حالتِ ذلّت سے یا اُس حالت سے کہ بحیثیت قوم وہ ابھی وجود میں ہی نہیں آئی نکلنا اور عُروج اور اقبال اور حکمرانی کی حالت تک پہنچنا ہے۔ غرض اِن تینوں واقعات کے بیان کی یہ ہے۔ کہ اہلِ اسلام سمجھ لیں۔ کہ وہ اِس کمزوری کی حالت میں نہیں رہینگے۔ جس میں نہ اُن کی جانیں امن میں تھیں اور نہ اموال محفوظ۔ بلکہ اُن کو ایک عظیم الشّان اور زندہ قوم بنایا جائیگا۔ سب سے پہلے حضرت اِبراہیم علیہ السلام والے وعدہ کا ذکر فرمایا۔ کہ ابراہیمؑ ایک اکیلا انسان تھا۔ جب اس کو وعدہ دیا گیا تھا کہ تجھے ایک عظیم الشان قوم بنایا جائیگا۔ اور ایک مُقدّس سرزمین کا مالک بنایا جائیگا۔ دوسرا واقعہ جیسا کہ میں ابھی دکھاؤں گا۔ بنی اسرائیل کی سو سالہ تباہی کے مُتعلّق ہے۔ جب یروشلم کو تباہ کر دیا گیا۔ اور سو سال کی ویرانی کے بعد اس کے ازسرِنو آباد ہونے کا ذکر ہے۔ یہ بھی ایک احیائے موتےٰ کی مثال ہے تیسرا واقعہ پھر حضرت ابراہیمؑ کے مُتعلّق ہے۔ اور اسمیں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ احیائے موتےٰ کس طرح ہُوا کرتا ہے +

بڑھانے سے یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ یہ ایک مثالی رنگ کا واقعہ ہے۔ قریۃ یعنی بستی سے
مُراد یروشلم ہے۔ جو حزقیل کے وقت میں بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ اِسی لئے فرمایا۔ وھی خاویۃ
علےٰ عروشھا۔ یعنی وہ بستی ویران پڑی تھی۔ انیٰ یحی ھذہ اللہ بعد موتھا۔
یہاں موت سے مُراد اُس بستی کی ویرانی اور احیاء سے مُراد اُس کا از سرِ نو زندہ کیا جانا ہے
اور نبی یہ دریافت کرتا ہے۔ کہ یہ اُجڑی بستی اب پھر کب آباد ہو گی۔ اس کا جواب اُسکو
یُوں نہیں دیا گیا۔ کہ سو سال کے بعد۔ بلکہ کوئی واقعہ اس پر وارد کیا گیا ہے۔ جس کا ذکر
اِن الفاظ میں ہے۔ فاماتہ اللہ مائۃ عام۔ یعنی سو سال کے لئے اللہ تعالیٰ نے
اس پر موت وارد کر دی۔ یہ موت وارد کرنا رویا میں تھا۔ اور یہ تین باتوں سے ظاہر ہے
اوّل اِسلئے کہ جن امُور کا آگے تذکرہ آتا ہے۔ ان میں ہڈیوں پر گوشت چڑھانے کا ذکر ہے
اور یہ صاف رویا ہے جس کا ذکر بائبل میں موجود ہے۔ دوسرے کم لبثت کے جواب میں
حضرت حزقیل فرماتے ہیں۔ یوماً او بعض یوم۔ تو گویا ایک طرف اگر سو سال گذر گیا
تھا۔ تو دوسری طرف ایک دِن یا دِن کا کچھ حصّہ گذرا تھا۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ سوال
عالم رویا میں تھا۔ اور یہ دن یا دن کا حصّہ حقیقت میں۔ تیسرے ولنجعلک اٰیۃ
للناس جو آخر پر ہے صاف بتاتا ہے۔ کہ یہ حضرت حزقیل پر کوئی حقیقی موت وارد نہ ہوئی
تھی۔ بلکہ بطور ایک نشان کے تھی۔ جس سے مُراد بنی اسرائیل کا اِتنی دیر حالت ذِلت میں
رہنا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جو یوماً او بعض یوم کے جواب میں فرمایا۔ بل لبثت مائۃ
عام۔ تو اِس سے منشاء یہی اطلاع دینا تھا۔ کہ ایک سو سال دِن یا دِن کے ایک حصّہ
میں گذر گیا۔ یعنی عالم مکاشفہ میں تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک سو سال بھی ایک دِن کی طرح
ہی ہے۔ اسکو لمبا زمانہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ حضرت حزقیل کا سوال انیٰ یحی درحقیقت
تعجّب کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے ساتھ وعدہ الٰہی تو یہ تھا۔ کہ یروشلم ہمیشہ
کے لئے ان کو دیا گیا۔ مگر اب اس کے ہاتھ سے نکل جانے کی مُدت لمبی ہو رہی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ
نے فرمایا۔ کہ اس کے سامنے تو سو سال ایک دن کی طرح ہی ہے۔ پس سو سال تک اُس کا
چلے جانا اس وعدہ کے منافی نہ تھا۔ یہ عجیب بات ہے۔ کہ جب وعدہ الٰہی ان الارض یرثھا
عبادی الصالحون اور ابراہیمی عہد کے ماتحت بیت المقدس مسلمانوں کو دیا گیا تو
ان پر بھی قریباً ایکسو سال کا زمانہ ایسا گذرا کہ پھر ان کے قبضہ سے نکلکر یہ سرزمین
عیسائیوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ یہ صلیبی جنگوں کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ پس یہودیوں کی
تاریخ میں اللہ تعالیٰ نے یہ اسلام کی صداقت پر ایک نشان رکھ چھوڑا تھا۔ کہ سو سال

اُٹھایا جاتا - اور اُن پر گوشت چڑھایا جاتا ہے - اور وہ ہڈیاں جی اُٹھتی ہیں - اور اِسی کشف میں اُن کو یہ بھی سمجھایا جاتا ہے - کہ یہ ہڈیاں اسرائیل ہیں - بالفاظِ دیگر اِس کشف سے مُراد اسرائیل کا ازسرِنو جی اُٹھنا یا ذِلّت اور تباہی سے نکلکر پھر قومی زندگی کا حاصل کرنا ہے - قرآن کریم کے الفاظ کا اگر مذکُورہ بالا کشف سے مقابلہ کیا جائے - تو معلُوم ہوگا - کہ جِس واقعہ کو بائیل کے ایک یا دو بابوں میں بیان کیا گیا ہے - اسی کا ذِکر نہایت اِختصار کے ساتھ مگر کسیقدر مزید روشنی ڈالکر قرآن کریم نے ایک یا دو سطروں میں کر دیا ہے - اصل واقعہ تو وہی ہڈیوں کا اُٹھانا اور اُن پر گوشت چڑھانا ہے - مگر اُس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی بتا دیا - کہ یہ حالت مُردگی کی ایک سو سال تک رہیگی - جِس کا ذکر بائیل میں نہیں ہے - بلکہ تاریخ بائبل سے اس کا پتہ لگتا ہے - اور یہ پتہ لگانا عرب کے ایک اُمّی کا کام نہ ہوسکتا تھا - جِس سے معلوم ہوُا - کہ یہ علم اس رویا کا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا - اِنسانی ذریعہ سے نہ تھا - بلکہ وحی الٰہی سے حاصل ہوُا تھا - چُنانچہ بخت نصر شاہ بابل نے ۶۱۳ قبل مسیحؑ میں یروشلم پر چڑھائی کر کے اُسے فتح کیا - اور ۵۹۹ء قبل مسیح میں اسکو بالکُل تباہ کر دیا - اور جو یہُودی قتل سے بچے تھے اُن کو جلا وطن کر دیا - پھر ۳۶ ۵ قبل مسیح میں بابلیوں کی تباہی کے بعد خورس شاہ ایران نے یہودیوں کو واپس آکر آباد ہونے کی اجازت دی - اور ۲۰ ۵ قبل مسیح تک تاریخ سے پتہ چلتا ہے - کہ یہ دوبارہ آباد ہوتا رہا اِس طرح پر ایک صدی تباہی کی یہُودیوں پر گذُری +

اب الفاظ قُرآنی میں سے چند الفاظ کی تشریح کیجاتی ہے - قبل اِس کے یہ بتا دینا ضرُوری ہے - کہ قرآن کریم نے کئی موقعہ پر رویا یا مُکاشفہ کا بیان واقعات کے رنگ میں کیا ہے - جیسے حضرت یوسفؑ کا رویا - یٰابت اِنّی رایت احد عشر کوکبا والشمس والقمر رایتھم لی سٰجدین - یہاں صاف طور پر دیکھنے کا ذکر ہے - گویا ایک واقعہ معلوم ہوتا ہے - اِسی طرح پر حضرت یُوسفؑ کے ساتھ جو دو قیدی تھے - وہ بھی اپنے رویا کو واقعہ کے رنگ میں ذکر کرتے ہیں - قال احدھمآ انی ارٰنی اعصر خمراج وقال الاٰخر انی ارٰنی احمل فوق راسی خبزا - اِسلئے جہاں کوئی قرینہ موجُود ہو جس سے ایک واقعہ کے کشف یا رویا ہونے پر شہادت ملتی ہو - تو کافی ہے - اِس جگہ قرینہ اگر ایک طرف خوُد الفاظ آیت کا بتاتا ہے - کہ یہ ایک کشف یا رویا کا ذِکر ہے - تو دوسری طرف بائبل میں اِسی کشف کی موجُودگی اسی کی مزید اور قطعی شہادت ہے +

او کالذی - یہاں بعض مُفسّرین نے ک کو زاید کہ دیا ہے - مگر یہ غلطی ہے - ک کے

ملک کے ملنے کا کیا نشان یا کیا دلیل ہے۔ برخلاف اس کے قرآن کریم کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کیسی صاف اور بین دلیل دیگئی ہے۔ جو حضرت ابراہیم ہی نہیں بلکہ ہر ایک فکر سے کام لینے والے کے دل کو اطمینان کامل بخشتی ہے +

فرمایا۔ فخذ اربعة من الطیر فصرھن الیك ثم اجعل علی کل جبل منھن جزء ثم ادعھن یاتینك سعیا۔ احیاءے موتےٰ کی کیفیت معلوم کرنے کی راہ بتائی ہے۔ مگر چونکہ یہاں یہ نہیں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایسا کیا بھی تھا۔ اسلیئے جو کچھ بتایا ہے۔ وہ فی الواقعہ ایک دلیل ہے۔ نہ ایک واقعہ جیسا کہ مفسرین کا خیال ہے کیونکہ اگر فی الواقعہ منشائے الٰہی یہ ہوتا کہ حضرت ابراہیم چار جانوروں کو مار کر پھر انہیں زندہ ہوتا ہوا دیکھ لیں تو یہ ذکر ہونا چاہئیے تھا۔ کہ حضرت ابراہیم نے ایسا ہی کیا لیکن یہ ذکر تو یہاں ہے ہی نہیں بلکہ جو کچھ خدا تعالیٰ نے فرمایا وہی گویا حضرت ابراہیم کے اطمینان قلب کا باعث ہوگیا۔ اور اسی بیان سے ہی آپ کو احیائے موتےٰ کی کیفیت معلوم ہوگئی۔ پس یہ بیان ایک دلیل کے رنگ میں ہے نہ کہ ایک واقعہ کے رنگ میں۔ اس بحث میں اوّل لفظ صُرھن قابل غور ہے۔ صار کے لیے دو مضارع ہیں۔ صار یصیر اور صار یصور اور امر کا صیغہ صُر موخر الذکر سے مشتق ہے۔ اور صارہ اور اصارہ کے معنے اس مضارع کے لحاظ سے صرف یہ ہیں۔ کہ اس نے اسکو مائل کیا۔ اور مائل کرنے کے معنوں میں ہی اس کے بعد صلہ الیٰ آتا ہے۔ چنانچہ گردن کو کسی چیز کی طرف کوئی جھکائے تو کہتے ہیں۔ یصور عنقه الی الشئی۔ اور امام رازی نے انہی معنوں کو ترجیح دی ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں قال ولی انه من صرت الشئی اصورہ اذا ملته الیه۔ مگر تعجب یہ ہے۔ کہ باوجود ان معنوں کے تسلیم کرنے کے پرندوں کا ٹکڑے ٹکڑے کرنا اس آیت کا ایک ایسا مفہوم ضروری قرار دے لیا گیا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ قطعھن یعنی ان کو ٹکڑے ٹکڑے کردے یہاں محذوف ہے۔

اب لفظ کے اصلی معنے لے کر آیت کا مطلب یہ ہوا۔ کہ چار پرندلو۔ پھر ان کو اپنی طرف مائل کر لو یعنی ہلالو۔ پھر اُن کو چار اطراف میں ایک ایک پہاڑ پر ایک ایک کو چھوڑ دو (کیونکہ ایک چار کا جزو ہے) پھر ان کو بلاؤ وہ تمہاری طرف دوڑتے چلے آئیں گے۔ تو چونکہ مقصود تو صرف ایک بات کا سمجھانا تھا۔ اسلیئے یہ نہیں فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایسا کیا بھی۔ بلکہ یہ مثال ہی ان کے اطمینان کے لئے کافی ہوگئی۔ اور ان کو سمجھ آگیا کہ جس طرح ایک پرند کو جو انسان سے بہت دور رہنے والی اور بھاگنے والی چیز ہے انسان ہلا کر یہاں تک اپنے حکم کے تابع کر سکتا ہے۔ کہ پھر اس کی آواز پر جس طرف وہ ہو

۲۵۹

کے اندر اندر اگر یہ مقام پھر مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے۔ تو یہ ان الارض یرثھا عبادی الصّٰلحون کے خلاف نہیں۔ لم یتسنہ کے اصل معنی ہیں۔ لم یات علیہ السنون یعنی اس پر سال نہیں گذرے۔ چونکہ کھانے اور پینے کی چیزوں پر عرصہ گذرنے سے وہ چیزیں لُس کر خراب ہوجاتی ہیں۔ اِسلئے بُسنے کے معنے بھی لے لیئے جاتے ہیں غرض صرف اس امر کا دکھانا ہے۔ کہ اگر ایک طرف ایک سوسال کے واقعات گذرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تو حقیقت میں وہ ایک دن ہی ہے۔ وانظر الی العظام سے مُراد یہ لینا کہ یہ گدھے کی ہڈیاں تھیں بعید از قیاس ہے۔ حمار کا ذکر تو اسی حدتک کیا گیا ہے جس حدتک طعام وشراب کا ذکر ہے۔ جیسے وہ محفوظ تھے ویسا ہی حمار بھی محفوظ تھا۔ اور وانظر الی حمارك سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ حمار موجُود تھا۔ اس کے بعد پھر تعبیر بیان فرائی ہے۔ ولنجعلك ایة للنّاس یعنی یہ تمہاری حالت تمہاری قوم کے لیئے ایک نشان ہے۔ اور اس نشان کا ذکر کرتے ہُوئے فرمایا۔ وانظر الی العظام یعنی وہی ہڈیاں جو اُسے رویا میں دکھائی گئی تھیں۔ کہ ان پر گوشت و پوست چڑھ رہا ہے +

۲۶۰

۳۶۸- واذ قال ابراھیم رب ارنی کیف تحی الموتیٰ - یہ تیسری آیت ہے جس میں احیاے موتے کا ذکر ہے یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کیفیّت احیاے موتے کا سوال کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کا وعدہ الٰہی پر ایمان تو تھا کہ جیسا اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے ایسا ہی ہوکر رہیگا یعنی جو اسکو وعدہ دیا گیا ہے۔ کہ اس کی نسل سے ایک عظیم الشّان قوم بنائی جائیگی وہ وعدہ ضرور ضرور پُورا ہو کر رہیگا یہاں تک کہ ایک مخالف سے وہ اس پر بحث بھی کر چکے۔ کہ اللہ تعالےٰ کی طاقت میں یہ ہے۔ اور وہ ایسا ہی کرکے رہیگا۔ مگر اسباب کا سمجھ لینا کہ کس طرح یہ ہوگا دل کو ایک مزید اطمینان دیتا ہے۔ اِسی لیئے فرمایا۔ ولٰکن لیطمئن قلبی حضرت ابراہیم کا یہ سوال اس کے مطابق ہے جس کا ذکر بائیبل میں بھی ہے کہ جب آپ کو یہ وعدہ دیا گیا۔ کہ کنعان کا مُلک آپ کو دیا جائیگا۔ تو آپ نے دریافت کیا کہ اے خداوند خُدا میں کس طرح جانوں کہ میں اُس کا وارث ہونگا (پیدائش ۱۵: ۸) لیکن کتاب پیدائش میں جو اس کا جواب دیا گیا ہے اس میں نہ کوئی نشان ہے نہ دلیل۔ کیونکہ وہاں یہ حکم دیا جاتا ہے۔ کہ ایک گائے ایک بکری ایک مینڈھا اور دو پرندلو پھر حضرت ابراہیم ان کو درمیان میں سے کاٹ ڈالتے ہیں۔ اور پھر جب جانور اُن کی لاشوں پر آتے ہیں۔ تو ابراہیم اُن کو ہٹا دیتے ہیں۔ دیکھو پیدائش ۱۵: ۹-۱۱- اب یہ سمجھ نہیں آتا کہ اسمیں

بھی تھا۔ کیونکہ دشمن مسلمان قوم کو نیست و نابود کرنے کے لیئے تلوار اُٹھا چکا تھا۔ تو
اب جب مُسلمانوں کو کامیابیوں کی بشارت دی۔ اور ان کو زندہ کرنے کا وعدہ دیا۔ کیونکہ
قوم کی زندگی درحقیقت اس کی کامیابی اور فتوحات میں ہے۔ تو ساتھ ہی اس کے اسباب
بھی بتائے۔ اور ان اسباب میں سے اوّل ایثار اور قُربانی کو رکھا۔ کیونکہ افراد کی قُربانیاں
ہی قوم کی زندگی کا باعث ہوتی ہیں۔ اور ان قُربانیوں میں مالی قُربانیوں پر بہت زور
دیا۔ کیونکہ مالی قُربانیوں کی ضرورت ہر حال میں ہر وقت قوموں کو پڑتی ہے۔ اور جان
کی قربانی کے موقعے کم ہوتے ہیں۔ مگر افراد کی مالی قربانی بغیر کوئی قوم کامیاب نہیں
ہوسکتی اور نہ زندہ رہ سکتی ہے مسلمان قوم اپنی کامیابی کے بعد پھر تب ہی حالت مُردگی
کی طرف لوٹی۔ جب انہوں نے خُدا کی راہ میں مالی قُربانیوں کو چھوڑ دیا۔ مالی قربانی
کی ضرورت صرف جنگ کے وقت نہیں بلکہ ہر قسم کے جہاد کے لیئے اس کی ضرورت ہے
خواہ وہ جہاد زبان سے ہو یا قلم سے یا دلائل سے۔ اسلیئے مالی قُربانی کا ہی یہاں ذکر کیا ہے +
خُدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کو اس بیج کے بونے سے مشابہت دی ہے۔ جس سے
ایک دانہ سے سات سو دانہ بنتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھکر۔ فرمایا کہ سات سو کیا چیز ہے
واللہ یضاعف لمن یشاء۔ اللہ تعالٰے چاہے تو اس سے بھی چند درچند کر دے۔
حضرت مسیح نے بھی انجیل میں ایک دانہ کے بڑھنے کی مثال دی ہے۔ مگر اس مثال میں صرف
تیس گنا ساٹھ گنا۔ اور حد سو گنا بڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ یعنی ایک دانہ سے سو دانہ بنتا ہے
مرقس ۴ : ۸ متی ۱۳ : ۲۳۔ اس کے بالمقابل الفاظ قرآنی کو پڑھنے سے قرآن کریم کی
عظمت معلوم ہوتی ہے۔ کہ اپنے مُتبعین کے لیئے کس قدر اجر عظیم کا وعدہ دیتا ہے۔ یہی سو گنا
یا ہزار گنا اجر نرا وعدہ ہی وعدہ نہیں رہا۔ بلکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں نے اسکو
عملی رنگ میں ثابت کر دکھایا۔ کہ انہوں نے اگر سینکڑوں خرچ کیئے تو لاکھوں پائے۔
اور اگر ہزاروں خرچ کیئے تو کروڑوں کے مالک ہوئے۔ عرب کی دولت کیا ہوگی۔ اسکو
خرچ کر کے قیصر و کسرے کے خزانوں کے مالک ہو گئے +
اب بھی دین اسلام کی ترقی انفاق فی سبیل اللہ سے ہی ہوگی جب ہوگی۔ جب تک مُسلمان
اس طرف سے غافل ہیں۔ کچھ نتیجہ پیدا نہیں ہوگا۔ باتیں کرنے کو تو زمین و آسمان کے
قُلابے ملاتے ہیں مگر عملی رنگ میں ایک حبہ بھی اشاعت اسلام کے لیئے خرچ کرنا پہاڑ
معلوم ہوتا ہے۔ اور شغلوں پر ہزاروں لاکھوں کروڑوں خرچ ہوتے ہیں۔ مگر اشاعت اسلام
کے نام پر پیسہ کھلنا بھی مشکل ہے۔ وہ خوب یاد رکھیں کہ ہزار منصوبے کریں کبھی کامیاب

۲۶۰

دہیں سے اُڑا چلا آتا ہے۔ تو جب اِنسان میں اور اُسکی بلائی ہُوئی چیز میں ایسا شدید تعلق محض ایک عارضی تدبیر سے پیدا ہو سکتا ہے۔ تو پھر اللہ تعالےٰ جو مالک اور خالق ہے اور وہی خالق اسباب بھی ہے۔ کیا اس کی آواز میں یہ تصرف نہیں کہ اس کی آواز پر وہ میں جو اس کی اپنی مخلوق ہیں بھاگتی چلی آئیں۔ اور وہ اسباب عروج و ترقی جو کسی قوم کے احیاء کا موجب ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ مشکل کام ہے۔ کہ اپنے خالق کے حکم پر وہ سب اِکٹھے ہو جائیں۔ یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے کہ لفظ طائر (جس کی جمع طیر ہے) پرند کے معنے کے علاوہ ایک اور معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی کسی کی نیکی یا بدی یعنی خوشحالی یا بدحالی کے اسباب جیساکہ خود قرآن کریم نے بھی اس لفظ کو اس معنی میں استعمال فرمایا ہے۔ وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ +

رکوع ۳۶ (۲۶۱)

۳۶۹۔ مثل الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ۔ یہاں سے انفاق فی سبیل اللہ کا مضمون شروع ہوتا ہے۔ اور دو رکوع میں اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے تین موقعوں پر انفاق کی طرف توجہ دلائی ہے یعنی اوّل آیت ۱۹۵ میں وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ جہاں فرمایا۔ کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرو گے۔ تو اس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ کیونکہ دشمن تو ہلاکت کے درپے تھا پس اگر مسلمان ملکر اب اس دشمن کو نہ روکیں تو ہلاک ہو جائیں گے۔ پھر آیت ۲۴۶ میں اس ذکر کے بعد کہ بنی اسرائیل نے جب دشمن کا مقابلہ کرنے سے اِنکار کیا تو ان پر ایک قسم کی موت وارد کی گئی۔ فرمایا من ذاالذی یقرض اللہ قرضا حسنا۔ یہاں بھی مُراد یہی ہے۔ کہ دشمن کے مقابلہ کے لیئے مال کا خرچ کرنا بھی ضروری ہے۔ پھر بنی اسرائیل کی تاریخ کا واقعہ ذکر کرکے اور آیتہ الکرسی سے (جس میں مسلمان قوم کی عظیم الشان کامیابیوں کی بشارت ہے) پہلے فرمایا انفقوا مما رزقنٰکم۔ اب مُسلمانوں کو احیاء کی بشارت دے کر اور یہ بتا کر کہ جب ہم دُنیا میں کسی قوم کو بڑا بنانا چاہتے ہیں۔ تو اس کے اسباب بھی مُہیّا کر دیتے ہیں۔ چوتھی مرتبہ انفاق فی سبیل اللہ کی تحریص دلائی۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے۔ کہ جیساکہ امام رازی نے لکھا ہے۔ قولہ فی سبیل اللہ مختص بالجہاد فی عرف القرآن۔ یعنی قرآن کریم کی اِصطلاح میں فی سبیل اللہ کا لفظ جہاد سے مختص ہے مگر ساتھ ہی جہاد کے معنے کی وسعت کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے۔ جس کا ذکر اپنے موقعہ پر ہو گا ہاں اس وقت کی جب یہ سُورت کریمہ نازل ہو رہی تھی عظیم الشان ضروریات جہاد میں جنگ

۲۶۵

انفسھم کمثل جنۃ بربوۃ - یہ دوسری مثال اُن لوگوں کی ہے جو اللہ کی رضا کے لئے اور اپنے نفسوں کے ثبات کیلئے مالوں کو خرچ کرتے ہیں - مال کے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے انسان کی ثابت قدمی خدا کی راہ میں بڑھتی ہے - کیونکہ مال انسان کی محبوب چیز ہے - اور جس چیز کے لیئے وہ اپنا مال خرچ کرے یا جس چیز کے لئے اپنے قوے کو لگا دے وہ چیز بھی اس کی محبوب ہو جاتی ہے - پس جب خدا کی راہ میں اپنے مال کو خرچ کرے گا تو اُس راہ کی محبّت بڑھنے سے اس میں زیادہ ثابت قدمی اور وفاداری پیدا ہوتی جائیگی - جو لوگ اپنے مال اسلام کے لیئے خرچ نہیں کرتے یا اپنے قویٰ کو اسلام کی خدمت میں نہیں لگا دیتے اُن کا دعوئے محبّت اسلام کا جھوٹا ہے +

اللہ کی رضا کے لیئے خرچ کرنے والے کی مثال ایک باغ سے دی ہے جو ایسی عُمدہ زمین پر واقع ہے - کہ زور کی بارش ہو یعنی اسباب موفقہ اچھی طرح پیدا ہو جائیں تو اُس باغ کا پھل کئی گُنا ہو جاتا ہے - ورنہ پھوار یا شبنم بھی اس کے پھل لانے کے لیئے کافی ہے - گویا یہ ایسا بیج ہے کہ ضائع کسی صُورت میں نہیں ہوتا +

۲۶۶

۳۷۴ - فاصابھا اعصار فیہ نار فاحترقت - یہ تیسری مثال من و اذی والے کی ہے - اس کا خرچ کرنا ہوتا تو رضائے الٰہی کے لیئے ہی ہے - اِسلیئے وہ جڑ پکڑتا اور باغ بن جاتا ہے - لیکن من و اذی اُس باغ پر آتش بگولے کا اثر کرتا ہے - اور تیار شدہ باغ کو ضائع کر دیتا ہے - گویا اِس رکوع میں رضائے الٰہی کے لیئے اور دینِ حق کو پھیلانے کیلیئے خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے - من و اذی اور ریاء سے روکا ہے - اور تینوں باتوں کی وضاحت تین مثالوں میں کر دی ہے +

رکوع ۳۷/۵
۲۶۷

۳۷۵ - یا یھا الذین امنوا انفقوا من طیبٰت ما کسبتم - اِس سے پہلے رکوع میں یہ بیان فرمایا تھا - کہ انفاق کس طرح پھل لاتا ہے - کس طرح بیج ضائع ہونے سے بچایا جا سکتا ہے - کس طرح آفات سے محفُوظ رہ سکتا ہے - اِس رکوع میں بتایا ہے کہ کونسا مال خرچ کرنا چاہیئے - کس طرح پر یعنی علانیہ یا چھپ کر خرچ کرنا چاہیئے - اور کس پر خرچ کرنا چاہیئے - اور اس طرح پر انفاق کی تمام اصُولی تفصیلات کو ان دو رکوعوں میں بیان فرما دیا ہے - کیونکہ انفاق ہی درحقیقت قومی حیات کی اصل رُوح ہے - کونسا مال ہو جو خرچ کیا جائے اس کے متعلق فرمایا - اپنی کمائی میں سے اچھی چیزیں خرچ کرو - تو گویا پہلی ضرورت یہ ہے کہ مال ناجائز طریق پر حاصل کیا ہوا نہ ہو بلکہ کمایا ہوا ہو - پھر اُس کمائی میں سے بھی اچھی چیزیں خدا کی راہ میں دے - جیسا کہ دوسری جگہ بھی فرمایا - لن تنالوا البر حتی تنفقوا

نہیں ہونگے۔ جب تک کہ اس قرآنی اصول کو اپنی زندگیوں میں عملی رہنما نہ بنائیں۔ اور
۲۶۱ اپنے مالوں کو دین کے لئے خرچ کرنا اپنا سب سے مقدم فرض نہ سمجھیں مسلمانوں میں مال و
دولت کی کمی نہیں۔ اگر کمی ہے۔ تو اس دل کی جو اللہ کی راہ میں اس مال کو خرچ کر سکے +

۲۶۲ ۳۷۰- ثم لا یتبعون ما انفقوا منا ولا اذی ۔ عام انفاق کی صورت میں من و
اذی یہ ہے۔ کہ جس کو دیا ہے اس پر احسان نہ جتائے یا اسکو تکلیف نہ پہنچائے۔ اور جہاد
یا اشاعت دین کے لئے جب خرچ کرے۔ تو اس صورت میں احسان جتانا یہ ہے کہ اپنے
چندہ یا عطیہ پر فخر کرتا پھرے۔ کہ میں نے اس قدر روپیہ دیا ہے۔ اور اذی یہ ہے۔ کہ دوسرں
کو یہ کہہ کر دکھ پہنچائے۔ کہ فلاں نے تھوڑا کیوں دیا یا فلاں نے کیوں نہیں دیا +

۲۶۴ ۳۷۱- کالذی ینفق ماله رئاء الناس ولا یومن باللہ والیوم الاخر۔
مسلمانوں کو مخاطب کر کے تو یہی فرمایا۔ کہ اپنے صدقات کو من و اذی سے ضائع نہ کرو۔
مگر ریا یا دکھاوے کے لئے دینے کو ایسا قبیح فعل بنا کر دکھایا ہے۔ کہ گویا یہ تو مسلمان کا کام
ہی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ریا کے لئے دینا اس شخص کا کام ہے۔ جو اللہ اور یوم آخر پر
ایمان نہیں لاتا +

۳۷۲- فمثله کمثل صفوان علیه تراب فاصابه وابل فترکه صلدا۔
ایک صاف پتھر ہو اس پر کچھ مٹی پڑی ہو۔ زور کی بارش ہو تو حالانکہ بارش کا کام
تو دانہ کو اگانا اور سرسبز کرنا ہے۔ مگر اس مٹی پر دانہ اگانے کی بجائے وہ مٹی کو ہی دھو ڈالیگی
اور پتھر صاف کا صاف رہ جائیگا جس پر دانہ کا اگنا ہی محال ہے چہ جائیکہ ایک دانہ کا سات
دانہ بنے۔ یہ ریا سے خرچ کرنے والے کی مثال دی ہے۔ کہ ایک طرف اگر انفاق پر اتنا عظیم الشان
وعدہ ہے۔ کہ ایک دانہ کا سات سو دانہ بنتا ہے۔ تو دوسری طرف ریا سے دینے والے کی حالت
یہ ہے۔ کہ وہ بیج جو اس نے بویا تھا۔ اس کی جڑ اصلی زمین میں نہیں کہ وہ بارش کے ساتھ
اور بڑھے اور پھیلے بلکہ جس مٹی پر وہ دانہ گرا تھا وہ مٹی بھی بارش سے بہہ جاتی ہے۔ اور
وہ دانہ اُگنے ہی نہیں پاتا۔ اور نہ اس کی جڑیں زمین میں لگنے پاتی ہیں +

لا یقدرون علی شیء مما کسبوا اس کا نتیجہ ہے۔ اور اس میں اسبات کی طرف
اشارہ ہے۔ کہ جو کچھ یہ کافر جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخر پر ایمان نہیں لاتے اسلام کی مخالفت پر
خرچ کر رہے ہیں۔ اس کا ان کو کوئی پھل نہیں ملیگا۔ بلکہ اُن کی ساری محنت اور مال اکارت
جائینگے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا فسینفقونها ثم تکون علیهم حسرة ثم یغلبون +

۲۷۳- ومثل الذین ینفقون اموالهم ابتغاء مرضات اللہ وتثبیتا من

۲۷۱ اچھا ہے۔ بلکہ اسکی عظمت اور وقعت کے لحاظ سے مقدم اسے ہی کیا۔ ہاں غربا کی کچھ مدد کرنی ہو تو پھر بیشک چھپا کر دو۔ وہ بھی تمہارے لئے اچھا ہے +

۲۷۲ ۳۷۸۔ لیس علیك ھدٰھم ولکن اللہ یھدی من یشاء۔ عام طور پر اس سے یہ مُراد لی گئی ہے۔ کہ غربا کی امداد میں مُسلم اور غیر مُسلم سب کو دو۔ کیونکہ لکھا ہے کہ اسماءؓ نے جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اپنی دادی اور والدہ پر خرچ کرنے کے متعلق پوچھا جو دونوں مشرکہ تھیں تو یہ آیت نازل ہُوئی لیکن ہو سکتا ہے۔ کہ اس سے مُراد یہ ہو کہ جہاد پر خرچ کرنا یا اشاعت اسلام کے لئے اپنے مالوں کو لگانا یہی صرف تمہارے لئے ضروری ہے۔ ہدایت دینا تو اللہ تعالیٰ کے اختیار ہے۔ ہاں مسلمانوں کو اپنے فرض میں غافل نہیں ہونا چاہئے +

وما تنفقوا من خیر فلا نفسکم کے معنے اِس صُورت میں یہ ہونگے کہ جو کچھ مال تُم خرچ کرو گے۔ وہ تمہارے اپنے لوگوں کی بھلائی کے لئے ہے۔ کیونکہ اپنے ہی بھائی بندوں کو تم ہدایت کی طرف بُلاتے ہو۔ یا جہاد کے ذریعہ سے تم ان لوگوں کو جو کُفّار کے ظُلم برداشت کرتے تھے ان مظالم سے چھڑواؤ گے۔ بلکہ خلقکم من نفس واحدۃ سے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ سب انسان انفسکم میں داخل ہیں +

۲۷۳ ۳۷۹۔ للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ۔ آیت ۲۷۱ میں فرمایا تھا۔ کہ صدقات مخفی رنگ میں فقراء کو بھی دیئے جا سکتے ہیں۔ یہاں یہ بیان فرمایا ہے۔ کہ کونسے فقراء مُراد ہیں۔ اِس میں تو شک نہیں کہ قرآن کریم عام طور پر محتاجوں مساکین یتامےٰ کی خبر گیری کی تاکید فرماتا ہے۔ مگر بھیک مانگنا نہیں سکھاتا۔ اور یہاں جن فقراء کا ذکر ہے۔ وہ درحقیقت فی سبیل اللہ کے مناسب حال ہے۔ یعنی چونکہ یہاں مدِّنظر تو جہاد میں اموال کا خرچ کرنا ہے۔ اور جہاد سے مُراد دین کے لئے یا خدا کی راہ میں ہر ایک کوشش ہے۔ تو اِس لحاظ سے فقراء کی تصریح بھی یوں فرمائی۔ کہ وہ ایسے فقراء ہوں جو اللہ کی راہ میں (فی سبیل اللہ) محصُور ہو گئے ہوں۔ اِس میں ذیل کے لوگ داخل سمجھے گئے ہیں:۔

(۱) وہ مجاہدین یعنی خُدا کی راہ میں کوشش کرنے والے جو اپنا ذریعہ معاش نہ رکھتے ہوں (۲) وہ لوگ جو کُفّار کے ظُلم کی وجہ سے اور راستوں میں سے امن اُٹھ جانے کی وجہ سے تجارت نہ کر سکتے ہوں (۳) وہ لوگ جو دینی جنگ میں زخمی ہو گئے ہوں +
کیا اعلےٰ درجہ کا اِنتظام تھا۔ کہ کچھ لوگ خالص دین کے لئے کوشش کرنے والے

آیت ۲۶۷

مما تحبون - اور یہاں آگے صاف فرمایا کہ لا تیمموا الخبیث یعنی ردی یا ناکارہ چیز کے دینے کا ارادہ بھی نہ کرو جس چیز کی خود تمہارے نزدیک بھی کچھ وقعت نہیں اور وہ تمہاری اپنی نگہ میں قدر و قیمت نہیں رکھتی - اس کو دے کر تم اچھے نتائج کے اُمیدوار کس طرح ہو سکتے ہو - آج کل کی اسلامی ہمدردی کی بڑی حد یہی ہے - کہ کاروبار سے فارغ ہو کر دل بہلانے کے لیئے چار باتیں اسلامی ہمدردی کی بھی کر دیں - یہ بھی خبیث مال کا خدا کی راہ میں خرچ کرنا ہے - جس کا نتیجہ کچھ نہیں ہوتا +

۲۶۸ ۳۷۶ - ویامرکم بالفحشاء یہاں فحشاء کے معنے بُخل کے ہیں یعنی جب خدا کی راہ میں انسان مال خرچ کرنے لگتا ہے - تو شیطان اُسے ڈراتا ہے - کہ تو غریب ہو جائے گا - اور وہ اس کے دل میں یہ ڈالتا ہے - کہ اس موقعہ پر بُخل سے کام لینا چاہیئے - پس جن لوگوں کے دل میں خدا کی راہ میں دیتے وقت ایسے خیال پیدا ہوں انھیں سمجھ لینا چاہیئے کہ شیطانی وساوس ہیں اور ان کو دُور کرنا چاہیئے +

۲۷۱ ۳۷۷ - ان تبدوا الصدقت فنعما ھی وان تخفوھا وتؤتوھا الفقراء فھو خیر لکم - اس میں انفاق کا طریق بتایا - قرآن کریم ہر ایک مسئلہ پر انسانی ضرُوریات کے سارے پہلوؤں کو مدِ نظر رکھ کر بحث کرتا ہے - انجیل کی اس مشہور پہاڑی تعلیم میں صدقات کا مضمون اتنی ہی بات پر ختم ہو جاتا ہے - کہ تم دکھاوے کے لیئے خیرات نہ کرو - بلکہ ایسی طرح کرو کہ تمہارا دایاں ہاتھ دے تو بائیں کو خبر بھی نہ ہو - مگر نہ علانیہ طور پر دینا لازمی طور پر دکھاوے کے لیئے دینا ہے - اور نہ ہی کوئی شخص جو انسانی ضرُوریات سے واقف ہے یہ کہہ سکتا ہے - کہ جب کبھی کوئی شخص کچھ دے تو ایسی صُورت میں دے کہ دایاں ہاتھ دے تو بائیں کو خبر نہ ہو - وہ یورپین اقوام کے بڑے بڑے رفاہ عام کے کاموں کے چندے جن کا آئے دن اخباروں میں اعلان ہوتا ہے - وہ انجیل کی تعلیم کے تو خلاف ہیں - مگر انسانی ضرُوریات اس بات کی مقتضی ہیں - کہ کبھی اگر انسان چھپ کر خرچ کرے تو کبھی علانیہ بھی کرے - چنانچہ بڑے بڑے قومی ضرُوریات کے چندے اور رفاہ عام کے بڑے بڑے کاموں کے لیئے عطیئے لازماً علے الاعلان ہونے چاہئیں - علاوہ اور فوائد کے اس طرح پر وہ دوسروں کے لیئے نیکی کی تحریص کا موجب ہوتے ہیں - اب دیکھو کہ قرآن کی تعلیم کیسی کامل اور جامع ہے - اور کس طرح پر ہر ایک قسم کی انسانی ضرُوریات کو مدِ نظر رکھتی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے - کہ یہ انسان کی تعلیم نہیں - بلکہ خُود خالق فطرت انسانی کی طرف سے ہے - سو یہاں فرمایا کہ علانیہ طور پر خدا کی راہ میں مال خرچ کرنا بھی بہت

انسان مال کی محبت میں اِس قدر غرق ہو جاتے ہیں ۔ کہ خُدا کی محبت تو ایک طرف رہی
اخلاق فاضلہ سے بھی عاری ہو جاتے ہیں ۔ پس مال کی محبت کم کرنے کے لئے اگر ایک
طرف انفاق یعنی مال خرچ کرنے کی ترغیب دی ۔ تو دوسری طرف سُود کھانے سے روکا +
ربا پر بہت بحث ہُوئی ہے کیا تھا کیا نہ تھا ۔ یہ بحث فضُول ہے ۔ یہ عرب کے
اندر ایک مشہور مُتعارف امر تھا ۔ اور سب لوگ اس کے معنوں سے واقف تھے ۔ ایسی
روایات کہ حضرت عمرؓ نے کہا ۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ربا کے معنے بتانے کی مُہلت
نہیں ملی کسی طرح قابل اعتبار نہیں ہیں ۔ ربا کا لفظ قرآن کریم میں کئی دفعہ استعمال
ہُوا ہے ۔ اور اوّل تو اِس بات کا ہی کوئی ثبوت نہیں ۔ کہ یہ آیت یا یہ رکُوع آنحضرت
صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام میں نازل ہُوا ۔ مگر اس کے علاوہ دوسرے مقامات
پر بھی تو یہ لفظ آچکا تھا ۔ ربا کیا تھا وہی جو ہمارے ہاں بیاج یا سُود کہلاتا ہے ۔
امام رازی لکھتے ہیں ۔ الامر الذی کان مشھورًا متعارفًا فی الجاھلیۃ انھم
کانوا یدفعون المال علی ان یاخذوا کل شھر قدرا معینا ویکون راس المال
باقیا ثم اذا حل الدین طالبوا المدیون براس المال فان تعذر علیہ الاداء
زادوا فی الحق والاجل ۔ یعنی ربا ایک ایسا امر تھا جو ایام جاہلیت میں مشہور مُتعارف
تھا ۔ اور وہ یہ کہ اس شرط پر مال (بطور قرض) دوسرے کو دیدیتے تھے ۔ کہ ہر مہینے ایک
مقرر رقم لے لیا کریں گے ۔ اور راس المال یعنی اصل رقم قرضہ ویسے کی ویسی باقی رہیگی
پھر جب قرض کی ادائیگی کا وقت پہنچ جاتا تو مقروض سے راس المال طلب کرتے ۔ اور
اگر وہ ادا نہ کرسکتا تو رقم میں بڑھا دیتے اور میعاد بھی بڑھا دیتے ۔ اب یہ صُورت
ہمارے ہاں کے سُود سے جو ہندو لیتے ہیں بالکل ملتی جُلتی ہے ۔ وہ بھی ماہوار دو پیسے یا
ایک پیسہ فی روپیہ اصل پر لینا کر لیتے ہیں ۔ ہاں سہُولت کے لئے اگر ہر مہینہ نہ لیا تو اکٹھا
سال بعد یا میعاد ختم ہونے پر وصول کر لیا ۔ یا اصل میں بڑھا کر از سر نو رقم بنا لی ۔ اس میں سُود
اور سُود در سُود دونوں آجاتے ہیں ۔ اور درحقیقت دونوں میں کچھ فرق نہیں سوائے اس کے
کہ سُود در سُود میں ہر سال سُود کی رقم اصل میں بڑھا لیجاتی ہے +

صدقات اور سُود کے مضمون میں ایک اور بھی مناسبت ہے جس کی طرف قرآن کریم
نے اِس سے اگلی آیت میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے ۔ یمحق اللہ الربوا ویربی
الصدقٰت ۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں ۔ کیونکہ صدقہ تو وہ ہے
جو اغنیاء سے لیا جاتا اور فقراء کو دیا جاتا ہے ۔ اور سُود وہ ہے جو فقرا یا محتاجوں سے

آیت ۲۷۳

ہوں - اور جو ان میں سے اپنا ذریعہ معاش نہ رکھتے ہوں - دوسرے ان کی مدد کریں - مگر بجائے اس کے مسلمانوں کا بہت سارا روپیہ اُن پیروں کی نذر میں ضائع ہوتا ہے - جو نہ صرف دین کی خدمت ہی کرنے والے نہیں - بلکہ اسلام کے لئے ننگ ہیں +

ان فقراء کے متعلق کچھ اور باتیں بھی بیان فرمائی ہیں - لا یستطیعون ضرباً فی الارض یعنی طلب معاش کے لئے زمین میں چل پھر نہیں سکتے - یحسبھم الجاھل اغنیاء من التعفف - سوال کرنے سے رُکتے ہیں - جس کی وجہ سے جاہل یعنی ناواقف لوگ اُن کو غنی سمجھتے ہیں - معلوم ہوا سوال سے رُکنا خوبی کی بات ہے - اور اللہ تعالےٰ اُنہیں کو دینے کی سفارش کرتا ہے - جو نہ صرف دین کی خدمت میں لگ جاتے ہیں بلکہ سوال بھی نہیں کرتے - وہ مولوی لوگ جنھوں نے وعظ کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے - اور ہر وعظ کے اخیر پر مداری کی طرح دست سوال دراز کرتے ہیں - ان کے لئے اسمیں سبق ہے - پھر اور کھول کر فرمایا - لا یسئلون النّاس الحافا - دُنیا میں ایک لوگ ہیں - جو نہ صرف سوال ہی کرتے ہیں - بلکہ اس طرح پیچھے پڑ جاتے ہیں - کہ دینے والے کا خلوص بھی باقی نہیں رہتا - فرمایا یہ لوگ ایسے نہیں ہوتے +

رکوع ۳۸ آیت ۲۷۵

۳۸۰ - الذین یاکلون الربٰوا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطٰن من المس - اس رکوع میں ربا یا سُود کی حُرمت کا ذکر ہے - تعلق اس مضمون کا پچھلے رکوع کے ساتھ یُوں ہے - کہ اللہ تعالےٰ نے وعدہ دیا تھا - کہ جو لوگ اسکی راہ میں مال خرچ کرینگے - ان کو ایک ایک کے سات سات سو بلکہ اس سے بھی کئی گُنا اجر ملیگا - چنانچہ پچھلے دو رکوعوں کے مضمون کو بطور خلاصہ اس رکوع کی پہلی آیت میں یُوں بیان فرمایا - الذین ینفقون اموالھم بالیل والنھار سرا و علانیۃ فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون - یعنی ان کو بڑے بڑے اجر بھی ملیں گے - اور وہ کامیاب بھی ہونگے - لیکن اسلام کی اصل غرض لوگوں سے خرچ کرا کر اُن کو مالدار بنانا نہ تھا - بلکہ اصل غرض تو یہ تھی - کہ خدا کی محبت میں ترقی کریں - ہاں انفاق کا یہ لازمی نتیجہ ہے - اور قانُون قدرت یُوں ہی ہے - کہ جو لوگ خرچ کرتے ہیں - وہ بہت کچھ پاتے بھی ہیں - لیکن مال کی محبت اگر زیادہ ہو تو خدا کی محبت کو ٹھنڈا کر دیتی ہے - اسلیئے اللہ تعالےٰ نے یہاں وہ بات بیان فرمائی ہے - کہ مالدار ہونے کے باوجود بھی مال کی ایسی محبت ان کے دلوں میں پیدا ہونے نہ دے جو خُدا کی محبت کو سرد کر دے - اور یہ سُود خواری سے روکنا ہے - سُود خوار تو ہیں اور سُود خوار

قرار دیا ہے۔ کہ گویا یہ خُدا اور اُس کے رسُول کے ساتھ جنگ کرنے کے برابر ہے۔ البتّہ
ایک سوال پیدا ہوتا ہے یعنی یہ کہ جو لوگ بنکوں میں روپیہ حفاظت کے لیئے رکھواتے
ہیں۔ اور ان کی غرض سُود لینے کی نہیں ہوتی۔ اس سُود کے روپے کو کیا کیا جائے۔
اِس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر ایسا روپیہ اشاعت اسلام پر لگا دیا جائے
تو وہ اس کے لیئے بطور کفّارہ ہو جائیگا۔ کیونکہ اشاعتِ اسلام درحقیقت اللہ اور
اس کے رسُول کے دُشمنوں کے ساتھ جنگ ہے۔ پس جو سُود کا روپیہ اس مصرف پر لگا دیا
جائے۔ اس کی وجہ سے وہ اللہ اور اُس کے رسُول کے ساتھ جنگ نہ رہیگی +

۳۸۳۔ وان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ وان تصدقوا خیر لکم۔
یہ وہ ہمدردی ہے جو اسلام سکھاتا ہے۔ اگر مقروض تنگدست نہ ہو تو نہ صرف اُسے مُہلت
ہی دیجائے جب تک کہ وہ روپیہ ادا کرنے کے قابل ہو۔ بلکہ اگر اُسے معاف ہی کر دیا جائے
اور راس المال بھی بطور صدقہ چھوڑ دیا جائے۔ تو یہ بہتر ہے۔ اس کے بالمقابل آجکل
کے مُہذّب قوانین کو دیکھو کہ تنگدست مقروض کو جیلخانہ میں پہنچا کر اُس کی بی بی
بچّوں کو بھُوکا مارنا بھی قانُونی طور پر قرضخواہ کا حق سمجھا جاتا ہے +



۳۸۴۔ یایھا الذین امنوا اذا تداینتم بدین الی اجل مسمی فاکتبوہ۔ اِس
رکُوع میں باہمی ایسے لین دین کے معاملات کا ذکر ہے۔ جن کا اثر آیندہ پر پڑتا ہو۔ پچھلے
تین رکُوعوں میں اگر ایک طرف انفاق فی سبیل اللہ پر زور دے کر مال کی محبت سے روکا
ہے۔ تو دوسری طرف سُود کو حرام قرار دے کر اس محبت کی جڑ کاٹی ہے۔ تو اب یہ بتا دینا
ضروری تھا۔ کہ مال کوئی ایسی چیز نہیں کہ آدمی اس کی کوئی پرواہ نہ کرے۔ کیونکہ ان
ہردو احکام میں غرض کچھ اَور تھی۔ اِسلئیے اب فرمایا۔ کہ مال سے متعلق اور لین دین کے
مُعاملہ میں اپنے حقُوق کو خوُب محفُوظ کرنا سیکھو۔ یہاں تک کہ لین دین کے سب معاملات کو
جو بطور دین ہوں لکھ لیا کرو۔ بلکہ شہادت بھی رکھ لیا کرو۔ اِس طرح پر گویا مال کی محافظت
کی طرف توجّہ دلائی ہے یہی اسلام کی سب سے بڑی خوُبی ہے۔ کہ انسانی قوٰی کی نشوونُما
میں اعتدال کے پہلو کو ہر وقت مدِّنظر رکھتا ہے۔ مال کی محبّت کا کم کرنا یہ بیشک اخلاقِ
فاضلہ کے لیئے ایک اعلےٰ درجہ کا گُر ہے۔ مگر اُس کی طرف سے بالکُل لاپرواہ ہونا بھی درست
نہیں۔ کیوُنکہ جو شخص اپنے حقُوق کو محفُوظ کرنا نہیں سیکھتا وہ آخر دوسروں کا محتاج
ہوتا ہے۔ اور احتیاج خوُد انسان کو بعض قسم کے اخلاق فاضلہ سے محروم کر دیتی ہے
پس ایک پہلُو پر زور دے کر معًا دوسرے پہلُو کی طرف توجّہ دلا دی +

اغنیاء حاصل کرتے ہیں۔ اغنیاء اور فقراء میں مال کی تقسیم کا سوال ہمیشہ سے ایک پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔ اور بالخصوص یورپ میں جہاں ایک طرف اُمرا کے پاس روپیہ حد سے زیادہ اور دوسری طرف غُربا کی حالت حددرجہ خراب ہورہی ہے۔ تقسیم مال کے سوال نے ایک ایسا گروہ پیدا کردیا ہے۔ جو یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ دولت کی تقسیم سب میں یکساں ہونی چاہیئے۔ گو یہ خیال یُورپ میں روز بروز پھیلتا جارہا ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے۔ کہ اس کا عمل میں آنا ناممکن ہے۔ اسلام نے جو اصلاح پیش کی ہے وہ قابلِ عمل بھی ہے۔ اور ایک دُنیا نے اس پر عمل کرکے دکھا بھی دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ایک تو اغنیاء کو یہ حکم دیا کہ وہ ہر سال اپنے مال کا چالیسواں حصّہ بیت المال میں داخل کریں جہاں سے اس کے ایک حصّہ کے ساتھ غُربا کی امداد کیجاتی ہے۔ اور دوسری طرف اُمرا کو حکم دیا۔ کہ اگر اُنکے غریب بھائیوں کو ضرورت آپڑے۔ تو قرضہ بلا سُود دیدیا کریں۔ پس یہ ایک اعلےٰ درجہ کی میانہ روی کی تعلیم ہے۔ اور ہر طرح سے قابلِ عمل ہے۔ اور یُورپ میں تقسیمِ دولت کے سوال کو صحیح طور پر حل کرسکتی ہے +

سُود لینے والے کو اُس شخص کے ساتھ مثال دی ہے۔ جس کو شیطان چھُو کر مخبُوط کردے۔ سود درحقیقت سُود خوار کی آخری حالت یہی ہوتی ہے۔ کہ مال کی محبّت اُسکو ہر ایک قسم کے اخلاق فاضلہ سے عاری کرکے مال کی محبّت میں اُسے مخبُوط الحواس بنادیتی ہے +

حدیث میں سُود کھانے والے سُود دینے والے۔ گواہ اور کاتب سب پر لعنت کی ہے +

۳۸۱۔ ذالک بانھم قالوا انما البیع مثل الربوا و احل اللہ البیع وحرم الربوا۔ یہاں اس بات کی تردید کی ہے۔ کہ بیع اور سُود یکساں ہیں۔ کیونکہ اکثر لوگوں کا سُود کی حُرمت پر یہی اعتراض ہے۔ کہ ایک شخص اپنے روپے کو لگاکر اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اور یہ ایسا ہے۔ جیسا تجارت کرکے کوئی فائدہ اُٹھالے۔ اس اعتراض کا ذکر کرکے فرمایا۔ کہ یہ بات غلط ہے۔ تجارت آدمی کو محنت سکھاتی ہے۔ سُود خواری جو لوگ اپنا پیشہ بنالیتے ہیں ان کو محنت کوئی نہیں کرنی پڑتی۔ اسلام تجارت کو ترقّی دیتا ہے۔ اور ایسے پیشوں سے روکتا ہے جو انسان کو اخلاق فاضلہ سے عاری کرنے کے علاوہ اس میں سُستی اور کاہلی پیدا کرتے ہیں۔ دوسرا فرق سُود اور تجارت میں یہ ہے۔ کہ سُود خوار صرف نفع کا مالک ہوتا ہے۔ اور تجارت میں نفع نقصان دونوں پہلو ہوتے ہیں +

۲۷۹
۳۸۲۔ فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ۔ سود خواری کو ایسا خطرناک جُرم

۲۸۲ کر دیا ہے ۔ اور ایک ایک فقرہ میں ایک ایک قانون کی بنیاد قائم کر دی ہے + شہادت میں دو گواہوں کا رکھنا عام حالات کے لحاظ سے ہے ورنہ یہ کہیں ضروری نہیں ٹھیرایا گیا ۔ کہ دو گواہوں کی شہادت کے بغیر فیصلہ نہ دیا جائے +

۲۸۳ ۳۸۵ ۔ وان کنتم علی سفر ولم تجدوا کاتبا فرھٰن مقبوضۃ ۔ اِس آیت میں رہن باقبضہ کی اجازت دی ہے ۔ اور گو یہاں حکم مشروط معلوم ہوتا ہے ۔ کہ تم حالت سفر میں ہو اور کاتب نہ ملے تو کوئی چیز قبضہ میں لے کر رکھ لینا جائز ہے ۔ مگر فقہاً کا اِس بات پر اتفاق ہے ۔ کہ یہ حکم عام ہے ۔ سفر ہو یا حضر کاتب ملتا ہو یا نہ ملتا ہو ۔ قرضہ کے معاملہ میں رہن باقبضہ جائز ہے ۔ اور جب قبضہ لیا جائیگا تو ظاہر ہے ۔ کہ اس سے منفعت اُٹھانا بھی جائز ہے ۔ چنانچہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ گھوڑا رہن رکھ کر اس سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت دیگئی ۔ پس اِسی طرح جائداد غیر منقولہ سے بھی رہن باقبضہ کی صورت میں کوئی شخص نفع اُٹھا سکتا ہے ۔ مثلاً زمین کی پیداوار سے بشرطیکہ اُس کے قبضہ میں ہو اور لگان سرکاری اور آکرے یا اور مواجب جو اُس زمین کے متعلق ہوں ۔ ایسا ہی مکان میں رہائش کر سکتا ہے ۔ یا اُس کو کرایہ پر دے سکتا ہے بشرطیکہ اُس کی مرمت وغیرہ کے اخراجات برداشت کرے +

رکوع نمبر ۴۰/۸
۲۸۴ ۳۸۶ ۔ للّٰہ ما فی السمٰوات وما فی الارض ۔ یہ اس سورت کا آخری رکوع ہے ۔ اور ساری سورت کا گویا خلاصہ ہے ۔ کامل توحید جو اس میں سکھائی گئی ہے اس کا انتہائی مقام یہ ہے کہ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب خدا کا سمجھا جائے ۔ اور انسان اپنی ہستی کو بالکل مٹادے ظاہری معنے کے لحاظ سے اس میں یہ پیشگوئی ہے ۔ کہ جب آسمان و زمین وما فیہما اللہ تعالےٰ کا ہے ۔ تو جو اللہ تعالیٰ کے بندے بنتے ہیں ۔ ان کو اللہ تعالےٰ کیوں عطا نہ فرمائیگا +

۳۸۷ ۔ وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ ۔ کہا گیا ہے ۔ کہ یہ آیت لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا سے منسوخ ہوگئی ۔ مگر اِس قول کو محقق مفسرین نے بھی رد کیا ہے ۔ ان الفاظ کے صاف معنے تو اسی قدر ہیں ۔ کہ جو کچھ تمہارے جی میں ہے ۔ اسکو ظاہر کرو یا چھپاؤ اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ تم سے محاسبہ کریگا ۔ اور اِس مفہوم اور لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا کے مفہوم میں کوئی ایسا تعارض معلوم نہیں ہوتا ۔ کہ ایک کو دوسرے سے منسوخ کرنے کی ضرورت پیش آئے ۔ سورۃ آل عمران کا نزول سورہ بقر کے بعد مانا گیا ہے ۔ اور وہاں پھر اسی کے ہم معنی الفاظ موجود ہیں ۔ قل ان تخفوا ما فی صدورکم او تبدوہ یعلمہ اللہ ۔

لین دین کے معاملات چار طرح پر ہو سکتے ہیں (۱) بیع العین بالعین یعنی لینے دینے کی دونوں چیزیں موجود ہوں (۲) بیع الدین بالدین یعنی لینے دینے کی دونوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ یہ ایک قسم کی فرضی بیع ہے۔ نہ روپیہ موجود ہے نہ مال بلکہ ایک فرضی سودا ہے جیسا کہ آجکل تجارت کے رنگ میں جُوا کھیلا جاتا ہے اس کو اسلام نے منع کیا ہے۔ (۳) بیع العین بالدین (۴) بیع الدین بالعین۔ یہ آخری دونوں صورتیں یعنی جب لینے یا دینے کی چیز میں سے ایک موجود ہو اس آیت کے ماتحت آتی ہیں۔ اور یہی مداینہ ہے۔ اس میں حکم دیا۔ کہ اول تو ایسے معاملات کو لکھ لیا کرو۔ دوسرے گواہ رکھ لیا کرو۔ تا جھگڑے کم ہوں +

عرب ایک اُمّی اور اَن پڑھ قوم تھی۔ اور ان میں لکھنے کا رواج اِس قدر کم تھا۔ کہ ان کے بڑے بڑے عجیب اشعار بھی محض حافظوں میں ہی محفوظ رکھے جاتے تھے۔۔ اور بہت کم ان کے ہاں لکھنے کا رواج تھا۔ ابتداءً یہ حکم ہر ایک لین دین کے معاملہ کو لکھ لینے کا بظاہر انہی کو دیا گیا معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بات حیرت میں ڈالنے والی ہے۔ کہ ایک ایسی قوم کہ جس میں لکھنے کا رواج اس قدر کم ہو۔ اور لکھنے کا مصالحہ کاغذ وغیرہ بھی موجود نہ ہو۔ اُن کو ایسا حکم کیوں دیا جاتا ہے۔ اور کیا بظاہر یہ تکلیف اُن کی طاقت سے بڑھ کر نہیں۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس حکم میں درحقیقت اسلام کی آیندہ کامیابیوں اور مسلمان قوم کے ایک عظیم الشان قوم بنائے جانے کی طرف اشارہ تھا۔ کیونکہ لین دین کے معاملات پیچیدہ ہمیشہ بڑی دولتمند قوموں میں ہوتے ہیں عرب کے لین دین کے معاملات تھے کیا جن کو ایسی وقعت دی جاتی۔ یہ درحقیقت ایک پیشگوئی تھی کہ مسلمان اِس اعلےٰ عروج قومی پر پہنچنے والے ہیں۔ کہ اُن کے معاملات بلحاظ اپنی وسعت اور اہمیّت کے اِس قابل ہو جائیں گے۔ کہ ان کو ضبط تحریر میں لانا ضروری ہوگا +

پھر اسی آیت کو غور سے پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ کہ کس طرح ایک ترقی یافتہ قوم کی اِس قسم کی جملہ ضروریات کی اِس میں بُنیاد رکھی گئی ہے۔ کاتب بھی ہوں جو لکھنے سے انکار نہ کریں مگر کاتب کو اس کا معاوضہ بھی دیا جائے۔ گواہی کے متعلق بھی قانون باندھ دیا۔ کہ گواہ کسی معاملہ میں گواہی سے انکار نہیں کر سکتا۔ مگر گواہ کو اس کے ہرجہ کا معاوضہ دیا جائے۔ اور اس بات کو آج مہذب قوموں نے تسلیم کیا ہے معاملہ کرنے والا بچہ ہو یا بوڑھا۔ یا کم عقل ہو۔ یا کوئی اور امر مانع ہو تو اس کا ولی مقرر ہونا چاہیئے۔ جو اس کی طرف سے کارروائی کرے غرضیکہ وہ تمام امور جن کی ضرورت محسوس کرکے آج قوانین بنانے پڑے ہیں سب کا یہاں ذکر

۲۸۵ تھے اور ایک ہی تھے۔ بلکہ یہ کہ وہ سب خدا کی طرف سے تھے۔ اور سب کا خدا کی طرف سے ہونا ہم مانتے ہیں +

۲۸۶ ۳۹۰۔ ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا ج ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملتہ علی الذین من قبلنا ج ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ ج واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولینا فانصرنا علی القوم الکافرین ۰

سُورت کا خاتمہ اِس پاک دُعاء پر کرتا ہے جس کے آخری الفاظ میں سُورت کی غرض وغایت کو بھی بتا دیا۔ کہ یہ سُورت مسلمانوں کو کامیابی کی راہ بتاتی ہے۔ اور اُس سڑک پر چلاتی ہے جس پر چل کر وہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اور منکرانِ اسلام پر غالب آسکتے ہیں۔ گویا سارے وسائل اور ذرائع کو جن سے حقیقی کامیابی ہوسکتی ہے بیان کرنے کے بعد اب دُعا سکھائی جو اولئک علی ھدی من ربھم واولئک ھم المفلحون کے وعدہ کو پُورا کرے۔ اور اس طرح پر یہ بتا یا کہ جو راہیں بتائی جاتی ہیں اُن پر چلو پھر خُدا سے بھی دُعا کرو تو کامیاب ہو سکتے ہو۔ اس سُورت کی غرض وغایت مسلمانوں کو ایک زندہ اور کامیاب قوم بنانا اُس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور جو شخص زیادہ غور نہ کرے اسکے لئے اوّل وآخر ہی کافی ہے۔ کیونکہ شروع میں فرمایا تھا کہ ان راہوں پر چلو گے تو اولئک ھم المفلحون کا مصداق ہوگے۔ یعنی کامیاب ہو جاؤ گے۔ کیونکہ فلاح کامیابی کو ہی کہتے ہیں۔ اور آخر میں یہ دُعا سکھائی ہے۔ کہ جس میں یہ بتایا کہ اسلام کے مُنکرین پر غالب آنے کے لئے ہمیشہ خُدا سے دُعا کرتے رہو۔ کیونکہ اللہ کا وعدہ ہے کہ دین اسلام کو سب دینوں پر غالب کریگا۔ دین کا غلبہ تو اس کے عقائد اور اُس کی تعلیم کی قبولیّت میں ہے۔ مگر یہ قبولیّت جب عام ہوتی ہے۔ تو ظاہر طور پر بھی ایک غلبہ ملتا ہے۔ کیونکہ اُمرا اور بادشاہ بھی اس میں داخل ہوتے ہیں +

پھر یہ بھی اسلام کی تعلیم کی خوبی ہے۔ کہ اِس فتح وظفر کے ساتھ جو دُعا سکھلائی ہے وہ اِنسان میں فروتنی اور عاجزی پیدا کرنے والی ہے۔ نسیان یعنی بُھول کر ایک کام کا ہو جانا اور خطا یعنی ارادہ کچھ اور ہونے ارادہ کسی دوسرے فعل کا سرزد ہو جانا۔ اس پر عفو کی دُعا سکھائی۔ پھر پہلی قومیں اپنی شامت اعمال سے بڑے بڑے بوجھوں کے نیچے دب گئیں تو اس سے بچنے کے لئے واغفر لنا سکھایا یعنی اللہ تعالیٰ کی حفاظت طلب کرتے رہنا تاکہ ہماری کمزوریاں بدنتائج پیدا نہ کریں۔ پھر بڑے بڑے مقاصد کو حاصل کرنے

آیت ۲۸۴

اللہ کے علم رکھنے سے بھی یہی مُراد ہے۔ کہ چونکہ اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔ اسلئے اسی کے مطابق تم سے محاسبہ کریگا۔ اب یہ کیسا گورکھ دھندہ بن جاتا ہے۔ کہ پہلے ایک آیت نازل ہوتی ہے پھر دوسری سے منسُوخ ہوتی ہے پھر اسی کے ہم معنی آیت نازل ہوتی ہے۔ دراصل یہ معنے ان الفاظ کے نہیں کہ خواہ تم چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ تعالیٰ ضرور ہی اُس پر گرفت کریگا۔ گویا ایک بدی کا خیال اگر دل میں آئے تو پھر چاہے انسان اِس خیال کو عمل میں لائے یا نہ لائے اس پر ویسی ہی گرفت ہوگی۔ بلکہ یحاسبکم بہ اللہ کے صاف معنی صرف یہی ہیں۔ کہ جس حد تک جو کام کرو گے اسی حد تک بھرو گے۔ اگر انسان کے دل میں ایک نیکی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ مگر وہ اُسکو عمل میں نہیں لاتا۔ تو اسی کے مطابق اس کا محاسبہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ گویا خیال جو آیا تو نیکی کر بھی لی۔ ایسا ہی اگر ایک انسان کے دِل میں بدی کا خیال آتا ہے۔ پھر اِنسان اس کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے۔ اور اس پر عمل نہیں کرتا۔ تو یہ بدی کرنے کے برابر نہیں۔ صرف غلط معنے سمجھ کر اس آیت کو منسُوخ کہا گیا ہے۔ بلکہ اقرب تو یہ ہے کہ یہاں خاص خطاب کفار کو ہے۔ کہ جیسی تم تجویزیں اسلام کو ہلاک کرنے کے لئے کر رہے ہو ویسا ہی تم سے محاسبہ بھی ہوگا۔ اور تم ضرور پکڑے جاؤ گے +

۳۸۸۔ فیغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء۔ اللہ تعالیٰ کی مشیّت اُنہی قوانین کے مطابق اپنا کام کرتی ہے جو اس نے بیان فرما دیئے ہیں۔ جب اِنسان نیکی کی طرف قدم اُٹھاتا ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے نیچے آتا جاتا ہے۔ اور جب اس کا قدم بدی کی طرف اُٹھتا ہے اور اُدھر ہی اُٹھتا چلا جاتا ہے۔ تو وہ خود اپنے آپ کو عذاب کے اندر لاتا جاتا ہے +

آیت ۲۸۵

۳۸۹۔ اٰمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون کل اٰمن باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ۔ اسلام کی وسعت جس کا ذکر شروع میں بھی کیا درمیان میں بھی۔ اب آخر میں پھر اس کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ کہ مسلمان اِنسان اُسی وقت بنتا ہے۔ جب خدا کی ساری کتابوں اور سارے رسُولوں پر ایمان لاتا ہے۔ یہ درحقیقت تفسیر ہے اُس کی جو فرمایا تھا۔ والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک۔ گویا انزل میں کتابیں اور رسُول داخل ہیں۔ اور ایسا ہی ما انزل من قبلک تفسیر ہے کتبہ ورُسلہ کی۔ کہ کتابوں اور رسُولوں سے مُراد وہ کتابیں اور رسُول ہیں۔ جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے آچکے +

لا نفرق بین احد من رسلہ کے یہ معنے نہیں۔ کہ سب رسُول ایک ہی مرتبہ کے

کے لئے سخت کوششیں کرنی پڑتی ہیں۔ اس کے لئے فرمایا دُعا کرو۔ وارحمنا
یعنی اللہ تعالےٰ اپنے رحم کا معاملہ کرے۔ اور مشکلات حائل نہ ہو جائیں جن کی برداشت
کی طاقت ہی نہیں۔ سب کا نتیجہ ہے فانصرنا علی القوم الکافرین +

ولقد یسرنا القرآن للذکر فہل من مدکر

# نکات القرآن

## حصہ سوم

## سورۃ آل عمران

مرتبہ

مولوی **محمد علی** صاحب ایم-اے

سنہ ۱۹۱۶ء

قیمت فی جلد ۸؍ — تعداد اشاعت ایک ہزار — طبع اول

حمیدیہ سٹیم پریس لاہور باہتمام ابو نظام الدین مستاجر چھپا

ملنے کا پتہ - ماسٹر فقیر اللہ صاحب احمدیہ بلڈنگس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلی علےٰ رسولہ الکریم

# ضروری نوٹ

پہلے پارہ کے تفسیری نوٹ شائع ہوتے ہی اُن کا کثیر حصہ ہاتھوں ہاتھ نکل گیا - اسلیئے میںنے ارادہ کیا تھا کہ دوسرے پارہ کے نوٹوں کو فوراً شائع کردوں - اور اس غرض کے لیئے اُن کی کتابت وغیرہ ہو چکی تھی کہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے کچھ التواء ہوگیا - اِسی اثناء میں مجھے بھی کچھ وقت کے لیئے باہر جانا پڑا - اور پھر یہ بھی خیال ہوا کہ دوسرے حصہ میں بجائے پارۂ دوم کے تفسیری نوٹ شائع کرنے کے سُورۂ بقرہ کو ختم کردوں چنانچہ یہ حصہ سُورۂ بقرہ کو ختم کرتا ہے - نام میں میں نے تبدیلی کردی ہے یعنی بجائے تفسیری نوٹ کے نکات القرآن نام تجویز کیا ہے - اور چونکہ خدا نے چاہا تو سارے قرآن شریف پر اس طرح کے نوٹ شائع کرنے کا ارادہ ہے اسلیئے اس کو میں نے حصہ دوئم قرار دیا ہے - غالباً اِسی قدر حجم کے یعنی سو سو صفحے کے یہ حصص وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہینگے جن میں عموماً دو دو پاروں کے نوٹ آسکیں گے - واللہ الموفق والمعین +

محمد علی - احمدیہ بلڈنگس نولکھا لاہور

## اخبارات کی رائیں

میری اِس ناچیز کوشش کی جس کی غرض صرف خدمت قرآن ہے - جو قدر دانی پبلک نے کی ہے - اس کے متعلق صرف ذیل کے دو اقتباس کافی ہونگے :-

### زمیندار ۱۵ - اپریل سنہ ۱۹۱۵ء

"جناب مولوی محمد علی صاحب ایم اے اُن عزیز الوجود بزرگوں میں سے ہیں جن کی عالمانہ زندگی کا کوئی لمحہ خدمتِ اسلام سے خالی نہیں رہتا - وہ روزانہ قرآن کریم کا درس دیتے ہیں - اور ہر آیت کی تفسیر میں حقائق و معارف کے دریا بہا دیتے ہیں حال میں اس درس مقدس کے بعض اہم اقتباسات انھوں نے خود ہی قلمبند کرکے شائع فرمائے ہیں - جن میں اکثر آیات جزو اوّل اور کسیقدر آیات جزو ثانی کی تفسیر ہے - اور اس خوبی کی تفسیر ہے کہ شاید اُردو زبان کا خزانہ ایسے تابناک جواہر ریزے بڑی مشکلوں سے بھی نہ نکال سکے" +

### وطن ۱۳ - اپریل سنہ ۱۹۱۵ء

"مولوی صاحب موصوف نے قرآن شریف کے پہلے پارے کے تفسیری نوٹ لکھکر شائع کئے ہیں ہمارے پاس بھی ایک کاپی بغرض ریویو اُنھوں نے بھیجی ہے ..... کاغذ لکھائی چھپائی سب موزون اور قابل تعریف ہے اس وقت تک کثرت مشاغل کے سبب بالاستیعاب اس کتاب کو پڑھنے کا موقع نہیں ملسکا لیکن جستہ جستہ مختلف مقامات کو ہمنے دیکھا ہے اور اسبات کا یقین ہوگیا ہے کہ یہ نہایت مفید کتاب ہے ..... اس کی قدر مسلمانوں کو ضرور کرنی چاہیئے جیسی کہ مولوی صاحب کے علم و فضل سے توقع تھی انہوں نے زمانۂ حال کی ضروریات اور غیر مذاہب والوں کے اعتراضات کو جو وہ قرآن شریف پر کیا کرتے ہیں پیش نظر رکھکر یہ نوٹ لکھے ہیں ..... ہماری خواہش ہے کہ مولوی صاحب موصوف اسی طرح پورے قرآن شریف کے تفسیری نوٹ شائع کرسکیں ..... ہم اپنی طرف سے اِس کتاب کی پچاس جلدیں خرید کر مساجد کے اُن اماموں کو جو کم استطاعت ہیں فائدہ عام کے لیئے مفت تقسیم کرنا چاہتے ہیں" +

مطبوعہ نولکشور پریس لاہور

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

# سورۃ ٣ - آل عمران

## (٢٠- رکوع اور ١٩٩- آیات)

نام

٣٩١- اس سورت کا نام آل عمران ہے۔ عمران حضرت موسےٰ اور ہارون کے والد کا نام ہے۔ اور چونکہ اس سورت میں نبوت کے سلسلہ موسویہ سے رخصت ہونے کا ذکر ہے۔ اور اس سلسلہ کے آخری نبیوں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسےٰ علیہ السلام اور بالخصوص آخر الذکر کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے۔ اس مناسبت کے لحاظ سے اس کا نام آل عمران رکھا گیا ہے +

نزول

٣٩٢- ترتیب نزول کے لحاظ سے اس سورت کا تعلق سورہ بقرہ سے وہی ہے۔ جو ترتیب قرآنی کے لحاظ سے یعنی اس کا اکثر حصہ سورہ بقرہ کے بعد نازل ہوا ہے۔ تیرھویں رکوع سے لے کر قریباً آخر تک اس سورت میں جنگ احد کے واقعات کا ذکر ہے۔ اور اس لیے اس حصہ کا نزول سنہ ٣ ہجری کا متعلق ہے۔ ابتدائی حصہ میں بالخصوص عیسائی مذہب کی تردید ہے۔ اسی حصہ میں آیت مباہلہ بھی ہے جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے۔ کہ اگر یہ عیسائی دلائل کو نہیں مانتے تو اُن کو مباہلہ کے لیئے بلاؤ۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نجران کے عیسائی وفد کو اس حکم الٰہی کی تعمیل میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مباہلہ کے لیئے بلایا تھا۔ وفد نجران سنہ ٩ ہجری میں آیا۔ مگر یہ قرین قیاس نہیں۔ کہ اس سورت کا سارا ابتدائی حصہ جس میں عیسائی مذہب پر بحث ہے اور جو درحقیقت ٨٠ آیت تک یا اُس کے بھی بعد تک چلتا ہے۔ اس سال میں نازل ہوا ہو۔ اور نہ اس بات کا کوئی ثبوت ہے۔ کہ یہ اس وقت نازل ہوا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے وفد نجران کے مقابلہ پر پیش کیا۔ مگر اس سورت میں تو قرین قیاس یہی ہے کہ نازل شدہ پہلے کا تھا۔ ان لوگوں کے سامنے اسے پیش کیا گیا۔ ممکن ہے کہ خاص آیت مباہلہ کا نزول اسی وقت کا ہو۔ اور یا یہ بھی پہلے کی نازل شدہ ہو۔ بہرحال بڑا اور اکثر

ایک بڑی جمعیّت کے ساتھ اس ارادہ سے آیا تھا۔ کہ مُسلمانوں کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دے گویا وہاں قانون اور اصُول کے رنگ میں بعض امُور بیان کیئے ہیں۔ تو یہاں ایک خاص واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر جن وجُوہات سے اس جنگ میں مُسلمان پُوری کامیابی حاصل نہیں کر سکے اُن پر بحث کی ہے پچھلی سوُرت کے آخری حصّہ اور اس سورت کی ابتداء میں بھی ایک تعلّق ہے۔ وہاں آخری رکوع میں بیان فرمایا ہے کہ مُسلمان وُہ ہے جو سب سوُلوں پر ایمان لاتا ہے۔ تو یہاں ابتداء میں توریت اور انجیل کا خصُوصیّت سے ذِکر کیا ہے۔ کہ اُنکو بھی اللہ تعالےٰ نے نازل فرمایا۔ اور وہاں سُورت کو فانصرنا علی القوم الکافرین پر ختم کیا یعنی اس دُعاء پر کہ ہم کفّار کے ہاتھ سے ہلاک نہ ہوجائیں۔ بلکہ کفّار کے خلاف تو ہماری مدد فرما۔ تو اس سوُرت کا ابتداء اللّٰہ لا الٰہ الا ھو الحی القیّوم سے کیا۔ جن اسماء میں مسلمانوں کے احیاء اور قیام کی طرف اشارہ ہے۔ گویا وہ دُعا سُنی گئی ہے۔ اور مُسلمانوں کو یہ وعدہ دیا گیا ہے۔ کہ تم ہلاک نہیں ہوگے۔ بلکہ ایک زندہ اور طاقتور قوم بنائے جاؤگے ✤

خلاصہ و ربط مضامین

۳۹۴۔ اس سورت کے مضامین میں بھی اسی طرح ترتیب اور ربط ہے۔ جیسے سوُرہ بقرہ میں دکھایا گیا تھا۔ پہلے رکوُع میں اللہ تعالےٰ کی اُن صفات کا ذکر کرکے جو نہ صرف غلبۂ توحید اور مسلمانوں کے احیاء کی خوشخبری دیتی ہیں۔ بلکہ عیسائیت کے باطل عقیدہ کی بھی تردید کرتی ہیں۔ اور اس کے بعد بڑی فراخ دلی سے قرآن کے ساتھ توریت اور انجیل کو بھی منجانب اللہ مان کر کتب الٰہیہ کے معنے کرنے میں ایک ایسا محکم اصُول بتا دیا ہے۔ کہ جس کو ہاتھ میں لیکر ایک مسلمان دوُسرے مذاہب کی کتب مقدّسہ کو مانتا ہوُا نہ صرف اُن مذاہب پر غالب آ سکتا اور اسلام کی صداقت کو اُن کے مقابل میں روشن کر سکتا ہے۔ بلکہ اس اصول پر کاربند ہو کر اور قرآن کریم کی تفسیر میں اسے ملحُوظ رکھ کر مسلمانوں کے اندرونی اختلافات بھی بہُت کم ہو جاتے ہیں۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ مُتشابہات کو محکمات کے یا مخصُوصات کو کسی قانون اور اصُول کے ماتحت کیا جائے۔ اِس قانون کو ایک ایسی سورت کے شروُع میں بیان کرکے جو عیسائی مذہب کی تردید کرتی ہے۔ درحقیقت اس طرف اشارہ کیا ہے کہ عیسائیوں کو سب سے بڑی غلطی یہی لگی ہے کہ وُہ متشابہات یا مخصُوصات کو ہاتھ میں لیکر اُن سے ایسا مفہوُم نکالتے ہیں۔ جو محکمات یا اصُول کے خلاف ہوتا ہے۔ اور چونکہ اس قانون تفسیر کی خلاف ورزی کرکے دُنیا کا ایک بڑا حصّہ عیسائی مذہب کی وجہ سے چاہ ضلالت میں گرا ہے۔ اِس لیئے اس سوُرت کا پہلا رکوُع درحقیقت ایک فیصلہ کن دلیل اس باطل کی تردید کی ہمارے ہاتھ میں دیتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے رکوُع میں جنگ بدر میں آنحضرت

حصّہ اس سورت کا ۳ھ ہجری کا معلوم ہوتا ہے +

بعض عیسائی مصنّفین نے لکھا ہے کہ اس سورت کی چھبیسویں اور ستائیسویں آیات کا تعلق اس سورت کے مضمون سے کچھ نہیں اور یہ مکّی آیات ہیں جو یہاں بلا لحاظ ترتیب رکھدی گئی ہیں۔ حالانکہ ادنیٰ فکر سے بھی انسان معلوم کر سکتا ہے۔ کہ یہ دونوں آیات ہی اس سورت کی کُنجی کا کام دیتی ہیں۔ کیونکہ اصل غرض سُورت کی جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا۔ یہی ہے۔ کہ سلسلہ مُوسویہ میں نبوّت کے خاتمہ کا ذکر کرے۔ اب ان دونوں آیات میں کیا ذکر ہے۔ قل اللھم مالك الملك تؤتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء ۔ ان الفاظ میں یہ صاف اشارہ ہے۔ کہ ایک قوم سے مُلک لے لیا جائے گا۔ اور ایک دُوسری قوم کے سپُرد کیا جائے گا۔ اور ایک قوم جس کو پہلے عزّت دی گئی تھی اُسے ذلیل کردیا جائے گا۔ اور جو ذلیل نظر آتے ہیں اُن کو عزّت دیجائے گی۔ یہاں مُلک سے درحقیقت وہی بادشاہت مُراد ہے جس کو حضرت مسیح نے انگورستان والی تمثیل میں خدا کی بادشاہت کہا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ خبر دی ہے کہ وہ بادشاہت بنی اسرائیل سے لیلی جائے گی۔ جیسا کہ متی ۲۱: ۴۳ میں آپ کا یہ قول درج ہے "اس لیئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی۔ اور ایک قوم کو جو اس کے میوہ لاوے دی جائے گی" پس تؤتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء کی آیت بے تعلّق نہیں۔ بلکہ اس سورت کے ساتھ تو اس کا خاص تعلّق ہے۔ کیونکہ اس میں بنی اسرائیل سے نبوّت کے چلے جانے کا ذکر ہے +

تعلق ۲۹۳۔ اس سورت کا تعلّق سورہ بقرہ سے نہایت صاف اور واضح ہے۔ یہاں تک کہ ان دونوں سورتوں کو الزھراوان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور اس طرح پر گویا یہ دونوں سورتیں ایک کے حکم میں ہیں۔ جو باتیں سورہ بقرہ میں اشارہ کے رنگ میں بیان کی گئی ہیں۔ ان کو یہاں واضح کردیا ہے۔ اور جو وہاں کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ ان کا ذکر عموماً یہاں اشارہ اور کنایہ کے رنگ میں کر دیا گیا ہے۔ سورہ بقرہ میں زیادہ تر خطاب یہودیوں سے ہے۔ اور تھوڑا عیسائیوں سے سورہ آل عمران میں زیادہ تر خطاب عیسائیوں سے ہے اور تھوڑا یہودیوں سے۔ سورہ بقرہ میں یہ ذکر کیا گیا ہے۔ کہ مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت اس لیئے دیجاتی ہے کہ کفار دین اسلام کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ اب قتال فی سبیل اللہ میں ہی اُنکی زندگی ہے۔ اور پہلی قوموں کی مثالیں دے کر سمجھایا گیا ہے۔ کہ اُنھوں نے خدا کی راہ میں جنگ کرنے سے انکار کیا۔ تو موت کا فتویٰ اُن پر صادر ہوگا۔ سورہ آل عمران میں اُن جنگوں میں سے بعض کا ذکر ہے۔ اور بالخصوص تفصیل کے ساتھ جنگ احد کے واقعات کا ذکر ہے جس میں دشمن

علیہ وسلم کی پیشگوئی کی تھی۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے سب نبیوں کی تصدیق کرکے اور سب پر ایمان لانا ضروری قرار دے کر یہ ثابت کر دیا کہ ان پیشگوئیوں کے مصداق آنجناب ہی ہیں۔ دسویں رکوع میں یہ بیان فرمایا کہ جس طرح اس آخری نبی کی سب نبیوں نے خبر دے کر اسے درحقیقت اوّل النبیین ثابت کیا اسی طرح اس کا قبلہ بھی وہ مبارک گھر قرار دیا گیا جو توحید کا سرچشمہ ہونے کے لحاظ سے اوّل بیت وضع للناس ہے جس سے پہلے دُنیا کی تاریخ سے کسی معبد الٰہی کے ہونیکا پتہ نہیں لگتا۔ اور یہ مبارک گھر جس طرح سب سے پہلا گھر ہے سب سے آخری گھر بھی ہے۔ کیونکہ یہ مُبارک ہے جسکی خیر و برکت کبھی منقطع نہ ہو گی۔ پس گیارھویں رکوع میں یہ بتایا کہ جب ہم نے اس نبی کو دُنیا کے سارے نبیوں کی تعلیم کا جامع اور ان کی پیشگوئیوں کا مصداق بنا کر بھیجا ہے۔ جس کے ذریعہ سے ہم دُنیا کی کل قوموں کو ایک سلسلۂ اخوت میں منسلک کرنا چاہتے ہیں تو اب کسقدر ضروری ہوا کہ جو لوگ اسکے پیچھے چلیں وُہ اپنے اندر ایسے اختلاف پیدا ہونے دیں جو ایک فریق کو دُوسرے فریق سے اسی طرح دور ڈالدیں جس طرح پہلے ایک قوم دُوسری قوم سے دُور پڑی ہوئی ہے۔ اسلام نے چونکہ دُنیا میں ایک عظیم الشان سلسلۂ اخوت قائم کرنا ہے جسکی بنیاد اللہ تعالیٰ نے عرب جیسی جنگجو قوم کو جو کنتم علی شفا حفرۃ من النار کا مصداق تھی۔ بھائی بھائی بنا کر رکھدی تو اس لیئے ضروری ہوا کہ سب مسلمان ایک حبل اللہ کو مضبُوط پکڑلیں اور تمام اختلافات کے ہوتے ہوئے جو فطرت انسانی کا تقاضا ہے اسی حبل اللہ کے ماتحت جو قرآن کریم ہے اپنے آپکو رکھیں۔ کیونکہ اگر ایک دُوسرے کی بیخکنی کے درپے ہو جائیں گے۔ تو نتیجہ وہی ہوگا جو پہلی قوموں نے پایا۔ کہ اُن کے مُونھ سیاہ ہو جائیں گے۔ یعنی ناکامیوں اور نامرادیوں کا شکار رہیں گے اور جب آپس کے اندر اتفاق اور اتحاد کے لیئے نصیحت کی گئی تو ساتھ ہی یہ بھی بتانا ضروری ہوا کہ دوسروں کیساتھ کس قسم کے تعلّقات چاہئیں۔ پس بارھویں رکوع میں یہ فرمایا کہ مُسلمانوں کو دُنیا میں قائم کرنیکی غرض تو یہ ہے کہ لوگوں کی بھلائی چاہیں۔ مگر اہل کتاب میں چونکہ اکثر لوگ فاسق ہیں اور مسلمانوں کی ایذا کے درپے ہیں گو وہ مسلمانوں کو کوئی بڑا نقصان نہیں پُہنچا سکیں گے۔ اس لیئے یہ مناسب نہیں کہ اُن کے ساتھ ایسی حالت میں اہل اسلام کے دوستانہ اور رازدارانہ تعلّقات ہوں۔ کیونکہ اُن کے دلوں میں مسلمانوں کے لیئے بغض بھرا ہوا ہے ٭

تیرھویں رکوع سے آخر سورت تک غزوہ اُحد کے واقعات اِس میں مسلمانوں کو جو چشم زخم پُہنچا۔ اسکے اسباب وغیرہ امور پر بحث ہے۔ تیرھویں رکوع میں تو یہ بیان فرمایا کہ کس طرح پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم دشمن کے مقابلہ کے لیئے باہر نکلے اور بعض لوگ دشمن کی کثرت کی وجہ سے خوف زدہ ہو رہے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ملائک کی نصرت کا وعدہ دیا اور فرمایا کہ جس غرض کے لیئے یہ لوگ چڑھ کر آئے ہیں کہ مُسلمانوں کو نابود کر دیں اسمیں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ چوھویں رکوع میں کامیابی کے موٹے موٹے اصُول بیان فرمائے۔ سود نہ کھاوُ۔ اللہ اور رسول کی پُوری اطاعت کرو۔ آسایش اور تکلیف میں خرچ کرنے کی عادت ڈالو۔ عفو اور درگذر سے کام لو۔ اگر کوئی بُرا کام ہو بھی جائے تو جھٹ توبہ کرو اور اصلاح کرو۔ پہلی قومیں کس طرح تباہ ہوئیں اس پر بھی غور کرو۔ بڑے بڑے مصایب برداشت کرنیکے لیئے تیار رہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب کریگا۔ پندرھویں رکوع میں بیان فرمایا کہ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جنگ میں قتل بھی

صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے نشان کی طرف توجہ دلا کر توحید الٰہی کو سب مذاہب کی اصلی بنیاد بیان کیا گیا ہے اور ضمناً یہ پیشگوئی ہے کہ توحید الٰہی ہی آخر کار غالب ہوگی۔ اور چونکہ بنی اسرائیل توحید سے بہت دور جا پڑے تھے حتیٰ کہ ان کے ایک گروہ عظیم نے توحید کو نابود کرنا اور تثلیث کو دُنیا میں پھیلانا چاہا۔ حالانکہ توحید کا دُنیا میں پھیلانا ہی نبوت کا اصل کام تھا۔ اسلیئے تیسرے رکوع میں یہ بیان فرمایا کہ اب ملک اور عزت بنی اسرائیل سے لیکر ایک دوسری قوم کو دیئے جاتے ہیں جو ان کی اہل ہے۔ چوتھے رکوع میں سلسلہ بنی اسرائیل کے جو ایک منتخب اور برگزیدہ قوم تھی۔ آخری افراد کا ذکر فرمایا یعنی ایک طرف ذکریا اور اُن کے فرزند یحییٰ کا اور دُوسری طرف مریم صدیقہ کا جن سے مسیح نے پیدا ہو کر سلسلہ بنی اسرائیل میں نبوت کا خاتمہ کرنا تھا۔ پانچویں اور چھٹے رکوع میں حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش بچپن۔ بڑھاپے۔ نبوت تعلیم نشانات وفات اور تطہیر کا ذکر کر کے یہ بتایا۔ کہ وہ کسی بات میں انسانوں سے بڑھ کر نہیں۔ اور ایک ہٹ دھرم قوم کو جس نے ان تمام دلایل کی کچھ پروا نہ کی آخر مباہلہ کی طرف بُلایا۔ اور جب دیکھا کہ دلائل کیطرف بھی متوجہ نہیں ہوتے اور مباہلہ سے بھی انکار کر دیا تو ساتویں رکوع میں ایک اور پہلو سے انکو ملزم کیا۔ یعنی تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم کے پہلو سے جسکا ماحصل یہ ہے کہ سب مذاہب میں جو امر مشترک ہے۔ اس کو پہلے بطور اصول قایم کر لو۔ تو وہ اصول یہ معلوم ہوگا کہ الا نعبد الا اللہ یعنی اللہ کے سوائے کسی کی عبادت نہ کریں۔ پھر جسقدر تنازعات ہیں اُنکو اس اصول پر لا کر رکھیں تو نتیجہ یہ معلوم ہوگا کہ لا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ۔ کیونکہ ارباباً من دون اللہ میں آ کر سب کا اختلاف ہو جاتا ہے اور اصل اصول کے یہ خلاف بھی ہے۔ تو پس حق وہی ہے جو امر مشترک ہے۔ اس اصل کو بیان کر کے مذاہب کے مقابلہ کے اصول کی بُنیاد رکھی ہے اور یہی وہ اصول ہے جس پر آج اسلام یورپ میں غالب ہو رہا ہے۔ اور آخر کار کامل طور پر غالب ہوگا۔ اس اصول کے ساتھ ہی حضرت ابراہیم کا ذکر بھی فرمایا۔ کیونکہ حضرت ابراہیم کی بزرگی یہودیوں عیسائیوں اور عرب کے بُت پرستوں میں مسلم تھی۔ گویا وہ ان سب کے مشترک بزرگ ہیں پس اگر اُن کے مذہب کو لیا جائے تو وہ بھی کامل توحید کا ہی مذہب ہے جس میں اور کسی قسم کی ملاوٹ ثابت نہیں ہوتی۔ آٹھویں رکوع میں یہ بیان فرمایا کہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں ظاہر نہ ہوتا تو پہلی پیشگوئیاں۔ بالخصوص وہ مثیل والی عظیم الشان پیشگوئی اسی طرح دھری رہجاتیں۔ اور نعوذ باللہ خدا پر یہ الزام آتا۔ کہ ایک وعدہ کر کے اُسے کیوں پورا نہ کیا۔ پھر بتایا کہ یہ پیشگوئیاں ایک امانت کے طور پر اہل کتاب کے سپرد کی گئی تھیں۔ مگر انکی اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ مال دُنیا کی امانت کی پروا نہیں کرتے تو خدائی امانت کو کہاں ادا کرنے لگے۔ اسی رکوع کے اخیر پر یہ بھی فرمایا کہ نبی تو خدا کی توحید قایم کرنے آتا ہے۔ وہ کیونکر کہہ سکتا ہے کہ مجھے خدا بنا لو۔ نویں رکوع میں اسی مثیل والی پیشگوئی کو اور وسعت دی اور فرمایا کہ ایک حضرت موسیٰ کیا۔ کل نبی یہ پیشگوئی کر گئے تھے کہ ہم الگ الگ قوموں کے لیئے پیغام لائے ہیں۔ مگر سب سے آخر وہ ایک نبی آئیگا جو کل کا مصداق ہوگا۔ اور اسی رکوع میں یہ بھی بتایا کہ جس طرح سب نبیوں نے آنحضرت صلی اللہ

اشارہ کیا ہے کہ حضرت عیسٰے کا مذہب بھی بگڑ چکا۔ اور اس کے بعد تو کوئی دوسرا مذہب لوگوں کی اصلاح کے لیئے بھیجا نہیں گیا تھا۔ جو راستی پر ہونے کی وجہ سے دُنیا کی اصلاح کر سکتا۔ تو کیا اب ضروری نہ تھا کہ خدا کی طرف سے نیا کلام نازل ہوتا *

۳۹۷ مصدقا لما بین یدیہ۔ قرآن کریم کو یہاں اُن تمام وحیوں کا مصدق کہا گیا ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔ کیونکہ ان سب پر ایمان لانا قرآن کریم نے ضروری قرار دیا اور در حقیقت یہ ایک ہی کتاب ہے جس نے دُنیا کے تمام نبیوں کو سچا قرار دیا اور انکی سچائی پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔ اور اُن کے اندر جس قدر صداقتیں تھیں ان سب کو اپنے اندر جمع کر کے اُن کی تکمیل بھی کی۔ پس علاوہ سابقہ کتب کی پیشگوئیوں کے پورا کرنے کے (جسکے لیئے دیکھو نوٹ نمبر ۹۲) یہ تصدیق بھی مصدق کے لفظ میں پائی جاتی ہے *

۳۹۸۔ وانزل التورٰیۃ والانجیل۔ سورہ بقرہ میں توریت اور انجیل کا نام نہیں لیا۔ گو ما اوتی موسٰے و عیسٰے کا ذکر فرمایا ہے۔ سو توریت وہ کتاب ہے جو حضرت موسٰی کو دی گئی۔ اور انجیل وہ کتاب ہے جو حضرت عیسٰے کو دی گئی توریت۔ وری سے مشتق ہے اور وری کے اصل معنے تو ستر یعنی ڈھانکنے کے ہیں۔ مگر وری کا لفظ روشن کرنے کے معنے میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے افرءیتم النار التی تورون میں کیونکہ وری الزند کے معنے زند سے آگ نکالنے کے ہیں۔ پس توریت گویا تو اس لیئے توریت کہا کہ بعض مسایل اس کے اندر مستور رکھے گئے۔ جیسے معاد کے مسایل۔ اور یا اس لیئے کہ اس میں نور اور روشنی ہے۔ جیسا کہ توریت کو بار بار ھدی و نور کہا ہے۔ اور ایک جگہ ضیاء بھی کہا ہے۔ ولقد اٰتینا موسٰی و ھٰرون الفرقان و ضیاء اور انجیل مشتق ہے۔ عرب کے اس قول سے نجلت الشئ یعنی میں نے اس کو ظاہر کیا۔ تو انجیل میں چونکہ بار بار اٰتی و بعدی کا اظہار ہے جو نبی کریم صلّے اللہ علیہ وسلّم کے ظہور کے متعلق ہیں۔ اس لیئے اسے انجیل کہا۔ اور یونانی لفظ ایونجیل ہے۔ جس کے معنے خوشخبری ہیں۔ اور اس لیئے انجیل کے معنے بشارت ہیں۔ اور بشارت اسکو اسلیئے کہا۔ کہ اس میں نبی کریم صلّے اللہ علیہ وسلم کے آنے کی بشارت ہے۔ اور یہ معنے اس کے اشتقاق سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ بائبل جو پرانے اور نئے عہد ناموں کا مجموعہ ہے۔ توریت اور انجیل نہیں۔ نہ صرف ان دونوں کا مجموعہ ہے۔ پرانے عہد نامے میں تو علاوہ حضرت موسٰے علیہ السلام کی پانچ کتابوں کے اور بہت سی کتابیں انبیائے بنی اسرائیل کی ہیں۔ جن میں سے زبور بھی ہے۔ اور یونس کی کتاب ایوب کی کتاب سلیمن کی کتاب وغیرہ۔ اور نئے عہد نامے میں چار اناجیل ہیں۔ جن میں حضرت مسیح کی انجیل کوئی نہیں۔ بلکہ ایک متی کی انجیل ہے۔ ایک مرقس کی ایک لوقا کی ایک یوحنا کی۔ حالانکہ قرآن کریم جس انجیل کا ذکر کرتا ہے وہ وہ کتاب ہے جو حضرت عیسٰی علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اور نئی تحقیق نے جو انجیل کے بارے میں کی گئی ہے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ موجودہ اناجیل میں سے کم از کم پہلی تین اناجیل کا کوئی ایک ماخذ تھا۔ مگر وہ کتاب گم ہو چکی ہے۔ ممکن ہے وہی اصل انجیل حضرت مسیح علیہ السلام کی ہو۔ اور علاوہ ان چار

آیت

ہو جائیں تو کیا مسلمان اسلام کو چھوڑ سکتے ہیں اور پھر اس ضلالت میں گرنا پسند کر سکتے ہیں۔ جس سے اسلام نے انھیں باہر نکالا ہے۔ اور فرمایا کہ پہلے نبیوں کی معیت میں نیک لوگوں کو دشمنان دین کے ساتھ جنگ کرنے پڑی سو کامیابی استقلال سے ملتی ہے۔ سولھویں رکوع میں بتایا کہ احد کے جنگ میں جو مسلمانوں کو ہم و غم اور تکلیف اٹھانی پڑی تو اسکی وجہ بعض لوگوں کی نافرمانی تھی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کے مطابق ان کو دشمن پر قابو دیدیا تھا۔ مگر باایں ساری گھبراہٹوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھر سکون عطا فرمایا اور جن سے کمزوری سرزد ہوئی تھی انکو معاف فرما دیا۔ سترھویں رکوع میں فرمایا کہ اس جنگ کے واقعات نے سچے مومنوں اور منافقوں کے درمیان تمیز کر دی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق فاضلہ کو بھی اس موقعہ پر ظاہر فرمایا کہ کیسی وسیع القلبی سے آپنے عفو سے کام لیا باقی رہیں منافقوں کی باتیں۔ سو خدا تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔ کہ اس مصیبت کے ذریعہ سے انکو مومنوں سے الگ کر دیتا۔ اٹھارھویں رکوع میں بتایا کہ سچے مومن کبھی دشمن کی طاقت سے یا اسکی کثرت سے گھبراتے نہیں۔ کیونکہ دشمن اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ انیسویں رکوع میں یہود کے بیہودہ اعتراضات کا جواب ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ انکا سلوک نبیوں سے ہمیشہ ہی ایسا رہا ہے۔ باقی رہیں مسلمانوں کی تکلیفیں سو اہل کتاب اور مشرکوں کی طرف سے کچھ نہ کچھ دکھ مسلمانوں کو ہمیشہ پہنچتا ہی رہے گا۔ سو اس پر صبر سے کام لینا چاہیئے۔ آخری رکوع میں پھر مسلمانوں کو کچھ دعاؤں کی تعلیم دے کر ان کی کامیابی اور اُن کی فتح و ظفر کا وعدہ دیا ہے اور آخر پر فرمایا کہ دشمن کے مقابلہ کے لیئے ہمیشہ طیار رہو۔

رکوع ۱/۹ آیت ۱-۲

۳۹۵۔ الم ○ اللہ لا الہ الا ھو الحي القيوم۔ الم کے معنے انا اللہ اعلم نوٹ نمبر ۲۴ میں بیان ہو چکے ہیں یہاں مقطعات قرآنی پر مفصل بحث ہے۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید۔ اس کے حي اور قیوم ہونیکا ذکر [illegible] عیسائی مذہب کی تردید کی ہے لا الہ الا ھو میں تثلیث کی تردید اور حي قیوم میں مسیح کے خدا ہونے کی تردید ہے کیونکہ مسیح پر موت وارد ہوئی وہ حي نہیں کہلا سکتا۔ اور جو خود قائم نہ ہو وہ دوسروں کے قیام کا موجب کیونکر ہو سکتا ہے۔ چونکہ اس سورت میں عیسائی مذہب کی تردید اصل غرض ہے۔ اس لیئے شروع ایسے صفات سے فرمایا جن میں اس مذہب کی تردید ہو +

۳

۳۹۶۔ نزل عليك الكتاب بالحق تجھ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی۔ اہل لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ حق وہی ہے جو حسب اقتضائے حکمت ہوا ہو۔ پس قرآن کریم کے اقتضائے حکمت کے مطابق نازل کرنے سے یہ مراد ہے کہ ضرورت حقہ کے ساتھ نازل ہوا۔ یعنی بلا وجہ اور عبث طور پر ایک کام نہیں بلکہ حکمت الٰہی اس بات کی مقتضی تھی کہ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہوتا۔ تمام دنیا میں تاریکی پھیل چکی تھی پچھلے سلسلہ رسل میں جو رسول سب سے آخر تھا اس کو آئے ہوئے بھی چھ سو سال گذر چکے تھے اور خود حضرت مسیح کا مذہب جو دنیا کے لیئے موجب ہدایت ہو سکتا تھا وہ بھی بگڑ چکا تھا۔ یہ وہ امر ہے جس کا اعتراف سر ولیم میور نے اپنے دیباچہ لائف آف محمد صلے اللہ علیہ وسلم میں کیا ہے اور بالحق میں ضرورت حقہ کو بتا کر یہ بھی

طریق معلوم ہو سکتا ہے۔ تفاسیر میں لکھا ہے کہ جب وفد نجران آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوُا تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن سے حضرت مسیح کے بارہ میں گفتگو کی اور فرمایا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ حي اور قیوم ہے۔ اُنھوں نے اقرار کیا کہ ہاں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ عیسےٰ تو حي و قیوم نہیں پھر آپنے فرمایا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ خدا تعالےٰ پر آسمان و زمین کی کوئی شے مخفی نہیں۔ مگر عیسےٰ علیہ السلام کو تو سب باتوں کا علم نہ تھا۔ اُنھوں نے اقرار کیا کہ ہاں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ حضرت عیسےٰ کی صورت رحم میں خدا نے بنائی یا نہیں۔ اُنھوں نے کہا ہاں۔ پھر آپنے فرمایا کہ کیا تم نہیں جانتے۔ کہ خدا نہ کھانا کھاتا ہے نہ پانی پیتا ہے۔ نہ قضائے حاجت بشری کی ضرورت رکھتا ہے۔ مگر تم جانتے ہو کہ عیسےٰ ایک عورت کے پیٹ میں حمل میں آئے جس طرح عورتوں کو حمل ہوُا کرتا ہے (یہ الفاظ قابل غور ہیں۔ اصل لفظ یوں ہیں دیکھو تفسیر کبیر۔ ان عیسےٰ حملته امراة کحمل المرأة۔ جس کا لفظی ترجمہ یوں ہوگا۔ کہ عیسےٰ کو ایک عورت نے حمل میں لیا۔ عورت کے حمل کی طرح۔ یعنی جس طرح عورتوں کو حمل ہوُا کرتا ہے) اور اس کو جنا جس طرح عورتیں جنا کرتی ہیں۔ اور اُس کی پرورش کی جس طرح بچوّں کی پرورش کی جاتی ہے۔ پھر وہ کھانا بھی کھاتا تھا۔ پانی بھی پیتا تھا اور حاجت بشری کو بھی رفع کرتا تھا۔ تو اُنھوں نے ان سب باتوں کو تسلیم کیا تب آپ نے فرمایا کہ پھر وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ اُنھوں نے کہا کیا یوں نہیں آیا کہ وہ کلمة اللہ اور روح منه تھا۔ آپ نے فرمایا ہاں اُنھوں نے کہا ہمارے لیئے اسی قدر کافی ہے۔ تو اللہ تعالےٰ نے نازل فرمایا فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابه منه۔ جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ متشابہ بات کی پیروی کرتے ہیں۔ اب اس سے یہ مراد لازمی طور پر نہیں کہ یہ آیت اسی وقت نازل ہوئی بلکہ اکثر ایسے واقعات کو پڑھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وُہ آیت اُن کے حال پر چسپان ہوئی یا چسپان کیگئی اب یہاں قابل غور یہ امر ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کس وجہ پر اُن کو متشابہات کی پیروی کرنے والے قرار دیا۔ بات یہ تھی کہ آپ نے قرآن کریم سے استدلال کر کے چند اصولی امور اُن کے سامنے پیش کیئے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت عیسےٰ بشر ہیں اور انسان سے بڑھ کر نہیں۔ اس کے بالمقابل عیسائیوں نے کوئی اصول پیش نہیں کیا۔ بلکہ ایک خصوصیت پیش کی کہ مسیح کو کلمة اللہ کہا ہے۔ تو اصول کے بالمقابل خصوصیت کو پیش کرنے پر آپ نے فرمایا کہ یہ متشابہات کی پیروی ہے پس کسی خصوصیت کو کسی صاف قانون اور اصول کے خلاف پیش کرنا یہی متشابہات کی پیروی ہے۔ بالفاظ دیگر خصوصیات کو اصول اور قوانین کے ماتحت لانا چاہیئے +

اب اوّل ہم لفظ محکم اور متشابه کے معنے پر غور کرتے ہیں۔ محکم کے معنے یوں کیئے گئے ہیں متضح المعنی واضح الدلالة قائم بنفسه لا یحتاج ان یرجع فیه الی غیرہ۔ یعنی ایسی عبارت جسکے معنے واضح ہوں اور صاف طور پر اپنے معنے پر دلالت کرے۔ اپنے آپ میں قائم یا مضبوط ہو اور اسبات

آیت ۳

اناجیل کے ایک اعمال حواریین ہے اور بہت سے خطوط پولوس اور مسیح کے دوسرے حواریوں کے ہیں۔ اور ایک کتاب مکاشفات ہے۔ اور ان سب کو کوئی مسلمان الہامی تسلیم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد کوئی نبی ظاہر نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ آنحضرت کا ظہور ہوا +

۳۹۹۔ انزل الفرقان۔ فرقان کے لئے دیکھو نوٹ نمبر ۱۰۷۔ چونکہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا فرقان جنگ بدر ہے اس لئے یہاں فرقان کے نزول کے ذکر میں اسی کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اس فرقان کی طرف یہود اور نصاریٰ دونوں کو توجہ دلائی ہے۔ کیونکہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ایک ایسا نشان ہے جس سے یہ دونوں قومیں انکار نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ اس جنگ کی پیشگوئیاں نہ صرف قرآن کریم میں ہی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ بلکہ توریت میں بھی اس کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔ جن کا ذکر آگے آئے گا +

۴۰۰۔ ذوانتقام۔ انتقام کے معنے عقوبۃ یعنی سزا ہیں۔ الانتقام العقوبۃ یقال انتقم منه انتقاما ای عاقبه اور لیث نے کہا ہے۔ کہ انتقام کے معنے ہیں سزا کے طور پر بدلہ دینا اس کام کے لئے جو کسی نے کیا ہو پس ذوانتقام کے معنے ہوئے سزا دینے والا چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے فانتقمنا من الذین اجرموا اور فرماتا ہے فانتقمنا منھم فانظر کیف کان عاقبۃ المکذبین۔ تاج العروس میں ہے انتقم اللہ منه عاقبه

۴ ۴۰۱۔ لا یخفی علیه شئ فی الارض ولا فی السماء۔ اللہ وہ ہے جس پر کوئی چیز مخفی نہیں نہ زمین میں نہ آسمان میں۔ اس میں بھی مسیح کی الوہیت کے بطلان کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ مسیح علیہ السلام کی زندگی کے واقعات صاف بتاتے ہیں۔ کہ آپ پر سب وہ چیزیں مخفی تھیں جو انسانوں پر مخفی ہوتی ہے۔ حتی کہ ایک دفعہ بھوک کی حالت میں آپ انجیر کے ایک درخت کی طرف دوڑے گئے۔ حالانکہ اس پر کوئی انجیر نہ تھی۔ اور ایسا ہی آپ خود اقراری ہیں۔ کہ آپ کو علم غیب نہیں +

۵ ۴۰۲۔ یصورکم فی الارحام۔ فرمایا کہ خدا وہ ہے جو رحموں کے اندر تمہاری تصویریں بناتا ہے۔ اس میں بھی الوہیت مسیح کو باطل کیا ہے۔ کیونکہ مسیح کی تو اپنی تصویر رحم کے اندر بنتی ہے۔ پس جس کی تصویر رحم کے اندر بنتی ہے وہ مخلوق ہے۔ اور اس تصویر کا بنانے والا کوئی اور ہے۔ خدا وہی ہے جس نے مسیح کی تصویر رحم کے اندر معمولی انسانی بچوں کی تصویروں کی طرح بنائی۔ چنانچہ وفد نجران کے مقابل نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان آیات سے اسی طرح استدلال کیا دیکھو نوٹ نمبر ۴۰۳ +

۶ ۴۰۳۔ منه آیت محکمت ھن ام الکتب واخر متشبھت الآیه اس میں (یعنی اس کتاب میں جو اللہ تعالےٰ نے نازل فرمائی ہے) محکم آیات ہیں جو اصل کتاب ہیں اور کچھ اور متشابہ ہیں۔ پھر جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کی پیروی کرتے ہیں جو اس میں سے متشابہ ہے۔ فساد چاہنے کو اور اس کی تاویل چاہنے کو۔ اور اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا مگر اللہ۔ اور جو علم میں مضبوط ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے۔ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے اس آیت کریمہ میں اللہ تعالےٰ نے ایک اصول بیان فرمایا ہے جس سے کتاب اللہ کے الفاظ کی تاویل کا صحیح

پس ضروری ہوا کہ کسی امرِ مخصوص کے صحیح معنے سمجھنے کے لیئے پہلے ایک اصول قائم کیا جائے اور اس اصول کے ماتحت اس کی تاویل کی جائے۔ یہی وہ راہ ہے جو قرآن کریم نے سکھائی ہے اور اس راہ پر چلکر نہ صرف بیرونی تفرقوں کا علاج ہی ہو سکتا ہے۔ بلکہ مسلمانوں کے جسقدر اندرونی اختلافات ہیں ان کا بھی ایک حد تک فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اور جو اختلافات باقی رہ جائیں گے وہ اصولی اختلافات نہ ہونگے +

اس معنے کی تائید دو اور باتوں سے بھی ہوتی ہے۔ اوّل تو اس بات سے کہ جو ذکر وفد نجران کا اوپر ہوا اور اس میں جو طرز مناظرہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی وہ بھی اس کی صداقت پر شاہد ہے۔ کیونکہ آپ نے تو ایک قانون اور اصول کے رنگ میں بات فرمائی۔ مسیح بشر ہے یا بشر سے کچھ بڑھ کر۔ اس کا فیصلہ یُوں نہیں ہوتا۔ کہ چونکہ خدا نے اسے کلمۃ اللہ کہا ہے اور کسی دُوسرے بشر کو کلمۃ اللہ نہیں کہا۔ اس لیئے وہ بشر سے بڑھ کر ہے۔ اگر بالفرض مسیح کو کلمۃ اللہ کہا بھی ہے تو یہ ایک خصُوصیت ہے۔ اس خصُوصیت کو پہلے کسی اصُول کے ماتحت لانا چاہیئے۔ سو اصولاً بشریت کے جسقدر لوازمات ہیں اور جو بشر کو خدا سے الگ کرتے ہیں ان سب کا تذکرہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ خدا حيّ و قیّوم ہے۔ بشر حيّ و قیّوم نہیں۔ خدا سب علم رکھتا ہے۔ انسان سارا علم نہیں رکھتا۔ انسان کی تصویر رحم کے اندر بنانے والا خدا ہے جس کی تصویر بنتی ہے وُہ خدا نہیں۔ خدا کھانے پینے اور حاجات بشری سے بالا ہے۔ جو کھانے پینے اور حاجات بشری کا محتاج ہے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ خدا التغیرات سے پاک ہے۔ جو بچّوں کی طرح رحم مادر میں جاتا۔ پھر پیدا ہوتا۔ پھر بچّہ بنتا پھر بوڑھا ہوتا۔ پھر مرتا ہے وُہ خدا نہیں۔ اصولی رنگ میں یہ امور مسیح کو انسانوں میں داخل کرتے ہیں۔ خدا نہیں بناتے۔ پس ایک امرِ مخصُوص جو مسیح کے متعلق آگیا۔ کہ وُہ کلمۃ اللہ ہے۔ تو یہ متشابہات میں سے ایک امر ہو گیا۔ اس کی تاویل وُہ کریں گے جو دوسرے بیان کردہ مقامات کے خلاف نہ ہو جو اصولی رنگ کے ہیں۔ تو چونکہ اصُولی رنگ میں مسیح بشریت سے خارج نہیں ہوتے اور نہ خدا بنتے ہیں۔ اس لیئے ایک مخصوص امر کی وجہ پر اُن کو بشریت سے خارج کر کے خدا بنانا اصول کی خلاف ورزی اور متشابہات کی پیروی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے سارے دلائل کے مقابل جب عیسائیوں نے کلمۃ اللہ کا عذر پیش کیا تو آپ نے فرمایا یہ کجی کی نشانی ہے کہ تم ایک متشابہ بات کو لے کر اُس کو اصُول کے خلاف ٹھیراتے ہو +

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا یہ دعوےٰ ہے کہ اس نے تمام امور ضروریہ کی تکمیل کر دی ہے۔ اب فرُوعات تو اِس قدر وسیع دائرہ رکھتی ہیں کہ تا قیامت بھی اُن کو ایک دفتر میں اکٹھا نہیں کیا جا سکتا۔ روز نئی نئی فرُوعات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ پس یہ ماننا پڑے گا۔ کہ سب اصول کو قرآن کریم نے واضح کر کے بیان کر دیا ہے اور فروع میں سے حسب ضرورت کچھ لے لیا ہے۔ اِس لیئے بھی فروع کو اصُول کے ماتحت کر سکتے ہیں نہ اصُول کو فرُوع کے ماتحت۔ اسی بات کی طرف عدم توجّہی نے مذاہب میں غلطیاں پیدا کیں

کی محتاج نہ ہو کہ اس کے معنے معلوم کرنے کے لیئے دُوسرے موقعہ کی طرف رجُوع کیا جائے۔ اور متشابہ کے معنے ہیں۔ یصدق بعضه بعضا لا یدرك من نفس تلك الاية الا بالمراجعة الی ایات اخر۔ یعنی ایک حصّہ دوسرے حصّہ کی تصدیق کرے۔ خود اس آیت سے اس کے صحیح معنوں پر پورا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ سوائے اس کے کہ دوسری آیات کی طرف رجُوع کیا جائے +

اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں تو فرمایا کہ کتاب اللہ کی کچھ آیات محکم ہیں اور کچھ متشابہ۔ اور سورہ ہود کی پہلی آیت میں فرمایا کتٰب احکمت ایاتہ۔ یعنی یہ ایسی کتاب ہے۔ جس کی آیات محکم کی گئی ہیں۔ اور سورہ زمر کی تئیسویں آیت میں فرمایا کتٰبا متشابها یعنی یہ کتاب متشابہ ہے۔ سو ان تینوں باتوں کی تطبیق اس طرح ہوتی ہے کہ ساری کتاب تو اس لحاظ سے متشابہ ہے کہ اس کی ساری آیات ایک دوسری کی تصدیق کرتی ہیں۔ ایسا نہیں کہ ایک دوسری کے خلاف ہو۔ جس سے نسخ کا مسئلہ بھی غلط ٹھیرتا ہے اور ساری آیات کو محکم اس لیئے کہا گیا ہے کہ متشابہات کے معنے بھی محکمات کی طرف رجُوع کرنے سے واضح ہو جاتے ہیں۔ پس اس لحاظ سے ساری محکم ہو گئی اور اصولاً ایک حصّہ محکمات اور ایک متشابہات کا ہے۔ پس ان تینوں باتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے +

اب یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم نے محکمات اور متشابہات کی تفسیر میں اصول کیا بیان فرمایا ہے۔ کیونکہ یہاں آکر ایک دُوسری دقت پیش آتی ہے۔ کہ ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنے ہوتے ہیں۔ پس خود غرض لوگ اپنے حسب منشاء جس کو چاہتے ہیں متشابہ بنا کر اسے کسی دوسری آیت کے ماتحت کر دیتے ہیں۔ یا اُسکی تاویل اپنے حسب منشاء کر لیتے ہیں۔ پس ایک شخص اُسی کو محکم کہتا ہے دوسرا اسی کو متشابہ کہتا ہے علیٰ ہذا کوئی فیصلہ کی راہ پیدا نہیں ہوتی۔ تو پس کیا اس کا بھی کوئی علاج قرآن کریم نے بتایا ہے یا نہیں درحقیقت اگر الفاظ قرآنی پر غور کیا جائے تو ایک ایسی پکّی بات بتا دی ہے کہ تمام جھگڑے اُٹھ جاتے ہیں اور وُہ بات یہ ہے کہ محکمات کے متعلّق فرما دیا ہے کہ اس سے کیا مُراد ہے۔ اور کن کے ماتحت دُوسری آیات کو لانا ضروری ہے محکمات کیا ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ ھن ام الکتٰب۔ وہ کتاب کی اصل یا جڑ ہیں۔ اب ام یا جڑ اس چیز کو کہتے ہیں جو بطور اصل ہو۔ تو پس قرآن کریم ہمیں یہ ہدائت دیتا ہے کہ محکمات سے مراد اصُولی امور ہیں اور طرز تاویل یہ ہوگی کہ جو امر اصولی نہیں بلکہ فرعی امر ہے۔ یا ایک خصوصیّت ہے تو فروعات اور مخصُوصات کو جو بطور شاخوں یا ولد کے ہیں۔ جڑ اور ام کی طرف لوٹانا پڑیگا یعنی اصُول کے ماتحت کرنا پڑے گا۔ کیونکہ حق یہی ہے کہ جب تک مخصوصات اور فرُوعات کو اصُول کے ماتحت نہ لایا جاوے اس وقت تک حق بات انسان معلُوم نہیں کر سکتا۔ مخصُوصات کو اگر اصُول اور قانون سے الگ کیا جائے تو اُسکا نتیجہ وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان فرمایا ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله ایک مخصُوص امر کی تاویل کے پیچھے پڑ کر ایک فتنہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بعض کا مفہُوم بعض کے خلاف ہو جاتا ہے

آیت ۶

اس بستی کے آسودہ حال لوگوں کو نیکی کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ مگر وُہ اس حکم کی نافرمانی کرتے ہیں یا اللہ تعالےٰ
فرماتا ہے نسوا اللہ فنسیھم۔ اب اس کے ہم یہ معنے نہیں کر سکتے۔ کہ اُنھوں نے خدا کو بھلا دیا۔ سو خدا
نے اُن کو بھُلا دیا۔ کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ ماکان ربک نسیا۔ تیرا رب بھُولا نہیں کرتا۔ پس پہلی
آیت کو اس اصُول کے ماتحت لاکر اوّل الذکر میں لفظ نسی کی تاویل عن الظاہر کریں گے۔ اور
اس کے معنے یہ کریں گے۔ کہ اُنھوں نے خدا کو چھوڑ دیا۔ اس لیئے خدا نے اُن کو چھوڑ دیا۔ یا مثلاً فرمایا۔
زینا لکل امۃ عملھم تو اس کے یُوں معنے نہیں کرینگے۔ کہ ہر ایک قوم کے لیئے اُن کے عملوں کو جو وہ کرتی
ہیں۔ ہم نے اچھا کرکے دکھایا۔ گویا بدکاروں کے لیئے بدعملیوں کو اچھا کرکے دکھایا ہے۔ کیونکہ بدکاروں
کی بدعملیوں کے متعلق فرماتا ہے۔ زین لھم الشیطان اعمالھم۔ ان کے بُرے عملوں کو اچھے کرکے دکھانا
یہ شیطان کا کام ہے۔ خدا بُرے عملوں کو اچھے کرکے نہیں دکھایا کرتا۔ پس پہلی آیت میں عملھم سے مراد
وُہ عمل لیئے جائیں گے۔ جو اُن کو کرنے چاہئیں۔ اور مثالیں اس کی حضرت مسیح علیہ السّلام کے متعلق
یعنی آیت نمبر ۴۹ میں بحث پڑھیں ✦

آیت ۷

۴۰۵۔ لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا۔ ہمارے دلوں میں کجی نہ آنے دیجیو۔ بعد اس کے کہ ہمیں ہدایت
فرمائی۔ اس دُعا سے معلوم ہوتا ہے کہ متشابہات کی وجہ سے ٹھوکر کھانیوالے وہی لوگ ہوتے ہیں جو پہلے
ایک ہدائیت کو پالیتے ہیں۔ کیونکہ متشابہات کی پیروی کرنے والوں کے متعلق بھی یہی لفظ فرمائے ہیں۔
فی قلوبھم زیغ۔ اور یہاں بھی زیغ سے بچنے کی دُعا سکھائی۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح کو مان کر خدا
بنایا۔ گویا ہدائیت پاکر متشابہات کی پیروی کی۔ اس لیئے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا۔ کہ اگر اصُول کو چھوڑ کر
متشابہات کے پیچھے لگ جاؤ گے تو فی قلوبھم زیغ کے مصداق ہو جاؤ گے ✦

رکوع ۱/۲ آیت ۹

۴۰۶۔ لن تغنی عنھم اموالھم ولا اولادھم من اللہ شیئا۔ ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ کے خلاف
ان کو کچھ کام نہیں دیں گے یا اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے۔ اس سے پہلی آیت میں بھی انک جامع
الناس میں ایک اجتماع یا ایک مُٹ بھیڑ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہاں فرمایا کہ کفار اپنے مالوں اور اولاد
کو خدا کے خلاف لگا رہے ہیں۔ یعنی اس حق کے مٹانے کے لیئے جسے خدا نے قائم کیا ہے اپنے مالوں کو بھی خرچ
کرتے ہیں اور اولاد کو بھی ان جنگوں میں لگاتے ہیں جو اسلام کے خلاف شرُوع کردی گئی تھیں تو ان
الفاظ میں یہ پیشگوئی کی ہے۔ کہ اس سے اُن کو فائدہ کوئی نہیں ہوگا۔ اور نہ ان کے یہ مال اور اولاد ان کو
عذاب الٰہی سے بچا سکیں گے۔ اس میں صاف ان کی مغلوبیت کا ذکر ہے۔ اور چونکہ نار کا لفظ مجاز کے طور
پر جنگ پر بھی بولا جاتا تھا (کلما اوقدوا نارا للحرب اطفاھا اللہ۔ جب کبھی وہ لڑائی کے لیئے آگ
جلاتے ہیں۔ اللہ اس کو بُجھا دیتا ہے۔) اس لیئے اولئک ھم وقود النار میں یہ بھی اشارہ ہے۔ کہ ان
جنگوں کے اندر اسلام کو تو کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔ بلکہ یہ خود ہی بھسم ہو جائیں گے ✦

اور اسی اصول کو مدنظر نہ رکھنے کی وجہ سے مختلف اسلامی فرقوں نے ایک دُوسرے کے خلاف قرآن سے ہی نتائج اخذ کیئے۔ اگر سب لوگ اس بات پر کار بند ہوں کہ اصول کو تو چونکہ محکم کرنے کا ذکر خود قرآن کریم میں ہے پس ہر ایک فرع کو قرآن کریم کے قائم کردہ اصولوں پر پیش کیا جائے۔ تو بہت سے جھگڑے اُٹھ جاتے ہیں۔ حضرت مسیح کی اگر اس خصوصیت کا جس کی بنا پر نصاریٰ نے اُسے خدا بنایا ہے۔ جواب اس آیت کے اندر ہے۔ تو مسلمانوں نے بھی جو بہت سی خصوصیات حضرت مسیح کو دے رکھی ہیں اُن کا جواب بھی اسی آیت کے اندر ہے +

متشابہ کی پیروی کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ فتنہ چاہتے ہیں ابتغاء الفتنۃ۔ فتنہ یہ کہ ایک آیت کے مفہوم کو دُوسری کے خلاف کر دیا جائے۔ یا فروع اور مخصوصات کا ایسا مفہوم لیا جائے جو اصول کے خلاف ہو۔ مختلف آیات میں جنگ کرا دینا یہی ابتغاء الفتنۃ ہے۔ ابتغاء تاویلہ کے معنے ہیں اس کی تاویل یعنی معنے کا چاہنا۔ مفسّرین نے اس سے مراد یہ لیا ہے۔ التاویل الذی یشتھو نہ۔ یعنی ایسی تاویل جو اُنکی اپنی خواہش ہوتی ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ صرف ایک اس متشابہ آیت سے ہی اس کی تاویل نکالنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ متشابہ کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی تصدیق کرنے والی کوئی دوسری آیت ہو بیصادق بعضہ بعضا۔ پس جو ایک متشابہ آیت کو پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور دوسری آیات کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ وہ اُن لوگوں میں داخل ہے جن کے متعلق فرمایا فاما الذین فی قلوبھم زیغ۔ ان کے دلوں میں کجی ہے کیونکہ وہ اس سیدھے راستہ پر نہیں آنا چاہتے جو اُن کو بتایا گیا ہے کہ فروع اور مخصصات کو اصول اور قوانین کے ماتحت کریں۔ کل من عند ربنا میں بھی یہی بتایا ہے کہ ایک آیت کو دوسری کے مخالف نہ بناؤ یعنی مختلف آیات میں اختلاف نہ ڈالو۔ کیونکہ سب خدا کی طرف سے ہیں۔ پس ایسے معنے لو کہ ایک آیت کو دُوسری سے تطبیق ہو جائے +

اس مطلب کو چند مثالوں سے واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا اذا اردنا ان نھلك قریۃ امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا فحق علیھا القول۔ جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے آسودہ حال لوگوں کو امر کرتے ہیں۔ سو وہ اس کے اندر فسق یا نافرمانی کرتے ہیں۔ اب ظاہر الفاظ کو لے کر ایک شخص خیال کر سکتا ہے کہ اس سے مُراد یہ ہے کہ خدا تعالےٰ ہی ان کو نافرمانی کرنے کا حکم دیتا ہے۔ تو اس کے لیئے اب ضروری ہوُا۔ کہ دیکھا جائے کہ آیا قرآن کریم سے ایسا کوئی اصول معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ اپنے بندوں کو خود ہی نافرمانی کرنے کا حکم دیا کرتا ہے۔ تو نہ صرف ایسی کوئی آیت قرآن میں موجود نہیں بلکہ اس کے خلاف ہے ان اللہ لا یأمر بالفحشاء اللہ تعالےٰ کسی معمُولی بے حیائی کی بات کا بھی حکم نہیں دیتا۔ پس معلوم ہوُا کہ اللہ تعالےٰ فسق کا حکم نہیں دیا کرتا۔ پس پہلی آیت کو اب دوسری آیت سے تطبیق دینے کے لیئے ہم اسے اس موخر الذکر قانون کے ماتحت لائیں گے۔ کیونکہ قانون اللہ تعالےٰ نے یہ بتایا ہے کہ کسی بُری بات کا حکم اللہ تعالےٰ نہیں دیا کرتا۔ اور اس لیئے آیت کے معنے یوں کریں گے۔ کہ ہم

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس پیشگوئی سے بدر کی جنگ مراد لیتے تھے۔ صحیح احادیث سے ملتا ہے۔ چنانچہ اسی آیت
کی تفسیر میں بخاری میں ہے۔ عن ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال وھو فی قبۃ لہ
یوم بدر انشدك عھدك ووعدك اللھم ان شئت لم تعبد بعد الیوم ابدا فاخذ
ابوبکر بیدہ وقال حسبك یارسول اللہ فقد الححت علی ربك وھو فی الدرع فخرج و
ھو یقول سیھزم الجمع ویولون الدبر بل الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر۔ ابن
عباس سے روایت ہے کہ بدر کے دن نبی صلے اللہ علیہ وسلم ایک چھوٹے سے خیمہ میں تھے۔ اور بارگاہ الٰہی
میں یوں دُعا کر رہے تھے۔ میں تیرے عہد اور تیرے وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں۔ اے اللہ اگر تیری ایسی
ہی مشیّت ہے (یہ نظر بحالت ظاہر تھا۔ کیونکہ بظاہر مسلمان کفار کے سامنے اتنے تھوڑے اور بے سامان
تھے۔ کہ ان کے ہاتھوں اُن کا کچلا جانا صاف نظر آتا تھا) تو آج کے دن کے بعد زمین میں تیری پرستش
نہیں کی جائے گی ابوبکر نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا یارسول اللہ بس کیجیئے۔ آپ نے اپنے رب پر الحاح کیا ہے
آپ نے زرہ پہنی ہوئی تھی۔ پس آپ نکلے اور یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ سیھزم الجمع ویولون الدبر بل
الساعۃ موعدھم والساعۃ ادھی وامر۔ اسی قسم کی اور بہت سی پیشگوئیاں اسی جنگ کے متعلق
قرآن کریم میں تھیں۔ پس ایک طرف پیشگوئیوں کے پہلے موجود ہونے نے دُوسری طرف باوجود مسلمانوں کی
قلت اور بے سروسامانی اور دشمن کی کثرت اور مسلح ہونے کے کفار کا ہزیمت اُٹھانا۔ ان دونوں باتوں نے
جنگ بدر کو ایک عظیم الشان نشان بنا دیا تھا۔ تو اب مخالفت کرنے والوں کو کہا جاتا ہے کہ یہی نشان پر غور کرو +
اور اہل کتاب کے لیئے بالخصوص ایک نشان جنگ بدر میں یہ تھا۔ کہ جنگ بدر کی پیشگوئی اُن کی کتابوں
میں بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت اور بدر میں قریش کی طاقت کو کمزور کیا جانے
کی پیشگوئی صاف الفاظ میں یسعیاہ نبی کی کتاب میں موجود ہے۔ دیکھو یسعیاہ ۲۱: ۱۳ سے ۱۷ آیت تک
"عرب کی بابت الہامی کلام۔ عرب کے صحرا میں تم رات کو کاٹو گے۔ اے ددانیوں کے قافلو۔ پانی
لیکے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو روٹی لیکے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو
کیونکہ وے تلواروں کے سامنے سے ننگی تلوار سے اور کھینچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے
ہیں۔ کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا۔ ہنوز ایک برس۔ ہاں مزدور کے ایک ٹھیک برس میں قیدار
کی ساری حشمت جاتی رہے گی۔ اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے
کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا"
اب صاف ظاہر ہے کہ بھاگنے والے میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی طرف اشارہ ہے جس
میں حضرت ابوبکر آپ کے ساتھ تھے اور درحقیقت ساری تاریخ مقدس میں ایک ہی شخص کے بھاگنے کو یہ
عظمت حاصل ہوئی۔ کہ اُس سے ایک سنہ چل پڑا۔ پس اس بھاگنے میں آپ کی ہی ہجرت کی طرف اشارہ ہے

۱۰ ۴۰۷۔ کدأب آل فرعون۔ دأب کے اصل معنے ہیں جد اجتهد یعنی کوشش کی زور لگایا۔ اور دُوسرے معنے العادة المستمرة علی حالة یعنی ایک ہی حالت پر ایک عادت کا چلے جانا۔ پس اس جملہ کے معنے دونو طرح پر ہوسکتے ہیں۔ فرعون کے لوگوں کی کوشش کرنے اور زور لگانے کی طرح یا فرعون کے لوگوں کی حالت کی طرح یا عادت کی طرح۔ پہلی صورت میں یہ مطلب ہوا۔ کہ جس طرح فرعون کے لوگوں نے حق کے خلاف زور لگایا اسی طرح یہ بھی لگالیں۔ وہی نتیجہ پائیں گے۔ اور دوسری صورت میں یہ کہ ان کی حالت فرعون کے لوگوں کیطرح ہوگی +

۱۱ ۴۰۸۔ ستغلبون وتحشرون الیٰ جهنم۔ عنقریب تم مغلوب کیئے جاؤ گے اور جہنّم کی طرف اکٹھے کیئے جاؤ گے یہاں دو پیش گوئیاں ہیں۔ اوّل یہ کہ کافر مغلوب کیئے جائیں گے اور دوسرے یہ کہ وہ جہنّم میں جائیں گے جہنّم میں جانا ایک خشک دھمکی ہوتی۔ اگر اس کے ساتھ کوئی ثبوت نہ ہوتا۔ پس اس دُنیا کی مغلوبیت بعد موت جہنّم کے لیئے بطور دلیل کے ہوگئی۔ یہ کفّار کی مغلوبیت کی کھلی کھلی پیشگوئی ایسے وقت میں کی جاتی ہے جب اسلام ابھی نہایت کمزور حالت میں تھا۔ اور جس صراحت سے یہاں اُن کی مغلوبیت کا ذکر کیا۔ اس صراحت کے ساتھ پچھلی سورت میں نہیں کیا۔ بلکہ وہاں زیادہ تر اشارات میں ہی بتایا تھا +

۱۲ ۴۰۹۔ قد کان لکم اٰیة فی فئتین التقتا۔ تمہارے لیئے دو گروہوں میں جن کی باہم مُٹ بھیڑ ہوئی ایک (بڑا) نشان تھا۔ اس نشان میں یہاں بالخصوص اہل کتاب مخاطب ہیں۔ کیونکہ اس سورت کے ابتدائی حصّہ میں اصل خطاب انہی کے ساتھ چلتا ہے۔ دو گروہوں کی مُٹ بھیڑ سے مراد جنگ بدر ہے۔ جیسا کہ اگلے الفاظ میں صاف اشارہ بھی ہے۔ فئة تقاتل فی سبیل الله واخریٰ کافرة یرونهم مثلیهم رای العین جنگ بدر میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا نشان ایک تو اس طرح تھا۔ کہ قرآن کریم کی مکّی سورتوں میں مسلمانوں اور کفّار کے درمیان ایک مُٹ بھیڑ کی خبر بار بار دی گئی تھی جس میں کفّار کی ہزیمت اور مسلمانوں کی فتح کی پیشگوئی کی گئی تھی۔ یہاں تفصیل کے ساتھ ان پیشگوئیوں کے ذکر کا موقعہ نہیں۔ صرف ایک پیشگوئی پر کفایت کی جاتی ہے۔ سورہ القمر میں آخری رکوع میں ہے۔ ام یقولون نحن جمیع منتصر سیهزم الجمع ویولون الدبر بل الساعة موعدهم والساعة ادهی وامر۔ کیا یہ (کفار) کہتے ہیں کہ ہم ایک جماعت ہیں ایک دُوسرے کی مدد کرنے والے اُن کی جماعت کو ہزیمت دیجائے گی۔ اور وہ پیٹھیں پھیر کر واپس ہوجائیں گے۔ ہاں ایک گھڑی اُن کے وعدے کا وقت ہے اور وہ گھڑی بڑی سخت اور تلخ ہوگی۔ کہا جائیگا کہ یہ تو قیامت کے متعلّق ہے۔ مگر جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں۔ قرآن کریم نے پیشگوئی میں ایسی لطیف طرز اختیار کی ہے۔ کہ قیامت کی رسوائی کے ساتھ اس دُنیا کی مغلوبیت کا ذکر بھی کیا ہے۔ تاکہ ایک کے پورا ہوجانے سے دُوسرے کی صداقت پر شہادت ہو۔ مگر یہاں ساعة سے مراد وہی ہزیمت کی ساعت ہے۔ ورنہ قیامت کے دن ہزیمت اور جنگ کا کیا ذکر ہے۔ وہ تو اسی دُنیا میں ہوگی۔ اور یہ بھی ایک معنے میں اُن کے لیئے قیامت ہی ہے۔ ہاں پھر قیامت میں اس سے بھی زیادہ سختی اور تلخ کامی دیکھیں گے۔ اس بات کا ثبوت کہ خود

۱۴ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر عیسائیوں کے ذکر میں بالخصوص ان باتوں کا ذکر بھی غالباً پیشگوئی کے طور پر تھا کہ دُنیا کی مرغوب چیزوں کی محبت میں یہ قوم دُنیا کی سب قوموں پر فوقیت لیجانے والی تھی تزئین کا فاعل بیان نہیں ہوا۔ مگر قرآن کریم نے اس بات کا فیصلہ کر دیا ہے۔ کہ اچھے عملوں کو اور اُن کاموں کو جو لوگوں کو کرنے چاہئیں اچھا کرکے دکھانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم اور فرمایا وکذالک زینا لکل امۃ عملھم اور بُرے کاموں کو اچھا کرکے دکھانے والا شیطان او شیطان صفت لوگ ہیں۔ زین لھم الشیطان ما کانوا یعلمون۔ اور فرمایا وکذالک زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاؤھم +

الشھوات سے مراد ہے الاشیاء المشتھیات۔ یعنی مرغوب چیزیں۔ القناطیر۔ قنطار ماخوذ ہے کسی چیز کے مضبوط کرنے سے۔ اور مال کثیر کو قنطار اس لیئے کہتے ہیں کہ مصائب سے نجات پانیکے لیئے انسان اس پر بھروسہ کرتا ہے +

۱۶ ۴۱۲۔ الصٰبرین والصٰدقین والقٰنتین والمنفقین والمستغفرین بالاسحار یہاں پانچ امور کی طرف توجہ دلائی جن سے انسان اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچتا ہے اور دُنیا کے مرغوبات سے بہت بڑھ کر انعام پاتا ہے۔ مصائب کا مقابلہ کرے اور اُن کو برداشت کرنے کی قوت اپنے اندر پیدا کرے۔ جو مُنہ سے کہے اُسے پُورا کرکے دکھائے یعنی قدم مضبوط ہو اور نہ صرف پیچھے نہ ہٹے بلکہ آگے بڑھتا چلا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اختیار کرے۔ یعنی جو قدم آگے بڑھائے اللہ کی فرمانبرداری میں اور اس کی رضا کے لیئے ہو۔ پھر خرچ کرنے والا ہو۔ اپنے سارے قوائے کو خدا کی راہ میں لگا دے۔ اور اپنے مال کو بھی اللہ تعالےٰ کی راہ میں خرچ کرے۔ اور یہ سب کچھ کرکے کسی بات پر فخر نہ کرے۔ بلکہ صبح کے وقت جو بڑی قبولیت کا وقت ہے حفاظت الہٰی طلب کرتا رہے۔

۱۷ ۴۱۳۔ شھد اللہ انہ لا الہ الا ھو والملٰئکۃ واولوا العلم قائما بالقسط۔ یہاں اللہ تعالےٰ نے اپنی توحید پر تین قسم کی شہادت پیش کی ہے۔ اول خود اللہ تعالےٰ کی شہادت۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اس قول کی شہادت اس کی فعلی کتاب سے ملتی ہے۔ اور اُس کے ہاتھ کی نکلی ہوئی چیزیں خود توحید پر دلالت کرتی ہیں۔ دوسری شہادت ملائکہ کی ہے۔ جن کا تعلق پاک فطرت انسانوں سے ہے کیونکہ فطرت انسانی جب گرد و پیش کے حالات سے متاثر نہیں ہوتی۔ تو اللہ تعالیٰ کی توحید پر گواہی دیتی ہے۔ عموماً تمام لوگ یہاں تک کہ خدا کے منکر مصائب کے وقت میں خدا تعالےٰ کی ہستی کا اقرار کرتے ہیں اور بُت پرست اور دوسری قسم کے مشرک جب مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے بتوں کو اور دُوسرے شرکاء کو بھُول جاتے ہیں۔ اور خالص اللہ تعالےٰ کو پکارتے ہیں۔ اور علم والوں کی شہادت درحقیقت دُنیا کی الہامی کتابوں کی شہادت ہے۔ کہ وہ سب بھی بہت سی باتوں میں باہم خلاف

۱۲ اور الفاظ "عرب کی بابت الہامی کلام"، اس واقعہ کو عرب پر ہی محدود کرتے ہیں۔ اب اس بھاگنے کے ذکر کے تعلق میں یہ کہا کہ ایک سال کے اندر قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی۔ اور قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے۔ سو ایسا ہی ہوا۔ کہ جنگ بدر کا وقوع جو ہجرت کے ایک سال کے گذر جانے کے بعد ہوا۔ اس میں قیدار کی حشمت جاتی رہی۔ اور اُن کے بہادر لوگ گھٹ گئے۔ قیدار کا لفظ بائبل میں بہت مرتبہ بنی اسماعیل کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ پس اہل کتاب کے لیئے یہ کھلا کھلا نشان جنگ بدر میں تھا اور یوں بھی جنگ بدر میں ان کے لیئے نشان تھا۔ کہ وہ دیکھ سکتے تھے۔ کہ یہ نصرت الٰہی کے بغیر بات نہیں۔ اور اس لیئے چاہیئے تھا۔ کہ وہ اس بات کا خوف کرتے۔ کہ اُن کا حشر بھی وہی نہ ہو جو مشرک مخالفین کا ہُوا*

۴۱۰۔ یرونھم مثلیھم راي العین ۔ اُن کو ظاہر نظر میں اپنے سے دوچند دیکھتے تھے۔ یعنی مسلمان کفار کو بظاہر اپنے سے دوچند دیکھتے تھے۔ اور سورہ انفال میں ہے واذ یریکموھم اذ التقیتم فی اعینکم قلیلا و یقللکم فی اعینھم ۔ اور جب تم میں مٹ بھیڑ ہوئی تو اُن کو تمہاری نظر میں کم دکھاتا تھا۔ اور تم کو اُن کی نظر میں کم دکھایا۔ اِن دونوں بیانات میں کوئی مخالفت نہیں ہے۔ اصل واقعہ یُوں ہے کہ کفار کی کل جمعیت ایک ہزار کے قریب اور مسلمان تین سو کے قریب تھے۔ تو یرونھم مثلیھم سے یہ ثابت ہُوا کہ مسلمانوں کو وہ کوئی چھ سو کے قریب نظر آتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ بقیہ حصّہ پہاڑ کی اوٹ میں تھا۔ اور یہ دوچند دکھانا بے معنی نہ تھا۔ بلکہ اس میں حکمت یہ تھی کہ یہ بھی ارشاد الٰہی ہو چکا تھا۔ فان یکن منکم مائة صابرة یغلبوا مائتین وان یکن منکم الف یغلبوا الفین باذن اللہ ۔ (الانفال - ۶۶) کہ اگر تم میں سے ایک سو صابر ہونگے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور ایک ہزار تم میں سے ہونگے تو دو ہزار پر غالب آئیں گے۔ تو پس چونکہ یہ گویا وعدہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہو چکا تھا۔ کہ تم دوچند جمعیت پر غالب آؤ گے۔ گو اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ زیادہ پر غالب نہیں آئیں گے۔ تاہم اس لیئے کہ مسلمانوں کے حوصلے مضبوط رہیں اور اُنھیں یقین کامل رہے کہ ہم دشمن پر غالب آئیں گے۔ ان کو اسی قدر حصّہ دکھایا گیا جو تعداد میں اُن کی اپنی جمعیت سے دوچند تھا۔ تو اس طرح پر کفار مسلمانوں کو تھوڑے کر کے دکھائے گئے۔ اور مسلمان بھی کفار کو تھوڑے سے دکھائے گئے۔ کیونکہ وہ تو واقعی تھے ہی تھوڑے۔ پس اُنھوں نے مسلمانوں کو ہیچ سمجھا۔ اور یہ خیال کیا کہ ہم فوراً اُن کو نابود کر دینگے۔ اگر یہ خیال اُن کے دل میں نہ ہوتا تو ممکن تھا۔ کہ جنگ کو ٹال دیتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اسی میدان میں پیشگوئیوں کے مطابق کفار کی طاقت کو توڑنا چاہتا تھا۔ پس قرآن کریم کی سب آیات ایک دوسرے کی موید ہیں*

۱۳ ۴۱۱۔ زین للناس حب الشھوٰت من النساء۔ الآیة ۔ مرغوب چیزوں کی خواہش لوگوں کو اچھی کر کے دکھائی گئی ہے۔ عورتوں سے بیٹوں سے وغیرہ۔ عام طور پر انسانوں کی یہی حالت ہے۔ کہ یہ چیزیں اُن کو

۲۱ کہ اپنی بدعملیوں کی وجہ سے وہ سزا کا حکم پائے۔ اِس صورت میں بھی اس کے نیک اعمال نے اسے کام نہ دیا۔ مگر قرآن کریم میں کئی موقعہ پر حبط اعمال کا ذکر ان معنوں کی رُو سے ہوتا ہے۔ کہ انبیاء اور صادقین کے خلاف ان کو ہلاک کرنے اور ان کے کاروبار تباہ کرنے کے لیئے جو لوگ منصُوبے کرتے ہیں وہ بے نتیجہ ہوتے ہیں کیونکہ حق تو آخر کار غالب آئیگا۔ پس ان کی کوششیں اور اُن کے منصُوبے ضایع جاتے ہیں۔ اسی حبط اعمال کا یہاں ذکر ہے۔ جیسا کہ آیت ماقبل کو ساتھ ملاکر پڑھنے سے روشن ہے۔ ان الذین یکفرون بایٰت اللّٰہ ویقتلون النبیین بغیر حق ویقتلون الذین یأمرون بالقسط من الناس فبشرھم بعذاب الیم۔ اولٰئک الذین حبطت اعمالھم فی الدنیا والاٰخرۃ ومالھم من نٰصرین۔ یعنی وہ لوگ جو اللّٰہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے یا ان کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے یا اُنکی قتل کے درپے ہو جاتے ہیں جو لوگوں میں سے نیکی کا حکم دیتے ہیں تو اُن کو عذاب الیم کی خبر دیدو۔ یہی وُہ لوگ ہیں جن کے اعمال دُنیا اور آخرت میں حبط ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی اُن کا مددگار نہیں ہوگا۔ دُنیا میں تو حبط اعمال ظاہر ہے کہ ناکام ہوئے۔ اور آخرت میں حبط اعمال اس لحاظ سے کہ اُنھوں نے اپنی ساری طاقتوں کو حق کی مخالفت پر لگا دیا۔ پس نیکی کے تمام موقعوں سے محرُوم ہو گئے +

حبط کے اصل معنی یہ ہیں کہ جانور بہُت کثرت سے کھائے۔ یہاں تک کہ اُسکا پیٹ پھُول جائے یا نفخ ہو جائے گویا غذا نے جو فائدہ اُسے پہُنچانا تھا وُہ نہیں پہُنچایا۔ یہی حال حق کی مخالفت کرنے والوں کے اعمال کا ہوتا ہے +

۲۲ ۱۴۷۔ اوتوا نصیبا من الکتٰب۔ ان کو ایک حصّہ کتاب کا دیا گیا ہے۔ مفسّرین نے عام طور پر صرف یہود کو مراد لیا ہے مگر یہود و نصارےٰ دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ ایک حصّہ کتاب کا دیا جانا انکو اس لیئے فرمایا کہ کتاب پورے طور پر محفوظ تو رہی نہیں تھی۔ پس اب جو کچھ اُن کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک حصّہ کتاب کا ہی تھا +

۱۴۸۔ یدعون الی کتاب اللہ لیحکم بینھم۔ اللّٰہ کی کتاب کی طرف بلائے جاتے ہیں کہ وہ ان میں فیصلہ کرے کہا جاتا ہے کہ ایک یہودی مرد اور عورت زنا کے مرتکب ہوئے۔ تو چونکہ وہ اپنے مقدّمات بھی بعض دفعہ نبی کریم صلے اللّٰہ علیہ وسلم کے حضوُر لے آتے تھے۔ تو رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ توریت میں رجم کا حکم ہے اس لیئے توریت کے حکم کے مطابق میں تمہارا فیصلہ کرتا ہوں۔ قرآن کریم کے الفاظ میں کسی ایک فیصلہ کی طرف بلانے کی تحدید نہیں۔ بلکہ الفاظ عام ہیں۔ اور سب سے بڑی بات جسکا فیصلہ یہود اور عیسائی اور مُسلمانوں کے درمیان ہونا ضروری تھا۔ وہ تو نبی کریم صلے اللّٰہ علیہ وسلم کی صداقت تھی۔ پس جب یہود کو کہا جاتا تھا۔ کہ توریت کے مطابق نبی کریم صلے اللّٰہ علیہ وسلم میں سچّے نبی اور موعود نبی کے سب نشان موجود ہیں تو وہ توریت سے بھی مُونھ پھیر لیتے تھے۔ اور جو صادق کی شناخت کی علامتیں توریت نے مقرر کیں اُن سے بھی انحراف کرتے تھے۔ لیکن اس رجم کے معاملہ میں یہ ایک عجیب بات ہے کہ لکھا ہے کہ جب توریت لائی گئی تو یہود نے عمدًا اس موقعہ کو چھپایا۔ جہاں رجم کا ذکر تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی رجم کا حکم

۱۷
رکھتی ہوئی اس بات پر متفق ہیں کہ خدا ہے اور ایک ہے۔ قائما بالقسط عامہ مفسرین نے شھد اللہ سے حال لیا ہے۔ مگر بعض نے اولوا العلم سے یعنی علم والے لوگ اس حال میں کہ انصاف کیساتھ حکم کرنے والے ہوں یہی گواہی دیں گے +

۱۸
۴۱۴۔ ان الدین عند اللہ الاسلام۔ پس جب اللہ تعالیٰ کی اس خالص توحید پر اللہ تعالیٰ کی فعلی کتاب پھر انسان کی فطرت۔ پھر دُنیا کی الہامی کتابیں گواہ ہیں۔ اور اسلام وہ دین ہے جس نے اس توحید کو سکھایا۔ تو اسلام ہی حقیقی دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہؤا۔ اسلام کے معنے فرمانبرداری بھی ہیں۔ اور دخول فی السلم۔ یعنی صلح میں داخل ہونا بھی ہیں۔ سو اسلام ایک طرف اگر انسان سے کامل فرمانبرداری قوانین الٰہی کی چاہتا ہے تو دُوسری طرف اس کامل فرمانبرداری کا نتیجہ بھی مسلمان کو دیدیتا ہے۔ اور وہ اس کو صلح میں داخل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس سلامتی کے پانے سے وُہ آخر دار السلام میں داخل ہوتا ہے جو جنّت کا نام ہے +

رکوع ۳/۱۱ آیت ۲۰
۴۱۵۔ فبشرھم بعذاب الیم۔ تبشیر کا لفظ عموماً خوشی کے موقعہ پر بولا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ اصل لفظ بشرہ سے مشتق ہے۔ اور خوشخبری پر بھی اس لیئے یہ لفظ بولا جاتا ہے کہ خوشخبری سے انسان کے بشرہ میں ایک تغیّر پیدا ہوتا ہے۔ پس اصل معنے کے لحاظ سے قرآن کریم نے اس کا استعمال ہر ایسی خبر پر کیا ہے جس سے بشرہ میں تغیّر واقع ہو۔ خواہ وہ خوشخبری ہو یا دُکھ کی خبر۔ جیسے یہاں اور اذا بشر احدھم بالانثیٰ ظل وجھہ مسودا وھو کظیم میں۔ اور بھی اس کی کئی مثالیں قرآن شریف میں ہیں +

۲۱
۴۱۶۔ حبطت اعمالھم۔ حبط اعمال سے مراد اعمال کا ضائع جانا ہے۔ بعض وقت انسان اعمال دنیوی میں مشغول رہتا ہے۔ تو ان اعمال کا اثر چونکہ اخروی زندگی پر کوئی نہیں۔ اس لیئے وہ سب ضائع ہی جاتے ہیں۔ یعنی آخرت میں کچھ کام نہیں دیتے۔ جیسے فرمایا الذین ضل سعیھم فی الحیوٰۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا اولئک الذین کفروا بایٰت ربھم ولقائہ فحبطت اعمالھم فلا نقیم لھم یوم القیٰمۃ وزنا۔ وہ لوگ جن کی ساری دوڑ دھوپ دُنیا کی زندگی میں کھو جاتی ہے۔ اور وُہ سمجھتے ہیں کہ وُہ اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہ وُہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے احکام اور اس کے لقاء کا انکار کرتے ہیں۔ سو ان کے اعمال ضائع جاتے ہیں اور قیامت کے دن ہم اُن کے لیئے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔ ایسا ہی فرمایا وقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلنٰہ ھباء منثورا۔ اور بعض وقت اِس طرح پر بھی حبط اعمال ہوتا ہے۔ کہ انسان ایک عمل کرتا ہے۔ جو بظاہر نیک ہوتا ہے۔ مگر اس کی نیت صحیح نہیں ہوتی جیسا بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ قیامت کے دن بعض ایسے لوگ لائے جائیں گے جو قرآن کو پڑھتے تھے۔ مگر اس لیئے کہ لوگ اُن کو قاری کہیں۔ پس اُنکو دوزخ میں لیجانے کا حکم دیا جائیگا۔ اور یہ بھی حبط اعمال ہی ہے۔ کہ انسان کے نیک عمل اس قدر کم ہوں

اُن سے ہم ملک لینا چاہتے ہیں۔ اور ایک قوم کو جس کو ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ ہم دنیا میں معزّز بنانا چاہتے ہیں اور ایک قوم جو اپنے آپ کو معزز خیال کرتی ہے اسے ہم ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ دُوسری جگہ قرآن کریم میں فرمایا۔ فقد اٰتینا اٰل ابراهیم الکتاب والحکمة واٰتیناهم ملکا عظیما۔ یعنی آل ابراہیم (مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت ہے) کو ہم نے کتاب اور حکمت اور ملک عظیم دیا ہے۔ اور ایسا ہی فرمایا فللّٰه العزة ولرسوله وللمومنین۔ عزّت تو اللہ اور اُس کے رسول اور مومنوں کے لیئے ہی ہے۔ یہ پیشگوئی ملک و حکومت دینے کی۔ اور مسلمانوں کو دُنیا میں ایک معزز قوم بنانے کی اس وقت کی جاتی ہے۔ جب ابھی عرب کے اندر مسلمان چاروں طرف کفار میں گھرے ہوئے تھے۔ اور کفّار کا ہی غلبہ تھا۔ اور یہودی اور عیسائی اور مشرکین عرب سب اس بات پر اتّفاق کئے ہوئے تھے کہ اس چھوٹے سے گروہ کو نابود کر دیں گے۔ ایسی حالت میں اس تسلی کا رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو ملنا کس قدر حیرت انگیز پیشگوئی ہے +

ملكَ کا لفظ اس موزونیت کے لحاظ سے بھی اختیار کیا ہے۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام بار بار خدا کی بادشاہت کی آمد کی خبر دیتے تھے۔ پس اس میں یہ بھی اشارہ ہے۔ کہ وہ بادشاہت اب آگئی۔ بہرحال لفظ ملك میں ظاہری وباطنی دونوں قسم کی حکومت شامل ہے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو علاوہ ان قرآنی پیشگوئیوں کے ویسے بھی مکاشفات میں دکھایا گیا تھا کہ آپ کی اُمّت دُنیا پر بادشاہ ہونے والی ہے۔ چنانچہ معتبر روایات میں غزوہ خندق کا یہ واقعہ درج ہے کہ خندق کھودتے ہوئے ایک عظیم الشّان پتھر حائل ہو گیا۔ جس پر کوئی ہتھوڑے کی ضرب کارگر نہیں ہوتی تھی لوگوں نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو خبر کی۔ آپ نے اس پر جب پہلی ضرب لگائی تو وہ پھٹ گیا۔ اور اس کے اندر سے بجلی کی طرح چمک نکلی۔ تو آنحضرت صلّے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ اکبر۔ سب صحابہ نے بھی تکبیر کہی۔ تو آپ نے فرمایا اضاءت لی منها قصور الحیرة۔ اس کے ساتھ حیرہ کے محل میرے سامنے روشن ہو گئے۔ پھر آپ نے دُوسری ضرب لگائی تو فرمایا اضاءت لی منها قصور صنعا۔ صنعاء کے محل اس کے ساتھ میرے سامنے روشن ہو گئے۔ اور آخر پر فرمایا واخبرنی جبرئیل علیه السّلام ان امتی ظاهرة علی کلها۔ اور جبرئیل علیہ السّلام نے مجھے خبر دی ہے کہ میری اُمّت ان سب پر غالب آئے گی۔ کیا خدا کی شان ہے کہ ایک طرف دس ہزار کی جرّار فوج مدینہ کو گھیرے ہوئے پڑی ہے۔ اور خود مدینہ کے اندر بھی دشمن موجود ہیں اور مٹھی بھر مسلمانوں کے بچاؤ کے لیئے آپ خندق کھود کر بچاؤ کی صورت پیدا کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف یہ عظیم الشان پیشگوئیاں کہ ان سب بڑے بڑے محلوں پر جو اس وقت بڑی بڑی سلطنتوں کے تخت گاہ ہیں ہم قابض ہونگے۔ کیا دنیا میں اِس کی نظیر کوئی پیشگوئی دکھا سکتا ہے۔ اور کیا آنحضرت صلّے اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے کا اس سے بڑھ کر کوئی ثبوت بکار ہے +

۲۲۰۔ تولج الیل فی النهار وتولج النهار فی الیل وتخرج الحي من المیت وتخرج المیت من الحي۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲:۔ زنا کا ذکر نہیں اسکے الفاظ یہ ہیں " جو لڑکی کہ کنواری ہے اور کسی کی منگیتر ہو اور کوئی اور شخص اسے شہر میں پاکے اُس سے ہم صحبت ہو تو تم ان دونوں کو اسی شہر کے دروازے پر نکال لاؤ اور تم ان پر پتھراؤ کرو کہ وے مرجائیں " یہ اصطلاحی زنا نہیں۔ اسی لیئے یہاں لفظ بھی " ہم صحبت " ہو۔ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ اسی قسم کے دُوسرے فعل پر سزا صرف تھوڑا سا جرمانہ بتاتی ہے " اگر کوئی آدمی کنواری لڑکی کو پاوے جو کسی کی منگیتر نہ ہو اور اُسے پکڑ کے اس سے ہم بستر ہو اور وے پکڑے جائیں

آیت ۲۲

موجود تھا۔ مگر موجودہ توریت میں رجم کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ صرف قتل کا حکم ہے۔ جیسا کہ احبار بیس باب دسویں درس سے ظاہر ہے "اور وُہ شخص جو دوسرے کی جورو کے ساتھ یا اپنے پڑوسی کی جورو سے زنا کرے۔ وہ زنا کرنے والا اور زنا کرنے والی دونو قتل کیئے جائیں"۔ حالانکہ مسیح کے وقت تک یہودیوں کا سنگساری کی حکم کو توریت کے اندر تسلیم کرنا خود اناجیل سے ثابت ہے۔ چنانچہ فریسی ایک عورت کو جو زنا میں پکڑی گئی تھی مسیح پاس لائے اور کہا "اے استاد یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی۔ موسےٰ نے تو توریت میں ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسیوں کو سنگسار کریں پر تو کیا کہتا ہے" (یوحنا ۸ - ورس ۴ و ۵) اور نہ صرف یہودیوں کا ہی یہ اقرار انجیل میں موجود ہے۔ بلکہ خود مسیح نے بھی اس کی صداقت پر مہر لگائی کہ واقعی توریت میں تو یہی حکم موجود ہے۔ چنانچہ جواب میں مسیح نے کہا "جو کوئی تم میں بے گناہ ہے پہلے وہی اُسے پتھر مارے"۔ اب موجودہ توریت میں سنگساری کا حکم قطعاً نہیں ہے۔ بلکہ قتل کا حکم ہے۔ تو اس لیئے انجیل بھی قرآن کریم کی شہادت کی موید ہے۔ کہ واقعی توریت میں تحریف ہوئی۔ اس سے ہمیں بحث نہیں کہ یہ خاص تحریف قرآن کریم سے پہلے ہو چکی تھی یا بعد میں ہوئی۔ بہرحال تحریف کا یہ قطعی ثبوت ہے جس سے کم از کم کوئی عیسائی تو کسی صورت میں انکار نہیں کر سکتا۔ اور اگر انکار کرے تو پھر انجیل کو جھوٹا یا محرف ماننے غرض عیسائیوں کے لیئے سوائے اس کے چارہ نہیں کہ یا توریت کو محرف مانیں یا انجیل کو محرف مانیں۔ دونو صورتوں میں قرآن کریم کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ پادری صاحبان مسلمانوں پر بہت اعتراض کیا کرتے ہیں کہ تم یُونہی توریت و انجیل کو محرف کہتے ہو کوئی ثبوت دو۔ اب اس ایک حکم میں تو قطعی طور پر توریت کی تحریف ثابت ہے۔ اور جو توریت کی تحریف نہ مانے وہ انجیل کی تحریف ماننے پر مجبور ہوگا اور اس سے زیادہ ہمیں دکھانے کی ضرورت بھی نہیں۔ ایک موقعہ پر تحریف کا ثبوت ایسا قطعی مل جانا کل کتاب کو قرآن کریم کے مقابل پایۂ اعتبار سے ساقط ثابت کرتا ہے*

کتاب اللہ سے مراد ہم نے توریت کو لیا ہے۔ مگر قرآن بھی مراد ہو سکتا ہے۔ اور درحقیقت ترجیح اسی کو ہے کیونکہ حقیقی کتاب اللہ کہلانے کا مستحق اُس وقت قرآن ہی تھا نہ توریت جو محرف ہو چکی تھی +

آیت ۲۵

۱۹ا۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ۔ کہو اے اللہ ملک کے مالک تو جسے چاہتا ہے ملک عطا فرماتا ہے۔ اور جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ یہ ایک دُعا ہے جو قرآن کریم نے سکھائی ہے۔ اب قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے خود جو دُعائیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کی وساطت سے مسلمانوں کو سکھائیں اُن کی غرض یہ تھی۔ کہ وہ انعامات جن کا ان دعاؤں میں ذکر ہے اللہ تعالےٰ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اور آنجناب کی وساطت سے آپ کی اُمت کو عطا فرمائے۔ پس اس دعا میں بظاہر کیا گیا ہے کہ ایک قوم کو جس کے پاس مُلک نہیں۔ ہم ملک دینے والے ہیں۔ اور ایک قوم جس کے پاس مُلک ہی

* یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ زنا کا لفظ صطلاح میں صرف اس بدفعل پر آتا ہے جسکا ارتکاب بیاہی ہوئی عورت سے ہو۔ اسکی سزا احبار ۲۰ : ۱۰ میں یہ ہے "اور وہ شخص جو دوسرے کی جورو کے ساتھ یا اپنے پڑوسی کی جورو سے زنا کرے۔ وُہ زنا کرنیوالا اور زنا کرنیوالی دونوں قتل کیئے جاویں"۔ اور استثنا ۲۲ : ۲۲ میں اسی جرم کی سزا پھر درج ہے "اگر کوئی مرد شوہر والی عورت سے زنا کرتے پایا جائے تو وے دونوں مار ڈالے جاویں"۔ لیکن بعض لوگ دھوکہ دینے کے لیئے استثنا ۲۲ : ۲۴ کو پیش کر دیتے ہیں جس میں اصطلاحی (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۱)

آیت ۲۷

تعلقات محبت و یگانگت پیدا کرنا اپنے ساتھ آپ دشمنی کرنا تھا پھر اس سے بڑھ کر وضاحت فرمائی۔ لاینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین ۔ انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولئک ھم الظٰلمون۔ اللہ تعالیٰ تمکو اُن لوگوں سے نہیں روکتا جنھوں نے تمہارے ساتھ دین کی وجہ سے جنگ نہیں کیا۔ اور نہ تمکو تمہارے گھروں سے نکالا ہے۔ کہ اُنکے ساتھ تم نیکی کرو۔ اور اُن سے انصاف کرو۔ اللہ تو انصاف کرنیوالوں سے محبت کرتا ہے۔ اللہ تمکو صرف اُن لوگوں سے روکتا ہے جنھوں نے دین کے بارہ میں تم سے جنگ کیا۔ اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا۔ اور تمہارے نکالنے میں (دوسروں کی) پیٹھ بھری کہ ان سے تم محبت و یگانگت کا تعلق پیدا کرو۔ اور جو شخص ایسوں کو ولی بناتا ہے تو ایسے لوگ ظالم ہیں +

کیا اس سے بڑھ کر صاف اور پسندیدہ قانون آج تک کسی قوم نے بنایا ہے۔ اسلام نے کسی کے ساتھ بلاوجہ دشمنی نہیں سکھائی۔ اور دشمنوں کے ساتھ بھی ایسی دشمنی کرنے کی تعلیم نہیں دی کہ ایک شخص پھر دشمن کی کسی خوبی کا بھی اعتراف نہ کرے۔ بلکہ یہود و نصاریٰ کی سخت دشمنی کے باوجود بھی ان کی خوبیوں کا اعتراف قرآن کریم کے اندر پایا جاتا ہے +

۴۲۲۔ الا ان تتقوا منھم تقٰۃ۔ مگر یہ کہ بچاؤ کرو اُن سے بچاؤ کرنا۔ ان الفاظ سے لوگوں نے تقیہ کے احکام نکالے ہیں۔ مگر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے۔ یہاں دشمن قوم سے تعلقات محبت پیدا کرنے کی ممانعت ہے اور الا ان تتقوا میں استثنائے منقطع ہے۔ یعنی دوستانہ تعلق اُنسے پیدا نہ کرو مگر اپنا بچاؤ اُنسے ضرور کرلو +

رکوع ۴ آیت ۳۰

۴۲۳۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ کہو اگر تم اللہ سے کچھ محبت رکھتے ہو۔ تو میری پیروی کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا۔ الفاظ تو عام ہیں۔ جو شخص محبوب الٰہی بننا چاہتا ہے وہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرے۔ مگر عیسائی بالخصوص مخاطب ہیں۔ اور حضرت مسیح کے ان الفاظ کی طرف اشارہ ہے۔ جو یوحنا ۱۴ باب ورس ۱۵-۱۶ میں مذکور ہیں۔ جہاں آنحضرت صلعم کے آنیکی پیشگوئی دوسرے تسلی دھندہ کے نام سے کی گئی ہے "اگر تم مجھ سے پیار کرتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا۔ اور وہ تمھیں دوسرا تسلی دینے والا بخشے گا" پس محبت کا دعوے کرنے والوں کو جو نحن ابنٰؤا اللہ واحبآؤہ کی آواز بھی بلند کرتے تھے۔ فرمایا کہ اگر خدا کے محبوب بننا چاہتے ہو تو ایک ہی راہ اب دنیا میں ہے۔ اور اس کی طرف مسیح بھی تم کو بلا گیا ہے۔ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دل سے پیرو بن جاؤ۔ اس کے بعد جو الفاظ ہیں ویغفر لکم ذنوبکم ان میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ کہ گناہوں سے حفاظت کفارہ پر ایمان لانے سے نہیں ہوتی بلکہ عمل سے اور عمل بھی یہ کہ آنحضرت کے نقش قدم پر چلو +

۳۲

۴۲۴۔ ان اللہ اصطفٰے اٰدم ونوحا واٰل ابراھیم واٰل عمران علی العٰلمین۔ اللہ تعالیٰ نے آدم اور نوح

بقیہ حاشیہ ۴۲۲: اور استثنا ۲۲ کا حوالہ کہیں نہیں دیا۔ پس معلوم ہوا کہ حضرت مسیح کے وقت میں زنا کی سزا جواب احبار ۲۰ اور استثنا ۲۲ میں قتل لکھی ہے۔ رجم تھی اور توریت میں تحریف کرکے اس کو بجائے رجم کے قتل بنایا گیا +

آیت ۲۶

ظاہری نظارے تو ہر آنکھ کے سامنے ہیں کہ کس طرح دن سے رات اور رات سے دن اور زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر قرآن کریم کا اشارہ درحقیقت اسی نور اور ظلمت اسی احیاء اور اماتت کی طرف ہے کہ ایک قوم اب ظلمت و موت سے نکل کر نُور او راحیاء کو پانے والی ہے۔ اور ایک قوم زندگی کو خیر باد کہکر موت کی حالت کی طرف جانے والی ہے +

۲۷

۴۲۱۔ لا یتخذ المؤمنون الکٰفرین اولیاء من دون المؤمنین۔ مومن مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ولی نہ بنائیں۔

وَلی کا لفظ ایسا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مومن میں اور اپنے میں ولایت کا تعلّق رکھا ہے۔ چنانچہ مومنوں کو اولیاء اللہ یا اللہ کے ولی کہا گیا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کو مومنوں کا ولی۔ واللہ ولی المؤمنین کافروں کے ساتھ جس تعلّق ولائیت سے روکا گیا ہے۔ اُس کی تشریح خود قرآن کریم نے کردی ہے فرمایا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء میرے اور اپنے دشمن کو ولی نہ بناوُ۔ سو ایسے کفّار جو اللہ تعالیٰ کے اور خود مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ اُن کو دوست بنانے سے روکا گیا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بجائے مسلمانوں کے ساتھ کوئی دلی تعلّق رکھنے کے اندر سے اُن کے ساتھ دشمنی کرتے اور ظاہرداری میں دوستی کا اظہار کرتے تھے۔ اور حتی الوسع اس کوشش میں لگے رہتے تھے۔ کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیر دیں۔ چنانچہ جس قدر واقعات اس آیت کی شان نزول میں لکھے ہیں۔ ان سب میں یہ امر مشترک پایا جاتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس قدر ایسی آیات ہیں جن میں کفار یا یہود و نصاریٰ کے ساتھ تعلق ولائیت رکھنے سے روکا گیا ہے وہ اس وقت کی آیات ہیں جب کفار اور یہود و نصاریٰ علانیہ مسلمانوں کے خلاف ہو کر ان کی تباہی کے درپے ہو چکے تھے۔ پس ایسی حالت میں کس قدر ضروری تھا کہ ایسے دشمنوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کرنے سے روکا جاتا۔ آج اگر ایک قوم کی دوسری کے ساتھ جنگ ہوتی ہے تو کیا پھر وہ قوم پسند کرتی ہے کہ اس کے بعض افراد دشمن قوم کے ساتھ تعلق محبت رکھیں اور اُن کے ساتھ دوستانہ خط و کتابت کریں +

سورہ ممتحنہ میں اس مضمون کو بہت صاف کیا گیا ہے۔ یہ سورت اوّل ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ یا یھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ اور پھر اُس کی وجہ بتائی یخرجون الرسول وایاکم ان تؤمنوا باللہ ربکم۔ رسُول کو اور تم کو محض اس قصُور پر نکالتے ہیں کہ تم اللہ۔ اپنے رب پر ایمان لائے ہو۔ اور پھر فرمایا۔ ان یثقفوکم یکونوا لکم اعداء و یبسطوا الیکم ایدیھم والسنتھم بالسوء و ودوا لو تکفرون۔ اگر وہ تم کو پالیں تو تمہارے پکے دشمن ہوں۔ اور اپنے ہاتھ اور زبانیں تمہارے ساتھ برائی کرنے کو بڑھائیں اور چاہیں کہ تم کافر ہو جاؤ۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ

بقیہ حاشیہ ملا ۲۲ :۔ تو وہ مرد جو اُسکے ساتھ ہم بستر ہوُا لڑکی کے باپ کو پچاس مثقال روپا دے اور وہ اس کی جورو ہو وے۔ کیونکہ اسنے اسے رسوا کیا اور اُسے اپنی زندگی بھر طلاق نہ دے" استثنے ۲۲/۲۸۔ اب ظاہر ہے کہ نہ رجم زنا کی سزا کہلا سکتی ہے نہ پچاس روپے جرمانہ۔ کیونکہ یہ اصطلاحی معنے میں زنا نہیں اور اسی لیئے ان صُورتوں میں توریت نے لفظ زنا بھی اختیار نہیں کیا۔ اور اس امر کا ثبوت کہ یوحنا ۸ میں جس عورت کا ذکر ہے۔ وہ زنا کے جرم کی مرتکب تھی۔ نہ صرف اس سے ملتا ہے کہ اسے عورت کہا گیا ہے نہ کنواری لڑکی۔ پھر یہ کہ اُسکے جرم کا نام زنا رکھا ہے۔ بلکہ اس سے بھی کہ خود بائبل میں یوحنا ۸ پر جو حوالہ توریت کا دیا ہے" ایسیوں کو سنگسار کریں" وہ احبار ۲۰/۱۰ اور استثنے ۲۲/۲۲ ہے۔

۳۴
جانا بھی اسی بات کو ظاہر کرتا ہے۔ اور چونکہ کہانت کا تعلق حضرت ہارون کے خاندان سے تھا۔ اسلئے مریم کو اخت ہارون اور اس کی والدہ کو امرأۃ عمران کے نام سے پکارا ہے۔ عربی زبان میں لفظ اب۔ ام۔ اخ اخت سب کے سب وسیع معنے میں استعمال ہوئے ہیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں انا دعوۃ ابی ابراھیم میں اپنے باپ ابراہیم کی دُعا ہوں۔ یہاں ابراہیم کو صاف طور پر اپنا اب کہا ہے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت صفیہؓ نے شکایت کی کہ مجھے یہودی عورت کہا جاتا ہے تو آپ نے فرمایا تو نے جواب میں یوں کیوں نہ کہا۔ ان ابی ھارون وعمی موسیٰ وزوجی محمد۔ میرا باپ ہارون ہے اور میرا چچا موسےٰ ہے اور میرے خاوند محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ یہاں صفیہ کے باپ اور چچا کی نسبت ہارون اور موسےٰ علیہما السلام سے کی ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ عمران اور ہارون کے لفظوں سے وہی عمران اور ہارون مراد نہ لیئے جائیں اور امرأۃ اور اخت کے وسیع معنے نہ لیئے جائیں +

۴۲۶۔ انی نذرت لک ما فی بطنی محررا۔ یہ مریم کی والدہ کی عرض بارگاہ الٰہی میں ہے۔ کہ اے میرے رب جو کچھ میرے پیٹ میں ہے وہ مَیں نے آزاد کر کے تیری نذر کیا۔ محرر کے معنے ہیں حر بنایا گیا۔ اور مراد یہ ہے کہ اپنے کاروبار سے یا دنیوی مشاغل سے آزاد کر کے محض اللہ تعالےٰ کی خدمت کے لیئے وقف کیا گیا۔ بنی اسرائیل کی اس گئی گذری حالت میں بھی اس کے اندر ایسی عورتیں پائی جاتی ہیں۔ جو محض دین الٰہی کی خدمت کے لیئے اپنی اولاد کو وقف کر دیتی ہیں۔ پھر کس قدر افسوس ہے مسلمانوں پر کہ ان کے اندر دین کی خدمت کے لیئے وقف ہونے والوں کا نشان کیوں نہیں ملتا۔ اللہ تعالےٰ نے یہ تذکرہ قرآن کریم میں اسی لیئے کیا ہے۔ کہ تا مسلمان اس سے سبق حاصل کریں۔ کہ گو بنی اسرائیل کی حالت اس وقت بہت بگڑ چکی تھی مگر پھر بھی اُن کے اندر محض رضائے الٰہی کے لیئے اپنی زندگیاں وقف کرنے والے لوگ موجود تھے پس کس قدر شرم کا مقام ہے کہ مسلمانوں کی حالت بنی اسرائیل کی عورتوں سے بھی گئی گذری ہو +

۳۵
۴۲۷۔ انی اعیذھا بک وذریتھا من الشیطان الرجیم۔ رجیم کے معنے ملعون ہیں۔ یا وہ جو رحمت الٰہی سے دُور ڈالا گیا ہے۔ مریم کی والدہ کی دُعا ہے کہ مریم اور اس کی اولاد شیطان ملعون کے حملہ سے محفوظ رہے اس دُعا سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ باوجود مریم کو ہیکل کی خدمت کے لیئے وقف کرنے کے اُن کا یہ منشاء نہ تھا کہ وہ کنواری رہیں گی۔ بلکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ جوان ہو کر بیاہی جائے گی اور صاحب اولاد ہو گی۔ اسی لیئے نہ صرف مریم کے لیئے دُعا کی۔ بلکہ مریم کی اولاد کے لیئے بھی دُعا کی +

جو خوبی کسی مذہب میں یا کسی شخص میں پائی گئی ہے ایک مسلمان کو وہ خوبی ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بہترین طریق پر دینی چاہی ہے۔ مریم کی والدہ نے تو بچہ جننے وقت اُس کے لیئے دُعا کی کہ وُہ بچہ شیطان کے مس سے محفوظ رہے۔ مگر ہمارے نبی کریم صلعم نے جو دُعا مسلمانوں کو سکھائی ہے۔ وہ نطفہ کے رحم میں قرار پکڑنے سے بھی پہلے ہے بلکہ مرد و عورت کے تعلق کے وقت وہ پاک دُعا سکھائی ہے۔ اللھم

آیت ۳۲

اور آل ابراہیم اور آل عمران کو سب دنیا پر چن لیا۔ چونکہ اصل مقصد اس سورت کا یہ بتانا ہے کہ بنی اسرائیل سے اب نبوت جاتی ہے۔ اس لیئے آل عمران پر لاکر خاتمہ کر دیا۔ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ عمران حضرت موسیٰؑ کے والد کا نام تھا۔ اس لیئے آل عمران میں گویا سلسلہ موسویہ کا ذکر کیا ہے۔ آل عمران حالانکہ آل ابراہیم میں شامل ہے مگر اس کا علیحدہ ذکر اس لیئے فرمایا۔ کہ آل ابراہیم کی ایک شاخ مدت سے اپنے آپ کو ہی نبوت و ملک کی وارث سمجھے ہوئی تھی۔ حالانکہ آل ابراہیم کا اصلی عروج بنی اسمٰعیل کے ذریعہ بہ طفیل نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہونا تھا۔ جیسا کہ دُوسری جگہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کرکے فرمایا فقد اٰتینا اٰل ابرٰاہیم الکتاب والحکمۃ واٰتینٰھم ملکا عظیما۔ پس آل ابراہیم کو آل عمران سے الگ کرکے بیان کرنے کی غرض یہی ہے۔ کہ آل عمران میں تو سلسلہ موسویہ آجاتا ہے۔ اور آل ابراہیم کے اصطفا کا اصل اشارہ حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے ❖

۳۴

۴۲۵۔ اذ قالت امرأۃ عمران۔ جب عمران کی عورت نے کہا۔ امرأۃ عام طور پر عورت کو بھی کہتے ہیں اور بی بی کو بھی کہتے ہیں۔ چونکہ اوپر اس عمران کا ذکر صاف طور پر آل عمران میں موجود ہے۔ جن سے حضرت موسیٰ اور ہارون کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس لیئے یہاں امرأۃ عمران سے مراد آل عمران کی ایک عورت ہی معلوم ہوتی ہے بائبل میں بھی ایک بڑے مورث کے نام سے ایک قوم کو پکارا گیا ہے۔ جیسا بنی اسرائیل کی جگہ بہت دفعہ صرف اسرائیل ہی آیا ہے۔ اور بنی اسمٰعیل کو قیدار کے نام سے پکارا ہے۔ جو عربوں کے مورث اعلےٰ تھے پس اس لحاظ سے قرین قیاس یہی ہے کہ عمران سے مراد سلسلہ آل عمران ہے۔ اور یہاں ذکر انہی میں سے ایک عورت کا ہے۔ اور چونکہ اُوپر آل عمران کے اصطفا کا ذکر ہے۔ جو عام ہے۔ یہاں اُن میں کی ایک خاص عورت کا ذکر فرمایا جس کے ذریعہ آل عمران کے آخری برگزیدہ انسان کا ظہور ہونا تھا۔ ایک دوسری مثال جو اسی ذکر کے اندر آئے گی وہ بھی آل عمران کی آخری یادگاروں یعنی زکریّا اور یحییٰ علیہما السلام کے متعلق ہے یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ مریم کو اُخت ہارون کرکے پکارا گیا ہے اور گو بعض مفسّرین نے ان دونوں ناموں عمران اور ہارون کی یہ توجیہہ کی ہے کہ عمران حضرت مریم کے والد کا نام تھا۔ اور ہارون آپ کے ایک بھائی کا نام تھا۔ اور اس کے خلاف شہادت نہ ہونے کی وجہ سے یہ بات بھی قابل قبول ہے۔ لیکن چونکہ اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ اور جس عمران کا اُوپر ذکر کیا اس سے صاف طور پر مراد حضرت موسےٰ علیہ السّلام کے والد ہیں۔ اور ہارون جسکا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ بھی اسی عمران کے بیٹے ہیں۔ اس لیئے اقرب الی الفہم یہی بات ہے کہ امرأۃ عمران اور اخت ہارُون دونوں لفظوں میں انہی اعلےٰ مورثوں کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت مریم علیہا السّلام کا کوئی نسب نامہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ مگر یہ بہرحال معلوم ہوتا ہے۔ کہ مریم کے والدین کا تعلق بنی اسرائیل میں خاندان کہانت سے تھا۔ اور اسی خاندان سے حضرت زکریّا کا بھی تعلق تھا۔ اور مریم کا ہیکل کی خدمت کے لیئے مخصوص کیا

۳۵

کے لیئے اپنی سعی اور اپنا کسب ہی ہے۔ سوائے انبیاء علیہم السلام کے۔ ان لیس للانسان الا ما سعی۔ الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ ترک شر اور حصول خیر کے لیئے مجاہدہ اور اکتساب ضروری ہے۔ ان دعاؤں کا اثر بھی ایک خاص حد تک ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ بس ایک کے لیئے دعا ہو گئی اب وہ کبھی غلطی ہی نہیں کر سکتا۔ خود مریم کے تذکرہ میں اللہ تعالٰے نے فرمایا صدقت بکلمات ربھا وکتبہ وکانت من القانتین۔ یعنی اصول صحیحہ پر بھی قائم ہوئی اور پھر اللہ تعالٰے کی فرمانبرداری بھی اختیار کی۔ لیکن جو شخص ایک نیکی کے موقعہ کو پاکر پھر اسے گنوا دیتا ہے۔ وہ ذمہ داری سے بری نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کی جوابدہی یاد ہے۔ کہ اس کو ایک موقعہ دیا گیا تھا۔ اس نے اسے ضائع کر دیا +

۳۶

۴۲۸۔ کلما دخل علیھا زکریا المحراب وجد عندھا رزقا قال یامریم انی لک ھذا قالت ھو من عند اللہ ان اللہ یرزق من یشاء بغیر حساب۔ جب کبھی زکریا مسجد میں اس کے پاس جاتے تو اس کے پاس رزق پاتے۔ انھوں نے کہا اے مریم یہ کہاں سے ملا۔ اس نے کہا اللہ کی جناب سے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ اس آیت پر بعض قصے بیان کیئے گئے ہیں۔ کہ مریم کے پاس بے موسم کے میوے آتے تھے۔ یہ محض اعجوبہ پرستی ہے۔ اللہ تعالٰے نے قرآن میں کہیں نہیں فرمایا نہ صحیح احادیث میں کوئی ایسا ذکر ہے۔ بات تو سیدھی ہے۔ کہ مریم چونکہ ہیکل کی خدمت کرتی تھیں۔ زائرین جیسا کہ دستور ہے کچھ اُن کو دیجاتے ہونگے۔ زکریا نے جب مریم سے دریافت کیا تو انھوں نے خدا پرستوں کا سا جواب دیا کہ جو کچھ ملتا ہے اللہ کی جناب سے ہی ملتا ہے۔ کیونکہ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ اب یہی بیحساب رزق دینے کا وعدہ قرآن کریم میں کئی جگہ مسلمانوں کے لیئے آیا ہے۔ تو اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ سچ مچ آسمان سے اُترتا ہے۔ جس کے لیئے اللہ تعالٰے کوئی سبب پیدا کر دے۔ وہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالٰے تو یہاں تک فرماتا ہے۔ ان من شئ الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدر معلوم۔ ساری چیزوں کے خزانے ہمارے پاس ہی ہیں اور ہم ایک معین اندازہ سے نازل کرتے رہتے ہیں۔

۳۷

۴۲۹۔ ھنالک دعا زکریا ربہ۔ تب زکریا نے بھی اپنے رب سے دعا کی (کہ اللہ تعالٰے اسے بھی ایسی نیک اولاد دے) معلوم ہوتا ہے حضرت زکریا بنی اسرائیل کی حالت کو دیکھ کر یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اب یہ قوم اس قابل نہیں رہی۔ کہ اس کے اندر وہ پاک لوگ پیدا ہوں جو اس قوم کو راہ راست پر رکھ سکیں۔ چنانچہ دوسری جگہ ان کے یہ الفاظ مذکور ہیں۔ وانی خفت الموالی من ورائی۔ ان کا خوف اسی وجہ سے تھا۔ کہ ان لوگوں کی عملی حالتیں ان کو اچھی نظر نہ آتی تھیں۔ ورنہ انبیاء کو مال و جائداد کے ورثوں کا فکر نہیں ہؤا کرتا۔ بلکہ یہ ورثہ تو وہ چھوڑتے ہی نہیں۔ پس جب مریم کے اندر انھوں نے ایسی نیکی اور سعادت دیکھی تو اُن کی طبیعت میں بھی ایک جوش پیدا ہوا۔ کہ اللہ تعالٰے انھیں بھی ایسی نیک اولاد عطا کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکوں کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے تو نیک اولاد کے لیئے ہی

جنبنا الشیطان وجنب الشیطان ما رزقتنا۔ اے اللہ شیطان کو ہم سے دُور رکھیو۔ اور جو کچھ ہم کو عطا کرے (یعنی اولاد) اُس سے بھی شیطان کو دور رکھیو۔ درحقیقت اسلام سب مذاہب کی خوبیوں کا جامع ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ ایک بنی اسرائیل کی عورت کی دُعا کو قبول کرکے اس کی بیٹی اور اس بیٹی کی اولاد کو مس شیطان سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ تو کیا اس کو ایک مسلم کے ساتھ کچھ بغض ہے کہ وہ اُس کی دُعا کو جو نطفہ کے رحم میں قرار پکڑنے سے بھی پہلے کی گئی ہے قبول نہیں کرے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ پر بدظنی ہے۔ مریم کی ماں کا ذکر تو مسلمانوں کی تعلیم کے لیئے ہی اللہ تعالےٰ نے کیا۔ ہاں دُعا خلوص نیت سے ہو تو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ مریم کی ماں ایک طرف اپنی اولاد کو خدمت دین کے لیئے وقف کرنے کا پختہ عزم کرتی ہے بلکہ نذر مانتی ہے۔ دُوسری طرف بچہ کے پیدا ہونے پر اُس کے مس شیطان سے محفوظ رہنے کی دُعا کرتی ہے پس اس کے خلوص پر مُہر لگ گئی۔ مگر ایک دُنیا دار خواہ وہ نام کا مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ جس کے دل میں دین کے لیئے کبھی درد پیدا نہیں ہوا۔ اولاد کو خدمت دین کے لیئے وقف کرنا تو ایک طرف رہا۔ اس کی اولاد اگر مس شیطان سے پاک ہو تو کیوں کر۔ پس یہ خوب یاد رکھو کہ جس طرح بنی اسرائیل کی ایک عورت کی دُعا قبول ہو سکتی ہے۔ محمد رسول اللہ صلعم کے ایک پیرو کی دُعا بدرجہ اولیٰ قبولیت کا استحقاق رکھتی ہے۔ اس لیئے یہ جو حدیث میں آیا ہے۔ ما من مولود یولد الا و یمسہ الشیطان حین یولد ... الا مریم وابنہا۔ کہ کوئی مولود پیدا نہیں ہوتا۔ مگر شیطان اسے مس کرتا ہے۔ جب وہ پیدا ہوتا ہے۔ سوائے مریم اور اُس کے بیٹے کے۔ اس کے معنے بھی درحقیقت یہی ہیں اور یہ گویا اس آیت کی تفسیر ہے۔ کہ جو شخص اس طرح پر درد دل سے دُعا کرتا ہے۔ وہ مریم اور اُس کے بیٹے کا مثیل ہو جاتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ خدا پر فرض نہیں کہ وہ ہر دُعا کو قبول کرے۔ مگر حدیث کا منشا یہی ہے کہ جس طرح مریم کی ماں نے اپنی بیٹی اور اُس کی اولاد کے لیئے دُعا کی اسی طرح ہر شخص دُعا کرے تاکہ اس کی اولاد مریم اور ابن مریم کی طرح مس شیطان سے پاک ہو۔ تو جس خدا نے مریم کی ماں کی دُعا قبول کی وہ ایک مسلمان کی دُعا کو بھی ضرور قبول کرے گا۔ جس کے لیئے خود وعدہ فرمایا۔ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلھم یرشدون۔ اس حدیث کا یہ منشا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ نعوذ باللہ من ذالک دیگر انبیاء مس شیطان سے محفوظ نہ تھے۔ انبیاء تو ایک طرف رہے۔ ایک مومن کی اولاد بھی مس شیطان سے پاک ہو سکتی ہے۔ مگر پیدائش کے وقت مس شیطان سے پاک ہونے کا منشا یہ نہیں کہ وہ شخص انبیاء کی طرح معصوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ کہ طبعاً ان میں بدی کا میلان کم ہوتا ہے یا نیکی کا میلان غالب ہوتا ہے۔ مگر گرد و پیش کے حالات سے متأثر ہو کر وہ بعض وقت بُرائی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ گو پہلے بدی کا میلان اُن میں زیادہ ہو۔ مگر نیک صحبت سے اور نیک حالات سے متأثر ہو کر یہ میلان بھی دُور ہو جاتا ہے۔ اور وہ نیک ہو جاتے ہیں۔ اصل معیار تو ہر شخص

[۳۸] ۴۳۲۔ وحصورا۔ اور وہ پرہیزگار بھی ہوگا۔ حصر کے معنے حبس یعنی روکنے کے ہیں۔ اور حصور وہ ہے جو اپنے آپ کو بدیوں سے روکتا ہے۔ الذی یکثر منه حصر النفس +

[۴۰] ۴۳۳۔ ایتك الا تكلم الناس ثلثة ایام الا رمزا۔ تیرے لیئے نشان یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں سے کلام نہ کرے مگر اشارہ سے۔ یہ ایک حکم ہے جس کی غرض خود قرآن کریم نے بتا دی۔ واذکر ربك كثیرا و سبح بالعشي والابکار یعنی اپنے رب کا بہت ذکر کرو اور صبح و شام تسبیح کرتے رہو۔ غرض لوگوں سے تعلق کم کرنا اور ذکر الٰہی میں زیادہ مصروف رہنا تھا۔ انجیل کے قصہ میں لکھا ہے کہ اس سوال پر کہ انی یکون لی غلام۔ میرے لڑکا کب ہوگا۔ ذکریا کو گونگا کر دیا گیا۔ اور اس وقت سے لیکر یحییٰ کے پیدا ہونے تک وہ بالکل گونگا رہا۔ قرآن کریم میں گونگا ہونے کا ذکر نہیں ہے +

[رکوع ۵/۱۴، آیت ۴۱] ۴۳۴۔ واصطفٰك علی نساء العٰلمین۔ دُنیا کی عورتوں پر تجھ کو چُن لیا۔ اس زمانہ کی تمام عورتوں میں حضرت مریم علیہا السلام کو ایک اعلےٰ مرتبہ دیا گیا۔ بلکہ اللہ تعالےٰ نے اس سے کلام بھی کیا۔ اور اس کے پیٹ سے خدا کا ایک نبی پیدا ہوُا +

[۴۳] ۴۳۵۔ ذالك من انباء الغیب [illegible] ہ الیك۔ مریم کے انتخاب میں اور پھر اس ذکر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصطفا اور فضیلت کی طرف بھی اشارہ تھا۔ کیونکہ مریم کو باوجود اس بزرگی کے کہ اللہ تعالےٰ نے اسے تمام دُنیا کی عورتوں پر برگزیدہ کیا۔ اس اُمت کے مومنوں سے مثال دیگئی ہے۔ جیسا کہ سورہ تحریم کے آخری رکوع سے ظاہر ہے۔ الغیب سے مراد یہاں وہی باتیں ہیں۔ جو آئندہ ہونے والی ہیں۔ اور جن کا انسانوں کو کوئی علم نہیں +

۴۳۶۔ اذ یلقون اقلامھم ایھم یکفل مریم۔ مفسّرین نے عام طور پر یہاں مراد کاہنوں کی قرعہ اندازی کو لیا ہے۔ گو کاہنوں کا ذکر نہ پہلے ہے نہ پیچھے۔ صرف زکریا کا ذکر ہے۔ جہاں فرمایا وکفلھا زکریا۔ خدا نے اس کو یعنی مریم کو زکریا کی سپردگی میں دیا۔ اس آیت کے پہلے اور پیچھے ملائکہ کا ذکر ہے بلکہ ماکنت لدیھم اذ یختصمون میں تو صاف ملاء اعلےٰ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ جیسے دوسری جگہ قرآن کریم میں فرمایا ماکان لی من علم بالملاء الاعلےٰ اذ یختصمون جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نبی کی بعثت کے وقت ملاء اعلےٰ میں بھی ایک جھگڑا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پہلا حصّہ آیت کا کاہنوں کے متعلّق ہو اور دوسرا حصّہ ملاء اعلےٰ یا ملائکہ کے متعلق +

[۴۴] ۴۳۷۔ ان اللہ یبشرك بكلمة منه اسمه المسیح عیسی ابن مریم۔ اللہ تعالیٰ تجھے بشارت دیتا ہے۔ بذریعہ اپنے ایک کلام کے (ایک لڑکے کی) جسکا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہے۔ عام طور پر اس کے معنے یوں کیئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ تجھے اپنے ایک کلمہ کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام مسیح عیسےٰ ابن مریم ہے پہلی میں معمولی معنوں کو لیتا ہوں۔ اس لحاظ سے گویا مسیح کو اللہ تعالیٰ کا ایک کلمہ کہا گیا ہے۔ اور عیسائیوں

آیت ۳۷

پیدا ہوتی ہے۔ باوجود بوڑھا ہوجانے کے زکریا نے اولاد کے لیے دُعا نہ کی۔ کی تو یہی دُعا کی۔ کہ خدایا
نیک اولاد عطا کر +

۳۸

۴۳۰۔ ان اللّٰہ یبشرک بیحییٰ۔ اللہ تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے۔ مفردات راغب میں ہے۔ فقد نبہ انہ
سماہ بذالک من حیث انہ لم تمتہ الذنوب کما اماتت کثیرا من ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم
لا انہ کان یعرف بذالک فقط فان ھذا قلیل الفائدۃ۔ یعنی متنبہ کیا۔ اس بات پر کہ
اسکا نام یحییٰ اس لیے رکھا۔ کہ اس پر گناہ کی موت وارد نہ کرے گا۔ جیسے کہ آدم کی اولاد میں سے بہتوں
پر کی ہے نہ صرف یہ کہ وہ اس نام سے پہچانا جائے گا۔ کیونکہ یہ تھوڑے فائدہ کی بات ہے۔ چونکہ حضرت
زکریاؑ کی دعا بھی ایسی اولاد کے لیے تھی جو صالح ہو۔ اس لیے جو بشارت اللہ تعالیٰ نے دی۔ اس میں
نام ہی ایسا رکھ دیا۔ جو اس دُعا کی قبولیت کو ظاہر کرنے والا تھا +

۴۳۱۔ مصدقا بکلمۃ من اللہ۔ کلمۃ ایک تو نحویوں کی اصطلاح میں ہے۔ اور صرف ایسے لفظ پر
بولا جاتا ہے جو مفرد معنی کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ مگر قرآن کریم میں اور عام محاورہ میں کلمہ سے مراد
کلام لیا گیا ہے۔ جیسا کافر کے اس قول پر کہ رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت۔ فرمایا انھا
کلمۃ ھو قائلھا۔ جس میں اس ساری کلام کو کلمہ فرمایا ہے۔ ایسا ہی فرمایا وتمت کلمۃ ربک الحسنیٰ
علی بنی اسرائیل بما صبروا۔ اس کلمہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ لیا گیا ہے ونرید ان نمن
علی الذین استضعفوا ونجعلھم الائمۃ ونجعلھم الوارثین۔ پس کلمۃ من اللہ سے
مراد اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ مفسرین نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے کہ یہاں کلمۃ من اللہ
سے کیا مراد ہے۔ بعض نے اس کلمہ سے مراد کلمۃ التوحید لیا ہے۔ اور بعض نے کتاب اللہ سمجھا ہے
اور بعض نے کلمۃ من اللہ سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کو لیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کے کلمہ ہونے پر تو الگ
بحث ہوگی۔ مگر مفسرین کے بیان کلمہ توحید اور کتاب اللہ مراد لینے سے اس بات کا فیصلہ ہوجاتا
ہے کہ کلمہ کا لفظ یہاں صرف کلام کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اب اللہ کی وہ کلام جس کی تصدیق
حضرت یحییٰ علیہ السلام نے کی۔ وہ صرف اُن کی پیدائش کی بشارت ہے۔ اور درحقیقت یہاں مراد
صرف اسی قدر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس کلام کو جو پیشگوئی کے رنگ میں حضرت زکریا پر ظاہر ہوا پورا کر
دکھائیں گے۔ یعنی جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کا نام یحییٰ بشارت کے رنگ میں رکھا ہے۔ وہ اس کو سچ بھی
کر دکھائیں گے اور گناہوں سے بچے رہیں گے کلمۃ من اللہ کے یہی معنے یعنی اللہ تعالیٰ کا کلام برنگ پیشگوئی
حضرت مسیح کے متعلق بھی ہیں۔ جیسا آگے چلکر دکھایا جائیگا۔ سورہ تحریم میں حضرت مریم کے متعلق صدقت
بکلمات ربھا۔ اس نے اپنے رب کے کلمات کو سچ کر دکھایا۔ یہ بھی اسی حال میں درست ہوسکتا ہے۔ کہ
کلمات سے مراد پیشگوئیاں لی جائیں۔ نہ کلمات ربھا سے مراد مسیح ہیں اور نہ کلمۃ من اللہ سے مراد مسیح ہے

مگر میں کہتا ہوں کہ یبشرك بكلمة منه میں با ذریعہ کے لیئے ہے۔یعنی معنے یہ ہیں کہ اے مریم اللہ
تعالےٰ تجھے اپنے ایک کلمہ کے ذریعہ بشارت دیتا ہے۔اور یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے حضرت ابراہیم
کو اسحاق کی بشارت ملی تو آپ نے فرمایا فبم تبشرون۔ تو فرشتہ نے اس کا جواب دیا بشرناك
بالحق ہم تجھے حق کے ذریعہ بشارت دیتے ہیں یہ مراد نہیں کہ الحق کی بشارت دیتے ہیں۔
اب یبشرك بكلمة منه اور بشرناك بالحق بالکل ایک جیسی مثالیں ہیں۔اگر ایک کی ذریعہ
سے مسیح کلمۃ اللہ بن سکتا ہے۔تو دوسرے کے ذریعہ اسحاق الحق بن سکتا ہے۔حالانکہ بات
صرف اس قدر ہے کہ ایک جگہ تو یہ مراد ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے کلام کے ذریعہ تجھے بشارت دیتا ہے
اور دُوسری جگہ مراد یہ ہے کہ ہم تم کو حق کے ذریعہ سے بشارت دیتے ہیں۔اس صورت میں مفعول
کو محذوف کرکے اُس کی بجائے فرما دیا اسمه المسيح وہ جس کی بشارت ہم دیتے ہیں۔اسکا نام
مسیح ہے۔تو کلمة منه سے مراد جیسا نوٹ نمبر ۴۳۱ میں صرف اللہ تعالےٰ کی پیشگوئی ہے۔اور اسی
کے موید یہ بات ہے کہ کلمة منه کے بعد فرمایا اسمه۔حالانکہ کلمة مُونث ہے۔تو پس اسمه
میں ضمیر مبشر بہ کی طرف جائے گی۔یعنی اس کا نام جس کی بشارت دی جاتی ہے۔کلمة کی ضمیر دوسری
جگہ صاف مؤنث ہے كلمته القاها الى مريم۔ تو پس جب ضمیر کے لیئے المبشر به کی تاویل کرنی پڑی
تو کلمة منه کو یبشرك کا مفعول ثانی بنانے کی کوئی ضرورت نہیں +

حضرت مسیح کے تین نام یہاں بیان فرمائے ہیں۔المسیح۔عیسےٰ۔ابن مریم۔المسیح اس لیئے کہ لانه
كان يمسح الارض اى يقطعها۔کہ وہ بہت چلنے تھے۔یعنی یہ گویا ایک پیشگوئی تھی۔کہ آپ کو
بہت زمین سفر کے ذریعہ قطع کرنی پڑے گی۔یہ وہ وجہ ہے جو امام رازی اور راغب نے دی ہے
اور بعض لوگوں نے مسیح بمعنی ممسوح لیا ہے جس میں اشارہ نبوت کی طرف لیا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے
کے قابل ہے کہ لانه كان يمسح الارض والی وجہ اسی صورت میں قایم رہ سکتی ہے کہ مانا جائے کہ
حضرت مسیح بہت ملکوں میں پھرے۔ورنہ صرف ملک شام میں رہنے سے یہ وجہ اُن پر صادق نہیں
آسکتی۔تو اس لحاظ سے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ مانا جائے کہ مسیح علیہ السّلام اور ملکوں میں
بھی گئے۔اور چونکہ بنی اسرائیل زمانہ قبل میں کچھ جلاوطن ہوکر افغانستان کشمیر کی طرف آگئے تھے
جیسا کہ متعدد روایات قومی سے ثابت ہوتا ہے۔اور شہروں کے ناموں اور رسم ورواج میں بھی بنی اسرائیل
کے ساتھ ان لوگوں کی مشابہت پائی جاتی ہے۔اور چونکہ حضرت مسیح سارے بنی اسرائیل کی طرف
رسول ہوکر آئے تھے۔جیسا کہ رسولا الى بنى اسرائيل کے لفظ سے ظاہر ہے۔اس لیئے حضرت مسیح
کا افغانستان وکشمیر میں آنا نہ صرف اُن کے نام کی پیشگوئی کو پُورا کرتا ہے۔بلکہ ان کے مشن کی اصل غرض
بھی اِسی صورت میں پُوری ہوتی ہے۔عیسےٰ آپ کا نام ہے۔اور ابن مریم کنیت جو آپ کی والدہ مقدسہ

کا اس پر بہت زور ہے۔ کہ مسیح کو کلمۃ اللہ کہکر قرآن شریف نے ایک ایسی خصوصیت دیدی ہے۔ جو دوسرے کسی نبی کو نہیں دی۔ اور پھر اس خصوصیت کی بُنیاد پر مسیح کو خدا بنایا جاتا ہے۔ یہی وہ دلیل ہے جو وفد نجران نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر پیش کی۔ دیکھو نوٹ نمبر ۳۹۴۔ اور یہی وُہ دلیل ہے جس پر آج بھی عیسائی زور دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم نے کیسا لطیف جواب بھی ان لوگوں کو دیدیا تھا۔ کہ اس کی بشریت یا خدائی کا فیصلہ اصُولی رنگ میں کرو۔ کیا جس شخص کے ساتھ کھانے پینے۔ قضائے حاجت کی ضروریات۔ ماں کے رحم میں رہنے۔ پیدا ہونے بڑھنے۔ جوان اور پھر بُڈھا ہونے کے پھر وفات پانے کے عوارض پائے جاتے ہوں اس کو بشر کہیں گے یا خدا۔ مگر ہر ایک باطل پرست کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ اصُولی بحث سے گریز کرتا ہے اور خصوصیات میں جا کر پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اب اگر یہ بھی مان لیں کہ مسیح کو کلمۃ من اللہ کہا گیا ہے اور اَور کسی نبی کا نام لے کر اس کے ساتھ کلمۃ اللہ کا لفظ نہیں بولا۔ تو کیا اس سے مسیح کی خدائی ثابت ہو سکتی ہے یا بشریت کے دائرہ سے وہ نکل جاتا ہے۔ یہ محض ایک دعوے ہے جس کی دلیل کوئی نہیں۔ کہ کیونکر صرف اس خصوصیت سے دائرہ بشریت سے نکل کر مسیح خدا بنجاتا ہے۔ پھر مسیح کو تو کلمۃ منہ کہا یعنی اپنی طرف سے ایک کلمہ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکیلا ہی کلمہ نہیں۔ بلکہ کلموں میں سے ایک کلمہ ہے اور اپنے کلمات کے متعلق اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ قل لوکان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی۔ کہ اگر میرے رب کے کلمات کے لئے سمندر بھی سیاہی بنجائیں تو میرے رب کے کلمات اس قدر لاتعد و لاتحصی ہیں کہ سمندر ختم ہو جائیں مگر وہ کلمات ختم نہ ہوں۔ تو کیا صاف ظاہر نہیں کہ اس لاانتہا تعداد میں سے جو اللہ تعالےٰ کے کلموں کی ہے۔ ایک کلمہ مسیح بھی ہے۔ پس خصوصیت بھی کوئی نہ رہی۔ پھر کلمۃ منہ کے معنے تو صرف اس قدر ہیں کہ وہ اللہ تعالےٰ کا ایک کلام ہے۔ اب جب کوئی شخص کوئی بات کرے اور وُہ بات پُوری ہو جائے۔ تو کہتے ہیں جاء کلامہ یا جاء قولہ۔ اس کا کلام یا اس کا قول آگیا۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ وُہ کلام یا قول مجسّم ہو کر آگیا۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جو اُس نے کہا تھا وُہ پورا ہو گیا ہے۔ پس اسی معنے میں مسیح کو کلمۃ اللہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ خدا نے ایک بات کہی تھی وہ مسیح کے آنے سے پُوری ہو گئی۔ پس مسیح کے آنے میں گویا خدا کا کلام آگیا۔ چنانچہ یہی توجیہہ مفسّرین نے پسند کی ہے۔ جیسا کہ امام رازی کہتے ہیں۔ انہ قد وردت البشارۃ فی کتب الانبیاء الذین کانوا قبلہ فلما جاء قیل ھذا ھو تلک الکلمۃ یعنی ان نبیوں کی کتابوں میں جو اس سے یعنی مسیح سے پہلے گذر چکے تھے مسیح کے متعلق بشارت تھی پس جب مسیح آیا تو کہا گیا کہ وہ کلمہ آگیا۔ اسی طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اپنی نسبت فرماتے ہیں۔ انا دعوۃ ابی ابراھیم۔ میں اپنے باپ ابراہیم کی دُعا ہوں۔ حالانکہ آپ کوئی دُعائے مجسّم تو نہ تھے۔ مگر چونکہ آپ کے وجود میں حضرت ابراہیم کی دُعا پوری ہوئی۔ اس لحاظ سے آپ نے اپنے آپ کو دُعا کہدیا ہے۔ پس اسطرح سے بھی کلمۃ منہ کے الفاظ سے ایک عیسائی کے ہاتھ کچھ نہیں آتا +

۴۵

میں معمولی بچوں کی طرح باتیں کرتے تھے۔ تو خدا کو اس خبر کے دینے کی کیا ضرورت تھی۔ تو اوّل اسکا جواب یہ ہے۔ کہ کہولت کی حالت میں باتیں کرنے کی خبر دینے کی جو ضرورت تھی وہی جھولے کی باتوں کی خبر دینے کی ضرورت تھی دوسرے یہ خبر بھی عالم الغیب ہی دے سکتا تھا۔ کہ وہ بچہ جو پیدا ہوگا صحیح سالم بھی ہوگا۔ بچپن میں بھی باتیں کریگا اور بڑی عمر بھی پائےگا۔ یہاں تک کہ اس حالت کو پہنچیگا۔ جب سفیدی بالوں میں نمودار ہو جاتی ہے۔ اور یوں اگر ہر ایک امر کو معمولی قرار دیا جائے تو پھر بچے دنیا میں کروڑ در کروڑ کی تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک مسیح کے پیدا ہونیکی خوشخبری دینے کی کیا ضرورت تھی وجیھا فی الدنیا والاخرۃ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ انبیاء وجیہ ہی ہوتے ہیں من الصالحین کہنے کی کیا ضرورت تھی انبیاء صالحین میں سے ہی ہوا کرتے ہیں۔ بات اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسیح کے ذکر میں ان تمام امور کو بیان کیا ہے۔ جو انسانوں کو پیش آتے ہیں بشریت کے تمام تقاضوں کا ذکر کیا۔ کچھ یہاں اور کچھ قرآن کریم کے دوسرے مقامات پر۔ مثلاً کانا یاکلان الطعام مسیح اور اس کی ماں دونوں کھانا کھاتے تھے۔ یہ بھی ایک دلیل الوہیت کے خلاف ہے۔ مریم نے اسکو حمل میں لیا۔ اس سے بھی بشریت ثابت کرنا مقصود ہے۔ دردِزہ کے ساتھ اسے جنا۔ اس سے بھی بشریت ثابت کرنا مقصود ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ بائبل میں ہے کہ عورت کو گناہ کی وجہ سے یہ سزا دی گئی۔ کہ دردِزہ کے ساتھ بچہ جنا کرے لیکن جب خود خدا جنم لیتا ہے۔ اور سب گناہوں کا کفارہ کرنے آتا ہے۔ تو وہ اصلی گناہ کی سزا تو ویسی کی ویسی ہی رہی۔ یعنی نہ صرف کفارہ پر ایمان لانے والی عورتیں دردِزہ کے ساتھ جنتی ہیں۔ بلکہ ”خدا کا بیٹا“ بھی پیدا ہوا تو اس کی ماں نے دردِزہ کی وہ تکلیف اٹھائی جو شاید معمولی سے بھی کچھ بڑھ کر تھی کہ یہ لفظ کہلوا دیئے یالیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا۔ غرض تمام واقعات زندگی میں جو مسیح کے متعلق بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ ویسا ہی تھا۔ جیسے اور بشر ہوتے ہیں۔ اس کے کام خدا کے برگزیدوں کے کاموں سے بڑھ کر نہ تھے۔ اس کی حیات اور اس کی موت سب بشریت کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ انہی میں سے ایک بات اسکا جھولے میں ہونا اور حالت کہولت تک پہنچنا ہے۔ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کی پہلی حالت جھولے کی ہوتی ہے۔ پھر ترقی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ چلنے پھرنے لگتا ہے۔ پھر جوان ہوتا ہے۔ پھر اپنی طاقت کے کمال کو پہنچتا ہے۔ پھر حالت کہولت کو جس میں قوائے جسمانی کا انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ اور قوائے روحانی بلوغت کو پہنچتی ہیں تو درحقیقت یکلم الناس فی المھد وکھلا میں ان سارے تغیرات کا نقشہ دو لفظوں میں کھینچ کر بتا دیا ہے۔ کہ جس کو تم خدا بناتے ہو وہ تو سارے معمولی انسانی تغیرات میں سے ہو کر گذرا۔ کیا خدا پر بھی کہیں ایسے تغیرات آیا کرتے ہیں *

۴۶

۱۴۴۔ قالت رب انی یکون لی ولد ولم یمسسنی بشر۔ قال کذالک اللہ یخلق ما یشاء۔ مریم نے کہا۔ اے میرے رب میرے بیٹا کب ہوگا۔ اور مجھے کسی بشر نے نہیں چھوا۔ فرمایا اسی طرح ہوگا۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب زکریا کو بچے کی بشارت دی گئی تو انھوں نے بھی یہی کہا انی یکون لی غلام میرے لڑکا کب ہوگا۔ انھوں نے اپنی رکاوٹ کا ذکر کیا۔ کہ میں بوڑھا ہوں اور میری بی بی بانجھ ہے۔ مریم نے اپنی رکاوٹ

کی عظمت اور بزرگی کے لحاظ سے آپ کو دی گئی +

۴۳۸۔ وجیھا فی الدنیا والاخرۃ ۔ دُنیا میں معزز ہونگے اور آخرت میں بھی۔ یہ کوئی خصوصیت مسیح کی نہیں اللہ تعالیٰ کے تمام نبی اُس کے حضور میں وجیہہ ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کی نسبت فرمایا وکان عند اللہ وجیھا +

۴۳۹۔ ومن المقربین۔ خدا کے مقربوں میں سے ایک ۔ کہتے ہیں ڈوبتا ہُوا تنکے کا سہارا تلاش کرتا ہے۔ وہی حالت بعض وقت عیسائی مشنریوں کی ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کہدیتے ہیں۔ کہ چونکہ قرآن نے مسیح کو مقرب کہا اور مقرب ملائکہ ہوتے ہیں۔ اس لیئے مسیح کو بشر سے اوپر مانا ہے۔ چونکہ قرآن کریم سے محض بے خبر ہیں اُن کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ جن مقربین میں سے مسیح کو کہا ہے ان مقربین میں امت محمدیہ کا ایک گروہ بھی داخل ہے۔ السابقون السابقون اولئک المقربون۔ یعنی سابقین اس امت کے مقربین بارگاہ الہٰی ہیں۔ اور من المقربین تو خود بتاتا ہے کہ مسیح کے علاوہ اور بھی مقرب ہیں +

۴۵

۴۴۰۔ ویکلم الناس فی المھد وکھلا۔ اور لوگوں سے جھولے میں اور بُڈھا ہونے کی حالت میں کلام کریگا۔ عجیب بات یہ ہے۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو بعض خصوصیتیں تو عیسائیوں نے دی ہیں۔ مگر بعض بلاوجہ مسلمانوں نے بھی دے رکھی ہیں۔ اب یہ تو ظاہر ہے۔ کہ ہر ایک شخص حالت کہولت میں لوگوں سے کلام کیا کرتا ہے پس یہ تو کوئی خصوصیت نہیں۔ اور جب یہ نہیں تو آیت کے دوسرے ٹکڑے میں کہ جھولے میں کلام کرے گا۔ خصوصیت پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جھولے میں سب ہی بچے کلام کرتے ہیں۔ اس کے لیئے یہ ضروری ٹھیرایا جاتا ہے۔ کہ جھولے میں مسیح علیہ السلام نبوت کا دعوے کریں۔ حالانکہ نبی کو قبل از بعثت یہ علم نہیں دیا جاتا۔ کہ وہ نبی ہے۔ تو کیا مسیح کے لیئے کوئی علیحدہ قانون نبوت کا تجویز کیا جائیگا۔ پھر اگر اس کلام کو جس میں نبوت کا ذکر ہے جھولے کے وقت کا کلام سمجھا جائے تو وہاں (دیکھو سورہ مریم) جعلنی نبیا کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اوصنی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادمت حیا۔ کہ مجھے جب تک زندہ ہوں نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہُوا کہ جب یہ کلام آپ نے کیا اُس وقت نماز اور زکوٰۃ کا حکم مل چکا تھا۔ حالانکہ کسی شریعت میں آج تک جھولے کے بچے کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم نہیں دیا گیا۔ پھر اُس وقت مسیح نماز کیوں کر پڑھتے ہونگے۔ اور کس مال کی زکوٰۃ دیتے ہونگے الغرض۔ جھولے میں اگر معمولی باتیں کرتے تھے۔ تو کوئی ہرج لازم نہیں آتا۔ سب تندرست بچے جھولے میں باتیں کیا کرتے ہیں۔ اور اگر سورہ مریم والی آیات جو قال انی عبد اللہ سے شروع ہوتی ہیں جھولے کا کلام ہے تو پھر مسیح کو گویا بچپن سے ہی علم دیدیا گیا تھا۔ کہ تو نبی ہے۔ بلکہ بچپن سے ہی نماز اور زکوٰۃ بھی آپ پر ضروری قرار دی گئی۔ اور ابھی آپ ماں کا دودھ پیتے تھے تو اُس وقت جبرئیل آپ پر وحی لے کر آیا کرتا تھا حالانکہ ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر چالیس سال کی عمر میں وحی نبوت نازل ہوئی۔ عام قانون بھی اللہ تعالٰے نے قرآن کریم میں یہی بیان فرمایا ہے کہ چالیس سال کی عمر میں انسان بلوغ روحانی کو پاتا ہے حتی اذا بلغ اشدہ وبلغ اربعین سنۃ ۔ غرض یہ بات کسی طرح قابل قبول نہیں۔ اب رہا یہ اعتراض کہ اگر جھولے

بن کران میں مل جل جاتے ہونگے۔ اور یا محض پرندوں کی شکل تو بن جاتی ہوگی۔ مگر ایک تماشہ کے طور پر انکا اڑنا ایک آنی نظارہ ہوگا۔ اور پھر وُہ مٹی کی مٹی رہجاتی ہوگی۔

اگر طیر سے ظاہری لغوی معنے مراد لیئے جائیں تو صورت اوّل قایم رہے گی یعنی وہ سچ مچ کا پرند بن گیا اور پرند بن کر دُوسرے پرندوں میں مل گیا۔ تو اس لحاظ سے ضروری ہؤا۔ کہ اُس کی نسل بھی چلے۔ پس گویا یوں ماننا پڑیگا کہ اس وقت جسقدر پرندے ملتے ہیں اُن میں کچھ مسیح کی مخلوق ہے اور کچھ باریتعالے کی۔ جو بالبداہت باطل ہونے کے علاوہ قرآن کریم کے بھی صریح مخالف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ام جعلوا اللہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیھم (الرعد-۱۶) یعنی کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوائے کوئی ایسے شریک بنائے ہیں جنہوں نے خدا کی خلق کی طرح کوئی چیز پیدا کی ہو۔ پھر وہ دونوں قسم کی مخلوق مجل گئی ہو یعنی اب پتہ نہ لگتا ہو کہ خدا کی مخلوق کونسی ہے۔ اور کسی معبود باطل کی مخلوق کونسی ہے۔ جس صورت میں حضرت مسیح کو ایک قوم نے اللہ کا شریک ٹھیرایا ہے۔ اور معبودان باطل کے خدا ہونے کو اللہ تعالےٰ اس طرح پر جھٹلاتا ہے کہ انھوں نے خدا کی خلق جیسی کوئی خلق نہیں کی کہ دونوں قسم کی مخلوق مل جُل جائے۔ تو یہ ماننا پڑا۔ کہ بموجب تصریح قرآن کریم کے مسیح نے بھی کوئی ایسی مخلوق نہیں بنائی جو خدا کی مخلوق جیسی ہو۔ پس یہ صورت اس طرح پر غلط ٹھیری +

اب ہم اس کو ایک اصول کے ماتحت لاکر محکمات اور متشابہات کے قانون کے رنگ میں اس پر بحث کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ کیا کوئی شخص فی الواقع خدا کی مخلوق جیسی مخلوق بنا سکتا ہے۔ گو وہ خدا کے اذن سے ہی ایسا کرے اور گو وُہ نبی ہو اور یہ امر بطور ایک اعجاز کے ہو۔ اب جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو خلق بمعنے پیدا کرنا صرف ذات باری کا خاصہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے ثبوت میں اوّل تو میں وہی آیت پیش کرتا ہوں۔ ام جعلوا اللہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیھم جس کے ساتھ ہی اللہ تعالےٰ اپنا ایک عام قانون بیان فرماتا ہے۔ قل اللہ خالق کل شیئ۔ یعنی نہ صرف یہی غلط ہے کہ معبودان باطل نے کسی چیز کو پیدا کیا ہو۔ بلکہ دُنیا میں اللہ کے سوا کوئی بھی کسی چیز کا خالق نہیں۔ کیونکہ فرمایا۔ کہ واللہ ہی ہر چیز کا خلق کرنیوالا ہے اِس سے معلوم ہُوا۔ کہ دُنیا میں کسی چیز کو سوائے اللہ کے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ اور نہ کسی انسان کی بنائی ہوئی چیز خدا کی بنائی ہوئی چیز کی طرح ہو سکتی ہے۔ کہ دونوں میں شناخت نہ ہو سکے۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ دُوسری جگہ فرماتا ہے خلق کل شیئ فقدرہ تقدیرا۔ اسی نے ہرایک چیز کو پیدا کیا۔ پھر اس کے لیئے ایک قانون اور ایک حد لبست مقرر کردی۔ پھر فرمایا۔ ربنا الذی اعطے کل شیئ خلقہ ثم ھدٰی۔ ہمارا رب وُہ رب ہے جس نے ہرایک چیز کو اُس کی پیدائش بھی عطا فرمائی۔ پھر اس کو اس کا کمال حاصل کرنیکا راہ بھی بتایا (طٰہٰ-۵۰) ان تمام آیات میں ایک کھلا کھلا قانون الٰہی بتا دیا۔ کہ پیدا کرنا صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ دُنیا میں کوئی چیز نہیں جس کو سوائے خدا کے کسی اور نے پیدا کیا ہو اور نہ انسان کی بنائی ہوئی چیز خدا کی بنائی ہوئی چیز جیسی

۴۶ کا ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جواب دیا۔ کہ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ اور ایک کام کو کر دیتا ہے۔ ہاں لم یمسسنی بشر سے یہ استدلال نہیں ہو سکتا۔ کہ آئندہ بھی مریم کو بشر نے نہیں چھونا تھا کیونکہ حضرت عیسےٰ کی ولادت کے مسئلہ کو اگر متنازعہ بھی مانا جائے۔ کہ وہ بغیر مس بشر کے پیدا ہوئے تھے یا مس بشر سے تو یہ امر بہرحال مسلّم ہے کہ حضرت عیسےٰ کے اور بھی بھائی اور بہنیں تھیں۔ وُہ تو آخر سب مس بشر سے ہی پیدا ہوئے تھے پس لم یمسسنی بشر صرف گذشتہ کے متعلق ہے۔ اور آئندہ کے لئے نہیں +

۴۷ ۴۴۲۔ ویعلمہ الکتٰب والحکمۃ والتورات والانجیل۔ اسے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل سکھائے گا۔ چونکہ یہاں کتاب کو توریت سے الگ کرکے بیان کیا ہے پس یا تو کتاب سے مراد کتابت ہے۔ یعنی لکھنا پڑھنا سکھائے گا۔ اور حکمت سے مراد علوم ہیں۔ اور یا کتاب سے مراد کتب الٰہیہ۔ کیونکہ توریت صرف حضرت موسےٰ کی کتاب کا نام ہے۔ اور حکمت سے مراد اس کا فہم ہو سکتا ہے۔

۴۸ ۴۴۳۔ ورسولا الی بنی اسرائیل۔ اور وُہ بنی اسرائیل کی طرف رسول ہو گا۔ عیسائی لاکھ کوشش کریں۔ قرآن کریم کا یہ فیصلہ کہ حضرت مسیح صرف بنی اسرائیل کی طرف رسول تھے۔ ٹل نہیں سکتا۔ انجیل جیسی کچھ ہے۔ یا جو کچھ حضرت مسیح کا کلام نبوت اس میں ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح نے سوائے بنی اسرائیل کے دوسروں کی طرف رسول ہونے کا دعوےٰ نہیں کیا۔ ایک مقام انجیل میں بیشک ایسا ہے کہ اس کی بنا پر آپ کی دعوت کو عام ٹھہرایا جاتا ہے۔ گو قطع نظر اس سے کہ وہ مقام الحاقی ہے۔ خود انجیل کے ہی دُوسرے مقامات اس کی کھلی کھلی تردید کرتے ہیں۔ اور اس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ مثلاً متی ۱۵ باب۔ درس ۲۴ میں صاف طور پر ایک غیر اسرائیلی عورت کی طرف توجہ کرنے سے آپ نے انکار کیا اور اسے یہ جواب دیا۔ کہ "میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی پاس نہیں بھیجا گیا" اور اصرار پر بھی یہی جواب دیا کہ "مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو پھینک دیویں" اور آخر اس عورت کی اس درخواست پر کہ جو ٹکڑے میز سے گر جائیں وہ کتے بھی کھا ہی جاتے ہیں۔ اس کی طرف توجہ کی۔ یہ آپ کا عمل کھلا کھلا گواہ اس بات پر ہے کہ جو کوششیں آپ کی مشن کو وسیع کرنے کے لئے کی جاتی ہیں وہ سب بے سود ہیں +

۴۴۴۔ انی قد جئتکم بایۃ من ربکم انی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن اللہ وابرئ الاکمہ والابرص واحی الموتی باذن اللہ وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم۔ اس آیت میں چار امُور کا ذکر فرمایا ہے۔ اور عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ چار امُور یہ ہیں۔ اوّل مسیح علیہ السّلام کا پرند بنانا دوسرے بیماروں کو شفا دینا تیسرے مردوں کو زندہ کرنا۔ چوتھے ایسی غیب کی خبریں بتانے پر قادر ہونا کہ کسی شخص نے کیا کھایا ہے اور کیا اس کے گھر میں ہے۔ ان چاروں امُور کو میں الگ الگ بیان کروں گا۔

اوّل خلق طیور یا پرندوں کا بنانا ہے۔ عام طور پر مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت مسیح علیہ السّلام پرند بنایا کرتے تھے۔ اب اگر اس کو مان لیا جائے تو دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ پرند دُوسرے پرندوں کی طرح جاندار

معمولی متین آدمی کی شان کے بھی شایان نہیں۔ چہ جائیکہ ایک نبی ایسا شغل اختیار کرے۔ کہ مٹی سے پرندوں کی شکل بنا کر اُن کو ایک آن کے لیئے متحرک کر دکھاوے۔ مگر ادھر وہ چیز ہاتھ سے نکلی اُدھر پھر مٹی کی مٹی۔ کیا اس سے کسی پر اتمام حجت ہو سکتا ہے یا کوئی غرض اصلاح نفوس کی پوری ہو سکتی ہے۔ نہ تو یہ فعل مخالف کے لئے مسکت ہو سکتا ہے۔ اور نہ مسیح کے پیرو خود اس سے کوئی رُوحانی فائدہ حاصل کر سکتے تھے۔ غرض اعجازی رنگ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے۔ کہ سچ مچ کے پرند بن کر مسیح کے بنائے ہوئے پرند دوسرے پرندوں میں مل جُل جائیں اور اس طرح پر خدا کی خلق اور مسیح کی خلق میں تشابہ ہو جائے۔ اور کچھ مخلوقات کا خالق خدا اور کچھ کا خالق مسیح رہے۔ اور یہ امتیاز بھی نہ ہو سکے۔ کہ مسیح کی مخلوق کونسی ہے اور خدا کی مخلوق کونسی اور یہ صورت سراسر قرآن کریم کے خلاف اور قرآن کے محکمات کو ردّی ٹھیراتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ میں ایک نقصان عظیم کو جائز رکھتی ہے۔ کیونکہ خالق کل شیٔ خدا نہ ہوا۔ اور خالق ایک نہ رہا بلکہ دو ہوئے اور یہ کوئی اس کا جواب نہیں کہ خدا کی اجازت سے مسیح علیہ السلام ایسا کرتے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ اپنی صفات کے تقاضا کے خلاف اجازت نہیں دیا کرتا۔ اس کی صفت خالقیت کا تقاضا یہی ہے۔ کہ ہر چیز کا خالق وہی ہو جیسا کہ اُسنے خود فرمایا خالق کل شیٔ اور دوسری صورت میں باوجود طیر کے مجازی معنے لینے کے پھر بھی یہ ایک عبث فعل رہتا ہے۔ جسکا نتیجہ کچھ نہیں اور خود یہ فعل بھی نبی کی شان کے شایان نہیں۔

اب بحث مذکورہ بالا سے یہ تو عیاں ہے کہ طیر کے ظاہری لغوی معنے پرند مفہوم آیت کو محکمات قرآنی کے خلاف ٹھیراتے ہیں۔ پس یہاں مجاز اور استعارہ کے رنگ کا کلام ماننا لازمی ہے۔ اور جب قرآن کریم میں مجاز اور استعارہ بہت مقامات پر پایا جاتا ہے۔ اور اصول یہی ہے کہ جب قرائن یا محکمات ظاہر معنے لینے کے مانع ہوں تو مجاز ماننا پڑتا ہے۔ تو یہاں مجاز ماننے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی کلام میں مجاز اور استعارہ کا استعمال بہت پایا جاتا ہے۔ اور آپ کے کلام کا ایک بڑا حصّہ تمثیلات میں ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ شاگردوں نے یہ اعتراض بھی کیا۔ کہ آپ تمثیلوں میں لوگوں سے باتیں کرتے ہیں جو اُن کی سمجھ میں نہیں آتیں تو مسیح نے کہا "اس لیئے میں اُن سے تمثیلوں میں بات کرتا ہوں۔ کہ وے دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سُنتے" (متی ۱۳/۱۴) پھر لکھا ہے کہ "یہ سب باتیں یسوع نے ان جماعتوں کو تمثیلوں میں کہیں اور بے تمثیل ان سے نہ بولتا تھا۔ تاکہ جو نبی نے کہا تھا پورا ہو کہ میں تمثیلیں لاکر کلام کرونگا" (متی ۱۳/۳۴-۳۵) پس یہ وجہ ہے کہ کیوں مسیح کا کلام اللہ تعالےٰ نے بھی تمثیل کے رنگ میں بیان فرمایا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ طیر سے مشابہت کس قسم کی ہے جس کا یہاں ذکر ہے۔ کیونکہ جب حقیقی طیر کا ذکر یہ کسی صورت میں ہو نہیں سکتا تو برنگ استعارہ طیر کی کسی صفت غالب کا ذکر کیا ہے۔ میں نے اوپر دکھایا ہے کہ بعض لوگ مجاز مانتے ہیں مگر طیر کی جسمانی شکل کو اصل وجہ مشابہت مانتے ہیں۔ اور مٹی کی شکلوں کے بنانے اور ان کے ایک آن کے لیئے پرواز کر جانے کا ذکر یہاں مانتے ہیں۔ لیکن ایک طرف تو ایسا ماننے سے نہ یہ کوئی اعجاز باقی رہتا ہے

کبھی ہوسکتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر ان لوگوں کے متعلق جن کو خدا بنا لیا گیا ہے اور بھی صراحت فرمائی۔ جیساکہ سب سے پہلی آیت میں یہ کہکر خلقوا کخلقہ۔ کیا اُنھوں نے بھی خدا کی پیدائش کی طرح کسی چیز کو پیدا کیا ہے۔ ایسا ہی فرمایا والذین یدعون من دون اللہ لا یخلقون شیئا وھم یخلقون ۔ اموات غیر احیاء ومایشعرون ایان یبعثون (النحل ۱۹ و ۲۰) اور وُہ لوگ جنھیں (یہ کافر) سوائے اللہ کے پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور وہ سب فوت بھی ہو چکے ہیں۔ کوئی ان میں سے زندہ نہیں اور اُن کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔ اسی کے مطابق سورہ فرقان میں فرمایا پس اللہ تعالےٰ نے خلق یا پیدا کرنے کے متعلق اپنا قانون اصُولی رنگ میں یہ بیان فرمایا۔ کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے۔ اور کہ اللہ کے سواء کوئی خالق نہیں۔ اور جن لوگوں کو معبوُد بنایا گیا ہے۔ اُنھوں نے کوئی خلق نہیں کی اور ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔ کہ اِنسان کی بنائی ہوئی چیز اور خدا کی خلق کی ہوئی چیز ایسی مل جل جائیں۔ کہ ان میں امتیاز نہ رہے۔ ایسا ہی فرمایا افمن یخلق کمن لا یخلق۔ جو خلق کرتا ہے وہ اُس جیسا ہوسکتا ہے۔ جو خلق نہیں کرتا۔ اب اگر مسیح کا خلق طیور مانا جائے تو مسیح من یخلق ہونے کی وجہ سے انسانوں جیسا نہ ہؤا بلکہ خدا جیسا ہؤا تو چونکہ قرآن کریم میں اختلاف نہیں ہے۔ لوکان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا۔ غیر اللہ کیطرف سے ہوتا تو اختلاف ہوتا۔ اس لئے یہ کسی صورت میں قابل تسلیم نہیں۔ کہ بار بار یہ قانون باندھ کر۔ کہ اللہ کے سواء کوئی کسی چیز کا خالق نہیں۔ اور پھر یہ بتا کر کہ جن لوگوں کو معبوُد بنایا گیا ہے۔ اُنھوں نے ہرگز ہرگز کسی چیز کو پیدا نہیں کیا۔ پھر خود ہی یہ کہدے کہ مسیح نے بھی کچھ پرند پیدا کیئے تھے۔ اس طرح پر صورت اوّل یعنی مسیح کا سچ مچ کے پرند بنا دینا جن پر ظاہری لغوی معنے کی رُو سے لفظ طیر کا صادق آسکے باطل ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ محکمات قرآنی اور تصریحات کلام ربّانی کے خلاف ہے۔

اب دوسری صورت یہ ہے کہ جو کچھ حضرت مسیح بناتے تھے وہ اصلی اور حقیقی پرند تو نہ تھے۔ بلکہ محض پرند کی شکل ہوتی تھی۔ جیسے مٹی کے کھلونے پرندوں کی شکل کے بنائے جاتے ہیں۔ ہاں وہ پرندُوح وغیرہ اُن کے اندر کچھ چیز نہ تھی جس کی وجہ سے حقیقی طور پر لفظ پرند یا طیر کا اُن کے لئے استعمال ہوسکے۔ جیسے مٹی کے کھلونے پرندوں وغیرہ کی شکل میں بنے ہوئے بازار میں ملتے ہیں۔ ایسے ہی وُہ بھی ہونگے اور حضرت مسیح کے نفخ سے صرف ایک آنی نظارہ اُن کے پرواز کا نظر آجاتا ہوگا۔ مگر فی الحقیقت وہ طیر یا پرند نہیں بنتے تھے۔ تو اس صورت میں گو تشابہ فی الخلق واقع نہ ہونے کی وجہ سے محکمات مذکورہ بالا کے خلاف تو یہ امر نہیں ٹھیرتا۔ مگر اس صورت میں اول تو لفظ طیر کا استعمال مجاز کے رنگ کا ہؤا نہ حقیقت کے طور پر۔ کیونکہ وہ واقعی پرند نہیں تھے۔ بلکہ ان کی شکل پرند سے مشابہ تھی۔ اور باوجود لفظ طیر کے مجازی معنے لینے کے اس میں اعجاز کا رنگ یا نبی کی شان کے شایان کوئی کام نہ رہا۔ بلکہ زیادہ تر ایک کھیل اور تماشہ کی صورت رہی۔ اور نبی کی شان سے یہ امر بعید ہے۔ کہ ان لوگوں کی طبائع کو جن کی اصلاح کے لیئے وہ آتا ہے ایسے کھیلوں کی طرف متوجہ کرے۔ اور خود ایسے کام اُن کو کرکے دکھائے جو کسی

مجھے تونے آگ سے پیدا کیا اور اُس کو یعنی اِنسان کو مٹی سے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ طین کا لفظ استعارہ کے رنگ میں فرمانبرداری کو چاہتا ہے۔ گویا طینی مخلوق میں فرمانبرداری کی اِستعداد زیادہ ہے۔ پس حضرت مسیح کے اس کلام میں انی اخلق لکم من الطین جو استعارہ کے رنگ کا کلام ہے۔ طین سے مراد وہ طبائع ہیں جو استعداد قبولیت کی زیادہ رکھتی ہیں۔ وہ گویا مٹی کی طرح ہیں کہ جس قالب میں ڈھالا جائے آجاتی ہیں۔ اور فرمانبرداری کا مادہ انمیں زیادہ ہے۔ پس اب اس ساری کلام انی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن اللہ سے مراد استعارہ کے رنگ میں یہ ہوئی۔ کہ حضرت مسیح اپنے اس نفخ روحانی کا ذکر کرتے ہیں جس سے وہ استعدادیں جو طینی ہونے کی وجہ سے قبولیت کی استعداد زیادہ رکھتی ہیں۔ ان کا وہ طیر کی ہیئت پر اندازہ کرتے ہیں۔ اور اُنکے اندر بلند خیالی پیدا کرنے کی تجویز کرتے ہیں اور زمین سے ان کے تعلقات کم کرنا چاہتے ہیں پس وہ اُن کے اندر ایک نفخ روحانی کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا کے نبی درحقیقت نفخ روحانی ہی کرنے آتے ہیں۔ اور نفخ روحانی سے قابل استعدادوں کو اعلےٰ مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔ تو آپ کے نفخ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان میں وہ طیری صفت زمین سے اوپر پرواز کرنے کی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رُوحانی پہلو سے انسان دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو زمین سے تعلق رکھتے اور زمین پر ہی چلتے ہیں وہ گویا دابۃ سے مشابہت رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو تعلقات سفلی کو قطع کرکے زمین سے اوپر پرواز کرتے ہیں وہ طیر کی مشابہت رکھتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ اپنے کلام میں اسکی طرف خود بھی اشارہ فرمایا ہے: وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم۔ زمین پر کوئی زمین کے اوپر چلنے والا جانور نہیں اور نہ کوئی پرند ہے جو اپنے بازوؤں کیساتھ اوپر پرواز کرتا ہو۔ مگر وہ تمہارے جیسے گروہ ہیں۔ گویا ایک گروہ انسانوں کا دابۃ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اور دوسرا گروہ طیر سے۔ اور اسی دُوسرے گروہ کے تیار کرنے کی طرف ہی حضرت مسیح یہاں اشارہ کرتے ہیں۔ کیونکہ انبیاء کا کام یہی ہوتا ہے۔ کہ قابل استعدادوں میں ایسی بلند خیالی اور عالی ہمتی پیدا کردیں کہ وہ زمینی نہ رہیں۔ (او چو برکس مہربانی مے کند۔ از زمینی آسمانی مے کند) ایک اور امر قابل ذکر اس بارہ میں یہ ہے۔ کہ ایک وضعی انجیل جو انجیل طفولیت کہلاتی ہے۔ اس میں حضرت مسیح کا بچپن میں پرند بنانے کا ذکر ہے۔ حالانکہ یہ ذکر کسی مستند انجیل میں نہیں۔ اصل بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت مسیح کے کلام کو کسی ظاہر پرست نے لے کر سچ مچ کے پرند بنانا سمجھکر انجیل طفولیت میں ایسا لکھدیا ہے۔ اور اسی کی اصلاح قرآن کریم نے نہایت لطیف پیرایہ میں یوں کی کہ ایک طرف تو مسیح کے خلق طیر کا ذکر کر دیا اور دوسری طرف کھلے کھلے قانون باندھ دیئے۔ کہ خدا کے سوا کوئی کچھ خلق نہیں کرسکتا۔ اور اِس طرح اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی جس پر انجیل نے پردہ ڈال رکھا تھا۔ سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون۔

۴۴۵-وابرئ الاکمہ والابرص۔ اکمہ مادرزاد اندھے کو بھی کہتے ہیں اور شبکور کو بھی۔ ابرص وہ جس کو برص کی مرض ہو جو ایک مشہور بیماری ہے۔ ظاہر معنے کے رو سے یہ دونوں جسمانی بیماریاں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ انبیاء کے آنے کی علت غائی جسمانی بیماریوں کا علاج نہیں بلکہ رُوحانی بیماریوں کا علاج ہوتا ہے۔ اگر کوئی نبی جسمانی بیماریوں کے اچھا کرنے میں بڑا ماہر بھی ہو تو بھی یہ اس کی نبوت پر کوئی دلیل نہیں ہوسکتی۔ برص اور شبکوری معمولی بیماریاں ہیں

نہ ایک نبی کے منصب کے شایان کوئی بات بنتی ہے۔ اس لئے جب مجاز ہی ماننا ہے تو کیوں اس قسم کا مجاز نہ مانا جائے۔ جیسا انبیاء کے کلام میں اکثر پایا جاتا ہے یعنی وہ جسمانیات سے اکثر روحانیات کی طرف لیجاتے ہیں مثلاً زمین کے مردہ ہونیکا ذکر ہے تو مراد اس سے روحانی موت ہے۔ اندھوں اور بہروں کا ذکر ہے تو مراد وہ لوگ ہیں۔ جو اپنی آنکھوں اور کانوں سے کام نہیں لیتے۔ بارش کا ذکر ہے تو مراد وحی الٰہی کا نزول ہے۔ تاریکی کا ذکر ہے تو جہالت مراد ہے۔ دن اور روشنی کا ذکر ہے تو نورِ ایمان مراد ہے۔ چنانچہ اسی طرح چارپایوں سے کسی قوم کو مشابہت دی۔ ان ھم کالانعام تو مراد فہم سے کام نہ لینا یا زمینی باتوں پر جھکے رہنا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ طیر کو جو امتیاز دوسرے جانداروں پر حاصل ہے وہ پرواز کرنا ہے یا زمین سے اوپر اڑنا۔ پس جب طیر کا لفظ کسی نبی کے کلام میں بطور استعارہ استعمال ہو۔ جیساکہ میں اُوپر ثابت کرچکا ہوں کہ یہاں سوائے استعارہ ماننے کے چارہ نہیں تو استعارہ میں اصل ذکر اسی مابہ الامتیاز امر کا ہوگا یعنی زمین سے اُوپر اٹھ کر پرواز کرنا۔ جیساکسی کے متعلق فرمایا۔ اخلد الی الارض وہ زمین کے ساتھ لگ گیا۔ مراد یہ ہے کہ زمینی چیزوں کی طرف مائل ہوگیا۔ اور اُوپر کی طرف اُسکی توجہ نہ ہوئی۔ پس برنگ استعارہ یہاں طیر سے مراد ایسے لوگ ہیں جو زمین اور زمینی چیزوں سے اوپر اُٹھ کر خدا کی طرف پرواز کرسکیں۔ اور یہ بات آسانی سے سمجھ میں بھی آسکتی ہے کہ کس طرح نبی کے نفخ سے انسان اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ زمینی خیالات کو ترک کرکے عالم بالا کی سیر کرے۔

مگر لفظ طیر کے علاوہ یہاں لفظ اخلق بھی ہے۔ سو اس میں کچھ مشکل نہیں۔ کیونکہ خلق کے معنے تقدیر یعنی اندازہ کرنے کے ہیں جیسے کہ راغب میں ہے الخلق اصلہ التقدیر المستقیم۔ اور خلق کا لفظ انسان کے لیئے محض اندازہ کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے شاعر کے اس قول میں۔

ولانت تفری ما خلقت     و بعض القوم یخلق ثم لا یفری

یعنی تو جو اندازہ یا ارادہ یا تجویز کرتا ہے۔ اسے کرگذرتا ہے اور عمل میں لے آتا ہے لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تجویزیں تو کرتے ہیں۔ مگر انکو عمل میں نہیں لاتے۔ اسی طرح ضرب المثل کے رنگ میں بولتے ہیں۔ ماخلقت الافریت وما وعدت الا وفیت میں نے کوئی تجویز نہیں کی۔ مگر اسے عمل میں لاد کھایا۔ اور میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا مگر اسے پورا کرد کھایا۔ اور مفسرین نے بھی یہاں اخلق کے معنے اقدر ہی کیئے ہیں۔ کیونکہ اگر خلق سے مراد سچ مچ پیدا کرنا لیا جائے تو پھر یہ دقت پیش آتی ہے کہ ابھی نفخ کے بعد اس نے پرندہ بننا ہے اسلیئے اخلق سے مراد صرف اندازہ کرنا ہی ہے +

دوسرا لفظ قابل تشریح طین کا لفظ ہے۔ طین کے معنے مٹی ہیں۔ اور قرآن کریم میں بار بار انسان کی طین سے پیدائش کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور ایک جگہ سارے انسانوں کا ذکر کرکے بھی فرمایا ہے۔ انا خلقناھم من طین لازب۔ اور شیطان آدم کی فرمانبرداری نہ کرنے کی وجہ صرف یہی پیش کرتا ہے ءاسجد لمن خلقت طینا۔ کیا میں اسے سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اپنی برتری جتاتا ہے۔ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین

کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اپنے کلام میں جیسا کہ وہ انجیل میں اب ملتا ہے۔ بیماروں کو شفا دینے سے مراد روحانی بیماریوں کا دور کرنا ہے۔

اب ہم دوسری طرف قرآن کریم پر غور کرتے ہیں تو یہاں بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن کریم میں روحانی بیماریوں کو شفا دینا ہی نبیوں کا کام لکھا ہے جسمانی بیماریوں کو نبیوں کے کام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ بیشک اندھوں۔ بہروں اور گونگوں کو اچھا کرتے ہیں۔ مگر ایک ہی فقرہ میں قرآن کریم نے اس ساری بحث کا خاتمہ کر دیا ہے۔ فانها لا تعمى الابصار ولكن تعمى القلوب التي في الصدور (الحج-۴۶) فرماتا ہے کہ سچ بات تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں بلکہ اندھے وہ دل ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔ اور اسی نابینائی کا ذکر قرآن کریم بار بار فرماتا ہے۔ صم بکم عمی فھم لا یرجعون۔ بہرے گونگے اندھے یہ ان کافروں کی حالت ہے۔ جو انذار کی پروا نہیں کرتے۔ نہ باتیں سنتے ہیں نہ ان پر غور کرتے ہیں۔ نہ مونھ سے کلمۂ حق کہتے ہیں نہ خدا کے نشانات کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے حق کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ اور یہی نہیں کہ روحانی امراض کا ذکر ہی بار بار فرمایا ہے۔ بلکہ شفا کا ذکر بھی اسی رنگ میں فرمایا۔ چنانچہ قرآن کریم کے متعلق ایک جگہ فرمایا ھدی وشفاء۔ وہ ہدایت بھی ہے۔ اور شفا بھی۔ لفظ شفاء کو ہدایت کے ساتھ لگا کر بتا دیا۔ کہ روحانی بیماریوں کی شفا مراد ہے نہ جسمانی بیماریوں کی۔ اور پھر فرمایا شفاء لما في الصدور۔ یہ سینوں کے اندر کی بیماریوں کے لئے شفاء ہے۔

پس انجیل اور قرآن کریم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء کا کام اور ان کی تعلیم روحانی بیماریوں سے نجات دینے کے لئے ہوتے ہیں۔ اور کتب مقدسہ میں جن بیماریوں کا ذکر اکثر آتا ہے۔ وہ روحانی بیماریاں ہوتی ہیں۔ اور جسمانی بیماریوں کو اچھا کرنے یا نہ کرنے سے کوئی تعلق نبوت کے کام کا نہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جو مریض دیئے گئے۔ کہ ان کا علاج کرو۔ ان کی مرض مسیح کے مریضوں کی مرض سے بہت بڑھ کر ہے۔ وہاں تو شبکور اور برص والے ہیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اندھے اور گونگے اور بہرے دیئے جاتے ہیں۔ شبکوری کا مریض دن کی تیز روشنی میں دیکھنے لگتا ہے مگر اندھا نہ رات کو دیکھتا ہے نہ دن کو۔ برص والے سے لوگ صرف تنفر کرتے ہیں۔ مگر وہ چلتا پھرتا سنتا بولتا ہے۔ مگر گونگا اور بہرہ تو گویا صفات حسنہ سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ ساتھ اندھا بھی ہو تو کوئی ذریعہ اس کے علوم حاصل کرنے کا باقی نہیں رہتا۔ اس میں درحقیقت یہ بتایا ہے کہ مسیح کے وقت کی بیماری ایسی خطرناک نہ تھی۔ جیسے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی بیماری اور جتنی بیماریاں خطرناک ہوں۔ اسی قدر فاضل طبیب بھی بکار ہوتا ہے۔ پس دنیا کا سب سے بڑا طبیب ہی اس قابل تھا۔ کہ ایسے لوگوں کو بھی شفا دے جو اندھے بھی ہیں اور گونگے بھی ہیں۔ اور بہرے بھی ہیں۔ ان ھم کالانعام بل ھم اضل۔ چارپائیوں سے بھی گئی گذری ان کی حالت ہو گئی ہے۔ مسیح کے وقت میں کچھ روشنی موجود تھی

تفسیر نور طبع ۱۳۸۵

جن کا علاج طبیب ہر زمانہ میں کرتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں - ابرص کے ساتھ اکمہ کو رکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ابرص ایک معمولی مرض کا مریض ہے - اسی طرح اکمہ بھی معمولی مرض کا مریض ہے - اور اس لیئے یہاں شکور کے معنے ہی لیئے جائیں گے نہ مادر زاد اندھے کے - جبکا ذکر برص جیسی معمولی بیماری کے ساتھ بالکل غیر موزون ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ حضرت مسیح کا معمولی جسمانی بیماریوں کا علاج کرنا ان کی نبوّت کا کوئی نشان نہیں - حالانکہ یہاں نشان کے طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے - اور پھر یہاں کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل کے علم کے بعد ان باتوں کو بیان کیا ہے - جن میں خلق طیر اور اکمہ اور ابرص کے علاج کا ذکر ہے - حالانکہ یہ دونوں باتیں کتاب وحکمت اور توریت اور انجیل کی تعلیم سے کوئی تعلّق نہیں رکھتیں - کیونکہ حکمت سے مراد یہاں علم طب نہیں بلکہ حقیقت تک پہنچنا اور اصل بات کا فہم حاصل کرنا ہے - پس قرینہ چاہتا ہے کہ یہاں رُوحانی بیماریوں کے علاج کا ذکر ہے - کیونکہ توریت و انجیل رُوحانی بیماریوں کے علاج کے لیئے نازل ہوئی تھیں نہ جسمانی بیماریوں کے علاج کے لیئے - اور خود انجیل میں حضرت مسیح کے اقوال اسی کے مؤید ہیں - کہ بیماروں کو شفا دینے سے مراد وہ رُوحانی بیماریوں کی شفا لیا کرتے تھے - چنانچہ متعدّد موقعوں پر ان کے یہ اقوال پائے جاتے ہیں - نمونہ کے طور پر ذیل کی مثالیں کافی ہونگی - متی ۱۳/۱۵ میں یہودیوں کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مسیح فرماتے ہیں "کیونکہ اس قوم کا دل موٹا ہوا - اور وے اپنے کانوں سے اونچا سُنتے ہیں - اور انھوں نے اپنی آنکھیں موندلیں تا ایسا نہ ہو کہ وے آنکھوں سے دیکھیں اور کانوں سے سُنیں اور دل سے سمجھیں - اور رجوع لادیں اور میں انھیں چنگا کروں" اب یہاں سب روحانی حالت اور روحانی بیماریوں کا ذکر کر کے آخر پر یہ الفاظ ہیں - کہ میں انھیں چنگا کروں جو ابرئی الاکمہ والابرص کے بالکل مطابق ہیں - اور صاف معلوم ہوتا ہے - کہ چنگا کرنے سے آپ کا منشاء یہ تھا - کہ رُوحانی بیماریوں سے شفا دوں - پھر متی ۹/۱۲ میں فرماتے ہیں "بھلے چنگوں کو حکیم درکار نہیں بلکہ بیماروں کو" اب یہاں تینوں لفظ یعنے بھلے چنگے حکیم اور بیمار - ظاہری معنے کے لحاظ سے استعمال نہیں کیئے گئے - بلکہ رُوحانی صحت - رُوحانی طبیب اور روحانی بیمار مراد ہیں پھر اس سے بھی بڑھ کر صفائی اس سوال وجواب سے ہوتی ہے جو متی ۱۱/۵ میں مذکور ہے - جہاں یہ ذکر ہے کہ یُوحنّا نے دو آدمیوں کو مسیح کے پاس بھیجا تا کہ دریافت کریں کہ وہ وہی مسیح ہے جسکی اُن کو انتظار تھی - تو اُسکے جواب میں حضرت مسیح نے یُوں فرمایا "یسُوع نے جواب میں اُنھیں کہا - کہ جو کچھ تم سُنتے اور دیکھتے ہو جا کے یوحنّا سے بیان کرو - کہ اندھے دیکھتے اور لنگڑے چلتے - کوڑھے پاک صاف ہوتے - اور بہرے سُنتے اور مردے جی اُٹھتے ہیں - اور غریبوں کو خوشخبری سنائی جاتی ہے" اب ظاہر ہے کہ یہاں آخری فقرہ میں غریبوں سے مراد مال و دولت سے محرُوم نہیں بلکہ دل کے غریب ہیں اور خوشخبری لفظ Gospel یا انجیل کا ترجمہ ہے - اس ایک فقرہ نے درحقیقت پہلے تمام فقروں کے معنوں پر روشنی ڈال دی ہے - کہ یہاں بھی مراد روحانی بیماریاں ہی ہیں ورنہ جسمانی بیماریوں کے ذکر میں غریبوں کو انجیل کا سنایا جانا ایک بے معنی بات ہے - پس ان تمام حوالجات سے ثابت ہے

برزخ الی یوم یبعثون (المؤمنون-۹۹-۱۰۰)- یہاں تک کہ جب انہیں سے ایک پر موت آجاتی ہے تو پھر وہ کہتا ہے میرے رب مجھے لوٹاؤ تاکہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں نیک عمل کروں- ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا یہ ایک بات ہے جو وہ کہتا ہے اور ان کے ادھر (یعنی بعد موت) ایک حالت برزخ ہے- اس دن تک کہ ان کو اٹھایا جائے- اب اس آیت میں بھی یہی اصول بیان فرمایا- کہ موت کے بعد اس دُنیا میں واپس آنا ممنوع ہے- اور ایسی خواہش پوری نہیں کی جاسکتی- بلکہ یوم البعث تک یعنی قیامت کے دن تک حالت برزخ میں رہنا ہوگا پس اس آیت کی رُو سے بھی مردوں کا قبل از بعثت اس دُنیا میں واپس آنا باطل ثابت ہوتا ہے- تیسری آیت جو اس بات پر شاہد ہے وہ ذیل کی آیت قرآنی ہے وحرام علیٰ قریة اهلکنٰها انهم لا یرجعون (الانبیاء ۹۵) اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کردیا- ان پر ایک بات قطعی طور پر ممنوع ہے- یعنی وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے- قریہ سے مراد بستی کے لوگ ہیں یعنی جو لوگ مار دیئے جاتے ہیں- وہ لوٹ کر نہیں آیا کرتے- اِس آیت کی تفسیر میں ایک حدیث نسائی اور ابن ماجہ سے مذکور ہے عن جابر بن عبد الله قال لقینی رسول الله صلی الله علیه وسلم- فقال یاجابر مالی اراك منکسرا قلت یا رسول الله استشهد ابی و ترك عیالا و دینا فقال الا ابشرك مالقی الله به اباك قال بلی..... قال یا عبدی تمن علی اعطك قال یا رب تحیینی فاقتل فیك ثانیة قال الرب تعالیٰ قد سبق منی انهم لا یرجعون یعنی جابر بن عبداللہ سے روائت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم ملے اور فرمایا اے جابر کیا وجہ ہے میں تم کو غمگین پاتا ہوں- میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا باپ شہید ہوگیا اور عیال اور قرضہ پیچھے چھوڑ گیا فرمایا- میں تم کو خوشخبری دوں کہ تیرے باپ کو اللہ تعالےٰ کے حضور کیا معاملہ پیش آیا- عرض کیا فرمایئے- (یہاں حدیث کا ایک ٹکڑا چھوڑ دیا گیا ہے)..... اللہ تعالےٰ نے (جابر کے والد کو) فرمایا- اے میرے بندے- تو میرے سامنے کوئی خواہش کر تاکہ میں تجھے دُوں- اُس نے عرض کیا اے میرے رب مجھے زندہ کردیجئے تاکہ میں دوبارہ تیری راہ میں مارا جاؤں- رب تعالیٰ نے فرمایا یہ میں پہلے وعدہ کرچکا ہوں کہ (جو مرجائیں گے) وُہ لوٹ کر (اس دُنیا میں) نہیں جائیں گے- اب یہ حدیث قطعی طور پر اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ مردہ کبھی اس دُنیا میں واپس نہیں آسکتا- اور مردہ کا واپس آنا قانون الٰہی کے خلاف ہے- کیونکہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے- کہ اللہ تعالےٰ نے خود جابر کے والد کو یہ کہا تھا- کہ جو چاہتے ہو مانگو میں دُونگا- مگر جب اُس نے دوبارہ دُنیا میں بھیجے جانے کی خواہش ظاہر کی تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا- کہ یہ نہیں ہوسکتا- کیونکہ یہ میرے وعدہ کے خلاف ہے- اب یہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کا فرمانا- کہ جو مانگو میں دُونگا- دوسری طرف مُسلمانوں میں اسوقت ایسے آدمیوں کی سخت ضرورت ہونا جو خدا کی راہ میں اپنی جانیں قربان کریں- یہ دونوں باتیں اس امر کی مقتضی تھیں کہ اگر خدا کے قانون میں کوئی مردہ اس دُنیا میں واپس آسکتا- تو جابر کا والد سب سے بڑھ کر واپسی کا مستحق تھا- مگر اللہ تعالےٰ نے باوجود یہ فرمانے کے کہ جو مانگو میں تم کو دونگا- پھر بھی دوبارہ دنیا میں اُس کے

ایک شریعت بھی تھی۔ انبیاء بھی یکے بعد دیگرے آتے رہتے تھے۔ مگر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے زمانہ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ظھر الفساد فی البر والبحر۔ خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا۔ اور روحانی بیماریاں غلبہ پکڑ گئیں اور شرائع اور کتابیں بالکل محرّف ہو کر بگڑ گئیں سلسلۂ نبوت پر بھی ایک لمبا زمانہ فترت کا گذر گیا پس حضرت مسیح کے وقت کی بیماریوں کو کمزور کر کے بیان فرمایا ہے یعنی جیسے شبکوری یا برص ہوتی ہے کہ اسکے علاج میں اسقدر مشکلات نہیں ہوتیں۔ اور یہی وہ رُوحانی امراض ہیں جن کا ذکر حضرت مسیح کے کلام میں ہے +

۴۴۔ واحی الموتٰی باذن اللہ۔ اور میں اللہ کے اذن سے مردوں کو زندہ کرتا ہوں۔ یہ تیسری بحث اسی قسم کی ہے جیسی دو پہلے گذر چکیں یعنی کہ حضرت مسیح کس طرح پر احیائے موتٰے کرتے تھے۔

آیا جو لوگ مرجایا کرتے تھے ان کو زندہ کر کے دوبارہ دنیا میں واپس لے آیا کرتے تھے۔ یا جیسے انبیاء علیہم السلام کا کام ہے کہ رُوحانی مُردوں کو زندگی بخشیں۔ آپ بھی روحانی مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ اوّل ہم پہلے سوال کو لیتے ہیں۔ اور پہلے اس بات پر غور کرتے ہیں کہ مردوں کا زندہ ہو کر اس دُنیا میں واپس آنا کوئی ایسا امر تو نہیں کہ قرآن کریم اس کی اجازت نہ دیتا ہو؟ کیونکہ اگر قرآن کریم مردوں کے زندہ ہو کر اسی دُنیا میں واپس آنیکی اجازت دیتا ہے تو ایک شخص کو اختیار ہے کہ مسیح کے مردوں کو زندہ کرنے کے معنے جسمانی زندگی کا دیا جانا لے۔ لیکن اگر قرآن کریم اس بات کو قطعاً روکتا ہے۔ تو پھر ہم مجبور ہونگے۔ کہ اُس کے معنے صرف احیائے روحانی کے لیں۔ اور اس طرح پر محکمات اور متشابہات کے اصُول کے ماتحت لا کر اس مسئلہ کو حل کریں۔ قبض رُوح کے متعلق اللہ تعالےٰ اپنا عام قانون قرآن کریم میں ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔ اللہ یتوفی الا نفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسك التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخرٰی الی اجل مسمّیٰ (الزمر-۴۲)۔ اللہ تعالےٰ قبض کرتا ہے روحوں کو ان کی موت کے وقت۔ اور جو مرتے نہیں ان کی نیند میں پھر روک رکھتا ہے اس کو جس پر موت وارد کردی اور واپس بھیجتا ہے دُوسرے کو ایک وقت مقرر تک۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالےٰ نے اپنا یہ قانون بیان فرمایا ہے۔ کہ قبض رُوح دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک موت کی حالت میں اور دوسرے نیند کی حالت میں۔ گویا ان دونوں حالتوں پر قبض روح کا لفظ بولا جاتا ہے۔

قبض رُوح کی تیسری کوئی طرز بیان نہیں فرمائی۔ اور ان دونوں طرزوں میں سے بھی ایک کے متعلق فیصلہ قطعی صادر فرمادیا کہ جس پر موت وارد کر دے۔ اس کو پھر اس دنیا میں واپس نہیں بھیجتا۔ ان کے زندہ ہونے کے لئے اللہ تعالےٰ نے قیامت کا وقت مقرر فرمایا ہے۔ پس اس آیت کی رو سے کوئی شخص جس پر موت واقعی وارد ہو چکی ہے۔ زندہ ہو کر اس دُنیا میں نہیں آسکتا۔ اس لیئے مردوں کے زندہ ہونے کا ذکر قرآن کریم میں جہاں ہوگا ہم مجبُور ہونگے۔ کہ یا تو اس کو قیامت کے متعلق سمجھیں اور یا اس سے مراد کچھ اور لیں +

پھر ایک اور آیت قرآن کریم میں اسی کی موید ہے یعنی یہی اصول وہاں بھی بیان کیا گیا ہے۔ حتی اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت کلا انھا کلمة ھو قائلھا ومن ورائھم

قرآن کریم میں مُردے ہی کہا گیا ہے۔ بلکہ انبیاء کا یہ کام بتایا گیا ہے۔ کہ وہ رُوحانی مردوں کو زندہ کریں۔ تو ہم احی الموتی باذن اللہ کے ایک ہی معنے لے سکتے ہیں۔ کہ اللہ کے اذن سے میں رُوحانی مردوں کو زندگی دیتا ہوں۔ اور یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ دراصل یہ تینوں فقرے یعنی اوّل خلق طیر۔ دوئم اکمہ اور ابرص کو شفا دینا۔ سوئم مُردوں کو زندہ کرنا۔ درحقیقت ایک ہی مطلب کے ظاہر کرنے والے ہیں یعنی نبی کے نفخ رُوح سے ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ جو طبعی فطرت کے لوگ ہیں یعنی بوجہ فرمانبرداری کے مادہ کے استعداد قبولیت کی زیادہ رکھتے ہیں۔ ان میں تو نفخ روح کا اثر اس قدر ہوتا ہے کہ ان کے زمینی تعلّقات منقطع ہو کر وہ بالکل خدا کے لیئے ہی ہو جاتے ہیں۔ اس سے ادنیٰ حالت ان لوگوں کی ہے جن کو بیمار کہا یعنی اکمہ اور ابرص۔ ان کی بیماریاں دور ہو کر وہ بھلے چنگے ہو جاتے ہیں۔ مگر سب سے ردی حالت اُن لوگوں کی ہے۔ جن میں سے روحانی زندگی مفقود ہو چکی ہے اور وہ مردوں کے حکم میں داخل ہو چکے ہیں۔ مگر ان پر بھی نبی کی قوت قدسی کا اثر ہوتا ہے۔ اور اُن کو از سرِ نو زندگی دی جاتی ہے۔ اصل غرض بہرحال ایک ہی ہے۔ یعنی انسانوں میں نفخ رُوح کرنا اور تین مختلف پیرائے اس کے صرف اس لیئے بیان فرمائے۔ کہ تا انسانوں کے تین مراتب پر یعنی اس حالت پر جس میں نبی اُن کو پاتا ہے شاہد ہوں یہی وجہ ہے کہ یہاں ان تینوں کو ایک ہی آیت قرار دیا ہے۔ اور یُوں فرمایا ہے انی قد جئتکم باٰیۃ من ربکم میں تمہارے رب کی طرف سے ایک نشان لایا ہوں۔ حالانکہ آگے ذکر تین باتوں کا ہے۔ اس سے اسی طرف اشارہ کرنا مقصُود ہے۔ کہ درحقیقت یہ تینوں باتیں ایک ہی مطلب کو ظاہر کرنے والی ہیں۔ اور نبی کی قوت قدسی کا فیضان ہی وہ نشان ہے جس کا یہاں ذکر مطلوب ہے +

۲۴۷۔ وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم۔ اور میں تم کو خبر دیتا ہوں ان چیزوں کی جو تم کھاؤ اور جو تم ذخیرہ کرو اپنے گھروں میں۔ اس موقعہ پر جو قصّے لکھے گئے ہیں کہ حضرت مسیح باہر لڑکوں میں کھیلا کرتے تھے۔ تو لڑکوں کو بتا دیا کرتے تھے۔ کہ تمہاری ماں نے فلاں چیز فلاں جگہ چھپا کر رکھی ہے۔ اور اس طرح لڑکے گھر میں جا کر ماؤں کو تنگ کیا کرتے تھے۔ پھر لکھا ہے کہ ایک دن محلّہ والوں نے سارے لڑکوں کو ایک مکان میں بند کر دیا۔ اور جب مسیح اُن کو بلاتے ہوئے آئے تو ان کے متولیوں نے کہدیا کہ وہ یہاں نہیں ہیں۔ اور جب مسیح نے اس مکان کی طرف جہاں وُہ لڑکے بند تھے۔ اشارہ کر کے کہا کہ یہاں کون ہے۔ تو اُنھوں نے کہدیا کہ سؤر تو وُہ سب لڑکے سؤر بن گئے۔ یہ بے سرو پا قصّے گھڑ لیئے گئے ہیں۔ جن کی غرض صرف مسیح کی ہر بات کو عجوبہ بنانا ہے حالانکہ مسیح میں دیگر انبیاء بنی اسرائیل سے بڑھ کر کوئی بات نہ تھی۔ اس آیت کے معنے صاف اس قدر ہیں کہ حضرت مسیح اُن کو بتاتے ہیں کہ کیا چیزیں کھاؤ اور کس قدر ذخیرہ کرو۔ گو یا حلال وحرام کے متعلق بھی کچھ احکام دیتے تھے۔ اور زیادہ تر ان کی تعلیم کا زور اس بات پر تھا کہ دُنیا کے مال و دولت کا زیادہ ذخیرہ مت کرو اور اپنے لیئے زمین پر خزانے جمع مت کرو۔ گو آپ کے پیروؤں نے آپ کی ہر ایک تعلیم کی خلاف ورزی ہی کی ہے

آیت ۴۸

آنے کی خواہش کو پورا نہیں کیا۔ اس بنا پر کہ یہ میرے وعدہ کے خلاف ہے۔ تو کیا یہ وعدہ خدا تعالےٰ نے حضرت مسیح کے زمانہ کے بعد کیا تھا کہ اب میں مُردوں کو زندہ نہیں کیا کروں گا۔ پھر ہم پوچھتے ہیں کہ خدا اگر مسیح کے ذریعہ سے مردوں کو زندہ کرتا تھا تو خود ایک مردہ کو زندہ کر کے کیوں واپس نہ بھیجدیا۔

احیاء روحانی

پس یہ تینوں آیتیں اس بات پر شاہد ہیں کہ مردے ہرگز اس دُنیا میں واپس نہیں آیا کرتے۔ اور یہ خدا تعالےٰ کا اٹل قانون ہے جس میں اللہ تعالےٰ نے ایک بھی استثناء پسند نہیں فرمایا۔ کافر کی خواہش پر کہ میں اب دوبارہ جاکر اصلاح کروں گا۔ یہی فرمایا کہ یہ ہمارے قانون اور سنت کے خلاف ہے کہ دوبارہ مردہ کو دُنیا میں بھیجیں۔ ایک مومن کی خواہش پر۔ حالانکہ جو مانگے اس کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اور اُس کی خواہش بھی محض اعلائے کلمتہ اللہ کے لیئے دوبارہ جانے کی تھی۔ یہی فرمایا کہ مردہ دُنیا میں واپس نہیں جاسکتا۔ پس جب اللہ تعالےٰ نے مُردوں کی واپسی کے متعلق ایسا کھلا کھلا قانون بیان فرمادیا تو احی الموتی کے معنے کسی صورت میں یہ نہیں ہوسکتے۔ کہ مُردوں کو زندہ کر کے اس دُنیا میں واپس بھیج دیتا ہوں۔ محکمات اس معنے کو غلط ٹھیراتے ہیں اس لیئے اب سوائے اس کے چارہ نہیں کہ یہاں بھی رُوحانی مردوں کا احیاء مراد لیا جائے۔ اور چونکہ قرآن کریم کی اندر روحانی مردوں کی احیاء کا ذکر بھی کثرت کے ساتھ اور بار بار آتا ہے۔ اور دوسری طرف پہلے دونوں فقروں میں بھی ظاہری معنے مراد نہیں لیئے جاسکتے اس لیئے یہی معنے درست ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کے محاورہ کو ہم دیکھتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کی طرف روحانی مردوں کا زندہ کرنا ہی منسوب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا او من کان میتا فاحییناہ وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمٰت لیس بخارج منھا۔ (الانعام-۱۲۳) کیا وہ شخص جو مردہ ہو پھر اُسے ہم زندہ کریں اور اس کو ایک روشنی دیدیں جس کے ساتھ وہ لوگوں کے اندر چلے اس شخص کی مثل ہوسکتا ہے جو تاریکیوں کے اندر ہی رہے۔ اُن میں سے باہر نکلنے والا نہ ہو۔ اب یہاں ایک مردہ کا ذکر ہے۔ اور اُس کے زندہ کرنے کا بھی ذکر ہے۔ مگر یہ کس قسم کا مردہ ہے۔ اور اس کا احیاء کیا ہے۔ اس مردہ کو جب اللہ تعالےٰ اپنی جناب سے نور ایمان عطاء فرماتا ہے تو اس نور کے ذریعہ سے پھر وہ لوگوں میں چلتا ہے۔ اور اس زندگی کے مقابل اس مُردہ کی حالت ہے جو تاریکیوں میں ہی رہتا ہے۔ پھر فرمایا۔ یا ایھا الذین اٰمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (الانفال-۲۴) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو فرمانبرداری کرو اللہ کی اور رسول کی۔ جب وُہ تمکو بلائے اس کے لیئے جو تمکو زندہ کرے۔ پھر فرمایا وما یستوی الاحیاء ولا الاموات ان اللہ یسمع من یشاء وما انت بمسمع من فی القبور (فاطر-۲۲)۔ زندے اور مُردے یکساں نہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے سُناتا ہے۔ اور جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں تم اُن کو نہیں سُنا سکتے۔ یہاں نہ صرف رُوحانی زندوں کو احیاء اور روحانی مردوں کو اموات کے نام سے پکارا ہے۔ بلکہ اُن کو من فی القبور بھی قرار دیا ہے۔ یعنی ایسے لوگ جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ پس جب قرآن کریم مردوں کے اس دُنیا میں واپس آنے کا دروازہ قطعاً بند کرتا ہے۔ اور روحانی مردوں کو

تفسیر لفظ مکر

کرنے والوں کا ہے۔ یہاں مکروا کی ضمیر حواریوں کی طرف نہیں جاتی۔ بلکہ ان لوگوں کی طرف جن کا ذکر اس سے پہلے ان الفاظ میں ہے فلما احس عیسیٰ منھم الکفر بعض اوقات مرجع ضمیر کا قریب نہیں بلکہ بعید ہوتا ہے۔

اس آیت میں جو لفظ مکر کا استعمال ہوا ہے اس کے معنے سمجھنے میں بعض لوگوں کو واقعی غلطی لگی ہے اور بعض شرارت کی راہ سے بھی اعتراض کرتے ہیں۔ تفسیر کبیر میں ہے قیل اصلہ من اجتماع الامر واحکامہ گویا اس لفظ کا اصل مفہوم امر کا اجتماع اور اس کی مضبوطی ہے۔ اس لیئے مکر کی تشریح اُنھوں نے یہ کی ہے فالمکر رایا محکما قویا مصونا عن جھات النقص والفتور یعنی مکر وہ تجویز محکم اور مضبوط ہے جو ہر ایک قسم کے نقص اور فتور کی وجوہات سے محفوظ ہو۔ اور پھر لکھا ہے۔ المکر عبارۃ عن تدبیر المحکم الکامل ثم اختص فی العرف بالتدبیر فی ایصال الشر الی الغیر۔ کہ مکر سے مراد ہے تدبیر محکم کامل پھر عرف میں اس تدبیر سے یہ لفظ مخصوص ہو گیا جس کا منشاء دوسرے کو تکلیف پہنچانا ہو۔ اور مفردات راغب میں مکر کے معنے یوں لکھے ہیں صرف الغیر عما یقصدہ بحیلۃ۔ کسی شخص کا پھیر دینا اس سے جس کا وہ قصد کرتا ہو حیلہ کے ساتھ۔ اور پھر اس کی مزید تشریح یوں کی ہے۔ وذٰلک ضربان مکر محمود وذلک ان یتحری بذٰلک فعل جمیل.... ومذموم وھوان یتحری بہ فعل قبیح۔ اور یہ دو قسم ہے یعنی ایک اچھا اور تعریف کیا گیا مکر اور وہ وہ ہے۔ جس سے کسی اچھے کام کے کرنیکا قصد کیا جائے۔ اور بُرا یا مذموم اور وہ یہ ہے۔ کہ اس سے کسی بُرے کام کا قصد کیا جائے۔ بعض الفاظ ایسے ہیں کہ اُن کے اصل معنی میں عمومیت تھی۔ پھر ایک خاص پہلو شہرت پا گیا۔ مگر قرآن کریم نے اُن کو وسیع معنے میں ہی استعمال کیا ہے مثلاً تبشیر کا لفظ ہے۔ اصل معنے کے لحاظ سے تبشیر کسی ایسی خبر کے دینے کو کہتے ہیں جس سے بُشرہ میں تغیر آجائے اور ایسی خبر خوشی کی بھی ہو سکتی ہے اور غم کی بھی۔ مگر پھر صرف خوشی کی خبر کے لحاظ سے اس کے معنے مشہور ہو گئے حالانکہ قرآن کریم نے اپنی اصلی وسعت کے لحاظ سے اس کا استعمال کیا ہے جیسے فبشرہ بعذاب الیم۔ اسی طرح لفظ مکر کا استعمال ہے۔ اس کے اصل معنے صرف خفیہ تدبیر کے ہیں۔ مگر پھر شر کے پہنچانے میں جو خفیہ تدبیر ہو وہ معنے زیادہ شہرت پا گئے۔ اور اردو میں تو بالکل یہی معنے مشہور ہو گئے۔ حالانکہ قرآن کریم نے اس کو اپنے اصل معنے کے لحاظ سے استعمال کیا ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ مکر کے ساتھ اچھے اور بُرے دونوں قسم کی صفات کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً فرمایا واللہ خیر الماکرین تو یہاں خیر کا لفظ ماکرین کے ساتھ بڑھا کر یہ بتا دیا ہے کہ مکر نیکی کے کاموں میں بھی ہو سکتا ہے۔ اور ایک جگہ فرمایا ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ۔ یہاں مکر کے ساتھ سیئ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ حالانکہ اگر مکر کے معنے میں برائی پائی جاتی تو اس کے ساتھ سیئ کا لفظ لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ پس مکر کے لفظ کے ساتھ خیر اور سیئ کی صفات مختلف موقعوں پر لگا کر یہ بتا دیا ہے۔ کہ قرآن کریم نے اس کا استعمال اپنے اصل اور وسیع معنوں کے لحاظ سے کیا ہے۔

یہاں یہودیوں کی باریک تدبیر تو شرارت کے رنگ میں تھی۔ کہ اُنھوں نے حکام وغیرہ کو اکسا کر مسیح کو صلیب

۴۸ اور وہ صرف زمین پر ہی اپنے خزانوں کے جمع کرنے کی فکر میں ہیں۔ غرض اسی طرف ان الفاظ میں اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ وما تدخرون فی بیوتکم +

۴۹ ۴۴۸۔ ومصدقا لما بین یدی من التوراۃ ۔ اور تصدیق کرنے والا ہوں اس کی جو میرے سامنے ہے توریت سے اس آیت سے یہ معلوم نہیں ہوتا۔ کہ توریت حضرت مسیح کے وقت تک بالکل محفوظ تھی۔ اور نہ ہی تصدیق کا یہ مطلب ہے کہ اُنھوں نے توریت کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کیا۔ بلکہ جس قدر حصّہ کی اُنھوں نے تصدیق کی اسیقدر اُن کے پیروؤں کے لیئے قابل عمل تھا۔ ہر ایک نبی بجائے خود ایک مرکز ہوتا ہے جس کے گرد اس کے اتباع گھومتے ہیں۔ وہ ایک آفتاب ہوتا ہے۔ اس کے گرد پھرنے والے سیارے اسی سے روشنی لیتے ہیں۔ پہلی کتابوں میں سے جس قدر حصّہ کی وہ تصدیق کرے اس قدر لے لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیح کی تعلیم میں صاف طور پر توریت کے بعض احکام کی منسوخی کا ذکر پایا جاتا ہے +

۴۴۹۔ ولاحل لکم بعض الذی حرم علیکم ۔ اور تاکہ میں حلال ٹھیراؤں۔ تمہارے لیئے بعض وہ چیزیں جو تم پر حرام کی گئیں۔ اس آیت میں وضاحت سے یہ بتادیا ہے۔ کہ ایک نبی اپنے سے پہلے نبی کے بعض احکام کو منسوخ کر سکتا ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک شریعت توریت میں بیشک دی گئی تھی۔ مگر آپ کے بعد جو نبی ظاہر ہوئے وہ اپنے اپنے زمانہ اور ضروریات کے مطابق اس میں سے کسی حصّہ کو منسوخ کرتے رہے یا بعض تعلیمات کی تکمیل کرتے رہے +

۵۰ ۴۵۰۔ ان اللہ ربی وربکم فاعبدوہ ھذا صراط مستقیم ۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی یہی تعلیم تھی۔ مگر افسوس کہ اس تعلیم کو اس کے پیروؤں نے پس پشت ڈال کر ایک ایسی تعلیم انکی طرف منسوب کی ہے کہ جو اُنھوں نے کبھی نہ دی تھی۔ حضرت مسیح کی کلام میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ کہ اُنھوں نے کہا ہو کہ تم میری عبادت کیا کرو۔ مگر خدا کی عبادت کی متعلق صاف اور صریح الفاظ ہیں اور ایک جگہ قریبًا قریبًا وہی لفظ ہیں جن کا ذکر یہاں قرآن کریم نے کیا ہے "تب یسوع نے اسے کہا۔ اے شیطان دور ہو۔ کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اس اکیلے کی بندگی کر" (متی ۴/۱۰) +

۵۱ ۴۵۱۔ من انصاری الی اللہ ۔ اکثروں کے نزدیک یہاں الی بمعنی مع ہے۔ مگر بعض نے الی اللہ کے معنے فی سبیل اللہ کے کیئے ہیں۔ تو گویا پہلی صورت میں یہ معنے ہوئے۔ کہ اللہ کے ساتھ میرا مددگار کون ہے۔ اور دوسری صورت میں یہ کہ اللہ کی راہ میں میرا مددگار کون ہے +

۴۵۲۔ قال الحواریون ۔ حواری ۔ حور سے مشتق ہے جس کے معنے شدۃ البیاض یعنی بہت سفیدی کے ہیں۔ اور حضرت مسیح کے ساتھیوں کو حواری اس لیئے کہا ہے کہ ان کا پیشہ کپڑوں کو دھو کر سفید کرنا تھا یعنی وہ دھوبی تھے۔ سعید بن جبیر نے یہی تشریح کی ہے۔ بعض کے نزدیک ان کو حواری کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے دل گناہوں سے پاک تھے۔ حضرت مسیح کے بارہ حواری مشہور ہیں جنمیں سے ایک نے حضرت مسیح کو گرفتار کرا دیا تھا +

۵۳ ۴۵۳۔ ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین ۔ اور انھوں نے تدبیر کی اور اللہ نے بھی تدبیر کی اور اللہ بہتر تدبیر

دوسرا وعدہ الفاظ و رافعك الی میں ہے یعنی رفع الی اللہ کا وعدہ۔ بعض لوگوں نے تدبر سے کام نہ لے کر اس سے مراد آسمان پر اٹھایا جانا لے لیا ہے۔ حالانکہ نہ یہاں نہ کسی دوسری جگہ قرآن کریم میں مسیح کے آسمان پر اُٹھائے جانے کا ذکر ہے۔ اور اللہ تعالےٰ آسمان کا نام نہیں کہ رفع الی اللہ سے مراد رفع الی السماء لیا جائے۔ حضرت ابراہیم فرماتے ہیں انی ذاھب الی ربی۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں۔ کہ وُہ آسمان کی طرف جانے والے تھے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حضرت ادریس کے ذکر میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے و رفعناہ مکانا علیا باوجودیکہ یہاں مکانا علیا کا ذکر ہے۔ پھر بھی مراد آسمان پر اُٹھائے جانا نہیں۔ بلکہ درجات کی بلندی مراد ہے جیسا کہ محققین کا مذہب ہے۔ پھر ہر ایک مسلمان ہر روز ہر نماز میں ہر رکعت میں دو سجدوں کے درمیان دُعا کرتا ہے۔ اللھم اغفرلی وارحمنی وارفعنی واجبرنی۔ اب اس دُعا میں ایک فقرہ وارفعنی بھی ہے جس کے معنے ہیں مجھے رفع عطا فرما۔ مگر یہ آج تک کسی کے وہم میں بھی نہ آیا ہوگا۔ کہ اس دعا سے مراد یہ ہے کہ مجھے آسمان پر اُٹھا لے جا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الرافع ہے۔ تو کیا وہ صرف اسی وجہ سے الرافع کہلایا کہ اُسنے مسیح کا رفع کیا یا اور بھی کسی کا رفع کرتا ہے۔ پس جس طرح یہ مومنوں اور انبیاء کا رفع فرماتا ہے۔ اسی طرح حضرت مسیح کا رفع بھی فرمایا یعنی بلندی درجات اور قرب الٰہی عطا فرمانے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں امام رازی بھی لکھتے ہیں ھوالرفعة بالدرجة والمنقبة لا بالمکان والجھة کما ان الفوقیة لیست بالمکان بل بالدرجة یعنی جس رفعت یا رفع یا بلند کرنے کا یہاں ذکر ہے۔ وہ بلندی درجہ اور مرتبہ کی ہے نہ مکان اور سمت کی۔ جیسا کہ اس دوسرے وعدہ وجاعل الذین اتبعوك فوق الذین کفروا میں فوقیت بلحاظ درجہ کے مراد ہے نہ بلحاظ مکان کے۔ چونکہ صلیبی موت میں لعنت نتیجہ ہوتا جس کے اصل معنے خدا سے دوری کے ہیں (دیکھو استثناء ۲۱/۲۳ جہاں لکھا ہے "کیونکہ وہ جو پھانسی دیا جاتا ہے۔ خدا کا ملعون ہے" پھانسی سے مراد جیسا کہ اصل حوالہ کے ملاحظہ سے ظاہر ہوگا صلیب پر لٹکانا ہے) اور رفع الی اللہ کے معنے خدا کے قرب کے ہیں۔ اس لیئے جب متوفیك میں طبعی موت کا وعدہ دے کر صلیبی موت سے بچانے کا ذکر فرمایا تو ساتھ ہی تقرب الی اللہ کی خوشخبری بھی دیدی۔

تیسرا وعدہ ہے مطھرك من الذین کفروا۔ کافروں سے تیری تطہیر کروں گا۔ یہودیوں نے حضرت مسیح علیہ السّلام پر بڑے بڑے الزام لگائے۔ جن میں سب سے بڑا الزام یہی تھا۔ کہ وہ آپ کو نعوذ باللہ من ذالك لعنتی قرار دیتے تھے۔ اب عیسائیوں نے بھی غلطی سے اس الزام کو قبول کر لیا۔ اور یہ عذر کر دیا کہ بیشک وہ لعنتی ہوُا مگر نہ اپنے گناہوں کے لیئے۔ بلکہ ہمارے گناہوں کے لیئے۔ اب جن لوگوں کا فرض تھا۔ کہ اپنے نبی کو الزاموں سے پاک کرتے۔ اُنھوں نے الزام کو ہی قبول کر لیا تو اس لیئے اللہ تعالےٰ نے جو یہ سب کچھ جانتا تھا۔ فرمایا کہ گو تیرے پیرو بھی تجھ پر لعنت کا الزام قبول کر لیں۔ لیکن ہم پھر بھی تیری تطہیر کریں گے۔ چنانچہ حضرت مسیح کی یہ تطہیر بذریعہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہوئی۔ کیونکہ آپ نے ہی اس لعنت کے الزام سے حضرت

آیت ۵۳

لٹکوا دیا۔ اور اللہ تعالےٰ کی باریک تدبیر ایصال خیر کے رنگ میں تھی۔ کہ ایک نہایت باریک تدبیر سے باوجود صلیب پر لٹکائے جانے کے حضرت مسیح کو صلیب کی موت سے بچا لیا جسکا ذکر مفصل آیت وما قتلوہ وما صلبوہ کے نیچے آئے گا +

رکوع ۶/۱۴ آیت ۵۴

۵۴۔ اذ قال اللہ یعیسےٰ انی متوفیك ورافعك الی ومطهرك من الذین کفروا وجاعل الذین اتبعوك فوق الذین کفروا الی یوم القیامة۔ یہاں حضرت عیسےٰ کے ساتھ چار وعدے فرمائے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے وعدہ ہے متوفیك جس کے معنے حضرت ابن عباس نے یوں کئے ہیں ممیتك (بخاری) یعنی تجھے موت دینے والا ہوں۔ اور لغت میں بالاتفاق توفاہ اللہ یا توفی فلان کے معنے لکھے ہیں قبض نفسه یا قبض روحه یعنی اس کی روح قبض کی۔ قرآن کریم میں بھی جہاں جہاں لفظ توفی کا ذی روح کے لیئے استعمال ہؤا ہے جس میں اللہ فاعل ہے۔ تو اس کے معنے سوائے قبض رُوح کے اور کچھ نہیں۔ اور تمام علم ادب عربی میں ایسی صورت میں لفظ توفی کا استعمال صرف قبض روح کے لیئے ہؤا ہے یعنی جہاں اللہ تعالےٰ فاعل ہو۔ اور ذی روح مفعول ہو۔ قرآن کریم نے تو خود بتا دیا ہے کہ توفی سے کیا مراد ہے۔ جہاں فرماتا ہے اللہ یتوفی الانفس حین موتها والتی لم تمت فی منامها۔ یعنی اللہ کا جانوں کو لینا دو ہی طرح پر ہے یا موت میں یا نیند میں بہرحال قبض رُوح ہی اُس کے معنے ہوئے۔ خواہ وہ قبض روح مستقل طور پر ہو۔ جیسے موت کے وقت اور خواہ عارضی طور پر جیسے نیند میں۔ لیکن معنے اُس کے قبض روح کے ہی ہیں۔ جسم کو اُٹھانا لفظ توفی کے معنے نہ کسی لغت میں نہ کہیں قرآن وحدیث میں نہ کہیں عربی علم ادب میں آئے ہیں۔ چونکہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے زندہ ہونے کا خیال عیسائیوں سے مسلمانوں میں رواج پکڑ گیا۔ اس لیئے اُنھوں نے اس لفظ کے معنے میں لغت کی بھی بعض وقت پروا نہ کی۔ اور جنھوں نے لفظ توفی کے حقیقی معنے پر غور کی۔ انھوں نے مسیح علیہ السلام کی موت کا بھی اقرار کیا۔ گو بعض نے پھر یہ کہدیا۔ کہ وہ تین گھڑی کے لیئے وفات پا گئے تھے پھر زندہ ہو گئے۔ بعض نے کہا سات گھڑی کے لیئے وفات پا کر زندہ ہو گئے۔ بہرحال اس سے یہ تو ثابت ہو گیا۔ کہ اُن کی وفات پانے کا انکار نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا وفات کے بعد زندہ ہو جانا۔ اس کو قرآن کریم خود روکتا ہے جیسا کہ نوٹ نمبر ۲۶۴ میں تفصیل کے ساتھ میں ذکر کر چکا ہوں۔ پس مسیح علیہ السلام کا وفات پا جانا ایک صریح اور یقینی امر ہے۔ اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اس ذکر کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ سو پچھلی آیت میں اللہ تعالےٰ نے یہودیوں کی ان تدابیر کا ذکر کیا تھا جن کے ذریعہ سے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو صلیب کی موت مار کر آپ کو نعوذ باللہ من ذلك جھوٹا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اور اللہ تعالےٰ ان کو اس موت سے بچانا چاہتا تھا۔ جسکا ذکر تفصیل کے ساتھ آیت بل رفعه اللہ الیه میں آئے گا۔ اللہ تعالےٰ کا حضرت عیسےٰ کو اس موت سے بچانا ہی وہ مکر اللہ تھا جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہے۔ اور یہاں وفات یعنی قدرتی موت کا ذکر کرکے یہ بتا دیا کہ انکی موت بذریعہ صلیب نہیں ہوئی۔ بلکہ معمولی طور پر آپ نے وفات پائی +

۵۶ اعمال صالحہ بھی بجالانے والے ہیں۔ انہی الفاظ میں مسلمانوں کا بار بار ذکر قرآن کریم میں ہے۔ گویا یہ ان کا ایک امتیازی نشان ہے۔ اور دوسرا گروہ ظالمین کا قرار دیا ہے۔ اس میں نصاریٰ کا ذکر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے از راہ ظلم اللہ کی صفات اور طاقتیں مسیح کی طرف منسوب کیں اور کفارہ کا مسئلہ قائم کرکے اعمال صالحہ سے بے رغبت ہو گئے۔ اور ظالم مشرک کو بھی کہتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان الشرك لظلم عظيم +

۵۸ ۵۷- ان مثل عيسٰى عند الله كمثل ادم خلقه من تراب ثم قال له كن فيكون - عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی مثال کی طرح ہے۔ اسے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اسے کہا ہو سو وہ ہو گیا آدم کا ذکر قرآن کریم میں دو رنگ میں آیا ہے۔ ابو البشر ہونے کے لحاظ سے یعنی بشریت کے لوازمات تامہ اس میں پائے جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ایک ہونے کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو کچھ اوپر ذکر ہوا۔ اس میں بھی انہی دو باتوں کا ذکر ہے یعنی حضرت عیسیٰ میں بشر ہونے کی ساری صفات پائی جاتی ہیں اور دوسرے وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ایک ہیں چنانچہ بشریت کے لحاظ سے آپ کی پیدائش۔ طفولیت۔ کہولت۔ وفات کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ یہی باتیں بشر کو خدا سے الگ کرتی ہیں۔ بشریت کے تقاضوں میں سے ہی پیدا ہونا اور مرنا۔ اور اس دنیا کی زندگی میں ان تغیرات کے ماتحت آنا ہے جو طفولیت سے لے کر کہولت تک انسان پر آتے ہیں۔ خدا نہ پیدا ہوتا ہے نہ مرتا ہے نہ اس پر تغیرات آتے ہیں۔ کہ بچپن کی حالت سے ترقی کرتا کرتا ترقی کے آخری مرتبہ پر پہنچ کر پھر اس کے قویٰ میں تنزل واقع ہونا شروع ہو۔ جس کی ابتدائی حالت کہولت کے نام سے موسوم ہے۔ جب بالوں میں سفیدی آنی شروع ہوتی ہے۔ اور برگزیدگی کے لحاظ سے آپ کے رسول ہونے اور دنیا میں ایک روحانی انقلاب پیدا کرنے اور رفعت مرتبہ وغیرہ کا ذکر ہے۔ پس جو کمال آدم میں اللہ تعالیٰ نے رکھا تھا۔ وہ کمال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی دیا۔ اور اس طرح پر عیسائیوں پر اتمام حجت کی اور اس اتمام حجت کا خلاصہ اس آیت میں ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے۔ کہ اس سورت کے صدر میں عیسائیوں کیساتھ ہی بحث ہے۔ اور غرض اس سارے بیان کی حضرت مسیح میں لوازمات بشریت کا ثابت کرنا اور یہ ظاہر کرنا ہے۔ کہ وہ خدا نہ تھا۔ پس ساری بحث کو اب بطور خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ جو کچھ باتیں آدم میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی بشریت اور برگزیدگی وہی عیسیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ خدا تم اس کو کس بنا پر بناتے ہو +

خلقه من تراب ثم قال له كن فيكون - میں بھی انہی دو مذکورہ بالا باتوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی خلقه من تراب یا مٹی سے پیدا کرنے میں بشریت کی طرف اشارہ ہے۔ اور کن فیکون میں برگزیدہ کیا جانے کی طرف۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ مٹی سے پیدا کیا جانا کوئی آدم اور عیسیٰ علیہ السلام

آیت ۵۴

بقیہ نوٹ ۴۵۴

مسیح کو پاک کیا اور اسی کی طرف اس آیت مطهرك من الذين كفروا میں اشارہ ہے اور اسی کی طرف یوحنا کی اس پیش گوئی میں بھی اشارہ ہے جو فارقلیط کے متعلق اُس نے اپنی انجیل میں درج کی ہے۔ جہاں لکھا ہے "وہ میری بزرگی کرے گی" (یوحنا ۱۶/۱۴) جہاں وہ سے مراد روح حق یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم کا دعوےٰ بھی ہے قل جاء الحق و زهق الباطل۔ الحق یعنی روح حق آ گئی اور باطل یعنی شیطان بھاگ گیا +

چوتھا وعدہ ہے وجاعل الذين اتبعوك فوق الذين كفروا الى يوم القيامة۔ یعنی ان لوگوں کو جو تیرے پیرو ہوئے ان پر جو تیرے منکر ہوئے قیامت کے دن تک فوقیت دیئے رکھوں گا مسیح کے حقیقی منکر یہود ہیں سو اللہ تعالےٰ نے ان کو ہمیشہ ہی یا عیسائیوں کے ماتحت رکھا یا مسلمانوں کے۔ جو کہ دونوں ایک ایک رنگ میں آپ کے ماننے والے ہیں۔ گو عیسائی صرف نام کے متبع ہیں۔ اس وعدہ الٰہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت مسیح کبھی دوبارہ آسمان سے نازل ہونگے۔ تو اس وقت سارے اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے۔ یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ خدا تو فرماتا ہے۔ کہ مسیح کے منکر بھی قیامت تک رہیں گے۔ نشان صرف یہ ہوگا۔ کہ مسیح کے منکر اس کے ماننے والوں کے ماتحت رہیں گے +

یہ بھی قابل ذکر امر ہے کہ ان چاروں وعدوں میں کیسی ترتیب لطیف ہے۔ اوّل توفی کا وعدہ ہے۔ پھر رفع کا پھر تطہیر کا۔ پھر فوقیت متبعین کا۔ ان میں سے کوئی وعدہ آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ رفع کا حقیقی مقام یعنی قرب الٰہی جس میں سارے حجاب دور ہو جائیں وفات کے بعد ہی ملتا ہے۔ پس توفی کے بعد رفع فرمایا۔ جب آپ کو مقام قرب عطا ہوتا ہے۔ تو اب مخلوق میں بھی آپ کی حقیقی عزت کے بڑھانے کا سامان پیدا کیا جاتا ہے۔ اور وہ آپ کی تطہیر یعنی الزامات سے پاک کرنا ہے۔ اور ان سب باتوں کے بعد فوقیت ماننے والوں کی ہے۔ جس کا دامن قیامت تک پھیلا ہوا ہے +

۵۵

۴۵۵۔ فاما الذين كفروا فاعذبهم عذابا شديدا في الدنيا والاخرة وما لهم من ناصرين

ان لوگوں کو جو کفر کرتے ہیں۔ سخت عذاب دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دُونگا۔ اور اُن کا کوئی مددگار بھی نہیں ہوگا۔ یہودیوں کی حالت خدا کے اس کلام کی صداقت کی کیسی پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے۔ باوجود دولتمند قوم ہونے کے ہمیشہ طرح طرح کے دکھوں میں ہی یہ لوگ مبتلا رہے۔ اور کوئی ان کا یار و مددگار نہ ہوا +

۵۶

۴۵۶۔ واما الذين امنوا وعملوا الصلحت فيوفيهم اجورهم والله لا يحب الظالمين ۝

اور جو لوگ ایمان لائے۔ اور اُنھوں نے عمل صالح کیئے ان کے اجر ان کو پورے پورے دُونگا۔ اور ظالموں سے اللہ تعالےٰ محبت نہیں کرتا۔ اس آیت میں مسیح کے ماننے والے دو گروہوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اوّل مسلمانوں کا ذکر ہے۔ الذين امنوا وعملوا الصلحت۔ وُہ ایمان بھی صحیح رکھتے ہیں۔ اور

اللہ تعالےٰ نے مجھے حکم دیا ہے۔ کہ اگر تم دلائل کو نہ مانو تو تم سے مباہلہ کروں تو انھوں نے کہا ہم اس بارہ میں مشورہ کر کے جواب دیں گے۔ پھر جب اُنھوں نے باہم مشورہ کیا تو ان کے سردار عبدالمسیح نے یہ مشورہ دیا۔ کہ تم مباہلہ منظور نہ کرو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔ گویا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا اثر ان کے دلوں پر ہو چکا تھا۔ سو اُنھوں نے مباہلہ سے بھی انکار کر دیا۔ پس ایک طرف اگر دلائل حقہ کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ناحق پر پایا تو دوسری طرف دعا کے مقابلہ میں بھی صریح عاجزی کا اظہار کیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے یہ علم دیا تھا۔ کہ عیسےٰ پرستی کا عقیدہ دنیا میں بہت زور پکڑنے والا ہے۔ اسی لیئے اس کے خلاف ہر رنگ سے اتمام حجّت کی طرز بتائی۔ اوّل دلائل کے رو سے اور پھر دعا کے رو سے اور جب ان دونوں باتوں سے انھوں نے مُونھ موڑ لیا۔ تو ایک تیسرے امر کی طرف ان کو توجہ دلائی جس کا ذکر اگلے رکوُع میں آتا ہے۔ مگر ان دونوں باتوں سے انکار پر فرمایا کہ یہ مفسد ہیں جو زمین میں غلط عقائد کو پھیلا کر فساد پھیلانا چاہتے ہیں *

رکوع ۱۵
آیت ۶۴

۴۵۹۔ قل یاھل الکتٰب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ۔ اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوائے کسی کی عبادت نہ کریں۔ جیسا کہ پچھلے رکوع کے آخر میں بیان کیا تھا۔ جب دلائل اور دُعا دونوں طرح اتمام حجّت ہو چکا۔ اور دلائل کے قبول کرنے سے اُنھوں نے انکار کیا۔ اور دُعا میں مقابلہ سے خائف ہوئے تو اب ان پر ایک اور رنگ میں اتمام حجّت کیا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تمہارے اور ہمارے مذہب میں جو امر مشترک ہے۔ اس کو دونوں بنیاد کے طور پر مان لیں تو بہت سا فساد مٹ جاتا ہے۔ ایک عیسائیت کیا جملہ مذاہب پر اسلام کی یہ حجّت قائم ہے۔ کہ اگر سب مذاہب میں امر مشترک کو نکالا جائے تو وہ اسلام کا مذہب ہے۔ اور اسلیئے کسی مذہب کا پیرو بھی اسلام کی حقانیت کا انکار نہیں کر سکتا۔ ایک رنگ میں سب قومیں ہی اہل کتاب ہیں۔ گو مخصوص طور پر یہود یا عیسائیوں کو اہل کتاب کے نام سے پکارا گیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ہر قوم میں ہم نے رسول بھیجا۔ پس اس رسول کی تعلیم ہی اس قوم کی کتاب ہے۔ اب اگر دُنیا کی ساری قوموں کے معتقدات اور ساری مذہبی کتابوں کو دیکھا جائے تو ذات باری کے عقیدہ میں جو امر مشترک ان میں پایا جاتا ہے وہ ایک خدا کی ہستی ہے۔ حتےٰ کہ کتب مقدسہ کے پیروؤں کو چھوڑ کر بت پرستوں تک کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ کہ ان کے بتوں سے اوپر ایک خدائے واحد ہے۔ اور بت بھی اسی کے دربار تک پُہنچانے والے ہیں ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی۔ پس تمام مذاہب دنیا میں اگر امر مشترک تلاش کیا جائے۔ تو وہ خدائے واحد کی پرستش کا عقیدہ ہے۔ پھر ہر قوم نے اس خدائے ذوالجلال کے نیچے اپنے لیئے طرح طرح کے خدا تجویز کر لیئے۔ کہیں رامچندر اور کرشن ہیں تو کہیں مسیح۔ پس اللہ تعالیٰ مذاہب میں فیصلہ کے لیئے ایک سیدھی راہ بتاتا ہے۔ کہ سب مذاہب میں امر مشترک کو لے لو۔ اسی کو

کے ساتھ مخصوص امر نہیں۔ بلکہ ہر فرد بشر کو اللہ تعالےٰ مٹی سے ہی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ سورہ کہف میں مومن اور کافر کے مکالمہ میں مومن کافر کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔ اکفرت بالذی خلقک من تراب ثم من نطفۃ ثم سوٰک رجلا۔ تو اس ذات پاک کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے۔ پھر تجھے ٹھیک مرد بنایا۔ ایسا ہی سورہ الحج میں فرمایا یایھا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقنٰکم من تراب۔ اے لوگو اگر تم بعث کے بارے میں شک میں ہو تو غور کرو کہ ہم نے تمکو مٹی سے پیدا کیا پس مٹی سے ہی سب نوع بشر پیدا ہوئی ہے۔ ہاں پھر بعض کو اللہ تعالےٰ چن لیتا ہے۔ اور ایک روحانی زندگی عطاء فرماتا ہے۔ بن باپ پیدائش کا نہ یہاں کوئی ذکر ہے۔ نہ کوئی ایسا اعتراض موجود ہے جس کا جواب دیا ہو۔ کیونکہ اس کا ذکر اگر ہوتا تو وہاں ہوتا جہاں پیدائش کے حالات کا ذکر تھا۔ یہاں تو حضرت عیسےٰ کی وفات کے تذکرہ کے ساتھ ساری بحث کو ختم کرکے اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے جیسا کہ اگلی آیت سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے۔ جہاں فرمایا الحق من ربک۔ حق اور اصلی بات یہی ہے جو اللہ تعالےٰ نے بیان کی ہے +

۶۰ ۵۸۔ فمن حاجک فیہ من بعد ما جاءک من العلم فقل تعالوا ندع ابناءنا وابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتھل فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ جب دلائل کے رو سے اتمام حجت کر دیا۔ مگر دلائل کو قبول کرنے سے عیسائیوں نے انکار کر دیا۔ تو پھر مباہلہ کے لیئے بلایا۔ یہ گویا ایک دُوسرے رنگ کا اتمام حجت ان پر تھا۔ یعنی اتمام حجت بذریعۂ دُعا۔ دُعا کی قبولیت کے قائل عیسائی بھی ہیں اور اس بات کے بھی قائل ہیں کہ جتنا کوئی شخص زیادہ مقبول بارگاہ الٰہی ہوتا ہے۔ اسی قدر اس کی دعا بھی زیادہ سنی جاتی ہے چنانچہ عبرانیوں باب ۵ درس ۷ میں جہاں مسیح کے صلیب کی موت سے بچائے جانے کے لیئے رو رو کر دعائیں کرنے کا ذکر ہے "بہت رو رو اور آنسو بہا بہا کے اس سے جو اس کو موت سے بچا سکتا تھا۔ دعائیں اور منتیں کیں" وہاں اس دعا کی قبولیت کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔ وسمع لہ من اجل تقواہ یعنی اس کے تقوٰے کی وجہ سے اسکی دعا قبول کی گئی۔ پس چونکہ متقی کی دعا کا سنا جانا ایک مسلم امر فریقین میں تھا۔ اس لیئے اب اس پہلو سے اتمام حجت کرتا ہے۔ کہ چونکہ تم کو یہ دعوٰے ہے کہ مسیح کو ابن اللہ مان کر تم خدا کے برگزیدے بن گئے ہو اس لیئے آؤ دونوں فریق مل کر دعا کریں کہ اللہ تعالےٰ اس فریق پر جو جھوٹ اختیار کر رہا ہے اپنی لعنت وارد کرے۔ یہاں لفظ نبتھل کا استعمال فرمایا ہے۔ جو ابتہال سے ہے جس کے معنے الاجتھاد فی الدعاء کے ہیں یعنی گڑگڑا کر دعا کرنا۔ چنانچہ راغب میں ہے۔ الابتھال فی الدعاء الاسترسال فیہ والتضرع۔ ابتہال کے معنے میں لعنت کا مفہوم نہیں ہے جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو وفد نجران کے سامنے پیش کیا۔ اور فرمایا کہ

۷۱ ایک حصہ پر ایمان لے آؤ اور ایک حصہ کا انکار کردو۔ اسی قسم کی چالبازیاں اب بھی کی جاتی ہیں بعض عیسائی یہ جتانے کے لیئے کہ ہم بڑے انصاف پسند ہیں اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیئے یُوں کہہ دیتے ہیں کہ بیشک پہلے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم صداقت پر تھے۔ اور محض عرب کو بت پرستی سے نکالنا چاہتے تھے لیکن بعد میں دنیوی اغراض مل گئیں اور ایک نیا دین بنا لیا گیا۔ اور جنگوں میں ناحق کا کشت و خون ہوا۔ یہ اسی قسم کی چالبازی ہے جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں موجود ہے۔ دین اسلام شروع سے ایک ہی تھا اور ایک ہی رہا۔ دنیوی اغراض سے ذات مقدس نبوی کا دامن ہمیشہ پاک رہا۔ بادشاہ بن کر بھی نہ آپ نے اپنی حکومت جتائی نہ دنیوی مال و زر یا آسائش کی طرف توجہ کی۔ اور اگر مدافعت کے لیئے تلوار اذن الہٰی سے آپ نے نہ اُٹھائی ہوتی تو دین اسلام کو ظالم مخالف تباہ ہی کر ڈالتے۔ اور دُنیا پر ایک ایسی تاریکی چھائی رہتی جس سے یہ کبھی باہر نہ نکل سکتی۔ آجکل پادریوں کی ایک اور چالبازی بھی ہے کہ جھوٹے قصّوں کے طور پر ایک عیسائی اور ایک مسلمان کا مکالمہ شائع کر دیتے ہیں جسمیں مسلمان کے مونہہ میں کمزور دلائل ڈال کر مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی صداقت پر شبہات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ غرض حق کے مقابل چالبازیوں سے کام اہل کتاب پہلے بھی لیتے رہے۔ اب بھی لیتے ہیں انہی چالبازیوں سے کہ دوست بنکر دشمن کا کام کرتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے +

۷۲ ۴۶۲۔ ولا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم ۔ اور ایمان نہ لاؤ۔ مگر اسی پر جو تمہارے دین کا پیرو ہو یعنی حقیقی ایمان تمہارا صرف اسی نبی پر ہو جو شریعت اسرائیلی کا پیرو ہو۔ ایمان کا صلہ لام بھی آتا ہے جیسے فاٰمن لہ لوط میں یعنی لوط اس پر ایمان لایا۔ یا اٰمنتم لہ قبل ان اٰذن لکم (طٰہٰ) یعنی فرعون نے ساحروں کو کہا کہ تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں۔ اور دوسرے مقام پر انہی الفاظ کو یوں فرمایا اٰمنتم بہ قبل ان اٰذن لکم (الاعراف) پس جب ایک طرف بعض لوگوں کو اس چالبازی کے لیئے تیار کیا۔ کہ وُہ جھوٹے طور پر ایمان کا اظہار کر کے پھر انکار کر دیں۔ تو دوسری طرف اپنے پیروؤں کو یہ بھی کہدیا کہ تم صرف ایسے نبی کو مانو جو تمہاری شریعت کا پیرو ہو۔ اور اسطرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے روکا +

۴۶۳۔ قل ان الھدیٰ ھدی اللہ ان یؤتیٰ احد مثل ما اوتیتم او یحاجوکم عند ربکم کہدو کہ (کامل) ہدایت اللہ کی ہدایت ہے۔ وہ یہ کہ دیا جائے کسی کو مثل اس کے جو تم کو دیا گیا یا وہ جھگڑا کریں گے تم سے تمہارے رب کے نزدیک۔ یہ جواب ہے اس کا جو اہل کتاب نے کہا تھا۔ کہ تم صرف ایسے نبی کو مانو جو تمہاری شریعت کا پیرو ہو۔ جیسا کہ پچھلے نوٹ میں ذکر ہے۔ اسکا جواب یہ دیا کہ یہ ضروری ہے کہ جو تم کو دیا گیا اس کی مثل کسی اور کو دیا جائے۔ اور اس مثل کے لفظ میں اشارہ ہے استثناء کی اس پیشگوئی کی طرف جس میں حضرت موسےٰ نے اپنی مثل ایک نبی کے ظاہر ہونے کی پیشگوئی کی تھی۔

آیت ۶۳

کلمۃ سواء فرمایا ہے۔ تو یہ امر مشترک یہی ہوگا۔ کہ صرف ایک خدا کی پرستش کی جائے۔ اس کلمۃ سواء میں درحقیقت مقابلۂ مذاہب کے عظیم الشان اصول کی طرف دنیا کو توجہ دلائی ہے۔ اور گویا یہ اشارہ فرمایا ہے۔ کہ جب اور کسی راہ سے نہ مانیں تو پھر مقابلہ مذاہب کا اصول پیش کرو اور امر مشترک کو بطور ایک بنیادی اصول کے مان کر آگے چلو تو اس سے بھی اسلام کی صداقت ہی نکلے گی +

یٰاھل الکتاب تعالوا۔ الآیہ یہ وہ الفاظ ہیں جن الفاظ میں صلح حدیبیہ کے زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ھرقل کو مخاطب فرمایا تھا۔ جس چٹھی کا فوٹو اب شائع ہو چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ آیات سنہ ۶ ہجری سے پہلے کی نازل شدہ ہیں۔ اس واقعہ سے حدیث کی صداقت پر بڑی بھاری شہادت ملتی ہے

۶۴

۴۶۰۔ لم تحاجون فی ابراھیم۔ حضرت ابراہیم کے بارہ میں کیوں جھگڑتے ہو۔ حضرت ابراہیم کا ذکر بھی اسی اصول کے لحاظ سے کیا جس کا اوپر ذکر ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم کا وجود بھی چاروں قوموں مشرکین عرب۔ یہودیوں۔ عیسائیوں اور مسلمانوں میں بطور ایک امر مشترک کے تھا۔ کہ چاروں آپ کی بزرگی کو مانتے تھے۔ گویا یہ بتایا ہے کہ توریت اور انجیل تو حضرت ابراہیم کے بعد کی کتابیں ہیں۔ اصل الاصول وہ ہے جس پر حضرت ابراہیم بھی قائم تھے۔ اور وہ وہی خدائے واحد کی عبادت ہے۔ اسی لیئے آیت نمبر ۶۷ میں فرمایا ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین آمنوا۔ کیونکہ یہ نبی اور مومن اس اصل الاصول یعنی خدائے واحد کی عبادت پر قائم ہیں۔ حالانکہ تم لوگ طرح طرح کی افراط و تفریط میں پڑ گئے ہو۔ اور خدائے واحد کی عبادت کے ساتھ کسی نے اپنے احبار اور کسی نے اپنے مسیح کی عبادت کو ملا لیا ہے +

رکوع ۱۵ ع

آیت ۷۱

۴۶۱۔ وقالت طائفۃ من اھل الکتاب آمنوا بالذی انزل علی الذین آمنوا وجہ النہار واکفروا آخرہ لعلھم یرجعون۔ اور اہل کتاب کے ایک گروہ نے کہا کہ مان لو اس کو جو اتارا گیا ہے ان لوگوں پر جو ایمان لائے پہلے حصہ دن میں اور انکار کر دو اس کے آخر تاکہ وہ لوٹ آئیں یہ یہودیوں کی چالبازیوں میں سے ایک چالبازی تھی۔ کیونکہ وہ ہر وقت مسلمانوں کو گمراہ کرنیکے درپے رہتے تھے۔ جیساکہ آیت ۶۸ میں بھی فرمایا ودت طائفۃ من اھل الکتاب لو یضلونکم اہل کتاب میں سے کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تم کو گمراہ کر دیں۔ جب دلائل کے مقابلہ سے یہ لوگ عاجز آگئے اور دین اسلام روز بروز قوت پکڑتا چلا گیا۔ تو انھوں نے بالمقابل طرح طرح کی چالبازیاں اختیار کیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ پہلے نبی کریم صلعم پر ایمان لانے کا اظہار کریں اور بعد میں کہدیں۔ کہ ہم نے اس دین کو دیکھ لیا یہ تو جھوٹا ہے اس لیئے ہم اب انکار کرتے ہیں۔ وجہ النہار سے مراد یہ بھی لی گئی ہے کہ نفاق کے رنگ میں ایسا کرو۔ یعنی صرف دکھانے کو اور آخرہ سے اس صورت میں یہ مراد ہوگی کہ دوسرے وقت جیساکہ فرمایا اذا خلا بعضھم الی بعض۔ اور یہ بھی معنے لیئے گئے ہیں کہ

(بقیہ نوٹ ۴۶۳)

توپھر وہ یعنی مسلمان رب کے نزدیک حجت میں تم پر غالب ہیں۔ کیونکہ ان کے ہاتھ میں پیشگوئی ہے۔ جس کا پورا نہ ہونا خود حضرت موسےٰ کی صداقت پر شبہ پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح پیشگوئیوں کے ذکر میں ہی سورہ بقرہ میں فرمایا تھا۔ اتحدثونھم بما فتح اللہ علیکم لیحاجوکم بہ عند ربکم یعنی یہودیوں کے بڑے بڑے سرداران کو کہتے تھے۔ کہ کیا تم مسلمانوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں یعنی وہ پیشگوئیاں جو تم کو معلوم ہیں۔ تم مسلمانوں کو بتاتے ہو۔ تاکہ تمہارے رب کے نزدیک ان پیشگوئیوں کے ذریعہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔ یعنی جب ان کو ان پیشگوئیوں کا علم ہو جائیگا۔ تو پھر ان کی حجت غالب رہے گی (۲-۷۶) اسی غلبۂ حجت کی طرف یہاں اشارہ ہے۔ کہ اگر شریعت موسوی کی طرح ایک دوسری شریعت نازل نہ ہو تو پیشگوئی کی وجہ سے مسلمانوں کی حجت تم پر غالب ہے +

اس کے بعد جو الفاظ آتے ہیں قل ان الفضل بید اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ واسع علیم یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔ کہدو کہ فضل اللہ کے ہاتھ میں ہی وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اللہ فراخی والا جاننے والا ہے۔ اپنی رحمت کے لیئے جس کو چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ یہ الفاظ بھی بنی اسرائیل کے اسی اعتراض کا جواب ہیں۔ کہ ہم صرف بنی اسرائیلی نبیوں پر ایمان لائیں گے۔ کیونکہ فرماتا ہے کہ اس فضل کا عطاء فرمانا جو نبوت کی صورت میں ملتا ہے۔ اور ایک موہبت الٰہی ہے۔ کسی خاص قوم کے اندر محدود نہیں ہو سکتا۔ بعینہ ایسے الفاظ ایسے ہی ایک اعتراض کے جواب میں سورہ بقرہ میں فرمائے۔ مایود الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم واللہ یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم (۲: ۱۰۵) اہل کتاب میں سے کافر اور مشرک اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ تم (مسلمانوں) پر تمہارے رب کی طرف سے خیر (یعنی وحی الٰہی) نازل کی جائے۔ اور اللہ اپنی رحمت کے لیئے جس کو چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ دونوں مقاموں کا مقابلہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا۔ کہ وہی اعتراض ہے اور وہی جواب۔ اس طرح یہ دونوں سورتیں ایک دوسرے کے مضامین اور معانی پر روشنی ڈالتی ہیں +

۴۶۴۔ ومن اھل الکتاب من ان تامنہ بقنطار یؤدہ الیک ومنھم من ان تامنہ بدینار لا یؤدہ الیک الا مادمت علیہ قائما۔ اور اہل کتاب میں سے وہ بھی ہے۔ کہ اگر اس کے پاس ایک ڈھیر زر نقد کا امانت رکھو تو وہ اُسے تمہارے حوالے کردیگا۔ اور ان میں سے وہ بھی ہے۔ کہ اگر اس کے پاس ایک دینار امانت رکھو تو وہ بھی تمہیں واپس ادا نہ کرے۔ مگر جب تک کہ اس کے سر پر کھڑے رہو۔ قرآن کریم نے ہر مذہب و ملت کے ساتھ انصاف پسندی کا معاملہ کیا ہے۔ کسی کی اچھی چیز کا انکار نہیں کیا۔ اور نہ بلاوجہ کسی کو بُرا کہا ہے۔ اسی طرح اپنے پیرووں کو بھی ہدائیت دی ہے۔ کہ بلا تفریق مذہب و ملت۔ قوم و رنگ

جیسا کہ استثنےٰ ۱۸/۱۵ میں ہے۔ یقیم لک الرب الٰھک نبیا من وسطک من اخوتک مثلی لہ تسمعون۔ یعنی تیرا رب تیرے درمیان تیرے بھائیوں میں سے میری مثل ایک نبی کو کھڑا کرے گا اس کی بات کو تم نے سُننا ہوگا۔ ایسا ہی استثناء ۱۸/۱۸ میں ہے۔ اقیم لھم نبیا وسط اخوتھم مثلک واجعل کلامی فی فمہ فیکلمھم بکل ما اوصیہ بہ۔ یعنی میں انکے لئے ان کے بھائیوں کو درمیان سے تیری مثل ایک نبی کو کھڑا کروں گا۔ اور اپنا کلام اس کے مُونھ میں ڈالوں گا۔ سو جو کچھ میں اسکو حکم کروں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ اب یہاں دوبار بنی اسرائیل کے لئے بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ایک نبی کے کھڑا کیئے جانے کی پیشگوئی ہے جو موسےٰ کی مثل ہو۔ اور جب وُہ آجائے تو پھر موسےٰ کی شریعت عملدرآمد کے قابل نہیں رہے گی۔ کیونکہ پھر حکم ہے لہ تسمعون۔ اس کی بات تم نے سننی ہوگی اب ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائی کا لفظ بنی اسمٰعیل پر صادق آتا ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم کے دو بیٹوں اسحاق اور اسمٰعیل کے متعلق کہ ان کو برکت دیجائیگی۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم سے وعدہ کیا تھا۔ حضرت موسےٰ نے درحقیقت اسی وعدہ کا اعادہ کیا ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل میں تو شریعت کی بنیاد حضرت موسیٰ کے ساتھ رکھدی گئی۔ بنی اسمٰعیل والا وعدہ باقی تھا۔ اس لیئے حضرت موسےٰ کی پیشگوئی میں بار بار تیرے بھائیوں کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اب یہ موسےٰ کی مثل نبی کا کھڑا کیا جانا سوائے اسکے کیا معنے رکھتا ہے کہ جس طرح ایک شریعت بنی اسرائیل کو موسےٰ کے ذریعہ سے دی گئی۔ اسی طرح ایک شریعت بنی اسمٰعیل میں سے ایک نبی کے ذریعہ سے دنیا کو دیجائے۔ یوں تو بنی اسرائیل میں نبی بہت ہوئے مگر موسےٰ کی مثل ہونے کا کسی نے دعوےٰ نہ کیا۔ حتیٰ کہ حضرت مسیح نے بھی نہیں کیا۔ اور نہ بنی اسرائیل کا کوئی نبی جو شریعت موسوی کا پیرو ہو ایسا دعوےٰ کر سکتا تھا۔ کیونکہ نہ صرف وہ نبی بنی اسمٰعیل سے ہونا چاہیئے۔ بلکہ پیشگوئی کے مطابق یہ بھی ضروری تھا۔ کہ اسے حضرت موسےٰ کی مثل ایک شریعت دیجائے کیونکہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کی خصوصیت جو آپ کو بنی اسرائیل کے کل انبیاء میں ممتاز کرتی ہے۔ وہ یہی ہے کہ آپ ایک جدید اور مستقل شریعت لائے۔ اس لیئے پیشگوئی میں موسےٰ کی مثل کا لفظ بار بار لانے سے سوائے اس کے کچھ منشا نہیں ہو سکتا۔ کہ وہ نبی بھی ایک جدید اور مستقل شریعت لانے والا ہو۔ اس لیئے قرآن کریم بنی اسرائیل کے اس اعتراض کے جواب میں کہ ہم اسی نبی کو مانیں گے جو ہماری شریعت کا پیرو ہو۔ اس پیشگوئی کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ کہ اس کے مطابق تو یہ ضروری ہے۔ کہ جو شریعت تم کو موسےٰ کے ذریعہ سے دی گئی ویسی ہی شریعت کسی اور کو دیجائے۔ تم اصرار کرتے ہو کہ ہم اپنی ہی شریعت کے پیرو نبیوں کو مانیں گے۔ حالانکہ حضرت موسےٰ کی پیش گوئی اس امر کی مقتضی ہے کہ اس جیسی ایک اور شریعت بھیجی جائے۔ پس تم اپنے اقرار میں غلطی پر ہو +

او یحاجوکم عند ربکم۔ اگر حضرت موسےٰ کی مثل دوسرا نبی کھڑا نہ ہو اور ایک اور شریعت نازل نہ ہو

۷۶ کر دیتا ہے۔ اور مومن کو یہ نعمت اس دنیا میں مل جاتی ہے ۔

۷۷ ۴۷۶۔ یلوٗن السنتھم بالکتٰب۔ سورہ بقرہ میں فرمایا فویل للذین یکتبون الکتٰب بایدیھم ثم یقولون ھٰذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنًا قلیلا (۲: ۷۹) افسوس ہے ان لوگوں پر جو اپنے ہاتھوں سے ایک تحریر لکھ لیتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ تاکہ اس (کارروائی) کے عوض تھوڑا مول لے لیں۔ یعنی دُنیا کمانے کے لیئے آپ ہی کچھ لکھ کر اسے کتاب اللہ بتاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی مراد ہے۔ راغب میں ہے لوی لسانہ بکذا کنایۃ عن الکذب وتخرص الحدیث یعنی لوی لسانہ بکذا کنایہ ہے۔ جھوٹ بولنے سے اور بات کے بنا لینے سے۔ اور لویت عنہ الخبر سے مراد ہے۔ اخبرتہ بہ علی غیر وجھہ۔ یعنی جو کچھ بات تھی اسکے خلاف خبر دی۔ اللو اور اللی عربی زبان میں جھُوٹ کے معنے میں آتے ہیں جیسے الحی اور المحی سچ کے معنے میں اور کہتے ہیں فلان لا یعرف الحو من اللو یعنی وہ شخص سچ کو جھوٹ سے نہیں پہچانتا پس یلوٗن السنتھم بالکتاب کے معنے ہوئے۔ کہ جھوٹ طور پر کتاب کو پڑھتے ہیں اور اسکی تصریح خود ہی فرمادی لتحسبوہ من الکتاب وما ھو من الکتاب انکی اس طرح پڑھنے سے غرض یہ ہوتی ہے کہ تم اسکو کتاب میں سے سمجھو۔ حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے یعنی وہ کوئی عبارت پڑھتے ہیں جو توریت میں سے نہیں۔ مگر انکی غرض یہ ظاہر کرنا ہوتی ہے۔ کہ وہ گویا توریت کو پڑھ رہے ہیں۔ پس جس طرح سورہ بقرہ میں لکھنے کے متعلق فرمایا تھا۔ کہ اپنے ہاتھوں سے لکھ کر اسے کتاب اللہ بتاتے ہیں۔ یہاں پڑھنے کے متعلق فرمایا۔ کہ ایسی طرح پر پڑھتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ سمجھی جائے۔ حالانکہ وُہ کتاب اللہ نہیں۔ اور آخری الفاظ یقولون علی اللہ الکذب اللہ پر جھوٹ افترا کرتے ہیں۔ اس بات کی تصریح کرتے ہیں۔ کہ یہودی اپنی طرف سے کچھ عبارتیں ساتھ ملا دیا کرتے تھے۔ یہ تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے یہوٗدیوں کا حال ہے۔ مگر توریت کے ساتھ یہ معاملہ مدت سے ہو رہا تھا اور اس لیئے کتاب اللہ محفوظ نہ رہی تھی ۔

۷۸ ۴۷۷۔ ماکان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتٰب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ۔ اصل کلام ابتک عیسائیوں کے ساتھ ہی چلا آتا ہے۔ گو درمیان میں کہیں کہیں یہودی بھی مخاطب ہو جاتے ہیں۔ پس حضرت مسیح کی طرف خدائی منسُوب کرنے والوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ ایک بشر جس میں بشریت کے سب لوازمات پائے جاتے ہوں۔ جیسے حضرت مسیح میں پائے جاتے تھے اس کے لیئے یہ کہاں شایاں ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ تو اسے کتاب اور فہم اور نبوّت دے۔ پھر وہ لوگوں کو کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ حضرت مسیح کو اللہ تعالیٰ نے کتاب اور فہم اور نبوت سب کچھ دیا تھا۔ پس یہ کہاں ہو سکتا تھا کہ انھوں نے خدا ئے واحد کی عبادت چھڑا کر اپنی عبادت کرائی ہو۔

۴۷۸۔ ربانیین۔ ربی اور ربانی ایک ہی معنے رکھتے ہیں۔ بخاری میں ہے الربانی الذی یربی الناس بصغار العلوم قبل کبارہ۔ یعنی وہ جو لوگوں کی تربیت کرتا ہے علوم کی سہل باتوں سے بڑی باتوں سے

(بقیہ نوٹ نمبر ۴۶۴)

ہر ایک کے ساتھ نیکی اور انصاف کا معاملہ کرو۔ ہر قوم میں اچھے لوگ بھی ہیں۔ پس ایک مسلمان کو کسی قوم کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ یہاں دینی معاملات یعنی پیشگوئیوں کا ذکر کرتے ہوئے دنیوی معاملات میں کھرے کھوٹے کا ذکر کرکے یہ بتایا ہے کہ جو لوگ دنیوی معاملات میں اور پیسے روپے کی امانت میں کھوٹے ہیں۔ ان سے دینی معاملات میں اور پیشگوئیوں کی امانت میں کھرے ہونے کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ ہاں مایوسی کی بات نہیں۔ اچھے لوگ بھی ان میں ہیں۔ سو ایسے لوگ آہستہ آہستہ اسلام میں شامل ہو گئے دنیوی اور دینی معاملات میں یکساں انصاف کے معاملہ کی ضرورت ہے۔ اس سے آگے چل کر بھی توجہ دلائی ہے۔ جہاں فرمایا۔ بلیٰ من اوفی بعھدہ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ عہد کسی کے بھی ساتھ ہو پورا کرنا چاہیئے۔ اور پھر معاً رُوحانیت کی طرف انتقال کرکے فرمایا ان الذین یشترون بعھد اللہ وایمانھم ثمناً قلیلا۔ جب انسان کے ساتھ عہد کا پورا کرنا بھی ایسا ضروری ہے۔ تو پھر جو شخص خدا کے عہد کو تھوڑی بات پر بیچ دیتا ہے وہ کیسا ظالم ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب مشرکین سے اس بنا پر بدمعاملگی کرنا جائز سمجھتے تھے۔ کہ ان کے معاملہ میں ہم اچھا کریں یا بُرا۔ ہم پر الزام نہیں۔ جیسا کہ خود قرآن کریم نے اس سے آگے چلکر بتایا ہے ذٰلک بانھم قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل۔ یعنی امانت کو اس لیئے نہیں دیتے۔ کہ کہتے ہیں ان امیوں (یعنی عرب کے اَن پڑھ لوگوں) کے بارے میں ہم پر کوئی الزام نہیں۔ اسلام اس کے خلاف تعلیم دیتا ہے۔ کوئی مشرک ہو یا جاہل ہو کسی مذہب کا پیرو ہو۔ ہر ایک سے معاملہ میں یکساں انصاف چاہیئے۔ اور عہد کا ایفاء بھی ہر ایک کے ساتھ بلاتمیز مذہب و ملت ضروری ہے۔ جیسا کہ بلیٰ من اوفی بعھدہ میں صاف ارشاد فرمایا +

۷۷

۴۶۵۔ ولا یکلمھم اللہ ولا ینظر الیھم یوم القیامۃ ولا یزکیھم۔ اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا اس بات کی علامت ہے کہ ایک شخص کو اللہ تعالیٰ کے دربار میں رسائی حاصل ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کی پروا نہیں کرتے۔ وہ اس قابل نہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ اُن سے کلام کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک اور نیک لوگوں سے کلام بھی کرتا ہے۔ قیامت کے دن ان کی طرف نظر نہ کرنے سے مراد یہ ہے۔ کہ رحم اور محبّت کی نگہ اُن پر نہ ڈالے گا اور ان کی طرف نظر شفقت نہ کرے گا۔ ورنہ اللہ تعالیٰ سب کو دیکھتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ۔ وہ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہونگے۔ اِس لیئے اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر شفقت سے دیکھے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے عہد کی خلاف ورزی کرنے والے اور اس کی پروا نہ کرنے والے اس نعمت سے محرُوم رہیں گے۔ جو جنّت کی سب سے اعلیٰ نعمت ہے۔ پھر یہ بھی فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ ان کا تزکیہ نہیں کرتا۔ یعنی ان کو گناہوں سے پاک نہیں کرتا اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہوں پر چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو گناہوں سے پاک

صلے اللہ علیہ وسلم ہوئے۔ گو بعض دوسرے نبی بھی جو آپ سے پہلے آچکے اس کے اندر شامل ہو گئے +

آپ ہیں اصل معنے اس آیت کے بتاتا ہوں۔ جیسا کہ قرآن کریم نے بار بار ذکر فرمایا ہے۔ اللہ تعالے نے ہر ایک قوم میں اور ہر ایک اُمت میں ایک رسول مبعوث کیا۔ یا بعض قوموں میں ایک سے زیادہ رسول بھی مبعوث کیئے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ جس قدر رسول آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے آتے رہے۔ یہ سب خاص خاص قوموں کی طرف آتے رہے۔ کل دنیا کی طرف مبعوث ہونا یہ صرف ایک ہی رسول کے لیئے مخصوص رکھا گیا۔ جو سب سے آخر اور سب کو ایک دین پر جمع کرنے کے لیئے آیا۔ تو چونکہ اس رسول نے ساری قوموں کو ایک دین پر جمع کرنا تھا۔ اس لیئے اللہ تعالے نے ساری قوموں سے بذریعہ اُن کے نبیوں کے یہ عہد لیا کہ جب وہ رسول آجائے تو تم سب نے اس کے دین پر چلنا ہوگا۔ کیونکہ اصل غرض یہی تھی کہ نسل انسانی کے اندر سے قومیت کی تفریقوں کو مٹایا جائے۔ اور سب کو بھائی بھائی بنایا جائے۔ مگر مختلف قوموں میں مختلف نبیوں کے آنے سے قومی امتیاز ایک حد تک مضبوط ہوتے چلے گئے۔ کیونکہ ہر قوم ہدایت کے لیئے اپنے ہی نبی کو دیکھتی تھی اور اس کو دوسری قوم کے نبی کی تعلیم سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور چونکہ تعلقات بین الاقوام بھی اُس وقت نہ تھے۔ سب قومیں اپنے اپنے ملکوں میں علیحدہ علیحدہ پڑی ہوئی تھیں۔ اس لیئے ان حالات کا اقتضاء بھی یہی تھا۔ کہ ہر قوم کے اندر جدا جدا نبی مبعوث ہو۔ مگر یہ علیحدگی جو ملکوں اور قومیتوں کی حدبندی سے پیدا ہوئی۔ ہمیشہ کے لیئے رہنے والی نہ تھی۔ اس لیئے یہ ضروری ہؤا کہ جب وہ وقت آجائے کہ تعلقات بین الاقوام کی راہیں کھل جائیں تو قومی رسولوں کی بجائے ایک ہی رسول ساری دنیا کی طرف مبعوث ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی رسول دُنیا میں ہؤا۔ جس نے علی الاعلان بار بار کہا۔ کہ میں کل عالمین کی طرف آیا ہوں۔ اور جس کے متعلق ارشاد ہؤا کہ ہمنے تم کو کافۃ للناس بھیجا ہے۔ جس نے قومیتوں کی ساری تفریقوں کو مٹایا اور نسل انسانی کو وہ حکم خداوندی سنایا جو ان کو بھائی بھائی بنانے والا تھا۔ یا ایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ و جعلنٰکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمکو شاخیں اور قبیلے بنایا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو سب سے متقی ہے۔ تو چونکہ اس رسول نے سب قوموں کو دین واحد پر جمع کرنا تھا۔ اس لیئے سب قوموں سے یہ عہد لیا گیا۔ کہ تم نے اس رسول پر ایمان لانا اور اس کی نصرت کرنی ہوگی۔ اور یہ عہد ہر ایک قوم سے بذریعہ اُن کے نبی کے لیا گیا یہی وہ مضمون ہے جس کو اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو ایک حدیث میں آیا ہے انا اوّل النبیین خلقا و اٰخرھم بعثا۔ کیونکہ اگر آپ اول النبیین خلقا نہ ہوتے تو آپ کے متعلق ہر نبی سے وعدہ کس طرح لیا جاتا۔ اور بعثت میں آخری اس لیئے ہوئے۔ کہ تا کل نبیوں سے آپ کے متعلق عہد لیا جائے اور آپ بھی کل کی تصدیق کریں +

بقیہ نوٹ ۱۴۹

آیت ۷۸

پہلے۔ یا ربانی علم اور دین میں راسخ لوگ کہتے ہیں حضرت علیؓ نے فرمایا انا ربانی ھذہ الامۃ میں اس امت کا ربانی ہوں۔ اور جب حضرت ابن عباس فوت ہوئے۔ تو ابن حنفیہ نے کہا۔ مات ربانی ھذہ الامۃ۔ اس اُمّت کا ربانی فوت ہو گیا۔ مفردات راغب میں ہے کہ ربانی وہ ہے جو اپنے نفس کی تربیت علم کے ساتھ کرتا ہے۔ من رب نفسہ بالعلم یا الذی یَرُبّ العلم یعنی جو علم کو بڑھاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے آنے کی اصل غرض یہ ہے۔ کہ لوگوں کو علوم کی طرف متوجہ کریں۔ اور ابن عباس نے ربانیون کے معنے کیئے ہیں حلماء۔ علماء۔ فقہاء

رکوع ۹ آیت ۸۰

۷۹۔ واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما اٰتیتکم من کتٰب وحکمۃ ثم جاءکم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ۔ اس آیت کے معنے پر بحث کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ سورہ آل عمران کے شروع سے جو بحث عیسائی مذہب کے اصولوں پر قرآن کریم نے شروع کی تھی۔ اس کا خاتمہ پچھلے رکوع کی آخری آیات سے کر دیا ہے۔ جہاں فرمایا۔ کہ انبیاء کا یہ کام نہیں ہوتا کہ وہ اپنے لیئے خدائی کی پیڑی جمائیں۔ بلکہ وہ لوگوں کو ربّانی بناتے ہیں نہ وہ یہ تعلیم دیتے ہیں کہ فرشتوں کو اور نبیوں کو خدا بناؤ۔ اس کے ساتھ گویا اس بحث کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اور اب اسلام کے متعلق ذکر شروع فرمایا ہے۔ اور اس رکوع میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ محمد رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم سب نبیوں کے موعود ہونے کے لحاظ سے اوّل النبیّین اور بعثت میں آخری نبی ہیں۔ اور اس سے اگلے رکوع میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ خانہ کعبہ سب سے پہلا خدا کا معبد ہے۔ جو زمین پر مقرر کیا گیا۔ اور وہ آخری معبد بھی ہے۔ اس لحاظ سے کہ اس کی خیر و برکت دائمی ہے۔ اور کبھی منقطع نہ ہوگی۔ گویا یہ دونوں رکوع اسلام کی کمال عظمت کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ اس بات پر کہ رسول مصدق جس کے آنے کا یہاں ذکر ہے۔ اس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ قریبًا قریبًا اُمّت کا اتفاق ہے۔ صرف سعید بن جبیر اور حسن اور طاؤس کے نزدیک یہ آیت عام ہے۔ مگر باقی تمام مفسّرین کا اس پر اتفاق ہے۔ کہ یہ صرف نبی کریم صلّے اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے۔ اور جیسا کہ میں دکھا چکا ہوں یہی حق بھی ہے۔ کیونکہ یہاں سے ذکر اسلام اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا شروع ہوتا ہے۔

حضرت سعید بن جبیر نے جو معنے اس آیت کے کیئے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہر نبی اپنے سے پیچھے ایک نبی کے آنے کی خبر دے جاتا ہے۔ سو جب وہ دوسرا نبی آجاتا ہے تو اُس وقت اُسی کا اتباع ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً حضرت نوحؑ کے بعد ابراہیم آگئے تو انہی کا اتباع ضروری ہو گیا۔ پھر حضرت موسےٰ آگئے تو انہی کا اتباع ضروری ہو گیا۔ حضرت عیسےٰ آگئے تو انہی کا اتباع ضروری ہو گیا۔ اور سب سے آخر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم آگئے تو انہی کا اتباع ضروری ہو گیا۔ اور چونکہ نبی کریم صلّے اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو تا قیامت کوئی چیز منقطع کرنے والی نہیں۔ اس لیئے ان معنوں کے لحاظ سے بھی اصل مصداق اس آیت کا حضرت محمد مصطفےٰ

۸۰ فرمایا۔ الم یؤخذ علیھم میثاق الکتب یعنی کیا نہیں لیا گیا اُن سے عہد کتاب کا جس سے مراد ہے وہ عہد جو کتاب میں مذکور ہے۔ یا بالفاظ دیگر جو بذریعہ کتاب کے لیا گیا۔ پس میثاق النبیین سے مراد جیسا کہ اکثر مفسرین نے لی یہی ہے المیثاق الذی وثقہ الانبیاء علی اممھم۔ یعنی وہ عہد جو مضبوط کیا انبیاء نے اپنی امتوں سے۔ گویا اللہ تعالےٰ انبیاء کی وساطت سے وہ عہد امتوں سے لیتا ہے۔

حضرت مسیح کے حواریوں نے بھی اس بات کی شہادت دی ہے۔ کہ وہ نبی مثل موسےٰ جس کی پیش گوئی استثناء ۱۸-۱۵ و ۱۸ میں ہے اس کے متعلق دُنیا کے کل نبیوں نے شہادت دی ہے۔ چنانچہ اعمال رسل باب ۳۔ آیت ۲۱ میں ہے "ضرور ہے کہ آسمان اسے لیئے رہے۔ اس وقت تک کہ سب چیزیں جنکا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آویں۔ کیونکہ موسےٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیئے ایک نبی میری مانند اٹھاوے گا جو کچھ وہ تمھیں کہے اس کی سب سنو" اس سے صاف معلوم ہے کہ حضرت مسیح کے بعد تک اس پیشگوئی کا انتظار تھا۔ اور دنیا میں ایک ہی شخص ہؤا ہے جس نے یہ دعوےٰ کیا۔ کہ میں وہ نبی ہوں جس کی بابت کل نبیوں نے خبر دی تھی۔ اور جس طرح اس کی خبر سب نبیوں نے دی۔ اسی طرح اس نے سب نبیوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا +

۸۴ ۴۸۰- ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ من الخسرین یہاں صاف بتا دیا۔ کہ اسلام کے سوائے دوسرا دین قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسلام سے مراد وہی دین ہے۔ جو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم لائے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالےٰ کا کامل فرمانبردار ہو۔ یہ آیت ان لوگوں کے لیئے کافی جواب ہے جو یہ کہدیا کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے نجات کو اسلام میں محدود نہیں کیا قرآن کریم دوسرے مذاہب میں صداقت کا انکار نہیں کرتا۔ مگر ساتھ ہی اس بات کی بار بار تصریح فرماتا ہے۔ کہ کامل نجات کی راہیں صرف محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہی کھلتی ہیں۔ اور درحقیقت جو سب مذاہب سب نبیوں پر ایمان ضروری قرار دیتا ہو۔ اس کو چھوڑنے والے سے بڑھکر خسران میں کون ہے۔

۸۶ ۴۸۱- اولئک جزاؤھم ان علیھم لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین ○- ان لعنتوں کی طرف اشارہ ہے جو حضرت موسےٰ کی پیشگوئی میں پائی جاتی ہیں۔ دیکھو نوٹ نمبر ۲۸۰ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے انکار سے ڈرایا ہے کہ اگر انکار کروگے تو اللہ تعالےٰ سے بھی دور کیئے جاؤگے جو چشمۂ قدوسیت ہے۔ اور ملائکہ سے بھی جو نیکیوں کے محرک ہیں۔ اور آخر لوگ بھی نفرت کریں گے اور آیت نمبر ۸۷ میں فرمایا خالدین فیھا۔ گویا یہاں اس لعنت کو ہی دوزخ قرار دیا۔ اور پھر اسی کو عذاب فرمایا

۸۹ ۴۸۲- ان الذین کفروا بعد ایمانھم ثم ازدادوا کفرا لن تقبل توبتھم۔ جو لوگ ایمان لائے پیچھے پھر کفر کرتے ہیں۔ پھر کفر میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی۔ انکا ایمان

اس رسول کی سب سے بڑی علامت جو یہاں بتائی وہ یہ ہے کہ وہ مصدق لما معکم ہے۔ یعنی اسکی تصدیق کرتا ہے جو پہلی قوموں کے پاس ہے۔ یہ ایک امتیازی نشان ہے جو رسول عربی فداہ امی وابی میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہی ایک رسول ہے جس نے اپنے سے پہلے دُنیا کے تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔ چنانچہ اس کا ذکر قرآن کریم میں بار بار ہے۔ ابتدائے قرآن میں ہی فرمایا۔ یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک۔ جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا۔ اس سب پر ایمان لاتے ہیں۔ اور پھر بار بار فرمایا لا نفرق بین احد من رسلہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں بھی اس رسول مصدّق کی اس امتیازی نشان کا ذکر فوراً کر دیا۔ جیسا کہ آیت ۸۳ میں فرمایا۔ قل اٰمنا باللہ وما انزل علینا وما انزل علی ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسےٰ وعیسٰے والنبیّون من ربھم لا نفرق بین احد منھم۔ کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو اتارا گیا ہم پر اور اس پر جو اتارا گیا ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور قبیلوں پر اور اس پر جو دیا گیا موسےٰ اور عیسےٰ اور سب نبیوں کو اپنے رب کی طرف سے ہم ان میں سے کسی میں بھی تفرقہ نہیں کرتے۔ پس یہاں درحقیقت بتا دیا ہے۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم دنیا کے کل نبیوں کی تصدیق فرماتے ہیں۔ اور اس طرح پر قرآن نے خود ہی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ رسول مصدق لما معکم سے کیا مراد ہے۔ کیونکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی دُنیا میں ایک رسول ہوا ہے۔ جس نے دُنیا کے کل نبیوں کی تصدیق کی ہے۔ اور ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے ❊

پس النبیین سے مراد دُنیا کے وُہ کل نبی ہیں۔ جو الگ الگ قوموں کیطرف مبعوث ہوئے۔ اور رسول مصدّق سے مراد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اب ہم آیت کی لفظی ترکیب کو لیتے ہیں۔ کیونکہ اس ساری بحث میں ہم نے مختلف قوموں اور امتوں سے عہد لینے کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں فرمایا میثاق النبیین امام رازی کہتے ہیں المراد ان الانبیاء کانوا یأخذون المیثاق من اممھم بانہ اذا بعث محمد فانہ یجب علیھم ان یومنوا بہ وان ینصروہ وھذا قول کثیر من العلماء۔ یعنی مراد یہ ہے کہ نبی اپنی اُمتوں سے عہد لیا کرتے تھے۔ کہ جب محمد صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوں تو ان پر واجب ہے کہ آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی نصرت کریں اور یہ کثرت سے علماء کا قول ہے۔ اس توجیہہ کی وجہ ظاہر ہے۔ نبیوں نے تو اس وقت تک زندہ نہ رہنا تھا۔ جب تک کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم دنیا میں ظاہر ہوں اس لئے میثاق النبیین سے مراد وہ عہد نہیں ہو سکتا جو نبیوں سے لیا گیا ہو۔ بلکہ چونکہ اصل تعلق اس بات کا ان کی امتوں سے تھا اس لئے نبیوں کے عہد سے مراد نبیوں کا عہد اپنی امتوں سے یا نبیوں کے ذریعہ عہد امتوں سے ہے۔ اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے میثاقہ الذی واثقکم بہ میں میثاقہ سے مراد وہ عہد ہے جو خدا نے لیا۔ حالانکہ لفظی معنے یوں ہونگے۔ اس کا یعنی خدا کا عہد ایسا ہی

۹۲ .... ذالك جزينٰهم ببغيهم اور یہودیوں پر ہم نے ناخن والے جانوروں کو حرام کر دیا تھا۔ یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی تھی (الانعام ۔۱۴۷) کتب آسمانی کے محاورہ میں بعض جگہ مؤرث اعلےٰ کا نام قوم کی بجائے استعمال ہو جاتا ہے ۔ گویا ان کا اپنے اوپر حرام کر لینا ہی تھا۔ کہ انھوں نے نافرمانیاں کیں ۔ اس لئے بعض چیزیں جن میں اونٹ کا گوشت وغیرہ تھا ان پر حرام کر دیا گیا تاکہ کینہ وری اور سرکشی کا مادہ ان میں اور ترقی نہ کرے ۔ یا ان پر اونٹ کی حرمت میں یہ حکمت تھی کہ چالیس سال بیابان میں گذارنے تھے ۔ جہاں اونٹ نے ہی ان کو کام دینا تھا ؞

۹۴ ۴۸۶۔ فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفا۔ ابراہیم نے بھی کامل فرمانبرداری کا نمونہ دکھایا۔ یہاں پھر اصول کی طرف متوجہ کیا کہ اصل الاصول تو یہ ہے کہ شرک کو چھوڑو۔ اور خالص توحید پر قائم ہو جاؤ۔ اب ابراہیم کے ذکر کے ساتھ خانہ کعبہ کا ذکر فرماتا ہے ؞

۹۵ ۴۸۷۔ ان اوّل بيت وضع للناس للذى ببكة مباركا وهدى للعٰلمين۔ سب سے پہلا گھر جو لوگوں کیلئے مقرر کیا گیا وہی ہے ۔ جو مکہ میں ہے برکت دیا گیا اور ہدایت سب قوموں کے لئے یہ دین اسلام کا دوسرا امتیازی نشان ہے کہ اس کا مرکز اس گھر کو قرار دیا گیا جو اس عالم پر توحید الٰہی کا سب سے پہلا نشان ہے بکہ اور مکہ ایک ہی ہیں ۔ مکہ معظمہ کا نام بکہ رکھے جانے کے کئی وجوہ بیان کیئے گئے ہیں ۔ بعض کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ وہاں کثرت سے جمع ہوتے اور ایک دوسرے کو دھکیلتے ہیں ۔ جیسے کہ محمد بن علی الباقر اور مجاہد اور قتادہ کا قول ہے ۔ سميت مكة بكة لانهم يتباكون فيها اى يزدحمون فى الطواف ۔ ایک اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ سميت بكة لانها تبك اعناق الجبابرة لا يريدها جبار بسوء الا اندقت عنقه ۔ یعنی اسے بکہ اس لئے کہا گیا ہے کہ بڑے بڑے سرکشوں کی گردنوں کو پست کر دیتا ہے ۔ کوئی سرکش برے ارادے سے اس پر چڑھ کر نہیں آتا ۔ مگر اس کی گردن توڑ دیجاتی ہے ۔ چنانچہ اسی لئے مکہ کا ایک نام الحاطمہ بھی ہے ۔ یعنے جو شخص اس کا استخفاف کرنے کا ارادہ کرتا ہے ۔ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے ۔ ایک مشہور نام مکہ کا ام القرٰی بھی ہے ۔ جو قرآن کریم میں بھی وارد ہوا ہے ۔ جس کے معنے ہیں بستیوں کی ماں یعنی جس کی چھاتیوں سے ساری زمین توحید الٰہی اور دین حق کا دودھ چوسے گی یہی ساری دنیا کا حقیقی مرکز ہے ۔ اسی وجہ سے مفسرین نے اسے زمین کا مرکز بھی کہا ہے جس سے مراد یہی ہے کہ وہ روحانی مرکز ہے ۔ ساری دنیا اسی ہدایت کے سرچشمہ سے سیراب ہوگی ۔ اسلام کے امتیازی کمالات میں سے یہ بات ہے کہ اس مذہب سے تعلق رکھنے والا ہر ایک لفظ آپ ہی اپنی حقیقت ظاہر کرتا ہے خود لفظ اسلام مذہب کی اصل غرض و غایت کو بتاتا ہے ۔ پھر اسکا رسول اس کی کتاب سب ایک حقیقت کو ظاہر کرنے والے ہیں ۔ حتیٰ کہ وہ مقام جہاں سے یہ پاک سرچشمہ پھوٹ کر نکلا ۔ وہ بھی اپنے معنی میں ہی اپنی اصلی حقیقت کو بتاتا ہے ؞

آیت ۸۹

لانا ان کی توبہ تھی۔ گویا اُنھوں نے اقرار کیا تھا کہ اب بدی کی راہوں پر نہ چلیں گے۔ مگر پھر منکر ہو گئے۔ اور منکر بھی ایسے کہ کفر میں ہی ترقی کرتے چلے گئے۔ ان کی توبہ کس کام کی اور قبول کس طرح ہو۔ توبہ کی قبولیت کے لیئے تو ضروری ہے۔ کہ انسان اصلاح کی راہ کو اختیار کرے۔ اور بدی کی راہوں سے قطعًا متنفر ہو +

# الجزء الرابع

رکوع ۱ آیت ۹۱

۴۸۳۔ لن تنالوا البر حتّٰی تنفقوا مما تحبّون۔ تم نیکی کو ہرگز نہیں پا سکتے۔ جب تک کہ اس سے خرچ نہ کرو جس سے تم محبّت کرتے ہو۔ اس میں یہ اصُول بتایا ہے۔ کہ انسان اپنی محبوب چیزوں کو خدا کے لیئے قربان کرنا سیکھے۔ کیونکہ جب تک انسان محبوب سے محبُوب چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لیئے تیار نہیں وہ حقیقی راستبازی کے مقام سے دُور پڑا ہوُا ہے۔ قلب مبارک نبوی پر تو یہ پاک کلام اترا ہی تھا۔ اور اس سے آپ کے قلب کی تیاری کا پتہ ملتا ہے۔ آپ کے قلب کی اپنی کیفیت تو وہ تھی جس کا ذکر ایک حدیث میں ان الفاظ میں آتا ہے لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل میں محبّت رکھتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں مارا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں پھر مارا جاؤں لیکن اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اللہ کی راہ میں اپنی سب محبوب چیزوں کو قربان کر چکے تھے۔ وہ مسلمان کہلانے والے جو ادنےٰ چیز کو بھی خدا کی راہ میں قربان نہیں کر سکتے۔ غور کریں کہ اسلام کے حقیقی مفہوم سے وہ کتنی دور پڑے ہوئے ہیں +

۹۲

۴۸۴۔ کل الطعام کان حلا لبنی اسرائیل۔ ہر قسم کا کھانا بنی اسرائیل کے لئے حلال تھا۔ یہ دراصل یہودیوں کے اس اعتراض کا جواب ہے جو وہ مسلمانوں پر کرتے تھے۔ کہ توریت میں تو اونٹ کا گوشت حرام ہے تم اونٹ کا گوشت کھاتے ہو۔ پس کل الطعام سے وہ کھانے کی چیزیں مراد ہیں جو مسلمانوں کے لیئے حلال ٹھیرائی گئی تھیں۔ اسلام کی تعلیم تو بار بار ان کو اصول دین کی طرف متوجہ کرتی تھی۔ مگر جیسا کہ کج بحث آدمیوں کا قاعدہ ہوتا ہے وہ چھوٹے چھوٹے فروعی امور کو بار بار درمیان میں لاتے تھے۔

۴۸۵۔ الا ما حرم اسرائیل علی نفسہ من قبل ان تنزل التوریٰۃ۔ اس سے مراد عمومًا یہ لی گئی ہے کہ بعض چیزیں اسرائیل یعنی حضرت یعقوب نے اپنے اوپر حرام کر لی تھیں۔ جس کی وجہ کوئی بیماری بتائی جاتی ہے۔ ایک اور توجیہہ ان الفاظ کی یہ ہوسکتی ہے۔ کہ دُوسری جگہ قرآن کریم میں ان چیزوں کا جو مسُلمانوں پر حرام کی گئی تھیں۔ ذکر کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وعلی الذین ھادوا حرمنا کل ذی ظفر

کے نام کی یادگار صرف اسی گھر کے ساتھ ہے جہاں مقام ابراہیم واقع ہے جس کے لئے دیکھو نوٹ ۱۹۵۔ عرب کے لوگ بت پرست تھے اور ناخواندہ تھے۔ دوسرے ملکوں اور لوگوں سے اُن کے کوئی تعلقات نہ تھے۔ مگر حضرت ابراہیم کے نام کا تعلق خانہ کعبہ کے ساتھ بھی ایک ایسے زمانہ سے چلا آتا ہے۔ جس کی تاریخ کوئی حدبندی نہیں کر سکتی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے حضرت ابراہیم ہوئے تب سے ہی یہ مقام بھی وہاں مشہور ہو گیا جس کا نام مقام ابراہیم ہے ورنہ عرب کے بت پرستوں کو کیا ضرورت تھی کہ ایک موحدوں کے سردار کا نام خانہ کعبہ میں قائم کرتے۔

پس ایک طرف مقام ابراہیم کا خانہ کعبہ کے اندر ہونا اور دوسری طرف اس قسم کی کسی ابراہیمی یادگار کا نام بیت المقدس یا دوسرے کسی مقدس مقام کے ساتھ نہ پایا جانا یہ دونوں اس بات پر شاہد ہیں کہ یہی حقیقی بیت اللہ حضرت ابراہیم والا ہے۔ اور جس طرح ظاہر میں مقام ابراہیم کو خانہ کعبہ کے ساتھ مخصوص کیا۔ اسی طرح روحانی مقام ابراہیم جو کامل فرمانبرداری ہے اور جس کا ذکر اذ قال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العلمين میں ہے۔ وہ بھی خانہ کعبہ کے نام کے ساتھ ہی مخصوص ہوا۔ کیونکہ گو سب انبیاء کا مذہب اسلام ہی تھا۔ مگر دنیا میں ایک اسی مذہب کا نام اسلام قائم رہا جس کا تعلق خانہ کعبہ سے ہے یعنی وہ مذہب جو نبی عربی حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم دنیا میں لائے۔

دوسرا کھلا نشان خانہ کعبہ کے متعلق یہ ہے کہ من دخله کان اٰمنا یعنی یہ ایک امن کا مقام ہے۔ یہ بھی خصوصیت ساری دنیا میں صرف خانہ کعبہ کو ہی حاصل ہے کہ وہ امن کا مقام ہے۔ حدیث میں ہے۔ الا وانها لم تحل لاحد قبلی ولا تحل لاحد بعدی الا وانها حلت لی ساعة من نهار الا وانها ساعتی هذه حرام لا يختلى شوكها ولا يعضد شجرها ولا تلتقط ساقطتها الا لمنشد۔ سن رکھو کہ مکہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں ہوا (یعنی ہمیشہ مقام حرمت رہا ہے) اور نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال ہوگا۔ (یعنی تاقیامت مقام حرمت رہے گا) اور وہ میرے لئے بھی صرف دن کی ایک گھڑی حلال ہوا (یعنی وہ وقت جب فتح مکہ کے وقت آپ اس میں داخل ہوئے ہیں) سن رکھو کہ وہ اس وقت سے حرمت کا مقام ہے نہ اُس کے کانٹے کاٹے جائیں گے نہ اس کے درخت قطع کیئے جائیں گے نہ اس کی گری ہوئی چیز اٹھائی جائے گی۔ مگر اس شخص کے لیئے جو اس کے (اصل مالک کو) پہنچا نیوالا ہو مکہ کی حدود کے اندر کسی قسم کا جنگ جائز نہیں۔ یعنی ان حدود کے اندر اس کے اندر جنگ کرنا منع ہے۔ اور یہ حرمت اس کی عرب کے اندر ابتدا سے اللہ تعالےٰ نے ایسی محکم رکھی تھی۔ کہ عرب جیسی جنگجو قوم جنکا شغل ہی دن رات جنگ کرنا تھا۔ اور جہاں قبیلہ قبیلہ کے ساتھ اور قوم قوم کے ساتھ ہر وقت برسرپیکار تھے اس قوم میں بھی مکہ کے حدود کے اندر کسی کی طاقت نہیں تھی کہ تلوار کو نیام سے باہر نکال سکے۔ پھر ایک حدیث میں مکہ کی حرمت کے متعلق یہ لفظ بھی آئے ہیں کہ اس کے اندر نہ دجال داخل ہوگا۔ اور نہ

اس مبارک مقام میں جو دُنیا کی ہدایت کا اصل مرکز ہے۔ وہ پاک گھر ہے جس کا نام البیت۔ بیت اللہ البیت العتیق۔ البیت المحرم۔ اول بیت۔ کعبہ ہے۔ یہاں اس کو اول بیت کے نام سے یاد فرمایا اس لئے کہ ابھی پچھلے رکوع میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس امتیازی نشان کا ذکر فرمایا تھا۔ کہ سب نبی آپ کے متعلق اپنی اپنی امت کو وعدہ دیتے چلے آئے۔ اور آپ پر ایمان لانے کا عہد لیتے چلے آئے گویا ایک معنی میں آپ اول النبیین تھے۔ اسی لئے اول بیت کو آپ کا قبلہ قرار دیا گیا۔ اسکے سب سے پہلا گھر ہونے پر نوٹ ۱۹۵ میں شہادت بیان کی جاچکی ہے۔ حضرت ابراہیم اس کے پہلے بنانے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ دوسری جگہ قرآن کریم میں صاف طور پر حضرت ابراہیم کے یہ لفظ ہیں۔ جب انھوں نے حضرت اسمٰعیل کو اس مقام کے قریب چھوڑا ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم۔ اے ہمارے رب میں نے اپنی نسل کے ایک حصّہ کو ایک ایسے بیابان میں چھوڑا ہے جسمیں کھیتی بھی کوئی نہیں۔ وُہ تیرے معزز گھر کے نزدیک ہے۔ گویا یہ بیت محرم پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اور حضرت ابراہیم نے حکم الٰہی کے ماتحت حضرت اسمٰعیل کو یہاں چھوڑا تھا تاکہ وہ محض اللہ کے فضل پر وہاں نشو ونماء پائیں۔ گویا یہ ایک نشان تھا اور حضرت ابراہیم کا حضرت ہاجرہ کو الگ کرنا ایک خاص منشائے الٰہی کے ماتحت تھا اور اس بیابان کو غیر ذی زرع فرما کر یہ اشارہ کیا کہ وہاں کوئی ایسی چیز نہیں جو دنیا کیلئے باعث کشش ہو سکے صرف ایک اللہ کا نام ہے جو یہاں لوگوں کو کھینچکر لائیگا تاکہ اسکی خالص توحید کے ہر ایک قسم کی آمیزش سے پاک ہونیکا یہ نشان ہو۔ اور جسطرح اس گھر کو اوّل بیت کہا ہے اسی طرح لفظ مبارک میں یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ خاتم النبیین کا یہ قبلہ خدا کی عبادت کا آخری گھر بھی ہے۔ کیونکہ مبارک کے معنے ہیں جسکی خیر و برکت کبھی منقطع نہ ہو اور دائمی ہو گویا جسطرح پہلے قبلے ایک وقت کیلئے تھے اور آخر انکی خیر و برکت ایکوقت آکر منقطع ہونیوالی تھی۔ یہ صورت اس پاک گھر کی نہ ہو گی۔ کیونکہ اس نے دنیا کی ساری بستیوں کا مرکز بننا تھا۔ اسکے بعد اور کوئی عبادتگاہ خدا کی اس دُنیا پر قائم نہ ہو گی۔ اور تاریخ خود اسپر شاہد ہے کہ اسکے بعد کوئی مقام اس قسم کا مرکز دنیا میں نہیں بنا۔ ھدی للعٰلمین کے لفظ میں انہی مطالب کی تصریح فرمادی کہ یہاں سے ہدایت ملے گی۔ اور وہ ہدایت عرب کے لیئے نہیں بلکہ دُنیا کی کل قوموں کے لیئے ہو گی ؀

۹۶ ۴۸۸۔ فیہ ایٰت بینٰت مقام ابراھیم ومن دخلہ کان امنا وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا۔ اس میں کھلے کھلے نشان ہیں مقام ابراہیم اور جو کوئی اس میں داخل ہو گا وہ امن پا لینے والا ہو گا۔ اور لوگوں کے لئے جو اس تک پہنچنے کا مقدور رکھتے ہوں اللہ کے لیئے اس گھر کا حج کرنا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں تو خانہ کعبہ اور مکہ معظمہ کے امتیازات اور اس کی برکات کا ذکر کیا۔ یہاں اسی گھر کے متعلق تین اور کھلے نشانوں کا ذکر فرمایا ہے جو اس کی عظمت کو ہمیشہ کے لیئے دنیا میں ثابت کرتے رہیں گے۔ ان میں سے پہلا نشان یہ ہے۔ کہ وہاں مقام ابراہیم ہے۔ اسکی ذکر سے اہل کتاب اور اُن کے ذریعہ سے تمام دُنیا پر اتمام حجت ہے کہ وہ مقدس گھر جس کا ذکر بیت ایل یا بیت اللہ کے نام سے توریت میں آتا ہے۔ وہ حقیقت میں یہی مقدس مقام تھا۔ کیونکہ دُنیا میں ابراہیم

کرتوتوں پر گواہ ہے۔ یعنی اپنے کیئے کا نتیجہ پالیں گے +

۹۸

۴۹۰۔ لم تصدون عن سبیل اللّٰہ من اٰمن۔ معلوم ہوا کہ اہل کتاب کے انکار سے مراد صرف نہ ماننا ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ ان لوگوں کو جو ایمان لاتے یا ایمان لانا چاہتے خدا کی راہ سے روکتے تھے۔ اسی لیئے اگلی آیت میں اہل کتاب کی ان کرتوتوں کی وجہ سے مسلمانوں کو متنبہ کیا۔ اور فرمایا کہ ان کی باتوں پر چلو گے تو تمھیں ایمان لائے پیچھے بھی کافر بنادیں گے۔ ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کفرین +

تبغونہا عوجاً۔ اہل کتاب اپنی بیہودہ گوئی سے ایک سیدھے سادے دین میں خواہ مخواہ کی کجیاں پیدا کرتے تا مسلمانوں کے دلوں میں اس کی طرف سے وسوسے پیدا کریں۔ یہی شیوہ آج بھی انھوں نے اختیار کر رکھا ہے +

رکوع ۱۱ آیت ۱۰۱

۴۹۱۔ اتقوا اللّٰہ حق تقتہ۔ اسلام کے کمالات اور امتیازی نشانوں کا ذکر کرکے اب مسلمانوں کو راہ بتاتا ہے۔ کہ وہ دنیا میں کیونکر ایک کامیاب قوم بن سکتے ہیں۔ سب سے پہلی ضرورت کامیابی کی تقوی اللّٰہ بتائی۔ مگر نرا مونھ کا تقوی نہیں بلکہ عملی رنگ میں تقوی۔ ایسا تقوی جیسا کہ حق ہے۔ ایک بھوکے کو اگر غذا اس کی بھوک کی ضرورت سے بہت کم ملے یا بیمار کو مناسب مقدار میں دوائی نہ ملے تو بھوک یا بیماری کی شدت رفع نہیں ہوتی۔ بیشک مسلمانوں کی کامیابیوں کا انحصار تقوی اللّٰہ پر ہے۔ مگر ایسا تقوی ہو جو تقوی اللّٰہ کا حق ہے۔ دوسری جگہ فرمایا فاتقوا اللّٰہ ما استطعتم۔ تقوی اللّٰہ کے اختیار کرنے میں جہاں تک تمہارا زور ہے لگاؤ۔ جس کام کے لیئے پورا زور خرچ نہ کیا جائے۔ اسمیں کامیابی کی امید نہیں ہو سکتی +

اس سے آگے فرمایا ولا تموتن الا وانتم مسلمون۔ موت تم پر نہ آئے۔ مگر اس حال میں کہ تم مسلم (فرمانبردار) ہو۔ اس میں تقوی کی حقیقت کو بھی ظاہر کر دیا۔ کہ اللّٰہ تعالے چاہتا ہے کہ تم اس کے کامل طور پر فرمانبردار رہو۔ چونکہ موت کا وقت تو انسان کو معلوم نہیں۔ اس لیئے موت کا ذکر کرکے دو باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اگر انسان اس بات کو یاد رکھے کہ اس پر موت آنے والی ہے۔ اور یہ دنیا اور اسکے سارے سامان یہیں رکھے کے رکھے رہ جائیں گے۔ تو چھوٹی چھوٹی خواہشات اور دنیا کی لذات کی محبت اللّٰہ تعالے کی فرمانبرداری میں حائل نہیں ہو سکتیں۔ اور دوسرے یہ کہ ہر حال میں فرمانبردار رہو ایسا نہ ہو کہ موت تم کو آلے اور اس وقت تمہاری حالت فرمانبرداری کی نہ ہو +

۱۰۲

۴۹۲۔ واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعا ولا تفرقوا۔ سب کے سب اللّٰہ کے رسے کو مضبوط پکڑلو اور پراگندہ نہ ہو جاؤ۔ ایک ایک فرد کی کامیابی کوئی کامیابی نہیں ہوتی جس طرح جسم انسانی میں صرف ایک حصہ کا نمو پذیر ہونا اور باقی کا نشوونما نہ پانا درحقیقت ایک بیماری ہے نہ ترقی۔ اسی طرح قوم میں چند افراد کا بزعم خود کوئی کامیابی حاصل کر لینا کوئی کامیابی نہیں۔ وہ عظیم الشان برکات جو دنیا میں ایک قوم کو کامیاب

آیت ۹۶

طاعون۔ یہ امن اس مقدس سرزمین میں کیوں رکھا گیا۔ اور کیوں ساری دنیا میں یہ ایک ہی جگہ اس امن کے لیئے مخصوص ہوئی۔ اور دنیا کے کسی کونہ میں صلح جو اور امن پسند قوموں کو یہ خیال نہ سوجھا۔ درحقیقت یہ قوم کا خیال نہ تھا بلکہ اللہ تعالٰے نے ایک جنگجو قوم کے اندر اپنی طاقت اور قدرت کا ایک نشان رکھا ہوا تھا کس لیئے ہتا کہ یہ ایک نشان ہو اس روحانی امن و امان کا جس کا جھنڈا اس مقام پر بلند ہو کر دنیا کی کل قوموں میں صلح و اتحاد اور اخوت کی بنیاد رکھی جانی تھی۔ پس یہ دوسرا کھلا نشان ہے۔ جو اس گھر کو عطاء کیا گیا +

تیسرا نشان ان الفاظ میں مذکور ہے ولله على الناس حج البيت۔ لوگوں کے لیئے (من استطاع اليه سبيلا کی شرط کے ماتحت) اللہ کے لیئے اس مقدس گھر کا حج کرنا ضروری ٹھیرایا گیا ہے۔ زیارتیں تو اور مقاموں کی بھی ہوتی ہیں۔ پھر مکہ معظمہ میں کیا خصوصیت ہے۔ بات یہ ہے۔ کہ ہر ایک مقدس مقام پر کوئی نہ کوئی زمانہ ابتلا کا بھی آجاتا رہا ہے۔ بیت المقدس کو کس شان و شوکت کے ساتھ سلیمان علیہ السلام نے بنایا۔ مگر تھوڑا ہی عرصہ بعد اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ حج اور زیارت کہاں کی اسی طرح پر دنیا کے کل مقدس مقامات ایک نہ ایک وقت اپنے مخالفوں کے ہاتھ میں پڑ کر تباہ و برباد ہو گئے ہیں تو اس کے قیام کی طرف اشارہ فرمایا۔ کہ یہ نہ صرف ہمیشہ کے لیئے قائم رہے گا۔ بلکہ اس کا حج بھی لوگ ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ گویا کسی وقت یہ اپنے مخالفوں کے ہاتھ میں نہ پڑے گا۔ اور یہ خصوصیت بھی ایسی ہے کہ اللہ تعالٰے نے اس کو شروع سے قائم رکھا ہے۔ چنانچہ جب خانہ کعبہ کے اندر بت بھی تھے اور اس کے متولی مشرکانہ عقاید رکھتے تھے۔ اس وقت بھی جب ایک عیسائی بادشاہ نے اس پر چڑھائی کی اور اس کو تباہ کر کے اس کے حج اور زیارت سے لوگوں کو روکنا چاہا۔ اور اس وقت اسکے متولیوں میں اس بادشاہ کی فوجوں سے مقابلہ کی کچھ بھی طاقت نہ تھی۔ تو اللہ تعالٰے نے غیب سے کچھ ایسے سامان پیدا کر دیئے۔ کہ وہ بادشاہ مع اپنی ساری فوج کے تباہ ہو گیا اور خانہ کعبہ محفوظ کا محفوظ رہا۔ اور اس کے حج اور زیارت میں تھوڑی دیر کے لیئے بھی وقفہ نہ ہونے دیا۔ اور یہ بھی اللہ تعالٰے کی قدرت کا ایک نشان ہے۔ کہ ایک عالمگیر جنگ کے اندر بھی جب خود وہ سلطنت بھی جنگ میں مبتلا ہے۔ جو اس مقام پر حکمران ہے۔ خانہ کعبہ کا حج نہیں رکا۔ یہ حج بھی ایک نشان ہے اس بات کا کہ لوگ ہمیشہ اس مقام سے متمتع ہوتے رہیں گے۔ اور اس کے روحانی فواید کو روکنے والی دنیا میں کوئی چیز نہ ہوگی اور اس کے ذریعہ سے لوگ اپنی روحانی منازل کے آخری مقام پر پہنچتے رہیں گے +

۴۸۹۔ لم تكفرون بايت الله۔ جب ایسے کھلے کھلے نشان بھی بتا دیئے گئے۔ پھر بھی اہل کتاب کا انکار کرنا کس قدر ظلم ہے۔ سو اُن کو یہ سمجھا کر کہ اب تو انکار چھوڑ دو۔ کیونکہ ان نشانوں کو تو موٹی سے موٹی نظر بھی دیکھ سکتی ہے۔ آخر فرمایا کہ اگر پھر بھی انکار اور تکذیب کو نہیں چھوڑیں گے۔ تو اللہ اُن کی

۹۷

مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے موجود ہے ۔

۹۴- ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر واولئک ھم المفلحون - اور چاہیئے کہ تم میں ایک ایسا گروہ موجود رہے جو خیر کی طرف بلاتے رہیں اور اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں - یہ کامیابی کا تیسرا اصول ہے اور اسکے ساتھ المفلحون کا لفظ لگا کر یہ بتا دیا ہے کہ حقیقی کامیابی اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکے گی -

ان امور میں سب سے پہلی بات دعوت الی الخیر ہے - اور اس سے مراد درحقیقت دعوت الی الاسلام ہے - کیونکہ دوسری جگہ فرمایا مایود الذین کفروا من اھل الکتب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم جہاں منزل من اللہ یعنی قرآن کریم کو خیر کہا ہے - اور چونکہ خیر کے معنے بھلائی ہیں - اور حقیقی بھلائی کی سب راہیں قرآن کریم میں ہی ہیں - اس لیئے ارشاد الٰہی یہاں یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ہمیشہ ایسی موجود رہے جو دعوت الی الاسلام کے کام میں لگی رہے - ابتدائے اسلام کا زمانہ تو وہ تھا کہ ہر ایک مسلمان کے اندر ایک ایسی روح دعوت الی الاسلام کی پھونک دی گئی تھی کہ وہ سب کے سب ہی داعیان اسلام تھے - اور اس جوش اور تڑپ کو لیکر وہ دنیا کے مختلف ممالک اور مختلف شہروں اور جزیروں میں نکل گئے اور تھوڑے ہی سالوں میں دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا یعنی اسلام کا نام دنیا کے دور دور کے ملکوں میں روشن کر دیا - افغانستان میں چین میں ہندوستان میں جزائر میں افریقہ میں ایران ترکستان شام میں غرض ہر ملک اور ہر شہر میں اسلام کا جھنڈا لگا دیا - پھر بعد اس کے ایک ایسا زمانہ آیا کہ بادشاہوں اور امراء کی توجہ دعوت الی الاسلام کی طرف سے کم ہو کر وہ تو اپنے تعیشات میں گرفتار بلا ہو گئے - علماء کی توجہ بھی زیادہ تر اپنے فروعی اختلافات میں صرف ہونے لگی پھر بھی بہت سے خدا کے بندے ان تمام جھگڑوں سے الگ ہو کر دعوت الی الاسلام کے کام میں لگے رہے - بہت سے وہ بزرگ جن کے ناموں پر آج ہزارہا لوگ قربان ہوتے ہیں - ان کی یہ عزت محض اسلام کی خدمتگذاری سے ہوئی - وہ درحقیقت روحانی بادشاہ تھے - اور جب دنیوی بادشاہوں نے دعوت الی الاسلام کے کام کو چھوڑ دیا تو ان روحانی بادشاہوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا - مگر یہ کس قدر افسوسناک نظارہ ہے کہ آج ان داعیان اسلام کی گدیاں محض دنیا کے چند پیسے کمانے کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں اور ہر ایک گدی جس میں ہزاروں اور لاکھوں کی آمد ہے - وہ چند لوگوں کے پیٹ بھرنے یا ان کے تعیش کا سامان پیدا کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہے اور نہ صرف دنیا کی محبت اور دنیوی جھگڑوں میں ہی گرفتار بلا ہو رہی ہے بلکہ طرح طرح کے بدعادات میں مبتلا ہو کر خود مسلمانوں کو چاہ ضلالت میں گرا رہی ہے اور دعوت الی الاسلام کا وہاں نام بھی نہیں - کاش ان گدیوں کی آمد کا دسواں حصہ بھی مسلمان دعوت الی الاسلام پر خرچ کرتے تو مسلمانوں کی قوم اس مردگی کی حالت کو نہ پہنچتی - کاش دنیوی بادشاہ ہی کچھ نظام دعوت الی الاسلام کا رکھتے تو ان کی سلطنتیں اس طرح تباہ نہ ہوتیں - مگر جب اللہ تعالٰی کے بتائے ہوئے اصولوں کو

قوم بناتی ہیں وہ جماعت پر اور اتحاد پر نازل ہوتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اتحاد کی ایک راہ بتادی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ سب ایک امر پر متفق ہوجاؤ اور وہ امر ہے حبل اللہ کو مضبوط پکڑ لینا۔ حبل رسہ کو کہتے ہیں۔ پھر ہر ایسی چیز کے لئے بولتے ہیں۔ جس کے ذریعہ سے آدمی کسی مقصد کو پہونچ سکے۔ اس لئے معاہدہ کو بھی حبل کہتے ہیں۔ جیسا کہتے ہیں کانت بینھم حبال فقطعوھا ان کے درمیان معاہدات تھے۔ پھر انھوں نے ان کو قطع کردیا۔ سو حبل اللہ کیا ہے۔ القرآن حبل اللہ المتین۔ اللہ کا مضبوط رسہ قرآن ہے۔ اور یہی قرآن درحقیقت مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد ڈالتا ہے۔ جس قدر لوگ قرآن سے دور پڑے ہیں۔ اور طرح طرح کے امور کو اپنے عقائد کا مدار ٹھیرایا ہے۔ اسی قدر ان میں تفرقہ بڑھا ہے۔ لیکن اگر باوجود اختلاف کے وہ قرآن کریم کو محکم پکڑے رکھتے تو ان کے اختلافات تفرقہ کی حد تک نہ پہنچتے۔ تفرقہ کی حالت وہ حالت ہے۔ جب کسی ایک چیز پر اتحاد نہیں رہتا اور ایک غرض واحد نہیں رہ جاتی۔ پس مسلمانوں کو چاہیئے کہ اگر وہ کامیاب قوم بننا چاہتے ہیں تو قرآن کریم کو اپنے اتحاد کی بنیاد رکھیں اور قرآن کی اشاعت اور تعمیل ان کی وہ غرض واحد ہو جو سب کا متحد اصول ہو۔ اس سے بہتر کوئی بنیاد اتحاد کی تجویز نہیں ہوسکتی یہ اتحاد فی الاصول دوسرا گر کامیابی کا بیان فرمایا

۴۹۳۔ واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم دشمن دشمن تھے۔ اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور اس کی نعمت سے ہی تم بھائی بھائی بن گئے۔ اس میں درحقیقت مسلمانوں کو یہ توجہ دلائی ہے۔ کہ ہم نے جو تم کو حبل اللہ یعنی قرآن کو اپنے اتحاد کی بنیاد قرار دینے کو کہا ہے۔ تو یہ اس لیئے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی طاقت رکھی ہے کہ یہ سخت سے سخت دشمنوں کو بھی بھائی بھائی بنا دیتا ہے۔ عرب کی قومیں اور قبیلے جن کی دشمنیوں پر صدیاں گذر کر ایک دوسرے کی عداوت اب ان کے خونوں میں داخل ہوچکی تھی۔ اور دن رات وہ ایک دوسرے سے جنگ پر آمادہ رہتی تھیں۔ بیس سال کے عرصہ میں قرآن کریم نے ان کے اندر ایک ایسا اتفاق اور ایسی اخوت پیدا کردی کہ جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پھر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایسی پاک کتاب کے پاس ہوتے ہوئے مسلمان ایک دوسرے کی تخریب کے درپے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو ہی دنیا سے نابود کرنا چاہتے ہیں۔

کیا جو کتاب عرب جیسی جنگجو قوموں کو جن کی باہمی عداوتوں پر صدیاں گذر چکی تھیں۔ بھائی بھائی بنا سکتی تھی وہ آج مسلمانوں کو بھائی بھائی نہیں بنا سکتی؟ اتفاق کتنی بڑی دولت ہے۔ دنیا کی کوئی دولت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ جیسا کہ خود قرآن اس پر شاہد ہے۔ لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم۔ اگر تم زمین کے سارے مال و زر کو بھی خرچ کر دیتے۔ تو دلوں میں وہ الفت و اتحاد پیدا نہ کرسکتے۔ اللہ نے ہی ان کے درمیان یہ الفت پیدا کی۔ سو اب بھی اللہ کی کتاب

ہوگی جس کا وعدہ اولئک ھم المفلحون میں ہے +

اس زمانہ میں جب دعوت الی الاسلام کے کام کی طرف سے مسلمان غافل ہو رہے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس صدی کے مجدد حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کو اپنی جناب سے یہ الہام کیا۔ کہ وہ ایک جماعت اس غرض کے لیئے طیار کریں۔ اور یہ بھی ان کو الہام کیا کہ بخرام کہ وقت تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں برمنار بلند تر محکم افتاد۔ جس میں درحقیقت وہی وعدہ ہے جو اولئک ھم المفلحون میں ہمیشہ کے لیئے مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ نے بارہا یہ اعلان کیا۔ کہ میرے آنے کی اصل غرض یہی ہے۔ کہ تا اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔ اور آپ جو اقرار اس سلسلہ میں داخل ہونے والوں سے لیتے تھے یا جو اقرار اب آپ کے جانشین لیتے ہیں وہ یہی ہے کہ "میں دین کو دنیا پر مقدم کروں گا" اس اقرار کا اصل منشاء بھی یہی ہے کہ ایک ایسی جماعت تیار ہو۔ جن کی متحد غرض خدمت دین ہو۔ پس درحقیقت احمدی جماعت کو تمام جماعتوں سے ممتاز اور مخصوص کرنے والی بات عملی رنگ میں یہی ایک ہے یعنی یہ ایک جماعت ہے جو محض خدمت دین کے لیئے بنائی گئی ہے۔ اس کے تمام افراد کی غرض واحد اور اسکا اصلی مقصد صرف ایک ہے یعنی اشاعت اسلام۔ گویا آپ نے مسلمانوں کے اندر اس حکم کی تعمیل کے لیئے۔ ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ایک جماعت بنانی چاہی ہے۔ پس ہر ایک شخص جو اس جماعت میں داخل ہوتا ہے وہ درحقیقت یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا اصل نصب العین صرف دعوت الی الاسلام رکھے گا۔ اور چونکہ جس قدر یہ جماعت ترقی کریگی اسی قدر دعوت الی الاسلام کا کام بھی ترقی کریگا اس لیئے ہر ایک احمدی کا فرض ہے۔ کہ وہ دوسروں کو بھی اس حق کی طرف توجہ دلائے۔ لیکن اسمیں کوئی شبہ نہیں۔ کہ لفظ احمدی کا اصلی مفہوم داعی الی الاسلام ہی ہے +

دعوت الی الخیر کے ساتھ دو باتیں اور بیان فرمائیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ یہ بھی گویا اسی جماعت کا کام ہے جو داعی الی الاسلام ہو۔ دوسروں کو اسلام کی طرف بلانا اور مسلمانوں کو نیک رستوں پر چلنے کے لیئے ہدایت کرنا اور بری راہوں سے روکنا۔ دعوت الی الاسلام کے ساتھ ہی یہ خوبی بھی مسلمانوں میں سے جاتی رہی ہے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے امور منکرہ ہوتے ہیں اور وہ روکتے نہیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ کہ جو امر منکر ہو اُسے جو ہاتھ سے روکنے کی طاقت رکھتا ہے ہاتھ سے روک دے جو ہاتھ سے نہیں مگر زبان سے روک سکتا ہے وہ زبان سے روک دے جو زبان سے بھی نہیں روک سکتا وہ دل سے ہی اس امر کے ساتھ نفرت رکھے۔ مگر جو امر منکر کے لیئے دل میں بھی تنفر نہیں رکھتا۔ وہ گویا اس پر راضی ہوگیا۔ یہودیوں کی بدترین حالت کا ذکر جہاں قرآن کریم نے فرمایا ہے وہاں یہ بھی فرمایا ہے کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ۔ جن امور منکرہ کا اُن کے اندر ارتکاب ہوتا تھا وہ اُن سے لوگوں کو روکتے نہیں تھے۔ جب قوم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے نہیں رہتے تو ساری

حاشیہ: ۱۹۱۲ء

دونوں گروہوں نے ترک کر دیا۔ بادشاہ اپنے تعیشات میں مصروف ہو گئے۔ گدی نشین اپنی دولت اور عزت کے بڑھانے میں لگ گئے اور علماء اپنے فروعی جھگڑوں میں منہمک ہو گئے تو دعوت الی الاسلام کا کام بالکل جاتا رہا۔ اور مسلمان اسی وجہ سے اس تنزل کی حالت کو پہنچے۔ کہ انھوں نے اپنی زندگی کے سامانوں کو خود لات ماری اور وہ جسے وہ غلطی سے اپنی زندگی سمجھ بیٹھے۔ یعنی اپنے ہی تعیشات اور اپنی ہی آسائش کا فکر وہ درحقیقت ان کی موت تھی +

کیسے کیسے پاک اصول فلاح کے مسلمانوں کو اس پاک کتاب کے اندر دیئے گئے تھے۔ دوسرے لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور کامیابیاں حاصل کیں۔ مگر مسلمانوں نے ان قومی اتخذوا هذا القرآن مهجورا (فرقان پ ۱۹) کا مصداق اپنے آپ ہی کو ثابت کر دکھایا۔ دنیا کی کون قوم ہے جو آج اسلام کے پاک اصول سے متمتع نہیں ہوئی ہے۔ اگر نہیں ہوئے تو صرف مسلمان نہیں ہوئے۔ کس قوم کی مقدس کتاب میں یہ اصول باندھا گیا ہے۔ کہ تم میں ہر وقت ایک جماعت رہے جو دعوت الی الاسلام کے کام کو کرتی رہے۔ سوائے قرآن کے یہ اصول کسی کتاب میں نہ پاؤ گے۔ مگر عملی طور پر کونسی قوم ہے جس کو آج دنیا میں اس اصول کی تارک دیکھتے ہو۔ تو سوائے مسلمانوں کے دوسری قوم نظر نہ آئے گی۔ ہر ایک قوم کو فکر لگی ہوئی ہے کہ دوسروں کو اپنا ہم مذہب بنائے۔ ہر ایک قوم ایک جدوجہد میں ہے اور سکون میں اپنی موت سمجھتی ہے۔ مگر مسلمان جنکی کتاب نے یہ پاک اصول سکھایا تھا۔ کہ ہر وقت جدوجہد میں لگے رہنا اگر غافل ہیں تو وہی اگر اپنے مذہب کی تبلیغ سے بے فکر ہیں تو وہی۔ نہ مبلغ پیدا کرنے کا سامان ہے۔ نہ دنیا کی ضروریات کی خبر ہے نہ اسلام پر حملوں کی پروا ہے نہ دوسرے مذاہب سے کچھ واقفیت ہے۔ پس کس قدر رونے کے قابل اس قوم کی حالت ہے جس کے گھر میں خزانہ ہے۔ مگر وہ خود اس خزانہ سے بے خبر ہے اور دوسرے لوگ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اللہ تعالیٰ نے کیوں دعوت الی الاسلام کے کام کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اسلام میں ایک جماعت کا موجود رہنا ضروری قرار دیا ہے جو دعوت الی الاسلام کے کام میں ہی لگی ہوئی ہو۔ اس جماعت کے افراد کی زندگیوں کا مقصد اصلی اشاعت اسلام اور اعلائے کلمۃ اللہ کے سوائے اور کچھ نہ ہو۔ اس لیئے کہ بغیر اس کے مسلمان قوم ایک زندہ قوم نہیں رہ سکتی۔ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے۔ کہ جس قوم نے اپنی ترقی کے لیئے اپنی تعداد کو بڑھانے کے لیئے جدوجہد ترک کر دی ہے۔ اس میں تنزل اور انحطاط شروع ہو گیا ہے زندگی کے آثار اس میں سے دور ہو گئے ہیں۔ اور وہ آخرکار مردگی کی حالت تک پہنچ گئی ہے۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا تنزل ان کی سلطنت اور حکومت کے جاتے رہنے سے ہوا ہے۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ مسلمانوں کا تنزل اس وقت سے شروع ہوا ہے۔ جب سے انھوں نے دعوت الی الاسلام کے کام کی طرف کم توجہی کر دی ہے۔ اور سلطنتوں کا جاتے رہنا محض اس کے نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے۔ پھر جب مسلمان دعوت الی الاسلام کے کام پر پوری توجہ کریں گے تو پھر وہی کامیابیاں اور وہی شان و شوکت اُن کے لیئے

۱۰۹ ان کو ایمانی اور عملی پہلو کے لحاظ سے اور تعلیم اور تہذیب کے لحاظ سے ایسے اعلےٰ مقام پر پہنچایا کہ کسی نبی نے اپنی اُمت کو اس مقام پر نہیں پہنچایا *

۱۱۰ ۴۹۷۔ لن یضروکم الا اذی۔ جیساکہ سیاق عبارت بتاتا ہے۔ یہاں صرف یہودی مخاطب ہیں۔ گو اہل کتاب کا وسیع لفظ استعمال فرمایا ہے۔ یہ ایک پیشگوئی ہے کہ یہود مسلمانوں کو کبھی بھی زیادہ تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے اذی تھوڑی تکلیف کو کہتے ہیں۔ یا ایسی تکلیف جو صرف زبان سے پہنچائی جائے۔ جیساکہ اسی سورت کے آخر پر فرمایا ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذی کثیرا یہود جنگوں میں مسلمانوں کے سامنے ہمیشہ پیٹھ ہی دکھاتے رہے وان یقاتلوکم یولوکم الادبار *

۱۱۱ ۴۹۸۔ ضربت علیھم الذلة این ما ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس۔ جہاں کہیں ہونگے ذلت کی مار ان پر رہے گی سوائے اس کے کہ اللہ کے معاہدہ کے نیچے یا لوگوں کے معاہدہ کے نیچے رہیں حبل اللہ یا حبل من اللہ تو قرآن کریم ہی ہے۔ پس حبل من اللہ کے نیچے آنے سے مراد یہ ہے کہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور حبل من الناس میں لوگوں سے معاہدہ مراد ہے۔ یعنی کسی دوسری حکومت کے ماتحت پناہ لیں۔ گویا یہود کے لیئے یہ پیشگوئی ہے کہ وہ دنیا میں بحیثیت قوم کبھی معزز نہ ہونگے۔ ہاں دو صورتوں میں وہ ذلت سے پناہ پا سکتے ہیں۔ مسلمان ہو کر کامل طور پر۔ جیسے افغان بھی بنی اسرائیل میں سے اپنا ہونا بتاتے ہیں۔ اور اُن کی روایات اسی پر شاہد ہیں۔ اور اگر مسلمان نہ ہوں تو کسی دوسری قوم کی حکومت کے نیچے رہیں۔ قومی محکومیت خود ایک حد تک قومی ذلت ہے۔ پس اس صورت میں دربدر پھرنے کی ذلت سے بچائے جائیں گے یعنی کچھ امن اُن کو مل جائے گا۔ قرآن کریم کی اس پیشگوئی کی صداقت پر یہودیوں کی تاریخ کافی شاہد ہے۔ باوجود صاحب مال و زر ہونے کے نہ حکومت اُن کے ہاتھ میں دنیا میں کہیں رہی نہ ہی قومی عزت نصیب ہوئی *

۱۱۲ ۴۹۹۔ لیسوا سواء من اھل الکتاب امة قائمة یتلون اٰیٰت اللہ اٰناء الیل وھم یسجدون۔ سب برابر نہیں اہل کتاب میں سے ایک ایسا گروہ بھی ہے جو رات کے وقتوں میں اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں۔ اس گروہ سے بعض کے نزدیک تو مراد اہل کتاب (غیر مسلمین) کا ہی ایک گروہ ہے۔ گویا قرآن کریم نے یہاں اہل کتاب کی کمزوریوں اور نقصوں کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ کسی قوم میں بھی سب لوگ یکساں نہیں ہوتے۔ بُرے بھی ہوتے ہیں اچھے بھی۔ ہاں جب بُروں کی کثرت ہو جاتی ہے تو اس قوم پر برا ہونے کا لفظ صادق آجاتا ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ ان میں سے نیک لوگ بالکل مفقود ہو جاتے ہیں ہاں اپنی طرز کے مطابق وہ بھی کچھ نیکی کرتے ہیں۔ گو ان کی نیکی کمال کو حاصل نہیں کر سکتی۔ اسی لیئے ان لوگوں کا ذکر کر کے فرمایا وما یفعلوا من خیر فلن یکفروہ یعنی جس قدر نیکی کریں گے اسی قدر اس کا فائدہ بھی اُٹھائیں گے۔ لیکن بعض کے نزدیک اس گروہ سے مراد اہل کتاب میں سے وہ لوگ ہیں جو اسلام لے

آیت ۱۰۳

قوم ارتکاب معاصی میں دلیر ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ آخر بدی کے کرنے پر لوگ فخر کرنے لگتے ہیں۔ اسلام کا یہ فخر تھا۔ کہ اس میں چھوٹے سے چھوٹا انسان بڑے سے بڑے کو نصیحت کر سکتا تھا۔ اور اس کی غلطی پر اسے بیدھڑک آگاہ کر سکتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق جیسا کامل راستباز خلافت کے منصب پر آتے ہی کہتا ہے فان زغت فقومونی۔ فاروق جیسے رعب والے انسان کے سامنے ایک بڑھیا یوں کہہ سکتی ہے کہ یا ابن الخطاب اللہ یعطینا وانت تمنعنا۔ قرآن تو عورتوں کے مہر کے متعلق فرماتا ہے ان اٰتیتم احدٰھن قنطارا فلا تاخذ وا منه شیئا۔ اور آپ کہتے ہیں بڑے بڑے مہر نہ دو۔ تو حضرت عمر اپنی رائے سے رجوع کرتے ہیں۔ لیکن آج مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ ہر حلقہ میں ایک پیر یا گدّی نشین ہے۔ اور اس کا حکم انکے لیئے خدا کے حکم کے قائمقام ہے۔ اس کو کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کہ تم میں یہ غلطی ہے۔ یا فلاں بات تم نے ٹھیک نہیں کہی۔ گویا دعوت الی الاسلام کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ان کے درمیان سے اٹھ گئے +

آیت ۱۰۵

۴۹۵۔ یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ کچھ مونھ سفید ہونگے اور کچھ مونھ سیاہ ہونگے۔ مونہوں کی سفیدی سے مراد سرور اور خوشی کا حاصل ہونا ہے۔ اور سیاہی سے مراد غم۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا واذا بشر احدھم بالانثیٰ ظل وجھه مسودا۔ یعنی جب لڑکی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے۔ تو مونھ سیاہ ہو جاتا ہے۔ مفردات میں ہے ابیضاض الوجوہ عبارۃ عن السرور واسودادھا عن الغم اور مونہہ کی سفیدی سے مراد فضیلت اور بزرگی بھی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ جس شخص پر عیب کا کوئی داغ نہ ہو اُسے ابیض الوجه کہا جاتا ہے +

رکوع ۱۲/۳ع آیت ۱۰۹

۴۹۶۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیئے پیدا کئے گئے ہو۔ تم نیکیوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔ یہاں مسلمانوں کو سب قوموں سے افضل قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس فضیلت کے کیا وجوہات ہیں۔ اوّل یہ کہ لوگوں کی بھلائی ایک مسلم کے مدنظر ہونی چاہیئے۔ گویا یہ اُمت پیدا ہی اس لیئے کی گئی ہے کہ اپنے آپ کو مخلوق خدا کی بھلائی کے کاموں میں لگا دے۔ باقی دو باتیں وہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہیں۔ گویا دوسروں کی بھلائی چاہنا۔ نیک باتوں کے کرنے کے لیئے کہنا۔ بری باتوں سے روکنا یہ وہ امور ہیں جو انسان کے حقیقی شرف کا موجب ہیں۔ اس امت کی فضیلت دوسری اُمتوں پر اس مزکی اور معلم کی فضیلت کی وجہ سے ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے اس امت کے تزکیہ اور تعلیم کے لیئے بھیجا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جس ردّی حالت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے عربوں کو پایا۔ کیا بلحاظ عقائد کے اور کیا بلحاظ اعمال کے۔ اور کیا بلحاظ جہالت کے۔ ایسی بدترین حالت کی قوم اور کسی نبی کو اصلاح کے لیئے نہیں دی گئی۔ مگر باوجود ایسی ردّی حالت میں پانے کے آنحضرت کی قوت قدسی نے

آیت ۱۱۵

سورت میں ذکر آچکا ہے۔ کہ کس طرح الفاظ کو مروڑ کر اپنی دلی خباثت کا اظہار کرتے تھے۔ راعنا کی جگہ راعینا کہدیا۔ یا رعن کہدیا۔ یہ موقعوں سے اظہار عداوت تھا۔ مگر دل میں ابھی بہت شرارتیں تھیں۔ اس لیئے اللہ تعالے نے ان شریروں کے مقابل مسلمانوں کو متنبہ کر دیا اور بتا دیا کہ ایسی قوم جو اندر ہی اندر اسلام کی بیخکنی کے در پے ہے۔ اس قابل نہیں کہ مسلمان اس پر اعتماد کر کے انھیں اپنے رازدار دوست بنائیں۔ چنانچہ اُن کی اندرونی حالت کا مزید نقشہ اگلی آیت میں کھینچا ہے۔ ھاانتم اولاء تحبونھم ولا یحبونکم۔ تم وہ لوگ ہو جو اُن سے محبّت کرو گے۔ مگر وہ تم سے محبت نہیں کرتے۔ پھر فرمایا واذا خلوا عضوا علیکم الانامل من الغیظ۔ جب الگ ہوتے ہیں تو غیظ و غضب کی وجہ سے اپنے ہاتھ کاٹتے ہیں۔ پھر اس سے اگلی آیت میں فرمایا ان تمسسکم حسنۃ تسؤھم وان تصبکم سیئۃ یفرحوا بھا۔ اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو ان کو بری لگتی ہے اور اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو یہ اس پر خوش ہوتے ہیں۔ عام اصول کا ذکر دوسری جگہ ہے

آیت ۱۱۹

۵۰۱۔ لا یضرکم کیدھم شیئا۔ ان کی جنگ یا ان کی مخالفانہ تدبیر تم کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ یہ ایک پیشگوئی ہے۔ کہ یہودیوں کی شرارتوں سے مسلمانوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا کید کے معنے میں مکر کیطرح غلط فہمی ہوئی ہے۔ ابن اثیر میں ہے الکید الاحتیال والاجتھاد یعنی کید سے مراد حیلہ یا کوشش ہے۔ اس لیئے کید کے معنے حرب یعنی جنگ بھی آئے ہیں چنانچہ ایک روایت میں ہے ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم غزا غزوۃ کذا ولم یلق کیدا ای حربا جس میں کید کے معنے صاف طور پر حرب کیئے ہیں اور یکید بنفسہ سے مراد حالت نزع ہے۔ اور راغب میں ہے الکید ضرب من الاحتیال وقد یکون مذموما و ممدوحا یعنی کید ایک قسم کے حیلہ یا تدبیر کا نام ہے جو کبھی برا ہوتا ہے اور کبھی اچھا۔ ایسا ہی اس شعر میں اذا ردھا بکیدہ فارتدت الی اما روا مار مدنی۔ جہاں بکیدہ سے مراد اللہ تعالے کی لطیف تدبیر ہے۔ کیونکہ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالے اپنے کید یعنی اپنی لطیف تدبیر کے ساتھ میری روح کو لاتا ہے +

رکوع ۱۳/۴ ع ۱۲

آیت ۱۲۰

۵۰۲۔ واذ غدوت من اھلک تبوئ المؤمنین مقاعد للقتال۔ یہاں سے جنگ احد کے واقعات کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ اور بقیہ حصہ سورت سوائے آخری دو رکوع کے انہی واقعات کے متعلق ہے۔ سنہ ہجری کے تیسرے سال میں ابو سفیان تین ہزار فوج کو ساتھ لئے ہوئے مدینہ پر چڑھ آیا اور احد پر جو مدینہ سے چار میل کے فاصلہ پر ہے ڈیرے ڈال دیئے۔ مختصر واقعات اس جنگ کے یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ اور گو آپ کی اپنی رائے یہی تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر جنگ کیا جائے۔ مگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے آپ نے باہر نکل کر جنگ کیا۔ اور ایک ہزار آدمی کو ساتھ لے کر نکلے۔ عبداللہ بن ابی جو منافقوں کا راس رئیس تھا۔ وہ رستہ سے اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر واپس آگیا۔ اور آنحضرت

۱۱۲ آتے ہیں۔ اس صورت میں مراد یہ ہوگی کہ یہ جو اہل کتاب پر مغضوب اور ذلیل ہونے کا فتویٰ ہے۔ یہ محض اُن کے اعمال کی وجہ سے ہے۔ اگر اچھے عمل کریں مسلمان ہوجائیں تو یہ نہیں کہ ان کے نیک عمل بھی اکارت جائیں گے۔ بلکہ ان کا اجران کو ملے گا +

۱۱۵ ۵۰۰۔ یایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا بطانۃ من دونکم لا یالونکم خبالا ودوا ما عنتم قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر قد بینا لکم الاٰیٰت ان کنتم تعقلون۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے سوائے اپنے راز دار دوست نہ بناؤ (جو) تمکو نقصان پُہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ جو تم کو تکلیف پُہنچے وہ اُن کو اچھی لگتی ہے۔ ان کے مُونھوں میں سے دشمنی ظاہر ہوچکی ہے۔ اور جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوُا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ہم نے کھولکر باتیں تم کو بتادی ہیں۔ اگر تم عقل سے کام لو۔ مخالفین اسلام کی بھی عجب حالت ہے۔ اس کی سیدھی باتیں بھی محل اعتراض ٹھیرائی جاتی ہیں۔ اس آیت میں کونسی بات ہے جس پر کسی عقل و فکر سے کام لینے والے کو اعتراض ہوسکتا ہے۔ مسلمانوں کو ایک ایسی قوم سے متنبہ کیا ہے۔ جو اُن کو نقصان پہنچانے کے لیئے ہر قسم کی جائز و ناجائز کوشش کر رہے ہیں۔ دشمنی یہاں تک پُہنچ گئی ہے کہ مسلمانوں کو دُکھ پُہنچے تو وہ خوش ہوتے ہیں پھر ان کی باتوں میں کھلی کھلی دشمنی ظاہر ہوچکی ہے۔ اور ابھی دلوں کے اندر جو غیظ و غضب بھرا ہوُا ہے وہ علاوہ ہے۔ کیا ایسے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کو محبت و الفت پیدا کرنی چاہیئے تھی؟ کیا واقعی اس قسم کے خطرناک دشمنوں کو جو مسلمانوں کی ہلاکت کے لیئے منصوبے کر رہے تھے۔ اپنا رازدار دوست بنالینے کی نصیحت کرنی چاہیئے تھی؟ جس نے آنکھوں پر پردہ ہی ڈال رکھنا ہے۔ وہ یوں تو کہہ سکتا ہے۔ کہ عرب میں کوئی ایسی قوم ہی نہ تھی جو مسلمانوں کے ساتھ ایسی عداوت رکھتی ہو۔ لیکن جب ایسے دشمن موجود ہوں تو ان سے متنبہ کرنے پر۔ ان کو رازدار دوست بنانے کے خلاف نصیحت کرنے پر۔ اعتراض کرنا مجنون کا کام ہی ہوسکتا ہے۔ مگر تعجب ہے عیسائی پادریوں کی سمجھ پر کہ ایک دفعہ جو یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اسلام پر اعتراض ہی کرنے جانا ہے۔ نہ آگا دیکھتے ہیں نہ پیچھا۔ اسلام کی ہر خوبی انھیں اپنی آنکھ کے یرقان کی وجہ سے برائی نظر آتی ہے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لے گئے تو کفار قریش اور ان کے ساتھی تو آپ کی کھلی دشمنی کا اظہار کرہی چکے تھے۔ مگر مدینہ کے اندر جو یہود اہل کتاب تھے۔ اُنھوں نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ کیا۔ کہ اگر کوئی دشمن مدینہ پر چڑھ کر آئے تو ہم ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ دیکھو نوٹ ۱۴۵۔ جہاں اس معاہدہ کے الفاظ دیئے گئے۔ مگر ادھر یہ معاہدہ کیا۔ ادھر اندر ہی اندر شرارتوں پر کمربستہ ہوگئے۔ اور مسلمانوں کے دشمنوں کو مسلمانوں کے خلاف اکساتے رہتے۔ بلکہ خود بھی دشمنوں کے ساتھ ملکر مسلمانوں کے نیست و نابود کرنے کی فکر میں رہتے۔ بدزبانی بھی بہت کرتے پچھلی

۱۲۰

کی جگہ کو خالی پاکر لشکر کفار نے مسلمانوں پر حملہ کیا۔ اُن کو کچھ نقصان پہنچا کر اپنی مصیبت میں مبتلا کر دیا اور خود اُن کے تعاقب سے محفوظ ہو کر اور مزید نقصان سے بچ کر انھوں نے اسی کو غنیمت سمجھا کہ میدان جنگ سے بچ کر نکلجائیں۔ مسلمانوں کو نقصان ضرور پہنچا۔ مارے بھی گئے زخمی بھی ہوئے۔ مگر انھوں نے شکست نہیں کھائی نہ میدان جنگ کو چھوڑا۔ کفار سخت نقصان سے ضرور بچ گئے۔ مگر اُنھوں نے کوئی فتح حاصل نہیں کی۔ بلکہ صرف مسلمانوں کے تعاقب سے محفوظ ہو کر گھر کی راہ لی۔ اور بایں ہمہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بہت لوگ زخمی ہو چکے تھے۔ اور بہتیرے زخمیوں کو وہ مشکلات کے ساتھ اُٹھا کر لے گئے +

اس آیت واذ غدوت من اهلك تبوئ المؤمنين مقاعد للقتال سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی اپنی جگہ پر لڑائی کے موقعوں پر بٹھانے کا کام بھی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم خود ہی کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالےٰ نے اس پاک انسان کے اندر قدرت کے سارے عجائبات کو جمع کر رکھا تھا نمازوں کے امام بھی خود جھگڑوں کے فیصلے کرنے والے خود۔ قوانین بنا کر دینے والے خود۔ لڑنے والے خود لڑائی کے لیئے موقعہ بنانے والے خود۔ غرضکہ کوئی پہلو ایسا نظر نہیں آتا جس میں آپ نے خود ہی ایک نمونہ قائم نہ کیا ہو +

۱۲۱

۵۰۳- اذ همت طائفتان منكم ان تفشلا والله وليهما۔ یہ دو گروہ انصار کے دو قبیلے تھے۔ بنوسلمہ خزرج میں سے اور بنو حارثہ اوس میں سے۔ همت سے مراد یہاں صرف یہ ہے کہ ان کو ایسا خیال گذرا تھا۔ الهم قد يراد به العزم وقد يراد به الفكر وقد يراد به حديث النفس یعنی هم سے مراد بعض وقت پختہ ارادہ اور بعض وقت محض فکر اور بعض وقت دل میں ایک بات کا آنا ہوتا ہے۔ عبداللہ بن ابی کے تین سو لوگوں کے ساتھ الگ ہونے سے ان کے دل میں بھی کمزوری دکھانے کا خیال گذرا۔ مگر جیسا کہ قرآن شاہد ہے۔ اللہ اُن کا ولی تھا پس وہ کسی الزام کے ماتحت نہیں۔ دشمن کی کثرت اور مسلمانوں کی قلت سے کوئی کمزوری کا خیال دل میں گذرا۔ اللہ تعالےٰ نے اُنھیں سنبھال لیا +

۱۲۲

۵۰۴- ولقد نصركم الله ببدر وانتم اذلة۔ بدر کی جنگ کی طرف اس لیئے اشارہ فرمایا۔ کہ وہاں تم کس قدر کمزور تھے۔ اگر یہاں دشمن چوگنا تھا تو وہاں بھی تگنا تھا۔ مگر تعداد کو چھوڑ کر اس وقت مسلمانوں کی حالت بلحاظ سامان جنگ کے بھی نہایت کمزوری کی تھی۔ پہلا جنگ تھا نہ سامان جنگ تھا۔ اور نہ ہی لڑنے والے سارے ایسے تھے جو میدان جنگ دیکھ چکے ہوں اذلة ذليل کی جمع ہے اور ذل کے اصل معنے ہیں مقابلہ سے عاجز ہونا۔ یہاں اذلة سے مراد تعداد کی کمی۔ کمزوری۔ ہتھیاروں اور مال کی قلت وغیرہ امور ہیں بدر اصل میں ایک کوئیں کا نام تھا۔ اور اسلام کی تاریخ میں اس مقام نے اس جنگ کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ جہاں سب سے پہلے مسلمانوں اور کفار قریش کی مٹ بھیڑ ہو کر کفار کی قوت پیشگوئیوں کے مطابق توڑی گئی +

بقیہ نوٹ ۱۲۵

صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف سات سو آدمی رہ گئے۔ میدان جنگ میں پہنچ کر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص موقعہ پر جہاں سے دشمن پر سخت زد پڑتی تھی۔ پچاس تیر اندازوں کو متعین کیا۔ اور اُن کو حکم دیا کہ خواہ مسلمانوں کو فتح ہو یا شکست وہ اپنے مقام سے نہ ہٹیں۔ جنگ شروع ہوئی اور کفار کا لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکا۔ مسلمانوں نے بھاگتے ہوئے کفار کا تعاقب کیا۔ تیر اندازوں نے جب یہ صورت دیکھی اور اُن کو یقین ہو گیا کہ فتح مسلمانوں کی ہو گئی ہے۔ تو ان میں سے ایک حصّہ نے اپنے امیر کو یہ کہا کہ ہم بھی دشمن کے تعاقب میں شامل ہونگے۔ تاکہ مال غنیمت میں حصّہ دار ہو جائیں۔ ایک حصّہ تیر اندازوں کا مع اپنے امیر کے اس امر کے خلاف تھا۔ لیکن زیادہ حصّہ غنیمت کو حاصل کرنے کے خیال سے اپنے مقام کو چھوڑ گیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نافرمانی کی۔ جب لشکر کفار نے تیر اندازوں کے مقام کو خالی دیکھا اور اپنے آپ کو اس سخت زد سے محفوظ پایا تو اُنھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور پھر کر مُسلمانوں پر حملہ کیا۔ مسلمانوں کا لشکر اس وقت تعاقب کی وجہ سے بے ترتیب ہو چکا تھا۔ تیر اندازوں کا مورچہ خالی ہو چکا تھا۔ اس لیئے اس حملہ کی سخت زد اہل اسلام پر پڑی۔ بعض لوگ اس بے ترتیبی کی حالت میں جن کی تعداد بہت قلیل تھی۔ بڑی جمعیت سے کٹ جانے کی وجہ سے میدانِ جنگ سے گریز اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ کفار کا حملہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر سخت ہوا۔ بہت سے مسلمان مارے گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت زخم آئے۔ آخر جب کفار نے دیکھا کہ اب مسلمان اپنی مصائب میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اور اپنے آپ کو انھوں نے تعاقب سے محفوظ پایا تو میدان جنگ چھوڑ کر اُنھوں نے واپس مکہ کی راہ لی اور مسلمان میدان جنگ میں ہی رہے۔ اگلے دن مسلمانوں نے تھوڑی دور تک یعنی ایک مقام تک جس کا نام حمراء الاسد تھا۔ کفار کے لشکر کا تعاقب کیا۔ مگر وہ بہت دور نکل گئے اور اس لیئے مسلمان مدینہ واپس آگئے۔
یہ وہ واقعات ہیں جنکا ذکر اس رکوع میں اور اس سے آگے آتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہدیا ہے کہ احد کے جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ لیکن یہ ایک غلط خیال ہے۔ آج تک یہ کسی نے نہ سُنا ہوگا۔ کہ جو لشکر میدان جنگ میں ہی رہے وہ شکست خوردہ کہلاتا ہے۔ کفار نے اگر فتح حاصل کی تو کیا۔ میدان تو مسلمانوں کے ہاتھ تھا۔ ہاں اگر وہ اپنی فتح سمجھتے تو پھر ضرور تھا۔ کہ مدینہ طیبہ پر حملہ کرتے۔ اور سب سے پہلے تو یہی ضروری تھا کہ وہ مسلمانوں کو میدان جنگ سے بھگا دیتے یا ان کو کلیتۃً تباہ کر ڈالتے۔ لیکن جس صورت میں مسلمان میدان جنگ میں ہی رہے۔ کفار کو اس قدر حوصلہ نہ ہوا۔ کہ وہ مدینہ کا رُخ بھی کریں۔ مال غنیمت ان کے ہاتھ کوئی آیا نہیں نہ کوئی مسلمان قیدی پکڑ کر لے گئے۔ تو اس کا نام کفار کی فتح رکھنا ایک بے معنی بات ہے بات صرف اسی قدر تھی کہ مسلمانوں نے جو شکست لشکر کفار کو دی اس کا وہ فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ بلکہ اُسکی بجائے بہت سا نقصان بھی اُٹھایا۔ اگر تیر انداز اپنی جگہ نہ چھوڑتے تو کفار کے لشکر کو یہ حوصلہ نہ ہوتا کہ وہ لوٹ کر مسلمانوں پر حملہ کریں اور مسلمان اُن کے تعاقب سے بہت سا مال غنیمت بھی حاصل کر سکتے تیر انداز

۱۲۴

مقابلہ کی جرأت مطلق نہ ہوئی۔ اب دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ کفار کو دو قسم کا وعدہ دیا گیا تھا۔ جسکے متعلق وہ بار بار مطالبہ بھی کرتے تھے۔ جیسے کہ سورہ النحل میں فرمایا۔ ھل ینظرون الا ان تاتیھم الملئکۃ او یاتی امر ربك کیا وہ اس امر کا انتظار کرتے ہیں کہ فرشتے ان پر آئیں یا تیرے رب کا امر ہی آجائے۔ دیکھو نوٹ ۲۱۰۔ سو اللہ تعالےٰ نے ان تینوں جنگوں میں جہاں کفار کی چڑھائی مسلمانوں پر تھی۔ ملائکہ کا نزول فرما کر مسلمانوں کی نصرت فرمائی اور کفار کو سزا دی اور ان کو اپنے ارادوں میں ناکام رکھا۔ اور فتح مکہ میں گویا امر رب ہی آگیا۔ کیونکہ اسلام کی حکومت قایم ہوگئی اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ چڑھائی ایسی پرشوکت تھی۔ کہ وہ کفار جو دس دس ہزار کا لشکر لے کر مٹھی بھر مسلمانوں کو تباہ کرنیکے لیئے جایا کرتے تھے۔ اب ان میں اتنی بھی ہمت اور جرأت نہ رہی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دس ہزار قدوسیوں کے مقابلہ میں میدان میں بھی نکل سکیں اور امر رب کا مقابلہ کر کون سکتا تھا۔ پس ملائکہ کے نزول میں گویا درحقیقت اللہ تعالےٰ نے اپنے اس وعدہ کو پورا فرمایا ہے۔ جسکا مطالبہ بار بار کفار کی طرف سے ہوتا تھا۔ اور یہ نزول ملائکہ کوئی فرضی بات نہ تھی۔ بلکہ ایک حقیقت تھی ورنہ یہ ناممکن تھا۔ کہ معدودے چند مسلمان اس قدر فوجوں کا مقابلہ کر کے کامیاب ہو سکتے۔ غور کا مقام ہے کہ ایک آدھ میدان میں اگر تھوڑے بہتوں پر غالب آجائیں تو اسے اتفاق کہا جا سکتا ہے۔ گو وہاں بھی کوئی نہ کوئی وجوہ کامیابی کی ضرور ہوتی ہیں۔ مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ اول میدان بدر میں کفار کی جمعیت تگنی۔ میدان کا اچھا حصہ اُن کے ہاتھ میں۔ پانی ان کے قبضہ میں۔ ان کی فوج میں تجربہ کار جنگی جوان بالمقابل مسلمانوں میں بچے اور بوڑھے شامل ہتھیار ندارد۔ میدان کی مشکلات۔ پھر بھی کفار سخت نقصان اٹھاتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ پھر میدان اُحد میں بجائے تگنے کے اب کفار کی تعداد مسلمانوں سے چوگنی ہے سواروں کی ایک ہزار جمعیت ان کی فوج میں ہے۔ خالد جیسے بہادر کے ہاتھ میں ان کی فوج کی کمانڈ ہے۔ مگر پھر بھی کفار خالی ہاتھ اور ناکام واپس جاتے ہیں۔ جنگ احزاب میں کفار کی تعداد مسلمانوں سے دس گنی علاوہ ازیں اندر یہودی دشمن منافق جاسوسوں کا کام کرنے والے موجود۔ مگر وہاں بھی خدا نے اس ٹڈی فوج کو ناکام اور نامراد کر کے واپس پھیرا۔ اور وہ سخت پریشانی کی حالت میں بھاگے۔ عقلمند کو سمجھانے کے لیئے تو یہ کافی ہے۔ کہ نزول ملائکہ ہر مقام پر ہوا۔ ورنہ ہر دفعہ پہلے سے تگنی فوج لاکر ناکام کیوں ہوتے

۱۲۵

۵۰۷۔ وما جعلہ اللہ الا بشری لکم ولتطمئن قلوبکم بہ۔ اور اسے (یعنی نزول ملائکہ کے وعدہ کو) اللہ تعالےٰ نے صرف تمہارے لیئے بشارت ٹھیرایا اور تاکہ تمہارے دل اس کے ساتھ مطمئن ہو جائیں۔ یہ سطح سورۂ انفال میں فرمایا وما جعلہ اللہ الا بشری ولتطمئن بہ قلوبکم۔ اور وہاں آگے چل کر فرمایا اذ یوحی ربك الی الملئکۃ انی معکم فثبتوا الذین امنوا سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب جب تیرا رب ملائکہ کو وحی کرتا تھا۔ کہ میں تمہارے ساتھ ہوں سو ان لوگوں کو جو ایمان لائے ثابت قدم

۵۰۵۔ الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلثۃ الاف من الملئکۃ منزلین۔ کیا یہ تمہارے لیئے کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار نازل کیئے گئے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے۔ چونکہ پچھلی آیت میں جنگ بدر کیطرف اشارہ ہے۔ اس لیئے بعض مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ تین ہزار ملائکہ سے امداد کا واقعہ اسی جنگ بدر سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر چونکہ جنگ بدر کے موقعہ پر اللہ تعالےٰ نے سورہ انفال میں صاف فرمایا ہے۔ اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملئکۃ مردفین۔ یہاں اللہ تعالےٰ نے صاف طور پر ایک ہزار فرشتوں کی امداد کا وعدہ فرمایا۔ اس لیئے جنگ بدر میں تین ہزار فرشتوں کی امداد کا وعدہ نہیں ہوسکتا۔ واقعات پر غور کرنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ جنگ بدر میں دشمن کی تعداد ایک ہزار تھی۔ اللہ تعالےٰ نے ایک ہزار ملائکہ سے مسلمانوں کی امداد فرمائی۔ جنگ احد میں دشمن کی تعداد تین ہزار تھی۔ اللہ تعالےٰ نے تین ہزار ملائکہ سے امداد فرمائی۔ نیز اسی سورت کی ایک اور آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی اس جنگ میں اہل اسلام کو امداد الٰہی کا وعدہ دیا گیا تھا۔ جیسا کہ فرمایا ولقد صدقکم اللہ وعدہٗ اذ تحسونھم باذنہ۔ اور اس وعدہ کے سواء اور کوئی وعدہ نہیں۔ پس لازماً یہ ماننا پڑے گا۔ کہ اسی ملائکہ کی امداد کے وعدہ کی طرف ہی اشارہ ہے۔ اور سات سو آدمیوں کا تین ہزار کے لشکر پر فتح پانا اور اُن کو بھگا دینا اور اُن میں سے بہتیروں کو مار ڈالنا اور کثرت سے لوگوں کو زخمی کر دینا یہ اسی نصرت کیوجہ سے ہی تھا۔

۵۰۶۔ بلیٰ ان تصبروا وتتقوا ویاتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسۃ الاف من الملئکۃ مسومین۔ ہاں اگر صبر کرو اور تقوےٰ اختیار کرو۔ اور دشمن سرعت کے ساتھ تم پر چڑھ آئے تو تمہارا رب تم کو پانچ ہزار تباہی ڈالنے والے ملائکہ سے امداد دے گا۔ یہ ایک تیسرے جنگ کی طرف اشارہ ہے جبمیں دشمن جوش اور سرعت کے ساتھ چڑھ آئیگا اور اس میں جنگ احزاب کی پیشگوئی ہے۔ جب دس ہزار کی تعداد میں دشمن مدینہ پر چڑھ آیا۔ تین ہی بڑے جنگ تھے جن میں دشمن یعنی کفار قریش مسلمانوں پر چڑھ کر آئے۔ جنگ بدر۔ جنگ احد۔ جنگ احزاب۔ ان تینوں لڑائیوں میں مسلمانوں کی تعداد کفار کی تعداد کے مقابل کچھ نسبت نہ رکھتی تھی۔ تینوں جنگوں کی غرض مسلمانوں اور اسلام کا استیصال تھا۔ تینوں میں کفار اپنے مقصد میں ناکام ہوکر واپس ہوئے۔ اور تینوں کے متعلق ہی نزول ملائکہ کا ذکر بھی ہے۔ اور جوں جوں کفار کی جمعیت مسلمانوں کے خلاف زیادہ چلی آتی ہے۔ اسی طرح ملائکہ کی تعداد میں بھی زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ بدر میں ایک ہزار دشمن آئے۔ ایک ہزار ملائکہ کی نصرت کا وعدہ فرمایا۔ احد میں ایک ہزار کی جگہ تین ہزار آئے۔ وہاں تین ہزار ملائکہ سے نصرت کا وعدہ فرمایا۔ جنگ احزاب میں اس سے بھی تگنی تعداد سے زیادہ آئے۔ وہاں پانچہزار ملائکہ کی نصرت کا ذکر فرمایا۔ یہ آخری جنگ تھی جس میں غنیم مدینہ پر چڑھ کر آیا۔ اور اس کے بعد پھر اسے مدینہ پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے بعد جو چڑھائی ہوئی وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ میں داخل ہونا تھا۔ اور اس موقعہ پر کفار کو

آیت

رکوع ۱۴ اع

آیت ۱۲۹

۵۱۰۔ لا تاکلوا الربٰوا اضعافا مضٰعفۃ۔ نہ کھاؤ سود چند در چند کرتے ہوئے اس رکوع میں اللہ تعالےٰ نے کامیابی کے اسباب کو بیان فرمایا ہے۔ منجملہ ان کے پہلی بات سود سے روکنا ہے۔ اس پر مفصل نوٹ پہلے گذر چکا ہے۔ دیکھو نوٹ ۳۸۰ اضعافا مضٰعفۃ یا چند در چند کہنے سے کوئی علیحدہ قسم کا سود مراد نہیں بلکہ صرف سود کی حقیقت کو ہی بیان کیا ہے۔ کہ وہ اصل قرضہ کی رقم کو چند در چند کرتا چلا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے سود اور سود در سود میں کوئی فرق نہیں کیا +

۱۳۰

۵۱۱۔ واتقوا النار التی اعدت للکافرین۔ اس میں یہ بتایا ہے۔ کہ آگ تو کافروں کے لیئے تیار کیگئی ہے پس سچا مومن ہو کر کوئی شخص آگ میں نہیں جا سکتا +

۱۳۱

۵۱۲۔ واطیعوا اللہ والرسول لعلکم ترحمون۔ جنگ احد میں جو نقصان مسلمانوں کو پہنچا وہ رسول کی نافرمانی کی وجہ سے ہی پہنچا اس لیئے مسلمانوں کی کامیابی کے اسباب میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی پوری فرمانبرداری اختیار کریں +

۱۳۲

۵۱۳۔ جنۃ عرضھا السمٰوات والارض۔ جنت جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ تفاسیر میں ایک روایت لکھی ہے کہ ہرقل کے فرستادہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ کہ آپ ایک ایسے جنت کی طرف بلاتے ہیں۔ جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ پس دوزخ کہاں ہے۔ آپ نے فرمایا۔ سبحان اللہ فاین اللیل اذا جاء النہار جب دن آجاتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی یہ آیت اور اس کی یہ تفسیر نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے صاف بتاتی ہے کہ جنت و نار در حقیقت دو کیفیات ہیں اسی سماوات اور ارض میں ایک حالت ایک شخص کے لیئے جنت ہے اور دوسری حالت دوسرے کے لیئے جہنم

۱۳۳

۵۱۴۔ والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین۔ مومن کے لیئے یہاں تین صفات بیان فرمائی ہیں جو اسے ادنےٰ حالت سے لے کر کمال تک پہنچاتی ہیں۔ ادنےٰ حالت تو یہ ہے کہ انسان اپنے غصہ کو دبائے۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ مرتبہ ہے کہ دوسرے کے قصور کو معاف کر دے۔ یعنی اسے ایسا مٹا دے کہ اس کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ مگر حقیقی کمال کا مرتبہ یہ ہے کہ جس سے قصور ہوا ہے اس کے ساتھ احسان بھی کرے۔ احد کے جنگ میں بعض کی غلطی سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا۔ تو اب یوں نہ چاہیئے۔ کہ ان پر غیظ و غضب کا اظہار ہو۔ چنانچہ خود نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف ان لوگوں کو معاف کیا۔ بلکہ وحی الٰہی کے ماتحت انہی لوگوں پر یہ احسان کیا۔ کہ انھیں آئندہ مشوروں میں شامل کیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بعد از جنگ اس غلطی کی طرف اشارہ تک بھی نہیں کیا +

۱۳۴

۵۱۵۔ لم یصروا علی ما فعلوا۔ انسان سے اگر ایک خطا ہو جائے تو اس پر اصرار نہ کرے۔ ایسے لوگوں کے گناہ اللہ تعالےٰ معاف کر دیتا ہے۔ لیکن جو غلطیوں پر اڑ بیٹھتے ہیں وہ دکھ اٹھاتے ہیں +

۵۱۶۔ ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون۔ ایسی مصیبت کے وقت یہ کس قدر خوشخبری ہے کہ مومن ہو تو

۱۲۵ رکھو۔ میں ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے کفر کیا رعب ڈالوں گا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ مومنوں کو ثابت قدم کرتا اور کفار کے دلوں میں رعب ڈالتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہو کہ ملائکہ کی تعداد کو کفار کی جمعیت سے ہر میدان میں ایک خاص نسبت نظر آتی ہے۔ اس بات پر کہ ملائکہ تلواریں ہاتھ میں لے کر جنگ نہ کرتے تھے۔ جس طرح پر انسان کرتے ہیں۔ سورہ انفال میں انشاء اللہ تعالےٰ بحث کی جائے گی۔ نزول ملائکہ میں کچھ شبہ نہیں۔ غرض اس کی وہی تھی جس کا ذکر خود قرآن کریم نے فرما دیا مومنوں کے لیئے بشارت اور اطمینان اور ان کا ثابت قدم رکھنا۔ کفار کے دلوں میں رعب ڈالنا +

۱۲۶ ۵۰۸۔ لیقطع طرفا من الذین کفروا اویکبتھم فینقلبوا خائبین۔ تاکہ کافروں کے ایک حصّہ کو کاٹ دے یا اُن کو ذلیل کر دے تاکہ وہ نامراد لوٹ جائیں۔ یہ آیت اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ کفار احد کے میدان سے ناکام واپس آئے۔ کیونکہ ان کی غرض مسلمانوں کا تباہ کرنا تھا۔ مگر وہ میدان ان کے ہاتھ میں چھوڑ کر آپ واپس آ گئے یہ تھوڑی ذلّت نہ تھی۔ جیساکہ واپسی کے وقت بعض عرب کے سرداروں نے ابو سفیان کو کہہ بھی دیا۔ اور اس سے پہلے یعنی مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے سے پہلے اُن کے لشکر کا ایک حصّہ کٹ بھی گیا تھا +

۱۲۷ ۵۰۹۔ لیس لک من الامر شئ او یتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظلمون۔ تیرا اس امر میں کچھ اختیار نہیں۔ اللہ چاہے تو ان پر رجوع کرے یا اُن کو عذاب دے وہ ضرور ظالم ہیں۔ سیاق و سباق صاف بتاتا ہے کہ ان الفاظ میں کفار کا ہی ذکر ہے۔ پھر اس کے متعلق مختلف رائیں ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کا نزول احد کے واقعہ سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں مسلمانوں کو اور خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو سخت تکلیف پہنچی اور زخم بھی آئے۔ اور حضرت حمزہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا مثلہ بھی کیا گیا تو اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں یہ فرمایا کہ ایسی تکلیفوں اور دکھوں کے پہنچنے پر کسی پر بددعا یا بدلہ لینے کا ارادہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اللہ کا اختیار ہے گو وہ ظالم ہی ہیں۔ مگر خدا چاہے تو ان پر رجوع ہی فرمائے چنانچہ اللہ تعالےٰ نے ان میں سے بہتوں پر رجوع برحمت ہی فرمایا اور ان کو اسلام کی توفیق مل گئی اور ان کی وہ سب بدکرداریاں اور جو دکھ اُنھوں نے مسلمانوں کو پہنچائے تھے معاف کر دیئے گئے بعض کے نزدیک اس آیت میں اھل بئر معونہ کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے دھوکہ دے کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بہت سے بزرگ صحابہ اور حافظین قرآن کو قتل کر دیا تھا۔ یعنی ان کو اپنے ساتھ یہ ظاہر کر کے لے گئے۔ کہ ہم ان سے دین اسلام سیکھنا چاہتے ہیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اُن کے قتل سے بڑا دکھ پہنچا اور آپ نے ان پر بددعا کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ چونکہ آپ کا وجود رحمت للعالمین تھا۔ اس لیئے اللہ تعالےٰ نے نہیں چاہا کہ آپ کسی پر بددُعا کریں۔ اس میں ان لوگوں کے لیئے سبق ہے جو بات بات میں اپنے مسلمان بھائیوں پر لعنت کرتے اور اُنکو بددعاؤں کی دھمکیاں دیتے ہیں +

بقیہ نوٹ نمبر ۵۲۰

کے قتل کی خبر عین میدان جنگ میں جب دشمن بھی چوگنی تعداد میں حملہ آور ہو رہا ہو اور مسلمان اپنے فائدہ کے موقعہ کو چھوڑ کر دشمن کی زد کے نیچے آپہنچے ہوں۔ فوج بے ترتیب ہو چکی ہو۔ کوئی معمولی امر نہ تھا۔ ایسے حالات میں اگر کسی جرنیل کے قتل کی خبر فوج کو ملتی تو وہ فوج دیوانہ وار بھاگ اُٹھتی اور دشمن کے مقابلہ کی ہمت ان میں باقی نہ رہتی۔ مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم تو صرف جرنیل نہ تھے۔ صرف فوج کو جنگ پر لے جانے والے نہ تھے بلکہ صحابہ کی کل امیدیں آپ کی زندگی سے اور آپ کی ذات سے وابستہ تھیں۔ وہ جرنیل بھی تھے بادشاہ بھی تھے۔ معلم بھی تھے۔ خدا تک پہنچانے والے بھی تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کی محبت صحابہ کے دلوں میں اس قدر تھی کہ دنیا کی تمام محبتیں اس کے مقابلہ میں ہیچ تھیں۔ آپ کی خاطر مال و دولت عزیز اقربا کاروبار تجارتیں جائدادیں املاک گھر سب کچھ تو قربان کر ہی چکے تھے۔ اب جانیں بھی قربان کردیں۔ اسی محبت کا نقشہ آپ نے درحقیقت اس حدیث میں کھینچا ہے۔ لایؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین۔ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں جب تک کہ میں اس کے لیئے باپ سے اور بیٹے سے اور تمام دنیا کے لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔ پس صحابہ کے لیئے آپ کے قتل کی خبر وہ بڑے سے بڑا صدمہ تھا جو معمولی دلوں کے آدمیوں کو دیوانہ کر دیتا۔ مگر یہ قوم باوجود محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ایسے عاشق و شیدا ہونے کے اس خبر سے پریشان نہیں ہوئی۔ صدمہ پہنچنا تو ضروری تھا اور بعض لوگوں کو گھبراہٹ بھی ہوئی۔ مگر ایسے لوگ تھوڑے تھے۔ اور اُن کا تھوڑا ہونا خود اس بات سے بھی ثابت ہے کہ اگر میدان جنگ کو فوج نے چھوڑ دیا ہوتا۔ تو قریش بقیہ کو تباہ کیئے بغیر میدان سے واپس نہ ہوتے۔ مسلمانوں کی اس حالت کا نقشہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ انس بن النضر ایک صحابی تھے جب آپ کو بھی یہ غلط خبر اڑتی اڑتی پہنچی تو آپ نے فرمایا ان کان محمد قد قتل فان رب محمد حی لا یموت وما تصنعون بالحیوٰۃ بعد رسول اللہ فقاتلوا علی ما قاتل علیہ۔ اگر محمد صلے اللہ علیہ وسلم قتل ہو گئے ہیں تو رب محمد زندہ ہے۔ جو کبھی نہیں مرے گا۔ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد تم زندگی کو کیا کرو گے جس بات پر آپ نے قتال کیا تم بھی اسی پر قتال کرتے چلے جاؤ۔ یہی عظمت توحید الٰہی کی ان دلوں میں بھری ہوئی تھی۔ کہ اپنے سب سے بڑے محبوب کے متعلق بھی ایسی خبر سننے پر اس توحید کے عقیدہ میں ایک ذرہ جنبش نہیں آئی۔ بلکہ اگر کہا تو یہ کہا۔ کہ تم محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی خاطر تو جنگ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ خدا کے دین کی حفاظت کے لیئے جنگ کرتے تھے سو جب وہ خدا زندہ ہے تو تمہارا قدم پیچھے کس طرح ہٹ سکتا ہے۔ ہاں ایک خدا کے پرستار کے موتھ سے ہی یہ کلمات نکل سکتے تھے۔ ایک مسیح کا پرستار یہ کلمے زبان پر نہ لا سکتا تھا تعجب ہے حالانکہ مسیح تو خدائے واحد کی عبادت ہی سکھاتے تھے۔ باایں ہمہ اُن کے مریدوں نے جب اپنے پیشوا کے متعلق صرف یہ فیصلہ ہی سُنا کہ اب صلیب کا حکم ہو گیا ہے تو ان کی کیا حالت ہو گئی۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ

تمہارا بول ہی بالا ہو گا پس کسی چھوٹی سی مصیبت کیوجہ سے مومن کو نہ چاہیئے کہ سست ہوجائے یا اس کے غم میں اپنے آپ کو ہلاک کرے۔ مصائب بھی آئیں گے لیکن مومن کے لیئے آخر بلندی اور رفعت ہے

۱۳۹ ۵۱۷- ان یمسسکم قرح فقد مس القوم قرح مثلہ۔ قرح کے معنے زخم۔ مراد اس سے مصیبت یا نقصان ہے۔ اگر مسلمانوں میں سے کچھ لوگ شہید ہوگئے۔ تو گھبرائیں کیوں۔ کیا باوجود تھوڑے ہونے کے انھوں نے ایسا ہی نقصان کفار کو نہیں پہنچا دیا۔ یہ جنگ احد کی طرف ہی اشارہ ہے۔ یعنی وہ کوئی فتح پا کر گھروں کو واپس نہیں گئے۔ جس طرح تم میں سے کچھ لوگ مارے گئے اور کچھ زخمی ہوئے یہی حالت ان کی ہوئی ہے۔ چنانچہ کئی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کفار کا لشکر مکہ کو واپس جاتا تھا تو اس قدر ان میں زخمی تھے کہ سواریاں بھی ان کے لیئے کافی نہ تھیں۔ بلکہ ان کے رفیقوں کو خود انھیں اپنی گردنوں پر اُٹھانا پڑا یہی وجہ ہے کہ دوسری جگہ اس سورت میں فرمایا اولما اصابتکم مصیبۃ قد اصبتم مثلیھا یعنی وہاں یہ فرمایا کہ تم کو ایک مصیبت پہنچی ہے۔ جس کی دو مثل تم کفار کو پہنچا چکے ہو۔ حالانکہ یہاں صرف قرح مثلہ فرمایا۔ دونوں موقعوں میں تطبیق یہ ہے۔ کہ یہاں صرف احد کی مصیبت کی طرف اشارہ ہے یعنی احد میں جیسی تکلیف انھوں نے تم کو پہنچائی ویسی تم نے ان کو پہنچائی اور دوسری جگہ بدر اور احد دونوں کا ذکر ہے یعنی ایک مصیبت تم نے اُن کو بدر میں پہنچائی اور دوسری احد میں تو یہ دو مثل ہوگئیں +

۱۴۱ ۵۱۸- ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم و یعلم الصٰبرین۔ نہ اس دنیا کی کامیابی اور نہ ہی آخری زندگی کی خوشحالی بغیر اس کے میسر آتی ہے۔ کہ اس کے لیئے کوشش کی جائے۔ اصل غرض تو یہ تھی کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہو جو خدا کی راہ میں تکلیف اٹھانے کے لیئے تیار اور باوجود تکالیفوں کے اس کی راہ میں کوشش کرنے والی ہو اور بغیر مصائب میں ڈالنے کے یہ غرض پوری نہ ہو سکتی تھی۔ یہاں علم سے مراد یہ ہے کہ تم اپنا مجاہد ہونا اور صابر ہونا ثابت کردو تو جب ایک امر واقع ہوجائے اس کا بھی ایک علم ہوتا ہے یہ علم تو اللہ تعالےٰ کو پہلے سے ہے۔ کہ کون مجاہد ہوگا۔ اور کون نہیں مگر ایک علم اور بھی ہے اور وہ اس امر کے متعلق کہ کون مجاہد ثابت ہوچکا ہے اور کون ناکامیاب ہوچکا ہے

۱۴۲ ۵۱۹- تمنون الموت من قبل ان تلقوہ۔ جو لوگ جنگ بدر میں شریک نہ ہوئے تھے۔ اُن کی یہ خواہش تھی کہ ہم بھی خدا کی راہ میں لڑ کر شہید ہوں۔ اور اس لیئے وہ چاہتے تھے۔ کہ میدان میں نکل کر جنگ ہوتا کہ ان کو اپنی ثابت قدمی اور اخلاص دکھانے کا پورا موقعہ ملے۔ اسی کا نام تمنائے موت رکھا ہے +

رکوع ۱۵ ع
آیت ۱۴۳ ۵۲۰- وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افاین مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم محمد ایک رسول ہی تو ہیں ان سے پہلے رسول سب گذر چکے۔ پھر کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل ہوجائیں تو تم اپنی ایڑیوں پر پھر آؤ گے۔ احد کے جنگ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی سخت زخم پہنچے۔ یہاں تک کہ آپ گر گئے۔ اور کسی نے یہ غلط خبر بھی اڑا دی کہ آپ قتل ہوگئے اسی کی طرف اشارہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

۱۴۴ جگہ حضرت عیسےٰ علیہ السّلام کا ذکر یوں فرمایا۔ ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل اُدر ظاہر ہے کہ مسیح ابن مریم سے پہلے سارے رسول فوت ہو چکے تو پس کوئی وجہ نہیں کہ بعینہ اسی قسم کے الفاظ ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل میں بعض کو مستثنےٰ مانا جائے۔ بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات پر یہ دوہری شہادت ہے۔ کیونکہ آیت ما المسیح ابن مریم الا رسول سے بھی حضرت مسیح کی وفات پر شہادت ملتی ہے جس طرح دوسرے رسول وفات پا گئے اور اس دنیا سے گذر گئے اسی طرح ضروری تھا کہ مسیح بھی وفات پائیں اور اس دنیا سے گذر جائیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گو اللہ تعالےٰ کا یہ بھی وعدہ تھا واللہ یعصمک من الناس۔ یعنی اللہ تعالےٰ لوگوں سے تجھے بچائے گا۔ بایں ہماں فرمایا کہ اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قتل بھی ہو جائیں تو بھی توحید الٰہی تو باطل نہیں ہو سکتی۔ نیز دیکھو اگلا نوٹ :۔

۱۴۴ ۵۲۱۔ وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتٰبا مؤجلا۔ کوئی شخص اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مرتا۔ ایک لکھا ہوا وقت ہے۔ گو الفاظ میں عمومیت ہے مگر اصل غرض آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کیطرف ہی توجہ دلانا ہے۔ بیشک ایسے اسباب اس جنگ میں جمع ہو چکے تھے۔ کہ اگر اللہ تعالےٰ کی حفاظت نہ ہوتی تو آنحضرت وفات پا جاتے۔ مگر چونکہ اللہ تعالےٰ وعدہ فرما چکا تھا۔ کہ آپ کو مخالفین پر غالب کریگا۔ اور اسلام کی حکومت کو قائم کر کے آپ کو اٹھائے گا اور یہ بھی وعدہ فرما چکا تھا۔ کہ لوگوں کے حملوں سے آپ کو محفوظ رکھیگا اس لئے اللہ تعالےٰ نے اُنہی وعدوں کو پورا فرمایا اور آنحضرت کی حفاظت فرمائی۔ حتیٰ کہ ایسے سخت ہلاکت کے مقام سے بھی کہ دشمن کی ساری فوج کا نشانہ آپ کا ہی وجود مبارک ہو رہا تھا۔ آپ کو سلامتی اور امن سے رکھا۔ اور گو آپ کو زخم بھی آئے۔ مگر وہ بھی ایسے زخم تھے کہ دوسرے ہی دن آپ پھر دشمن کے تعاقب میں نکل پڑے۔ آپ کی یہ حفاظت اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک کھلا کھلا نشان تھا +

۱۴۵ ۵۲۲۔ وکاین من نبی قٰتل معہ ربیون کثیر۔ کتنے نبیوں کو جنگ کرنا پڑا جن کے ساتھ بہت سے ربی بھی تھے۔ نبی کے آنے کی اصل غرض تو توحید الٰہی کو قائم کرنا۔ انسانوں کو ہر ایک قسم کی بدیوں سے پاک کرنا اور ان میں اعلےٰ جوہر انسانیت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اور نبیوں میں اسی لئے شفقت علیٰ خلق اللہ بہت پائی جاتی ہے۔ مگر بایں یہ بھی ایک سلسلہ ساتھ لگا ہوا ہے۔ کہ اُن کو لڑائیاں بھی کرنی پڑجاتی ہیں۔

آج بھی یہ اعتراض نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر کیا جاتا ہے اور اس وقت بھی اعتراض کرنے والے موجود تھے۔ کہ آپ جنگ کیوں کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ کوئی نرالی بات نہیں ہے۔ دُنیا میں جو نبی آئے ہیں ان میں سے بہتیروں کو لڑائیاں بھی کرنی پڑی ہیں۔ بنی اسرائیل کے نبیوں کے حالات بائبل میں اور کسی قدر قرآن کریم میں بھی ہیں اور اُن کی لڑائیوں کا ذکر بھی ہے۔ دُوسری قوموں میں بھی یہی حالت نظر آتی ہے۔ رامچندر جیسے انسان کو بھی جنگ کرنی پڑتی ہے۔ کرشن کو بھی جنگ کے لئے ایک قوم کو

علیہ وسلم کے صحابہ آپ کے قتل کی خبر سن کر بھی خدا کی راہ میں ویسے کے ویسے ہی مضبوط کھڑے ہیں۔ یہ وہ توحید کا مقام ہے جس پر اسلام ایک مسلمان کو قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور جس پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو قائم کرکے دُنیا کو دکھا دیا۔ کہ اس قوت قدسی کا انسان دنیا میں نہیں ہُوا +

جو کچھ انس بن النضر نے کہا وہی سب صحابہ نے کرکے دکھایا۔ چنانچہ انقلبتم علیٰ اعقابکم میں یہی اشارہ ہے۔ کہ کیا تم مسلمان ایسا کر سکتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سن کر دین کو ہی چھوڑ دو ہرگز نہیں ومن ینقلب علی عقبیہ۔ ہاں کوئی احمق ان باتوں سے گھبرا کر دین کو چھوڑ دے تو خدا کا وہ کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ مگر آیت کا خاتمہ سیجزی اللہ الشاکرین پر کیا۔ اور بتا دیا کہ تم شاکر ہو اسی لیئے اللہ تعالےٰ تم کو ایسی جزائیں بھی دے رہا ہے +

اس آیت وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل سے ایک اور اہم مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ وہ آیت ہے جس سے حضرت ابو بکر صدیق نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات پر استدلال کیا اور جس استدلال کے سامنے سارے صحابہ کی گردنیں جھک گئیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر جب شائع ہوئی۔ تو کون مسلمان ہوگا۔ جس کا دل چاہتا ہو کہ اس خبر پر یقین کرے۔ صحابہ کو جو آپ سے محبت تھی۔ وہ ایسی تھی کہ وہ لوگ آپ کی وفات کا کلمہ بھی مُونھ پر لانا پسند نہ کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے عام مجمع میں یہ کہہ دیا۔ کہ جو شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو وفات یافتہ کہے گا میں اسکا سر اڑا دونگا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ اتنے میں آئے اور سیدھے حضرت عائشہ صدیقہ کے گھر میں چلے گئے۔ کپڑا چہرہ مبارک سے اٹھایا اور دیکھا کہ آپ رفیق اعلےٰ سے جا ملے ہیں۔ تو آپ نے واپس مسجد میں آکر ایک خطبہ پڑھا۔ جس میں یہ آیت قرآن کریم کی بھی پڑھی وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم ایک رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے سب رسول گذر چکے۔ اور اس سے یہ استدلال کیا۔ کہ آنحضرت صلعم فوت ہو گئے تو سب لوگ خاموش ہو گئے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ استدلال اسی صورت میں کام دے سکتا تھا۔ جب صحابہ کا یہ اعتقاد ہو کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام رسولوں کو وفات یافتہ مانا جائے۔ کیونکہ اگر پہلے رسولوں میں سے کچھ ایسے بھی مانے جائیں کہ جنھوں نے وفات نہ پائی ہو تو پھر ایک رسول کی وفات پر یہ کوئی دلیل نہیں ہوسکتی۔ اگر بعض رسولوں نے وفات پائی اور بعض نے نہیں پائی تو پھر کیوں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان میں نہ ہوں جنھوں نے وفات نہیں پائی۔ ہاں اگر سب رسول ہی وفات پا چکے تو پھر آنحضرت صلعم کی وفات پر کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔ پس حضرت ابو بکر صدیق کے اس استدلال کی صحت کے سامنے سارے صحابہ کا خاموش ہو جانا ایک قطعی شہادت اس بات پر ہے کہ وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے کل رسولوں کو وفات یافتہ مانتے تھے۔ گویا آنحضرت سے پہلے کل نبیوں کی وفات پر صحابہ کا اجماع ہو گیا۔ علاوہ ازیں قرآن کریم میں دوسری

ہی کام کیا۔ ورنہ تین ہزار کی فوج چھ سات سو منتشر آدمیوں پر حملہ آور ہو اور آخر خود میدانِ جنگ سے بھاگ جائے کون مان سکتا ہے۔ لکھا ہے کہ جب کفار مکہ کو لوٹ گئے ہیں تو رستہ میں کہنے لگے ماصنعنا شیئاً ہم نے تو کچھ بھی نہ کیا۔ میدان جنگ میں مسلمانوں کو چھوڑ کر کیوں مکہ کی راہ لی۔ اس لیئے کہ ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ مسلمانوں کا قدم پھر سنبھلا تو پھر ہماری خیر نہیں۔ اس لیئے جب مسلمان اپنی تکالیف میں مبتلا تھے تو انھوں نے موقعہ کو غنیمت جانا۔

مسلمانوں کے کفار کے دل میں رُعب ہونے کی وجہ یہ بیان فرمائی۔ بما اشرکوا باللہ۔ کیونکہ وہ مشرک ہیں۔ اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرک بُزدل اور کمزور ہوتا ہے۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ جو شخص ادنے ادنے طاقت کے سامنے سر جھکا دینے کو تیار رہے۔ حتیٰ کہ باد و باران کی اور دوسری ارضی اور سماوی طاقتیں تو ایک طرف رہیں۔ بے جان چیزوں جیسے پتھروں اور بتوں اور مردہ انسانوں کو بھی اپنا خدا سمجھ کر ان کی عبادت کرنے لگتا ہے تو لازمی بات ہے کہ اس کا دل ہر ایک طاقت کے سامنے کمزوری دکھائے۔ برخلاف اس کے ایک خدا پر ایمان رکھنے والا موحد مسلمان ایک اللہ تعالیٰ کی طاقت کو ہی اپنے اوپر تسلیم کرتا ہے۔ اور کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ نہ حقیقی طور پر کسی چیز سے اسکا دل خائف ہوتا ہے ✤



۵۲۶۔ ولقد صدقکم اللہ وعدہٗ اذ تحسونھم باذنہ۔ اللہ نے اپنا وعدہ تمہارے ساتھ سچ کر دکھایا جبکہ تم اس کے اذن سے ان کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ یہ جنگ کی ابتدا تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جس وعدہ کا یہاں اشارہ فرمایا ہے۔ وہ وہی نصرت ملائکہ کا وعدہ ہے۔ جس کا ذکر آیت ۱۲۳ میں ہے۔ اذ تقول للمؤمنین الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلٰثۃ الاٰف من الملئکۃ منزلین۔ چنانچہ جب جنگ شروع ہوئی تو بہت سے آدمی کفار کے مارے گئے اور کثرت سے زخمی ہوگئے۔ یہاں تک کہ ان کا صاحب لواء بھی مارا گیا۔ بلکہ یکے بعد دیگرے نو آدمی جن کے ہاتھ میں جھنڈا آیا مارے گئے اور یہاں تک لشکر کفار کو نقصان پہنچا۔ کہ ان کو سوائے بھاگنے کے کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ کیونکہ بالخصوص تیراندازوں کی زد اُن پر بہت سخت پڑ تی تھی۔ اس طرح پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت کا وعدہ پورا کیا اور کفار نے پیٹھ دکھائی۔ حس کے معنے قتل کرنے کے ہیں۔ کیونکہ قتل سے حس باطل کر دی جاتی ہے ✤

۵۲۷۔ حتیٰ اذا فشلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم من بعد ما اراکم ما تحبون۔ یہاں تک کہ تم نے کمزوری دکھائی اور حکم کے معاملہ میں جھگڑا کیا۔ اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ خدا نے تمھیں وہ کچھ دکھا یا تھا جو تم چاہتے تھے۔ یہ اب جنگ کا دوسرا مرحلہ ہے۔ کفار بھاگ گئے۔ مسلمان تعاقب میں ہیں۔ تیرانداز جس مقام پر متعین ہیں۔ وہ ایک ایسا مقام ہے کہ بھاگتی ہوئی فوج ان کی زد کے نیچے ہے۔ اُن کو حکم ہے کہ خواہ مسلمانوں کو فتح ہو یا شکست تم نے یہ مقام کسی صورت میں نہیں چھوڑنا۔ مگر ان میں سے ایک حصہ کمزوری دکھاتا ہے۔ وہ کمزوری

آیت ۱۴۵

تیار کرنا پڑتا ہے۔ یہاں صحابہ کو بھی تسلی دی ہے۔ کہ جنگ کرنا ربی یعنی خدا سے تعلق رکھنے والا ہونے کے خلاف نہیں۔ بلکہ درحقیقت انسان کو اپنے کمال تک پہنچنے کے لیئے اس ضرورتِ انسانی یعنی جنگ میں سے بھی ہو کر گذرنا پڑتا ہے۔ اور بہت سے اخلاق ہیں جن کی تکمیل بغیر جنگ میں ہو کر گذرنے کے ہو ہی نہیں سکتی +

۵۲۳۔ فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما استکانوا۔ یہاں یہ بتایا کہ وہ اپنی حکومت قائم کرنے کے لیئے جنگ نہیں کرتے نہ اپنی خواہش سے لڑتے ہیں بلکہ فی سبیل اللہ یعنی جب اعدا خدا کے نام کو دنیا سے مٹانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ خدا کے نام لیواؤں کو تلوار کے ذریعہ سے نیست و نابود کر دیں۔ تو پھر اللہ تعالےٰ کسی نبی اور اس کے ساتھیوں کی چھوٹی سی جماعت کو ایک عظیم الشان اور طاقتور گروہ کے مقابل اور اُن کی سزا دہی کے لیئے کھڑا کر دیتا ہے۔ تا اپنی قدرت کا اظہار اس طرح پر کرے۔ ہاں اللہ کی راہ میں کام کرنے میں مصائب اور مشکلات بھی پیش آتی ہیں دُکھ بھی پہنچتے ہیں۔ مومن کو نہیں چاہیئے۔ کہ ان مصائب کی وجہ سے اس کا حوصلہ پست ہو جائے اور اس کی ہمت کمزور ہو جائے۔ نہ ہی اس کی طاقت اور قوت ان مشکلات کی وجہ سے کم ہوتی ہے۔ جب دل مضبوط ہوگا تو جسم میں بھی خود طاقت ہوگی۔ اور نہ ہی دشمن کے سامنے مومن کبھی عاجزی کا اظہار کرتا ہے +

رکوع ۱۶/۷ آیت ۱۴۸

۵۲۴۔ ان تطیعوا الذین کفروا یردوکم علےٰ اعقابکم۔ احد کے جنگ میں تین سو منافق کیوں الگ ہو گئے اس لیئے کہ انھوں نے سمجھا کہ کافروں کی عظیم الشان طاقت اور فوج کا مقابلہ بھلا یہ چند لوگ کیونکر کر سکتے ہیں۔ اس لیئے کیوں نہ اُن کی اطاعت ہی قبول کر لی جائے۔ اس قسم کی کمزوری کے خیالات کا جواب دیا کہ اگر تم ان کافروں کی اطاعت اختیار کر لوگے تو وہ تم کو تمہاری ایڑیوں پہ لوٹا دیں گے۔ یعنی جس گند میں سے تم نکلے ہو اسی میں تم کو پھر واپس کر دیں گے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا لا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان استطاعوا یعنی وہ تو اس حد تک مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ کہ اگر انکے بس میں ہو تو دین اسلام سے تم کو لوٹا دیں۔ تو پس ایسے حالات میں کفار کی اطاعت کو قبول کرنا گویا دین اسلام کو چھوڑنا تھا۔ اس لیئے فرمایا۔ کہ ایسے کمزور خیالات کو دل میں جگہ مت دو۔ خطاب میں یاایھا الذین امنوا یعنی مومن ہیں اس لیئے کہ ان کو متنبہ کیا ہے۔ کہ ایسے خیالات کو دل میں جگہ نہ دیں۔ اور یوں ظاہر میں منافق بھی ایمان کا دعوےٰ کرتے تھے۔ اور کمزوری کے خیال کو یوں دُور فرمایا۔ بل اللہ مولٰکم وھو خیر الناصرین۔ تمہارا مددگار اللہ تعالےٰ ہے۔ اور وہ بہتر مدد دینے والا ہے۔ پس ایک اُسی کی نصرت پر بھروسہ رکھو +

۱۵۰

۵۲۵۔ سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب۔ کافروں کے دلوں میں ہم رُعب ڈال دیں گے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نصرت بالرعب مسیرۃ شھر اور خود احد کے میدان میں آخر رُعب اسلامی نے

۱۵۱ جاں نثاری کے ان نمونوں کو ظاہر کیا جو بغیر اس کے مخفی رہ جاتے +

۵۲۹۔ ولقد عفا عنکم۔ اس قصور کو جو مسلمانوں سے ہوا۔ اللہ تعالےٰ نے معاف کر دیا۔ سب سے بڑا قصور تو انہی تیراندازوں کا تھا جنہوں نے حکم کی خلاف ورزی کی۔ مگر بعد میں جو فوج پریشان حالت میں اور منتشر تھی دشمن کے حملے کی وجہ سے کچھ لوگ کٹ کر الگ ہو گئے۔ گو وہ تعداد میں بہت تھوڑے تھے۔ مگا اللہ تعالےٰ نے سب کو معاف کر دیا جس طرح پر تھوڑوں کی نافرمانی کی وجہ سے سب کو دکھ پہنچا۔ اسی طرح جو نمونہ جاں نثاری کا بہتوں نے دکھایا اُن کی وجہ سے تھوڑوں کا قصور بھی اللہ تعالےٰ نے معاف کر دیا +

۱۵۲ ۵۳۰۔ اذ تصعدون ولا تلوٗن علی احد۔ یہ جنگ کا چوتھا مرحلہ ہے۔ کہ جب کفار کے تعاقب کی بجائے اب مسلمان خود اپنی مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ اور کفار کے حملہ کی زد میں آ گئے۔ اور بوجہ بے ترتیبی کے اب یہ حالت ہو گئی۔ کہ سب اپنی اپنی فکر میں بھاگے جا رہے ہیں۔ اور کوئی دوسری طرف مڑ کر دیکھتا بھی نہیں تھا +

۵۳۱۔ والرسول یدعوکم فی اخرٰکم۔ یہ پانچواں مرحلہ ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب اس بے ترتیبی کی حالت دیکھی تو اجتماع اور ترتیب کے لیئے آپ نے باآواز بلند پکارنا شروع کیا الیّ عباد اللہ انا رسول اللہ میری طرف آجاؤ۔ میں اللہ کا رسول ہوں۔

ایسے خطرناک موقعہ پر اپنے آپ کو آگے بڑھانا۔ اور دشمن کے حملہ کی زد میں لانا نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کمال شجاعت کو دکھاتا ہے۔ اور ظاہر کرتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالےٰ کی نصرت پر کس قدر بھروسہ تھا۔ اور واللہ یعصمک من الناس کے وعدہ پر کس قدر یقین تھا۔ کہ میدان جنگ میں دشمن کے غلبہ کے وقت آپ سب سے آگے ہوتے اور گویا دشمن کو اپنے اوپر حملہ کرنے کے لیئے بلاتے ہیں۔ یہی نقشہ آپ کی قوت قلبی کا میدان حنین میں نظر آتا ہے۔ جب مسلمانوں کی جمعیت دشمن کی سخت تیراندازی کی وجہ سے پریشان ہو گئی اور لوگ بالکل تاب مقابلہ نہ لا کر منتشر ہوتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ تو اُس وقت آپ دشمن کی صفوں کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب۔ میں نبی ہوں کوئی جھوٹ نہیں۔ میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔ احد کے میدان میں منتشر فوج کو جمع کرنے کے لئے آپ نے اپنی جان کی پرا نہیں کی۔ اور اس طرح یہ نمونہ دکھایا کہ ایک جرنیل کو میدان جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لیئے اپنے آپ کو کس طرح آگے کرنا چاہیئے۔ اور اپنے سپاہیوں کو یہ دکھانا چاہیئے۔ کہ وہ اپنی جان کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی اس آواز کا ہی یہ نتیجہ تھا۔ کہ مسلمانوں نے آپ کے گرد جمع ہونا شروع کیا۔ اور مسلمانوں کی منتشر جمعیت مجتمع ہو گئی +

۵۳۲۔ فاثابکم غما بغم لکیلا تحزنوا علی ما فاتکم ولا ما اصابکم۔ اثاب کے معنے ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کا دیدینا بھی ہیں۔ پس معنے یہ ہوئے کہ پھر اللہ تعالےٰ نے ایک غم کی جگہ دوسرا غم تم کو دے دیا۔ تاکہ تم غم نہ کرو۔ اس پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور نہ اس پر جو تم کو مصیبت پہنچی۔ یہ جنگ احد کا چھٹا مرحلہ ہے

۵۲۷

کیا ہے۔ اس کا ذکر آگے کیا ہے منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الاٰخرۃ۔ ان تیراندازوں میں دو گروہ ہو گئے ایک کے دل میں دُنیا کا لالچ آ گیا۔ اور اُنھوں نے کہا کہ ہم بھی مالِ غنیمت کے حاصل کرنے میں شریک ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اس سے محروم رہ جائیں۔ دوسروں نے کہا نہیں ہم کو یہاں رہنے کا حکم ہے۔ مال لینا ہماری غرض نہیں یہ یرید الاٰخرۃ والا گروہ ہے۔ پس دونوں میں تنازع ہؤا۔ جس کا ذکر تنازعتم فی الامر میں ہے۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ زیادہ حصّہ تیراندازوں کا اپنی جگہ چھوڑ گیا۔ اس لیئے فرمایا عصیتم۔ تم نے نافرمانی کی۔ کیونکہ حکم تھا۔ کہ جگہ نہ چھوڑنا۔ اور نافرمانی بھی مشکلات کے ماتحت نہیں کی۔ بلکہ خدا کے وعدہ کو پورا ہوتے دیکھ کر بھی نافرمانی کی +

یہاں بظاہر فشلتم۔ تنازعتم۔ عصیتم میں سب مسلمان مخاطب نظر آتے ہیں۔ مگر قرآن کریم کا قاعدہ ہے۔ کہ ایک قوم میں سے جب بعض لوگ ایک ایسا فعل کرتے ہیں جس کا اثر ساری قوم پر پڑتا ہے۔ تو اس کو ساری قوم کی طرف ہی منسُوب کرتا ہے۔ ان تینوں امور کے مرتکب صرف تیراندازوں میں سے چالیس آدمی تھے۔ مگر اس کا اثر ساری قوم پر پڑا +

۵۲۸۔ ثم صرفکم عنھم لیبتلیکم۔ پھر تم کو ان سے پھیر دیا تاکہ تم کو ایک امتحان میں ڈالے۔ خدا تعالےٰ کا ابتلا یا امتحان میں ڈالنا کسی ایسی محنت یا مشقت میں ڈالنا ہوتا ہے۔ جس سے اچھے انسانوں کے اچھے اور نکموں کے ردّی خصائل ظاہر ہو جائیں۔ مفردات میں ہے اذا قیل ابتلی فلان کذا وابلاہ فذالک یتضمن امرین احدھما تعرف حالہ والوقوف علیٰ مایجھل من امرہ والثانی ظھور جودتہ ورداءتہ۔ یعنی ابتلا میں دو مفہوم ہیں ایک کسی شخص کے حال کو پہچان لینا اور جس کا علم نہ ہو اس پر واقف ہو جانا۔ اور دوسرے اس کی جودت اور رداءت کا اظہار۔ یہ جنگ کا تیسرا مرحلہ ہے کہ کفار تیراندازوں کی جگہ کو خالی پاکر اور اُن کی زد سے محفوظ ہو جانے کی وجہ سے پھر کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ مسلمان کفار سے کچھ حاصل کریں ان کی زد کے نیچے آ جاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ یہ ہم نے اس لیئے کیا کہ جو تم میں اعلےٰ جوہر رکھتے ہیں ان کے جوہر اس میدان میں ظاہر ہوں چنانچہ صحابہ نے اس موقعہ پر جانفشانی کے ایسے ایسے نمونے دکھائے ہیں جو ہمیشہ کیلئے نمونہ کا کام دینگے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر چونکہ کفار کے حملہ کی اصلی زد تھی۔ اس لیئے آپ کے گرد صحابہ کا ایک گروہ جمع ہو جاتا ہے۔ اور ایک دیوار آپ کے گرد بن جاتی ہے۔ جو دشمن کی طاقت کی پوری زد کا نشانہ ہے۔ مگر وہ دیوار وہاں سے ہلتی نہیں۔ اور کفار کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے سے ایسا روکتی ہے کہ لوہے کی دیوار بھی نہیں روک سکتی۔ ایک صحابی ابودجانہ کا ذکر لکھا ہے۔ کہ وہ دشمن کی طرف پیٹھ کیئے ہوئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈھال بنا ہؤا کھڑا تھا۔ اور جو تیر اس پر آکر لگتا اسے نکال کر دوسرے ساتھی کو دیتا۔ کہ دشمن پر چلائے۔ غرض کہ اس مصیبت کے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ نے صحابہ کی

۱۵۳
۵۲۴- وطائفۃ قد اھمتھم انفسھم -ایک گروہ ایسا تھا- کہ اُن کو اپنی ہی جانوں کی فکر پڑی ہوئی تھی- منافقین کا گروہ عبداللہ بن ابی کے ساتھ جنگ کے شروع ہونے سے پہلے ہی واپس ہو گیا تھا- اب جو مسلمانوں کی تکلیف کا حال سُنا تو لگے طرح طرح کی باتیں بنانے- یظنون باللہ غیر الحق ظن الجاھلیۃ اہل جاہلیت کی طرح یعنی کفار کی طرح بدگمانی کرنے لگے- کہ اگر آنحضرت صلعم خدا کی طرف سے ہوتے- تو یہ تکلیف کیوں اُٹھاتے- پھر کچھ اپنے مشوروں کو اہمیت دینی شروع کی یقولون ھل لنا من الامر من شیئ- ہمارا بھی کچھ اختیار ہوتا- لوکان لنا من الامر شیئ ما قتلنا ھٰھنا- اگر ہماری بات مان لیجاتی تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے- عبداللہ بن ابی کا مشورہ یہ تھا- کہ مدینہ میں ہی رہ کر جنگ کی جائے- اب اس نے اپنے اس مشورہ کے درست ہونے پر زور دینا شروع کیا- کہ اگر میری بات مان لیجاتی تو یہ مصیبت کیوں پیش آتی- ما قتلنا سے مراد مدینہ والوں میں سے بعض کا قتل ہونا ہے- نہ کہنے والوں کا قتل ہونا- اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض کے متعلق کوئی امر ہو تو اسے ساری قوم کے متعلق بیان کر دیا جاتا ہے +

۵۲۵- لوکنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیھم القتل الی مضاجعھم- منافقین کی ان بیہودہ گوئیوں کا یہ جواب دیا ہے کہ جن مسلمانوں نے جان نثاری کی ہے اور خدا کی راہ میں شہید ہو گئے ہیں- وہ تو خدا کی راہ میں اس طرح جان دینے کو تیار تھے- کہ مدینہ میں رہ کر جنگ ہوتی تو وہ کوئی اپنے گھروں میں چھپے نہ بیٹھے رہتے بلکہ دشمن کے مقابلہ پر نکل کر جان نثاری کا سچا نمونہ دکھاتے- لوکنتم فی بیوتکم سے مراد یہی معلوم ہوتی ہے کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کرتے- ورنہ یوں تو منافق اپنے گھروں میں ہی رہے تھے- یہ بتانا مقصود ہے کہ جو شہید ہوئے اُنھوں نے تو جان نثاری دکھائی- اور خدا کی راہ میں اپنے آپ کو قربان کر دیا- جنگ یہاں ہوتی یا وہاں ہوتی وہ تو اسی طرح اپنے آپ کو قربان کر دیتے +

۵۲۶- ولیبتلی اللہ ما فی صدورکم ولیمحص ما فی قلوبکم- اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ بعض سینوں کے اندر مخفی تھا وہ اللہ تعالےٰ نے ظاہر کر دیا- جن دلوں میں منافقت اور کھوٹ تھا- اُن کا کھوٹ ظاہر ہو گیا اور جن کے دلوں میں بعض کمزوریاں تھیں ان کی تمحیص کر دی گئی- یعنی انکی کمزوریاں دور کر دی گئیں-

۱۵۴
۵۲۷- ان الذین تولوا منکم یوم التقی الجمعٰن انما استزلھم الشیطٰن ببعض ما کسبوا ولقد عفا اللہ عنھم- وہ لوگ جو تم میں سے بھاگ گئے اس دن جب دو جماعتوں میں مٹ بھیڑ ہوئی شیطان نے اُن کو لغزش میں ڈالا بوجہ بعض اُن باتوں کے جو اُنھوں نے کیں اور اللہ تعالےٰ نے اُن کو معاف کر دیا- یہاں بظاہر ان لوگوں کا ذکر معلوم ہوتا ہے جو جنگ میں شامل تو ہوئے- مگر میدان جنگ سے بھاگ گئے کیونکہ منافق التقی الجمعٰن سے پہلے ہی واپس چلے گئے تھے- بھاگنے کے وجوہات کا ذکر پہلے ہو چکا ہے- جب تیر اندازوں کے جگہ چھوڑ دینے کی وجہ سے کفار کا ہزیمت خوردہ لشکر لوٹا اور مسلمانوں پر حملہ آور ہوا تو مسلمانوں کی فوج بوجہ تعاقب کے پراگندہ حالت میں تھی- اور یکمر تبہ ایک بڑی فوج کے حملہ کے سامنے وہ اپنی جمعیت

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی آواز پر دشمن نے اپنے حملہ کا پورا زور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ڈالا۔ اور قبل اسکے کہ صحابہ آپ کے گرد جمع ہو سکیں۔ آپ کو سخت زخم پہنچے۔ یہاں تک کہ آپ گر گئے۔ ادھر اس آواز نے منتشر ہوئے ہوئے مسلمانوں کو اکٹھا کر دیا مسلمانوں کو پہلا غم تو یہ تھا۔ کہ دشمن اُن کے تعاقب سے بچ گیا اور الٹا ان کو مصیبت پہنچی۔ مگر اب جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حالت کو دیکھا تو وُہ اپنا غم بھول گئے اور اس کی جگہ اللہ تعالے نے یہ دوسرا غم دے دیا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ بتایا ہے۔ کہ تا جو غنیمت تمہارے ہاتھ سے نکل گئی اور دشمن بچ کر چلا گیا۔ اِس پر تم کو افسوس نہ رہے اور نہ ہی جو دکھ اور مصیبتیں مسلمانوں کو پہنچیں ان پر کچھ افسوس ہو کیونکہ رسول اللہ صلعم سے جو محبت مسلمانوں کو تھی وہ ایسی شدید تھی۔ کہ آپ کی تکلیف کو دیکھتے ہی اونھیں اپنے سب غم بھول گئے۔ وہاں میدان جنگ میں تو مرد تھے۔ جو رسول اللہ صلعم کو ادنے اتکلیف سے بچانے کیلئے اپنی گردنیں کٹوانے کو تیار تھے۔ بلکہ اسی میں راحت پاتے تھے۔ مدینہ میں عورتوں نے اپنے رشتہ داروں اور بیٹوں بھائیوں وغیرہ کی شہادت پر افسوس نہیں کیا جب اُن کو یہ معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر ایک واقعہ ایک بی بی کا لکھا ہے کہ اسے خبر دی گئی کہ اس کا باپ اور اسکا بیٹا اور اسکا خاوند جنگ میں شہید ہو گئے تو اُس نے دریافت کیا۔ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو زندہ ہیں لوگوں نے کہا ہاں تو اس نے کہا کل مصیبۃ بعدک جلل۔ آپ کے بعد ہر ایک مصیبت ایک حقیر شے ہے یہ وہ محبت تھی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہؓ مرد اور عورتوں کو تھی۔ اور در حقیقت صحابہؓ کی محبت کا نقشہ ہی اس حدیث میں کھینچا گیا ہے۔ لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین۔ تم میں سے کوئی ایمان نہیں لاتا جب تک کہ میں اُس کے نزدیک اُس کے باپ اور اُس کے بیٹے اور سارے لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔ اس کامل ایمان کا نقشہ صحابہ کی زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتا ہے +

۱۵۲ ۵۳۳۔ ثم انزل علیکم من بعد الغم امنۃ نعاسا۔ پھر غم کے بعد تم پر امن نازل کیا۔ نینْد کی حالت یا سکون کی حالت مفردات میں ہے النعاس النوم القلیل یعنی نعاس ہلکی نیند کو کہتے ہیں جیسے اُونگھ۔ اور اسی میں ہے وقیل کنایۃ عن السکون والھدو۔ یعنی نعاس کا لفظ کنایہ ہے سکون اور آرام کی حالت سے یہ جنگ احد کا ساتواں اور آخری مرحلہ ہے مسلمان آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے ہیں اور کفار ان کے انتشار کو پھر اجتماع کے رنگ میں دیکھ کر میدان جنگ چھوڑ گئے۔ اور مسلمان اسی میدان میں رہے۔ اور دشمن کی طرف سے ایسے مطمئن ہوئے کہ بعض کو نیند آ گئی۔ یا کامل سکون کی حالت وارد ہو گئی۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مسلمانوں نے گو تکلیف اٹھائی مگر شکست نہیں کھائی۔ کیونکہ میدان جنگ میں وہ موجود رہے اور ایسے اطمینان کی حالت میں تھے اور دشمن کی طرف سے ایسے بے خوف کہ بعض کو نیند بھی آ گئی۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر دشمن کی طرف سے کچھ خوف و خطر ہوتا تو نیند نہ آ سکتی تھی +

کفار مدینہ پر حملہ آور نہ ہوتے۔ ان بھاگنے والوں میں سے جو دو چار آدمی مدینہ میں پہنچے۔ لکھا ہے کہ جب وہ اپنے گھروں میں گئے تو ان کی بیبیوں نے ان کے مونھوں پر مٹی ڈالی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر تم بھاگ آئے ہو۔ یہ چرخے لو اور بیٹھ کر کاتنا شروع کردو۔

بھاگنے والوں میں کون کون تھے۔ اکثر روایات میں صرف حضرت عثمانؓ کا اور اُن کے ساتھ دو انصار سعد اور عقبہ کا نام پایا جاتا ہے۔ کسی ایک آدھ ناقابل اعتبار روایت میں حضرت عمرؓ کا نام بھی لے دیا گیا ہے۔ اسے میں ناقابل اعتبار اس لیئے کہتا ہوں کہ معتبر اور متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان جنگ میں تھے چنانچہ ذیل کا واقعہ صحیح حدیث بخاری میں پایا جاتا ہے جس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر میدان جنگ میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھے۔ بلکہ یہ بھی کہ آپ نے دشمن کے مقابلہ میں خاموش رہنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اور ابو سفیان کو جواب دیا۔ کہ ہم سب تجھے ذلیل کرنے کے لئے خدا کے فضل سے موجود ہیں۔ میں یہاں اس ساری روایت کو نقل کرتا ہوں۔ کیونکہ اس سے جنگ احد کے سارے واقعات پر روشنی پڑتی ہے +

عن البراء رضی اللہ عنہ قال لقینا المشرکین یومئذ واجلس النبی صلے اللہ علیہ وسلم جیشا من الرماۃ وامر علیہم عبد اللہ وقال لا تبرحوا ان رایتمونا ظہرنا علیہم فلا تبرحوا وان رایتموہم ظہروا علینا فلا تعینونا فلما لقینا ھربوا حتی رایت النساء یشتددن فی الجبل رفعن عن سوقھن قد بدت خلاخلھن فاخذوا یقولون الغنیمۃ الغنیمۃ فقال عبد اللہ عھد الی النبی صلے اللہ علیہ وسلم ان لا تبرحوا فابوا فلما ابوا صرف وجوھھم فاصیب سبعون قتیلا واشرف ابو سفیان - فقال افی القوم محمد فقال لا تجیبوہ فقال افی القوم ابن ابی قحافۃ قال لا تجیبوہ فقال افی القوم ابن الخطاب - فقال ان ھؤلاء قتلوا فلو کانوا احیاء لاجابوا فلم یملک عمر نفسہ فقال کذبت یا عدو اللہ ابقی اللہ علیک ما یخزیک قال ابو سفیان اعل ھبل فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجیبوہ قالوا ما نقول قال قولوا اللہ اعلی واجل قال ابو سفیان لنا العزی ولا عزی لکم فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجیبوہ قالوا ما نقول قال قولوا اللہ مولانا ولا مولی لکم قال ابو سفیان یوم بیوم بدر والحرب سجال وتجدون مثلۃ لم امر بھا ولم تسؤنی +

براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فرمایا ہماری اس دن مشرکوں سے مٹ بھیڑ ہوئی۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر تیر اندازوں کا (ایک خاص موقعہ پر) بٹھا دیا۔ اور اُن پر عبد اللہ کو امیر مقرر کیا۔ اور فرمایا تم نے جگہ نہ چھوڑنا۔ اگر تم دیکھو کہ ہم ان پر غالب آگئے ہیں۔ تو اپنی جگہ مت چھوڑو۔ اور اگر تم دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آگئے ہیں۔ تو تم ہماری مدد مت کرو (یعنی ہماری مدد کے لیئے اپنی جگہ نہ چھوڑو)

تفسیر رازی

کو قائم نہ رکھ سکے۔ اسی حالت میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے آواز دے کر لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہا۔ مگر ایسی حالت میں سب کا جمع ہونا محال تھا۔ بعض لوگ بالکل علیحدہ ہو گئے اور ان کے لیئے اصل جمعیت کے ساتھ ملنا مشکل ہو گیا۔ بعض ایسے لوگ میدان جنگ سے بھاگ گئے۔ اور اُن کے قدموں کو لغزش آگئی۔ کیونکہ خواہ کچھ بھی واقعات ہوں۔ میدان جنگ سے بھاگنا اللہ تعالےٰ کو مسلمانوں کے لیئے پسند نہ تھا۔ اور وہ تھوڑی دیر اور انتظار کرتے تو اصل جمعیت کے ساتھ ملجاتے۔ ہر ایک کمزوری کے فعل کو اللہ تعالےٰ نے شیطان کی طرف ہی منسوب کیا ہے۔ بعض ما کسبوا سے لازماً یہ مراد نہیں کہ بھاگنے والوں کا اپنا وہ فعل تھا۔ بلکہ مسلمانوں کی جماعت میں سے ایک حصہ نے کچھ ایسا کام کیا جس کی وجہ یہ لغزش ہوئی۔ وہ فعل کیا تھا اس کا ثبوت کافی سے زیادہ دیا جا چکا ہے کہ وہ تیر اندازوں کا اپنی جگہ کو چھوڑ دینا تھا۔ حالانکہ ان کو صریح حکم تھا۔ کہ وہ اس جگہ کو نہ چھوڑیں۔ پس تیر اندازوں کے اس فعل کی وجہ سے مسلمانوں کو ایک مصیبت کا سامنا پیش آیا۔ جس میں بعض لوگ اصل جمعیت اہل اسلام سے کٹ کر منتشر ہو گئے اور میدان جنگ سے بھاگ گئے ۔

اُن بھاگنے والوں کی تعداد کس قدر تھی۔ اور کون کون لوگ ان میں شامل تھے۔ یہ دو اہم سوال ہیں اوّل تعداد کا سوال ہے۔ روایات میں عموماً قیاس سے کام لیا گیا ہے۔ اس لیئے بعض نے کہدیا ہے کہ فوج کی ایک تہائی بھاگ گئی تھی اور ایک تہائی مجروح ہو گئے تھے۔ اور ایک تہائی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ یہ بالبداہت غلط ہے۔ کیونکہ سات سو کی کل جمعیت مسلمانوں کی تھی۔ اگر انہیں سے صرف دو سو آدمی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ گئے ہوتے تو تین ہزار کفار کی فوج اُن کو میدان جنگ پر قابض چھوڑ کر مکہ کو واپس ہو جاتی۔ بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ صرف چودہ یا سترہ آدمی رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہ گئے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد صرف وہ آدمی ہیں جو کفار کے دوبارہ حملہ کی ابتدا میں آنحضرت صلعم کے ساتھ رہ گئے تھے۔ کیونکہ سب لوگ تعاقب میں مصروف تھے۔ امام رازی جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہی درست معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ والذی تدل علیہ الاخبار فی الجملۃ ان نفرا منہم تولوا وابعدوا فمنہم من دخل المدینۃ ومنہم من ذھب الی سائر الجوانب واما الاکثرون فانہم نزلوا عند الجبل واجتمعوا ھناک یعنی مختلف روائتیں جس بات پر دلالت کرتی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ان میں سے ایک نفر بھاگ گئے تھے اور دور چلے گئے تھے (عربی زبان میں نفر کا لفظ تین سے نو تک یا دس سے کم آدمیوں کے گروہ پر بولا جاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ بھاگنے والوں کی تعداد دس سے کم تھی) ان میں سے بعض مدینہ میں داخل ہوئے۔ اور بعض دوسری اطراف میں بھاگ گئے۔ لیکن کثیر حصہ فوج کا پہاڑ کے پاس ہی رہا اور وہیں جمع ہو گئے۔ اور یہی حق ہے کیونکہ اگر مسلمانوں کی فوج کا کثیر حصہ مدینہ اور کفار کے لشکر کے درمیان حائل نہ ہوتا۔ تو کوئی وجہ نہ تھی کہ

اپنی ذات پر ستم ہو تو خاموش ہو رہنا اچھا ہے۔ لیکن اگر حق پر ستم ہو تو اُس وقت انسان کو خاموش نہیں رہنا چاہیئے۔ اِس حدیث سے صاف ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان جنگ میں موجود تھے ہاں حضرت عثمانؓ بھاگنے والوں میں سے تھے۔ اور شیعہ اور خوارج نے یہ طعن آپ پر کیا ہے۔ گو یہ طعن تعجب کی جگہ ہے۔ جب اللہ تعالےٰ خود فرماتا ہے ولقد عفا اللہ عنھم۔ جو کچھ بھی ان کا اس میں قصور تھا۔ اللہ تعالےٰ نے اسے معاف کر دیا۔ پس جس کو اللہ تعالےٰ معاف کر دے اس کا ذکر کرنا اور اس کی بناء پر پاک اِنسانوں پر حملہ کرنا خود شقیوں کا کام ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمرؓ کے سامنے اس طعن کا ذکر ہُوا۔ جو جواب آپ نے دیا وہی دُہرا دینا کافی ہے۔ اِس جواب میں حضرت عثمان کے بدر اور بیعۃ رضوان سے غیر حاضر ہونے کے وجوہ بھی درج ہیں +

عن عثمان ابن موھب قال جاء رجل حج البیت فرای قوما جلوسا فقال من ھؤلاء القعود قالوا ھؤلاء قریش قال من الشیخ قالوا ابن عمر فاتاہ فقال انی سائلک عن شیء اتحدثنی قال انشدک بحرمۃ ھذا البیت اتعلم ان عثمان بن عفان فر یوم احد قال نعم۔ قال فتعلمہ تغیب عن بدر فلم یشھدھا قال نعم قال فتعلم انہ تخلف عن بیعۃ الرضوان فلم یشھدھا قال نعم قال فکبر قال ابن عمر تعال لاخبرک ولابین لک عما سألتنی عنہ اما فرارہ یوم احد فاشھد ان اللہ عفا عنہ واما تغیبہ عن بدر۔ فانہ کان تحتہ بنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وکانت مریضۃ فقال لہ النبی صلے اللہ علیہ وسلم ان لک اجر رجل ممن شھد بدرا وسھمہ واما تغیبہ عن بیعۃ الرضوان فانہ لو کان احد اعز ببطن مکۃ من عثمان بن عفان لبعثہ مکانہ فبعث عثمان وکان بیعۃ الرضوان بعد ما ذھب عثمان الی مکۃ فقال النبی صلے اللہ علیہ وسلم بیدہ الیمنی ھذہ ید عثمان فضرب بھا علی یدہ فقال ھذہ لعثمان اذھب بھذا الاٰن معک (بخاری)

عثمان بن موہب سے روایت ہے انھوں نے کہا ایک شخص نے بیت اللہ کا حج کیا۔ اُس نے وہاں کئی لوگوں کو بیٹھے دیکھا اور پوچھا یہ کون لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اُنھوں نے کہا قریش ہیں۔ اس نے کہا یہ بوڑھا ان میں کون ہے۔ اُنھوں نے کہا ابن عمرؓ۔ سو وہ شخص حضرت ابن عمر کے پاس آیا اور کہنے لگا میں آپ سے کچھ سوال کرتا ہوں۔ کیا آپ بتلائیں گے۔ چنانچہ اُس نے کہا میں تم کو اس گھر کی حرمت کی قسم دیتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ عثمان بن عفان احد کے دن بھاگ گئے تھے۔ فرمایا ہاں۔ اُس نے کہا کیا تم جانتے ہو کہ وہ بدر کے دن غایب تھے اور اس میں شریک نہ تھے فرمایا ہاں۔ کہا کیا تم جانتے ہو وُہ بیعت رضوان سے پیچھے رہ گئے اور اس میں شریک نہیں ہوئے۔ فرمایا ہاں۔ اس شخص نے کہا اللہ اکبر (گویا حضرت عثمان پر یہ مطاعن قایم کیئے) ابن عمر نے کہا آؤ میں تمکو بتاؤں اور جو کچھ تمنے پوچھا ہے اسکو کھولدوں احد کے دِن ان کا بھاگ جانا سو میں گواہی دیتا ہوں۔ کہ اللہ تعالےٰ نے اسے معاف کر دیا۔ اور بدر کے دن

پس جب جنگ ہوئی کافر بھاگ گئے۔ یہاں تک کہ میں نے ان کی عورتوں کو دیکھا۔ پہاڑ میں مصیبت کے ساتھ چڑھی جا رہی تھیں۔ اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اونچا کیا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ اُن کی پازیبیں دکھائی دے رہی تھیں۔ پس تیر اندازوں نے کہنا شروع کیا۔ غنیمت غنیمت۔ عبد اللہ نے کہا کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے مضبوط حکم دیا ہے کہ اس جگہ کو مت چھوڑو۔ مگر اُنھوں نے انکار کیا۔ پس جب (تیر اندازوں نے) انکار کیا تو مسلمانوں کے مُونھ پھر گئے اور ستر مسلمان شہید ہوئے۔ ابو سفیان ایک اونچے مقام پر چڑھا۔ اور کہا کیا قوم میں محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ آپ نے فرمایا جواب نہ دو۔ پھر اُس نے کہا کیا قوم میں ابن ابی قحافہ (یعنی ابو بکر صدیق) ہیں۔ آپ نے فرمایا جواب نہ دو۔ پھر اُس نے کہا کیا قوم میں عمر بن خطاب ہیں تب اُس نے کہا یہ سب مارے گئے۔ اگر زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے۔ حضرت عمرؓ سے نہ رہا گیا۔ آپ نے فرمایا اے خدا کے دشمن تو جھوٹ بولتا ہے۔ اللہ نے ان لوگوں کو تجھے ذلیل کرنے کے لیئے زندہ رکھا ہے ابو سفیان نے کہا ہبل کی جے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس کو جواب دو صحابہ نے عرض کیا کیا کہیں فرمایا۔ کہو اللہ سب سے زیادہ بلند اور سب سے زیادہ بزرگی والا ہے۔ ابو سفیان نے کہا ہمارے لیئے عزّیٰ ہے اور تمہارے لیئے کوئی عزّیٰ نہیں۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو جواب دو۔ صحابہ نے عرض کیا۔ کیا کہیں فرمایا۔ کہدو۔ اللہ ہمارا مولیٰ (مددگار) ہے اور تمہارا کوئی مولیٰ (مددگار) نہیں ابو سفیان نے کہا یہ بدر کا بدلہ ہو گیا اور لڑائی ڈول کی طرح ہے۔ یعنی کبھی ایک طرف اونچی اور کبھی دوسری طرف اُونچی۔ اور بعض لاشوں میں تم مثلہ پاؤ گے۔ یعنی ناک کان وغیرہ کاٹے ہوئے۔ میں نے یہ حکم نہیں دیا اور نہ اسے بُرا مانتا ہوں ٭ (بخاری)

یہ حدیث نہ صرف مختصر الفاظ میں جنگ کے سارے واقعات کی جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے تائید کرتی ہے بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو احد میں بھاگنے والوں میں سے بتانے والے جھُوٹے ہیں آپ نہ صرف نبی صلّے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود ہیں بلکہ آپ کے قلب میں دشمن کے مقابلہ کی اسقدر قوت ہے کہ ابو سفیان کو کہدیا کہ ہم سب تجھے ذلیل کرنے کے لیئے زندہ موجود ہیں۔ تا اگر ابو سفیان میں طاقت ہے تو پھر مقابلہ کرے۔ مگر کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رُعب بیٹھ چکا تھا۔ اور اُنھوں نے مسلمانوں کو ایک مصیبت میں مشغول پا کر بھاگنے کا موقعہ غنیمت سمجھا۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے کیوں پہلے جواب سے روکا۔ کیونکہ ابو سفیان نے جو بات کہی تھی وہ صرف آپ کی یا آپ کے کسی صحابی کی ذات کے متعلّق تھی لیکن جبھی کہ اُبو سفیان نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ لوگ مارے گئے تو حضرت عمرؓ نے اس کو جواب دیا۔ کہ تو جھُوٹا ہے۔ ہم سب زندہ ہیں۔ گویا اسے بلایا کہ اگر تجھ میں طاقت ہے کہ ہم کو مار ڈالے تو اب بھی جنگ کر لے۔ اس کے بعد جب ابو سفیان نے اپنے بتوں کی بڑائی شروع کی تو نبی کریم صلّے اللہ علیہ وسلم کو توحید الٰہی کے لیئے اس قدر غیرت تھی۔ کہ اس موقعہ پر خاموش رہنا گوارا نہیں کیا۔ اس میں یہ سبق سکھایا ہے کہ

صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی سے سختی نہیں کی نہ کسی کو درشت لفظ کہا- بلکہ محبت بھرے کلام میں اُن سے گفتگو کی- اس آیت میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلق لینت کے کمال کو ظاہر فرمایا ہے- آنحضرت کی ذات بابرکات میں ہر قسم کے اخلاق فاضلہ اعلےٰ سے اعلےٰ پایہ کے پائے جاتے تھے- جیسا کہ آیت کریمہ انک لعلی خلق عظیم اس پر شاہد ہے- ان اخلاق کا ذکر قرآن کریم میں مختلف موقعوں پر آتا ہے- یہاں آپ کے خلق لینت کے کمال کو دکھایا گیا ہے +

ہر ایک خلق کا اظہار کامل رنگ میں اس وقت ہوتا ہے- جب اس کے اظہار کے مخالف موقعہ ہو- جنگ کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس میں نرمی کے اظہار کا موقعہ نہیں ہوتا- بلکہ انسان کے اندر جس قدر شدت ہے اس کا اظہار جنگ میں پورے زور کے ساتھ ہوتا ہے- لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ جب اُن احکام کی تعمیل میں جو کسی فوج کو دیئے گئے ہوں فروگذاشت ہو یا ان احکام کی تعمیل نہ ہو تو پھر قواعد جنگ اس امر کے مقتضی ہوتے ہیں کہ سخت سے سخت سزا دی جائے- پس اوّل تو موقعہ اظہار لینت کا نہیں بلکہ اظہار شدت کا تھا- دوسرے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی گئی- جس کی وجہ سے اس قدر عظیم مصیبت آپ کو اور مسلمانوں کو برداشت کرنی پڑی- اور یہ موقعہ سخت سے سخت سزا کو چاہتا تھا- مگر اس موقعہ پر نافرمانی کرنے والوں کو ایک حرف بھی ملامت کا نہ کہنا ظاہر کرتا ہے- کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم میں کس قدر کمال خلق لینت کا موجود تھا- کہ سخت سے سخت حالات کے ماتحت بھی- ہاں ان حالات کے ماتحت بھی جو بظاہر خلق لینت کے اظہار کے منافی معلوم ہوتے ہیں- آپ کے اندر اس خلق کا اظہار ہوتا ہے جو اللہ تعالےٰ نے اس کو اپنے تعریف کے موقعہ پر بیان فرمایا ہے- ورنہ آپ کے خلق لینت کے تو بے شمار نمونے تھے- دن رات خدام سے بی بیوں سے دوستوں سے دشمنوں سے نینت کا برتاؤ آپ فرماتے تھے- مگر یہ موقعہ اس خلق کے کمال کو دکھانے والا تھا +

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نرمی اور رحمت کے متعلق اور بھی بہت سی آیات قرآن کریم کی شاہد ہیں جیسا کہ فرمایا عزیز علیہ ما عنتم (کوئی دکھ تم کو پہنچے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے)- اور فرمایا واخفض جناحک للمومنین اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا انا لکم مثل الوالد- بلکہ والد سے بہت بڑھ کر شفقت اور محبت آپ کے دل میں بھری ہوئی تھی- نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس خلق کے اظہار میں یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ کے پیرو بھی اور بالخصوص وہ لوگ جو دوسروں کے لیئے پیشرو یا سردار کے طور پر ہوتے ہیں وہ اس قسم کے اخلاق اپنے اندر پیدا کریں تو ہی جماعت قائم رہ سکتی ہے- ورنہ کوئی جماعت نہیں بن سکتی +

۵۴۱- فاعف عنهم واستغفر لهم وشاورهم فی الامر- نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی لینت اور نرمی اسی حد تک محدود نہیں رہی کہ آپ نے غلطی کرنے والوں کو کوئی سخت لفظ نہیں کہا- بلکہ اس سے بڑھ کر اب یہ حکم

آیت ۱۵۴

ان کا غیر حاضر ہونا سو بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی اُن کے گھر میں تھیں اور وہ بیمار تھیں۔ سو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے (اُن کو تیمارداری کا حکم دیا اور) فرمایا کہ تم کو اتنا ہی ثواب ملیگا جتنا ایک شخص کو جو اس جنگ میں شریک ہوگا۔ اور ایک آدمی کا حصہ بھی مال غنیمت سے ملے گا۔ اور آپ کا بیعت رضوان سے غیر حاضر ہونا۔ سو بات یہ ہے کہ اگر عثمان سے زیادہ کوئی عزت اور شان والا مکہ میں ہوتا تو آنحضرت صلعم اسی کو مکہ والوں کی طرف بھیجتے سو آپ نے عثمان کو ہی بھیجا اور بیعت رضوان حضرت عثمان کی مکہ کو جانے کے بعد ہوئی پس آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنا دہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر مار کر فرمایا یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور اسے عثمان کی بیعت قرار دیا۔ اب جا اور ان باتوں کو ساتھ لے جا یعنی یاد رکھ +

پس حضرت عثمان یا دو چار اور صحابی جو بھاگے ہوں اُن کو اللہ تعالےٰ نے معاف کر دیا اور اصل قصور تیر اندازوں کا تھا۔ اُن کو بھی معاف کر دیا +

رکوع ۱۷ آیت ۱۵۵

۵۳۸۔ یایھا الذین امنوا لا تکونوا کالذین کفروا۔ مسلمانوں کو نصیحت فرمائی کہ منافقوں کی طرح تمہارے دلوں میں ایسے کمزوری کے خیالات نہ آئیں۔ قالوا لاخوانھم سے مراد ہے کہ اپنے بھائیوں کے حق میں کہتے ہیں یعنی ایسے رشتہ داروں کے متعلق جو جنگ میں شریک ہوئے اور مارے گئے۔ اُن کے متعلق منافق کہتے ہیں۔ لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا۔ اگر ہمارے پاس رہتے یعنی جس طرح ہم نے جنگ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا یہ بھی انکار کر دیتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے۔ اللہ تعالےٰ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ وہ تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب یہ حسرت ان کے دلوں کو کھاتی رہے گی۔ اور یہ ان کے لئے اسی دنیا میں آگ ہو گی +

۱۵۶

۵۳۹۔ ولئن قتلتم فی سبیل اللہ او متم لمغفرۃ من اللہ ورحمۃ خیر مما یجمعون۔ اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کیئے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی مغفرت اور رحمت بہت بہتر ہے۔ اس سے جو یہ جمع کر رہے ہیں اس میں مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ خدا کی راہ میں قتل ہو جانا یا خدا کی راہ میں کام کرتے کرتے مر جانا۔ یہ اس مال و دولت سے تو بہت بڑھ کر ہے جو یہ منافق جمع کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے جمع کیئے ہوئے مال تو آخر اُن کے لیئے حسرت کا موجب ہونگے۔ مگر مسلمانوں کو اللہ تعالےٰ اپنی حفاظت اور رحمت عطا فرمائے گا۔ جمع کیا ہوا مال انسان کو کسی مصیبت سے بچا نہیں سکتا۔ اس لیئے خدا کی راہ میں اپنی زندگیوں کو دینے کیلئے تم بہتر سامان اپنے لئے جمع کرو۔ یعنی اللہ کی حفاظت اور رحمت

۱۵۸

۵۴۰۔ فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک۔ اللہ کی کیسی بڑی رحمت ہے کہ تم اُن کے لیئے نرم ہو۔ اور اگر تم بد خلق سخت دل ہوتے تو تمہارے ارد گرد سے بھاگ جاتے۔ فظ اسے کہتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ درشتی سے پیش آئے سیئی الخلق ہو۔ غلیظ القلب سے یہ مراد ہے کہ اس کا دل کسی چیز سے متاثر نہ ہو۔ یعنی گو وہ بد خلق نہ ہو۔ مگر اس کے دل میں دوسروں کے لیئے رقت، محبت اور ہمدردی پیدا نہ ہو۔ لکھا ہے کہ جو لوگ احد کے دن بھاگ گئے تھے ان کی واپسی پر نبی کریم

۱۵۸

۵۴۲- فاذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ - بعض لوگ اپنی خواہشات کی پیروی کے لیئے اور خود بڑے بننے کے لیئے ان الفاظ کا یہ مطلب قرار دیتے ہیں - کہ جب تم خود کسی امر کا پختہ ارادہ کر لو تو پھر مشورہ کی ضرورت نہیں اللہ پر توکل کر لیا کرو - گویا اُن کے نزدیک توکل کے معنے یہ ہیں کہ اسباب سے کام نہ لیا جائے - حالانکہ یہ صحیح نہیں - توکل کے معنے یہ نہیں کہ اسباب سے کام نہ لو - بلکہ اس کا اصل مفہوم جس کی طرف قرآن کریم توجہ دلاتا ہے یہ ہے کہ اسباب سے کام لے کر نتیجہ کو خدا کے سپرد کرو - چنانچہ پیغمبر خدا صلے اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا اعقل و توکل - جس کا ترجمہ ہے پر توکل زانوئے اشتر بہ بند - یعنی اونٹ کا گھٹنہ باندھ کر - یا اسباب سے کام لے کر پھر توکل کرو - پس فرمایا کہ مشورہ کرو - مشورہ کے بعد جب ایک پختہ فیصلہ پر پہنچ جاؤ تو پھر نتیجہ کو اللہ پر چھوڑو - چنانچہ احد کے جنگ سے پہلے بھی یہی عملدر آمد نبی کریم صلے اللّٰہ علیہ وسلم کا تھا - آپ نے جنگ کے متعلق صحابہ سے مشورہ کیا - اور اس مشورہ کی بناء پر یہ پختہ فیصلہ کر کے کہ جنگ باہر نکل کر کرنا ہے - آپ نے تیاری کا حکم دیدیا اور خود بھی تیار ہو کر نکل آئے - تب بعض لوگوں نے خیال کیا کہ ہم نے رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کو مجبور کیا ہے کہ باہر نکل کر جنگ کیا جائے - اسلئے انھوں نے حاضر ہو کر کہا کہ یا رسول اللّٰہ اندر ہی رہ کر جنگ کیا جائے آپ نے فرمایا اب ایسا نہیں ہو سکتا - یہ عزمت فتوکل علی اللّٰہ پر عمل تھا - مگر عزم خود مشورہ کا نتیجہ تھا +

۱۶۰

۵۴۳- و ما کان لنبی ان یغل - غلول کے معنے ہیں خیانت - اور اصل میں کسی چیز کے خفیہ طور پر لینے کو کہتے ہیں - فرمایا نبی ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ خیانت کرے - کیونکہ نبی کو اللّٰہ تعالےٰ بچپن سے ہی ہر قسم کی بدی سے پاک رکھتا ہے - اور اس کی بعثت کی غرض دوسروں کو گناہوں سے پاک کرنا ہے - اگر وہ خود گنہگار رہو تو دوسروں کو گناہ سے کیا پاک کریگا - اس لیئے اللّٰہ تعالےٰ اس کو بناتا ہی ایسا ہے کہ اس کی فطرت گناہ سے پاک ہو - لفظ امانت اور خیانت عربی زبان میں وسیع مفہوم رکھتے ہیں - اور نبی کریم صلے اللّٰہ علیہ وسلم کا نام الامین آپ کی بعثت سے پہلے ایسا شہرت پا چکا تھا - کہ بچہ بچہ آپ کو الامین کے نام سے پکارتا تھا - پس ایسا شخص جس کے امین ہونے پر سارا ملک خود ہی شہادت دے چکا ہے - اس کی طرف کس طرح کسی قسم کی خیانت منسوب ہو سکتی ہے - بعض مفسرین کے نزدیک تو یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تیر اندازوں نے جو اپنی جگہ چھوڑی تو اُن کے دلوں میں یہ کمزوری کا خیال آیا کہ شاید ہمارا حصہ مال غنیمت سے نہ ملے - تو فرمایا کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ دُنیا کے مال میں خیانت کرے - کیونکہ اس کو دُنیا کے مال کی پرواہ کوئی نہیں ہوتی - اور بعض کے نزدیک ادائے وحی میں امانت کا ذکر ہے یعنی وحی کے معاملہ میں نبی بعینہ وہی پہنچاتا ہے جو اللّٰہ تعالےٰ کی طرف سے اُس پر نازل ہوتا ہے - اور بھی کئی اقوال اس میں ہیں +

نبی کریم صلے اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا - ھدایا العمال غلول - یعنی جو لوگ بطور حاکم مقرر ہیں انکا ہدیے لینا یہ بھی خیانت ہے یعنی اُن کا حق نہیں کہ ہدیوں کے بہانے لوگوں سے کچھ لیں - وہ اپنے کام کی تنخواہ پاتے ہیں

بقیہ نوٹ ۱۵۸

ہوتا ہے۔ کہ جو قصور ان سے ہو چکا ہے اس کو عفو کر دو۔ یعنے بالکل دل سے مٹا دو۔ اس طرح کہ اُس کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔ پھر اس سے بڑھ کر حکم دیا کہ ان کے لیئے حفاظت الٰہی طلب کرو۔ تا آئندہ ان سے ایسا قصور سرزد نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ یہاں استغفار کے معنے آئندہ گناہ اور قصور کے سرزد ہونے سے حفاظت طلب مانگنا ہے نہ پچھلے گناہوں کی معافی۔ کیونکہ پچھلے گناہوں کی معافی اول آیت ۱۵۲ میں تو اللہ تعالےٰ نے ان صریح الفاظ میں دی ہوئی تھی عفا اللّٰہ عنھم۔ اللہ نے ان کو معاف کر دیا۔ پھر اس آیت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بھی اُن سے عفو کرو اور ان سے ایسا معاملہ کرو کہ گویا یہ قصور ان سے سرزد ہی نہیں ہوا۔ تو اب خدا کی معافی کے بعد۔ رسول کی معافی کے بعد پھر جو حکم ہوتا ہے کہ ان کے لیئے استغفار کرو تو یہ استغفار ان گزشتہ گناہوں کی معافی کیلئے تو ہو نہیں سکتا۔ پس لازماً یہاں استغفار سے مراد آئندہ کے لیئے حفاظت کا طلب کرنا ہے تا پھر ان سے ایسا قصور سرزد نہ ہو تو یہ ان پر گویا ایک احسان ہے۔ اور عفو کے بعد احسان کا ہی مرتبہ ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ بھی عفو کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا۔ والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین۔ یعنی اوّل مرتبہ یہ ہے کہ جب دوسرے سے اس کے متعلق کوئی قصور سرزد ہو جائے تو غصہ کو دبائے۔ اس کے بالمقابل یہاں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی لینت کا ذکر کیا ہے کہ آپ نے کسی کو سخت لفظ سے مخاطب نہیں فرمایا۔ دوسرا مرتبہ قصور کا بالکل عفو کر دینا ہے۔ ایسا ہی حکم یہاں رسول اللہ صلعم کو ہوتا ہے۔ فاعف عنھم۔ پھر عفو کے بعد تیسرا مرتبہ فرمایا۔ کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کچھ احسان بھی کرو کہ ان کے لیئے اللہ تعالےٰ کی حفاظت طلب کرتے رہو تاکہ آئندہ اُن سے ایسا قصور سرزد نہ ہو یہ گویا واللہ یحب المحسنین کے مقابل پر ہے +

ان تین احکام کے بعد اب ایک اور حکم ہوتا ہے وشاورھم فی الامر۔ اُن سے مشورہ بھی ضروری امور میں لیتے رہو۔ اس میں گویا درحقیقت آنحضرت کی دعائے استغفار و حفاظت کی قبولیت کی طرف اشارہ ہے کہ جب اُن کے لیئے حفاظت طلب کرو گے تو اللہ تعالےٰ حفاظت عطا فرمائے گا۔ پس امور میں ان سے مشورہ بھی لیتے رہو۔ دوسرے اس لیئے مشورہ کا حکم یہاں دیا کہ چونکہ منافق کہتے تھے۔ کہ صحابہ کے مشورہ پر عمل کر کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ سے باہر نکلے تو یہ مصیبت اُٹھانی پڑی۔ گو اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے۔ لیکن اب اس غلط خیال کو دور کرنے کے لیئے یہ ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں سے مشورہ لیا کرو۔ یہ بھی قرآنی تعلیم کے کمالات میں سے ہے کہ مشورہ کا حکم ایسے موقعہ پر دیا جاتا ہے۔ جب بظاہر مشورہ پر عمل کرنے سے نقصان پیدا ہوا ہے۔ تاکہ یہ غلطی نہ لگے۔ کہ نقصان کی وجہ سے ایک نیک اصول کو ہی ترک کر دیا جائے۔ اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو تمام پاک اور نیک اصولوں پر قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیئے یہ سکھایا ہے کہ اس بات کی پروا بھی نہ کرو کہ نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ مشورہ پر عمل کرنا ایک ضروری اصول ہے۔ بس پر عمل پیرا ہونا ہر حال میں ضروری ہے +

کام جماعت کی طرف ہی منسوب ہوتا ہے +

۱۶۵ ۵۴۸- ولیعلم المومنین ولیعلم الذین نافقوا۔ تاکہ جان لے مومنوں کو اور جان لے اُن کو جو منافق ہو چکے ایک علم تو اللہ تعالےٰ کا یہ ہے کہ کوئی واقعہ کس طرح ہوگا۔ مثلاً کون منافق ثابت ہوگا۔ اور کون مومن اور دوسرا علم اس واقعہ کے ہو جانے کا ہے۔ اس لئے فرمایا الذین نافقوا۔ تاکہ اُن لوگوں کو جان لے جو منافق ہو چکے۔ احد کے جنگ نے منافقوں کو الگ کر دیا۔ اس سے پہلے وہ مسلمانوں کے اندر ملے ہوئے تھے +

۱۶۶ ۵۴۹- قاتلوا فی سبیل اللہ او ادفعوا۔ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دشمن کو اپنے سے ہٹا دو۔ یہاں سمجھایا ہے کہ اگر ایک اعلےٰ مقصد کو مدنظر رکھ کر جنگ نہیں کرتے جو قتال فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی حق کی حمایت میں لڑنا یا اس لیئے جنگ کرنا کہ تا حق نیست و نابود نہ ہو جائے۔ تو پھر اس لیئے ہی جنگ کرو کہ اپنے آپ سے دشمن کی مدافعت کرو۔ کیونکہ دشمن تو اس بات پر تلا ہوا ہے کہ تم کو بھی نیست و نابود کر دے۔ پس حق کی حمائت میں نہیں لڑتے تو اپنے آپ کو بچانے کے لیئے ہی لڑو +

۵۵۰- لو نعلم قتالا لا تبعنٰکم۔ اگر ہم جنگ جانتے تو ضرور تمہاری پیروی کرتے۔ مطلب یہ کہ یہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ یہ جنگ نہیں۔ کیونکہ ایسے طاقتور دشمن کے ساتھ اس قدر تھوڑے آدمیوں سے کیونکر مقابلہ ہو سکتا ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم جانتے کہ جنگ ہوگا تو ہم تمہارے ساتھ چلتے +

۱۶۷ ۵۵۰ الذین قالوا لاخوانھم وقعدوا لو اطاعونا ما قتلوا۔ وہ لوگ جو اپنے بھائیوں کے بارہ میں کہتے ہیں اور خود جنگ سے پیچھے ہٹ کر بیٹھے رہے۔ کہ اگر وہ بھی ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے یعنی منافق اپنے اُن بھائی بندوں کا جو مومن تھے اور جنگ میں شہید ہو گئے ذکر کر کے کہتے تھے کہ اُنھوں نے ہماری بات کو نہ مانا ورنہ جیسے ہم واپس آگئے تھے وہ بھی واپس آجاتے تو کیوں قتل ہوتے جواب میں فرمایا فادرؤا عن انفسکم الموت ان کنتم صٰدقین۔ اگر محض جنگ کو ٹال کر ہی موت سے بچ سکتے ہو۔ تو پھر موت کو اپنے اُوپر نہ آنے دو۔ وہ تو بہرحال آ ہی رہے گی۔ حق کی حمایت میں لڑتے ہوئے مرجانا ایک ذلت کی زندگی سے بہتر ہے +

۱۶۸ ۵۵۱- ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا۔ دیکھو نوٹ ۲۳۳

۱۶۹ ۵۵۲- ویستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم الا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ٥ جو لوگ شہید ہو گئے ان کو دوہری خوشی ہے۔ ایک تو یہ خوشی کہ اللہ کی جناب سے ان کو وہ رزق ملا جو اُن پر کبھی موت وارد نہ ہونے دے گا۔ اور دوسرے جو پیچھے رہ گئے ہیں اُن کے متعلق ان کو یہ خوشی ملتی ہے کہ اُن پر خوف و حزن نہیں رہے گا۔ یعنی وہ یقیناً کامیاب ہونگے +

رکوع ۱۸/۹
آیت ۱۷۱ ۵۵۳- الذین استجابوا للہ والرسول من بعد ما اصابھم القرح۔ وہ لوگ جنھوں نے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی۔ بعد اس کے کہ اُن کو زخم پہنچا۔ یہ ان مومنین کے کمال ایمان کو ظاہر کرتا ہے

۱۶۲ ۵۴۴- هم درجات عند الله یعنی لهم درجات ان کے لیئے اللہ تعالیٰ کے ہاں درجات ہیں۔ اور یا مراد یہ ہے کہ اللہ کے ہاں لوگوں کے مختلف مراتب ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے الناس معادن کمعادن الذهب والفضة

۱۶۳ ۵۴۵- لقد من الله على المومنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم يتلوا عليهم اٰيٰته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة - اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا۔ جب اُن کے اندر ایک رسول انہی میں سے مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیات کو پڑھتا اور ان کو پاک کرتا اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ کس قدر بڑا احسان یہ تھا۔ وہی شخص ذہن میں لاسکتا ہے جو ایک دفعہ جزیرہ نمائے عرب۔ بلکہ اس وقت کی کل دنیا کی حالت پر نظر ڈالے کہ کس طرح چاروں طرف گمراہی کا دور دورہ تھا۔ وان كانوا من قبل لفي ضلال مبين۔ تاریکی اور جہالت ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ اس خطرناک گمراہی اور سخت تاریکی کو دور کرنے کے لیئے اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر یہ احسان کیا کہ اُن میں سے ایک رسول بھیج دیا۔ تاکہ اس سے آیات اللہ کو سیکھ کر اور اُس کے ہاتھ سے پاک ہو کر اور اس سے کتاب اور حکمت کی تعلیم حاصل کر کے مومن خود دنیا کے مزکی اور معلم بنیں۔ جنگ کے واقعات میں اس ذکر کے لانے سے اس طرف بھی اشارہ کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ لڑائیاں یا اُن میں کامیابی کوئی اصل غرض اسلام کی نہیں۔ بلکہ اصل غرض ہے تزکیہ نفوس۔ اور تعلم و تعلیم کتاب و حکمت۔ سو اس اصل غرض کو جنگوں کے اندر بھی اسی طرح یاد رکھنا ضروری ہے۔ جس طرح گھروں میں امن سے بیٹھے ہوئے +

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبوت کی اصل غرض و غایت کو بیان فرمایا ہے۔ نبی سب سے پہلے اللہ کی آیات لوگوں پر پڑھتا ہے۔ یہاں آیات اللہ سے مراد اُس کی اپنی وحی ہے۔ اور لوگوں کے اوپر تلاوت کرنے کا منشاء یہ ہے کہ وہ لوگ بھی ان آیات اللہ کی تلاوت کریں۔ مگر یہ تلاوت بے معنی نہیں۔ بلکہ اس کی اصل غرض تزکیہ ہے۔ اس لیئے نبی بذریعہ ان آیات یا وحی کے جو اس پر نازل ہوتی ہیں لوگوں کا تزکیہ نفوس کرتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی ان آیات اللہ کی تلاوت تزکیہ نفوس کے لیئے کرتے ہیں۔ پھر اسی حد تک ان لوگوں کو نہیں چھوڑتا۔ بلکہ اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ تاکہ اس سے تعلیم پا کر وہ دوسروں کے لیئے معلم بنیں +

۱۶۴ ۵۴۶- اولما اصابتكم مصيبة قد اصبتم مثليها - تم کو کچھ تکلیف پہنچی جس کی دو مثل تم پہنچا چکے ہو یعنی احد میں جو تکلیف تم کو پہنچی ویسی ہی تکلیف خود جنگ احد کے اوائل میں اور پھر اس سے پہلے بدر میں تم دشمن کو پہنچا چکے ہو +

۵۴۷- قل هو من عند انفسكم - کہو وہ تمہارے اپنے ہی لوگوں یا اپنی ہی جانوں کی طرف سے ہے یعنی احد میں تم کو مصیبت نہ پہنچتی۔ اگر تمہارا ایک حصہ خلاف ورزی حکم رسول کی نہ کرتا۔ جماعت کے ایک حصہ کا

۱۷۲ بڑھتا کہ خدا کا طاقتور ہاتھ اب ہماری مدد کو ضرور آئے گا۔ یہ وہ صحابہ کا ایمان تھا جس نے انکی آنکھوں میں دنیا کی ساری طاقتوں کو ہیچ کر دیا تھا۔ اور جس کی وجہ سے ایک گدڑی پوش عرب کے دل میں کسریٰ جیسے بادشاہ کا دربار اور اُس کی ساری شان وشوکت ہیچ تھی۔ غرض نعیم بن مسعود کی یہ چال کام نہ آئی اور مسلمان مقابلہ کے لیئے نکلے اور موعود مقام پر ہو کر واپس آگئے ۔

۱۷۳ ۵۵۵۔ فانقلبوا بنعمة من الله وفضل لم یمسسهم سوء۔ سو لوٹ کر آئے اللہ کی نعمت اور فضل کو لے کر انکو کوئی تکلیف نہ پہنچی۔ چونکہ دشمن مقابلہ میں آیا ہی نہیں۔ اس لیئے تکلیف سے محفوظ رہے۔ مگر اس سے بڑھ کر یہ کہ وہاں یعنی بدر صغریٰ کے مقام پر ایک تجارتی میلہ لگتا تھا۔ وہاں خرید و فروخت کے ذریعہ انھوں نے فائدہ بھی اٹھایا۔

۱۷۴ ۵۵۶۔ انما ذلكم الشيطن يخوف اولياءه۔ یہ شیطان صرف اپنے رفیقوں کا ڈراوا دیتا تھا یا یہ شیطان صرف اپنے ساتھیوں کو ڈرا سکتا ہے۔ یہاں شیطان سے مراد وہی نعیم بن مسعود ہے جس کا ذکر اوپر نوٹ ۵۵۵ میں ہوا یا بعض نے کہا کہ یہ ڈراوا دینے والے عبد القیس کا ایک قافلہ تھا۔ بہر حال یہاں شیطان سے مراد انسان شیطان ہے۔ فرمایا کہ یہ شیطان کا جھوٹا ڈراوا ہے۔ [illegible] اپنے ساتھیوں یعنی منافقوں کے دلوں میں پیدا کر سکتا ہے۔ مومن اس سے نہیں [illegible] ۔

۱۷۷ ۵۵۷۔ انما نملي لهم ليزدادوا اثما۔ ہم ان کو مہلت دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گناہ میں بڑھتے ہیں۔ یہ لام عاقبت کا کہلاتا ہے۔ اس کے لانے سے کرنے والا کا منشاء یا ارادہ ظاہر کرنا مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف فعل کے نتیجہ کا اظہار ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا فالتقطه آل فرعون ليكون لهم عدوا وحزنا۔ پس اسے آل فرعون نے اٹھالیا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ وہ ان کا دشمن اور ان کے لیئے غم کا موجب ہوا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ آل فرعون کا موسےٰ کو اٹھانے سے یہ ارادہ نہ تھا۔ کہ وہ ان کا دشمن بنے یا ان کے لیئے غم کا موجب بنے۔ بلکہ ان کا تو خیال تھا۔ کہ شاید ہم کو نفع دے۔ پس یہاں لام صرف نتیجہ کو ظاہر کرنے کے لیئے ہے۔ اسی طرح جعلوا لله اندادا ليضلوا عن سبيله میں لام صرف نتیجہ کو ظاہر کرنے کے لیئے ہے ۔

۱۷۸ ۵۵۸۔ ما كان الله ليذر المومنين على ما انتم عليه حتى يميز الخبيث من الطيب وما كان الله ليطلعكم على الغيب ولكن الله يجتبي من رسله من يشاء۔ اللہ ایسا نہیں کہ مومنوں کو اس حالت پر چھوڑ دے جس پر تم ہو۔ یہاں تک کہ پلید کو پاک سے الگ کر دیکھے۔ اور اللہ ایسا نہیں کہ تم کو غیب کی خبر دے۔ بلکہ اللہ اپنے رسولوں میں سے جسکو چاہتا ہے چُن لیتا ہے۔ اس آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالےٰ ابتلاؤں اور مشکلات کے ذریعہ سے مومنوں کو منافقوں سے الگ کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ مشکلات میں مومن ہی ثابت قدم رہتے ہیں۔ اسی طرح جنگ احد کے واقعہ نے بھی مومنوں اور منافقوں کو الگ الگ کر دیا۔ اور مومنوں نے اپنی جانبازی سے اپنے ایمان کی صداقت پر مہر لگا دی۔ پہلے حصہ آیت میں فرمایا کہ مومنوں کو منافقوں سے الگ کرنا ضروری تھا۔ تا وہ جو خدا کی راہ میں جانفشانی سے کام کر سکتے ہیں۔ ایک الگ جماعت بن جائیں

نمبر ۵۵۵ حاشیہ — ایک تو وہ لوگ ہیں جن کا ذکر خدا کے کلام میں دوسری جگہ ہے۔ یعبد اللہ علی حرف ایک کنارہ پر کھڑے ہو کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اگر آرام ملتا رہا تو خوش رہے اور خدا کی راہ میں ذرا تکلیف پہنچی تو خدا کے ہی منکر ہو گئے۔ مگر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نہ صرف دین کی راہ میں اور اللہ کی رضا کے لیئے ہر قسم کے مصائب ہی اُٹھاتے تھے۔ بلکہ مصائب اُٹھا کر پھر بھی اللہ اور رسول کے حکم میں اسی طرح فرمانبرداری دکھاتے تھے۔ یہ ایک کامل الایمان لوگوں کا گروہ تھا۔ کہ اس قدر تکلیف اُٹھانے کے بعد جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تو پھر چل کھڑے ہوئے۔ یہ غزوہ حمراء الاسد کا ذکر ہے۔ اسی میدان احد سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم ابو سفیان کا تعاقب کریں گے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ابو سفیان احد کے میدان سے واپس ہوتا ایک مقام روحاء پر پہنچا تو اُس کو اور اسکے ساتھیوں کو بڑی ندامت ہوئی۔ کہ ہم نے مسلمانوں کو اس قدر کمزور کرکے پھر بغیر استیصال کے چھوڑ دیا۔ اسلیئے اُنھوں نے واپسی کا ارادہ کیا۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی تو آپ نے فوراً اپنے صحابہ کو کوچ کا حکم دیا۔ اور ایک مقام حمراء الاسد تک آپ گئے۔ مگر دشمن آپ کے آنے کی خبر سن کر پہلے ہی بھاگ چکا تھا۔

۱۷۲ — ۵۵۴۔ الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا۔ وہ لوگ جن کو لوگوں نے کہا کہ (دشمن) لوگوں نے ایک بڑا لشکر تمہارے لیئے جمع کیا ہے۔ پس ان سے ڈرو تو اس سے اُن کا ایمان بڑھا۔ یہاں ایک دوسرے واقعہ کی طرف اشارہ کرکے صحابہ کے کمال ایمان کا ذکر فرمایا ہے یہ وہ واقعہ ہے جو غزوہ بدر صغرے سے متعلق ہے۔ کہتے ہیں کہ ابو سفیان جب میدان جنگ سے چلا تو اُس نے کہا ہمارا تمہارا مقابلہ اگلے سال بدر صغرے کے مقام پہ ہوگا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو فرمایا کہ کہدو بہت بہتر ہے۔ جب اگلا سال آیا تو ابو سفیان اپنے آدمیوں کو لے کر نکلا لیکن جب ایک مقام مر الظہران پر پہنچا تو اللہ تعالے نے اُس کے دل میں رُعب ڈال دیا اور وہ وہیں سے واپس ہو گیا۔ وہاں ایک شخص نعیم بن مسعود اُسے ملا اور ابو سفیان نے اُسے کہا کہ میں تم کو دس اونٹ دونگا اگر تم محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو روک دو۔ اور اُسے یہ قصہ سنایا کہ میں نے اُحد کیوقت یہ وعدہ کیا تھا۔ کہ بدر صغرے میں ہم اگلے سال پھر جنگ کے لیئے آئیں گے۔ لیکن یہ سال ہمارے لیئے موزوں نہیں ہے۔ پس تم مدینہ جاؤ اور مسلمانوں کو ڈرا دو۔ چنانچہ یہ نعیم (جس کو آیت ۱۷۵ میں شیطان کے نام سے پکارا گیا ہے) مدینہ آیا اور مسلمانوں کی تیاری دیکھ کر اُن کو ڈرانا شروع کیا کہ پچھلے سال تمہارے گھر پہنچ کر وہ تم کو اس قدر نقصان پہنچا گئے تھے۔ اب اُنھوں نے اس قدر بڑی جمعیت تیار کی ہے کہ اگر تم اُن کے ساتھ لڑنے کے لیئے نکلوگے تو کوئی تم میں سے بچ کر نہیں آئے گا۔ مگر مسلمان تو خدائی وعدوں کے بھروسہ پر جنگ کر رہے تھے۔ نہ اپنے بازو کی قوت پر ان کو لشکروں اور جمعیتوں کا خوف کیوں ہوتا۔ بلکہ جس قدر لوگ دشمن کی کثرت سے ڈراتے اسی قدر اُن کا ایمان

۱۸۰

میں شامل ہونا پڑتا ہے۔ خدا کی عجب شان ہے۔ کہ نحن اغنیاء کہنے والوں کو کس طرح بتایا کہ تم باوجود صاحب
مال ہونے کے فقیر رہو گے۔ چنانچہ یہودی گو ہمیشہ سے یورپ میں لاکھ پتی اور کروڑ پتی رہے مگر ہمیشہ ذلیل اور در بدر
خوار ہوتے رہے اور بڑے بڑے سخت مصائب کا شکار ہوتے رہے ✣

۱۸۲

۵۶۲ - الذین قالوا ان اللہ عھد الینا الا نؤمن لرسول حتی یاتینا بقربان تاکلہ النار۔ وہ جو کہتے ہیں کہ
اللہ تعالےٰ نے ہمارے ساتھ یہ عہد کیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں۔ یہاں تک کہ وہ ایسی قربانی لائے۔
جسے آگ کھاتی ہو۔ اس قربانی سے جسے آگ کھا جائے۔ یہودیوں کی سوختنی قربانی مراد ہے۔ اس سوختنی قربانی کا ذکر
توریت کی کتاب احبار میں تفصیل سے موجود ہے۔ جس کے باب اوّل میں مختلف قسم کی سوختنی قربانیوں کے
متعلق ہدایات موجود ہیں۔ اور گائے بیل۔ بھیڑ بکری پرند ہر قسم کی سوختنی قربانیوں کا حکم ہے۔ گویا یہ
سوختنی قربانی شریعت موسوی کا جزو تھی۔ پس یہودیوں کا یہ کہنا کہ ہمارے ساتھ خدا کا یہ عہد ہے۔ کہ ہم کسی
نبی پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانی نہ لائے یعنی ایسی قربانی کا حکم نہ دے جسے آگ کھا جائے۔
درحقیقت اسی کے ہم معنی تھا۔ جو قول ان کا سورہ بقرہ میں اور اس سورت میں بار بار مذکور ہو چکا ہے
کہ اسرائیلی شریعت کے پیرو نبیوں کے سوائے ہم کسی پر ایمان نہ لائیں گے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ شریعت
محمدی میں سوختنی قربانی موقوف کی گئی ہے۔ یہ درحقیقت کسی معجزہ کا مطالبہ نہ تھا کیونکہ اس کے جواب
میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ کہدو کہ تمہارے پاس مجھ سے پہلے رسول آئے۔ بیّنات یعنی دلائل اور معجزات
کے ساتھ اور اُس کے ساتھ جو تم کہتے ہو بالبینٰت و بالذی قلتم۔ جہاں بالذی قلتم کو بیّنات سے الگ
کر کے بتا دیا ہے کہ یہ مطالبہ معجزہ کا نہیں۔ فلم قتلتموھم ان کنتم صٰدقین۔ اگر تم سچے ہو تو تم نے اُن کو
کیوں قتل کیا۔ گویا یہاں یہ ظاہر فرمایا ہے۔ کہ یہ تمہاری شقاوت قلبی کی وجہ سے ہے۔ ورنہ جن نبیوں کے
متعلق تمہارا یہ عذر نہ تھا اور وہ تمہارے پاس کھلے دلائل بھی لائے اور شریعت موسوی کے بھی پیرو تھے
جیسے بنی اسرائیل کے انبیاء۔ اُن کو تم کیوں قتل کرتے رہے۔ خطاب کے الفاظ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئیے
کیونکہ الزام قوم پر بحیثیت قوم کے ہے

۱۸۳

۵۶۳ - فقد کذب رسل من قبلک جاؤ ا بالبینٰت والزبر والکتٰب المنیر۔ تم سے پہلے بھی رسول جھٹلائے
گئے جو دلائل اور زبوروں اور روشن کتاب کے ساتھ آئے زُبُر۔ زبور کی جمع ہے۔ اور زُبْرۃ کی جمع بھی زُبُر
آجاتی ہے۔ زُبُرۃ کے معنے ہیں لوہے کا بڑا ٹکڑا۔ اور اس کی جمع زُبَر۔ با کے زبر کے ساتھ ہے جیسے اٰتونی
زُبَر الحدید (الکہف) ہیں۔ اور استعارہ کے طور پر۔ وہ چیز جو ٹکڑے ٹکڑے کی جائے۔ اس پر بھی زُبرۃ کا
لفظ بول دیتے ہیں اور اس کی جمع زُبُر آجاتی ہے۔ جیسے فتقطعوا امرھم بینھم زُبُرا۔ اور زبور جس کی جمع
زُبُر یہاں آئی ہے اس کے معنے کتاب ہیں۔ راغب میں ہے۔ کل کتاب غلیظ الکتابۃ یقال لہ الزبور
کیونکہ زبر لکھنے کے معنے میں آتا ہے۔ اور زبور بمعنے مزبور وہ چیز ہے جو لکھی جائے۔ اور زجاج کے نزدیک

آیت ۱۷۸

اور دوسرے حصّہ آیت میں فرمایا کہ اس تمیز کو اللہ تعالےٰ یوں پیدا نہیں کیا کرتا کہ منافقوں کے نام بتا دیا کرے لیطلعکم علی الغیب سے یہی مراد ہے بلکہ اس کی سنت جاریہ ہمیشہ سے یہی ہے کہ وہ ابتلاؤں اور تکلیفوں کے ذریعہ سے مومنوں اور منافقوں کو الگ الگ کر دیتا ہے۔ اس کی طرف اشارہ ہے یجتبی من رسلہ میں جہاں اپنی سنت مستمرہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جیساکہ سورہ بقرہ میں فرمایا تھا۔ ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ و لما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم الباساء و الضراء و زلزلوا حتی یقول الرسول والذین اٰمنوا معہ متی نصر اللہ ؏

آیت ۱۷۹

۵۵۹۔ ولا یحسبن الذین یبخلون بما اٰتھم اللہ من فضلہ ھو خیرا لھم بل ھو شر لھم۔ جو لوگ بخل کرتے ہیں اس مال کے متعلق جو اللہ نے اُن کو اپنے فضل سے دیا ہے وُہ اُن کے لیئے بہتری کا موجب نہیں بلکہ وہ اُن کے لیئے شر کا موجب ہے۔ سورہ بقرہ کے آخر میں انفاق فی سبیل اللہ کے فوائد کھول کھول کر بتائے تھے۔ اور اس کی طرف توجہ دلائی تھی۔ یہاں مختصر الفاظ میں ان لوگوں کا ذکر کیا جو اللہ کی راہ میں دینے سے بخل کرتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کا مال اُن کی بہتری کا موجب نہیں ہؤا کرتا۔ بلکہ ان کے لیئے دکھ کا موجب ہوتا ہے۔ چنانچہ یہودیوں کی وُہ دولت جو اُنھوں نے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کی۔ آخر اُن کے لیئے ہر جگہ اپنی ہی رسوائی کا موجب ہوئی ؏

۵۶۰۔ سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیٰمۃ۔ جو وہ بخل کرتے ہیں قیامت کے دن اسی کے طوق اُن کو پہنائے جائیں گے۔ اس میں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جیسا کوئی گناہ کرتا ہے ایسی ہی اس کی سزا پاتا ہے۔ دُوسری جگہ فرمایا کہ انسان کا ہر ایک عمل اُس کی گردن میں ڈالا جاتا ہے۔ یعنی اُس کے نتیجہ سے وُہ اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا۔ جیساکہ فرمایا وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بخل سے کس قدر نفرت تھی۔ حدیثوں میں آیا ہے کہ آپ اجود الناس تھے یعنی سب لوگوں سے زیادہ سخی۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ نے کبھی کسی سائل کو رد نہیں کیا ؏

رکوع ۱۹ ع
آیت ۱۸۰

۵۶۱۔ لقد سمع اللہ قول الذین قالوا ان اللہ فقیر و نحن اغنیاء سنکتب ما قالوا۔ اللہ ان لوگوں کی بات کو سنتا ہے جنھوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں ہم اُسے محفُوظ رکھیں گے مدینہ کے مُسلمان یعنی انصار تو اکثر کھیتی باڑی کرنے والے لوگ تھے۔ اور بڑے مالدار نہ تھے۔ مہاجرین سب مال و دولت و املاک سے دست بردار ہو کر یہاں پُہنچے تھے۔ یہودی باوجود اہل کتاب ہونے اور سنت اللہ سے واقف ہونے کے بیہُودہ طور پر بکواس کرتے رہتے تھے۔ ان اللہ فقیر سے اس صورت میں یہ مراد ہے کہ اللہ فقیر ہے کیونکہ اپنے مومنوں کو وہ بہُت سا روپیہ نہیں دے دیتا۔ یا چونکہ جنگوں کے لیئے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو چندے بھی کرنے پڑا کرتے تھے تو اس پر یہ لوگ استہزاء کرتے تھے کہ کیا خدا فقیر ہے جو چندوں کی ضرورت پڑ گئی حالانکہ یہ بدبخت قوم خوب اس بات سے واقف تھی کہ سنت اللہ یوں ہی ہے کہ مومنین کو مالی اور جانی ہر قسم کے جہاد

تفسیر: ربنا ما خلقت ھذا باطلا سبحانك فقنا عذاب النار۔ وہ لوگ جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمینوں کی مخلوق میں فکر کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب تو نے اس کو باطل پیدا نہیں کیا۔ تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے۔ تو ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اسلام نے انسانی قوی کی تمام شاخوں کی یکساں نشوونما کی ہے۔ چونکہ ان دونوں سورتوں میں یعنی سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران میں مسلمانوں کو تمام کامیابی کی راہیں بتائی ہیں۔ اس لیئے اُن کے اندر ہر قسم کی وہ ہدایات جمع کر دی ہیں جنپر چل کر وہ ایک کامیاب اور زندہ قوم بن سکتے۔ اور بن جانے کے بعد زندہ اور کامیاب قوم رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی ابتداء ان الفاظ سے کی تھی کہ جو لوگ فلاں فلاں اصول پر عمل پیرا ہونگے اولئك علے ھدی من ربھم واولئك ھم المفلحون یہی لوگ سیدھی راہ پر ہیں اور یہی کامیاب ہونگے۔ اور آل عمران کا خاتمہ بھی ان الفاظ پر کیا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔ تقوی اللہ اختیار کرو۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ پس ان دو سورتوں میں ساری کامیابی کی راہیں بتا دی ہیں۔ ان اصول دین سے لے کر جن پر مذہب کی بنیاد ہے۔ اللہ پر ایمان۔ نبیوں اور کتابوں پر ایمان۔ اعمال کی جزاء و سزا پر ایمان۔ اور عملاً۔ اقامت صلوٰۃ۔ اور انفاق اس آخری حد تک کہ کامیاب اور زندہ قوم کے لیئے یہ بھی ضروری ہے کہ وُہ علوم کی طرف توجہ کرے جنگوں کا ذکر بھی اسی لیئے کیا۔ کہ زندہ قوم کو جنگوں کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ قربانی اور ایثار پر بھی بڑا زور دیا۔ اور اب اس رکوع میں یہ فرمایا۔ کہ خدا کی مخلوق میں بھی غور اور فکر کرو۔ اور تغیرات زمانہ پر بھی غور و فکر کرو۔ ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنھار لآیت۔ مگر علوم کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ساتھ ہی بتا دیا۔ کہ تمہارا علوم میں اس طرح انہماک نہ ہو کہ خدا کو ہی بھول جاؤ۔ اس لیئے مقدم اس بات کو کرو کہ اللہ تعالیٰ کا خیال کھڑے اور بیٹھتے اور لیٹتے غرض ہر حالت میں تمہارے دلوں پر غالب ہو +

۵۶۶- ربنا انك من تدخل النار فقد اخزیتہ ..... واتنا ما وعدتنا علی رسلك ولا تخزنا یوم القیامة انك لا تخلف المیعاد۔ اس دعا کو ختم ان الفاظ پر کیا ہے۔ کہ ہم کو وہ کامیابیاں اور وُہ انعامات عطا فرما جن کا وعدہ تو نے اپنے رسولوں کی زبانی کیا ہے۔ رسولوں کی زبانوں پر جو وعدہ اللہ نے فرمایا تھا اُسکا ذکر اسی سورت میں ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وعدہ کی طرف ہی اشارہ ہو جو خاص محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ کہ میں تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی کامیاب کروں گا سورہ بقرہ میں اس کی بجائے یہ الفاظ ہیں فانصرنا علی القوم الکافرین۔ جس سے معلوم ہوُا کہ یہی وعدہ رسولوں کی زبانی ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو کافروں پر نصرت عطا فرمائے گا۔ اور اُن کے دین کو دنیا میں غالب کرے گا +

۵۶۷- فاستجاب لھم ربھم۔ اُن کے رب نے اُن کی دُعا کو قبول فرمایا۔ سورہ بقرہ میں صرف دُعا پر خاتمہ کر دیا تھا۔ مگر یہاں اس دُعا کی قبولیت کا بھی تصریح کے ساتھ ذکر فرمایا +

(حاشیہ: ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲ — ۵۶۵)

الزبور کل کتاب ذی حکمۃ یعنی ہر ایک کتاب جس میں حکمت کی باتیں پائی جائیں وہ زبور ہے اور بعض کے نزدیک وہ کتاب جس میں نری حکمت کی باتیں ہوں اور احکام شرعی نہ ہوں زبور ہے۔ حضرت داؤد کی کتاب کا نام اللہ تعالےٰ نے خصوصیت سے زبور لیا ہے۔ یہاں کتاب منیر کے مقابل میں زُبُر کا لفظ لانے سے یہ سمجھا گیا ہے کہ زبر سے مراد صحیفے ہیں اور کتاب منیر سے مراد توریت۔ انجیل اور زبور ہیں۔ مگر قرآن نے صحف ابراھیم و موسیٰ بھی فرمایا ہے۔ ہاں یوں کہہ سکتے ہیں کہ زبر سے مراد وہ کتابیں ہیں جو ان انبیاء کو ملیں جو شریعت موسوی کے پیرو تھے اور کتاب منیر سے مراد توریت ہے۔ مگر اسکا یہ مطلب نہیں کہ زبور اور کتاب کوئی الگ الگ شئے ہیں ہر ایک زبور بھی ایک کتاب ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ حضرت داؤد کو زبور دیا جانے کا ذکر فرمایا تو دوسری جگہ آپ کو کتاب کا دیا جانا بیان فرمایا ہے۔ [illegible] کتاب شریعت کے بالمقابل ان کتابوں کا نام زبور رکھدیا ہے۔ اسی لیئے یہاں اس کو کتاب المنیر کہدیا ہے۔ ویسے کل انبیاء کی کتابوں کو زُبُر بھی کہدیا ہے۔ جیسے سورہ شعرا میں ہے۔ وانہ لفی زبر الاولین [illegible] تعالیٰ پیشگوئیاں پہلی ساری زبوروں میں موجود ہیں۔ جن میں توریت بھی شامل ہے۔ بلکہ اس [illegible] یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ زُبُر سے مراد صرف پیشگوئیوں کا حصہ ہو جو ہر نبی کو دیا گیا۔ اور کتاب منیر سے مراد ہر نبی کی کتاب جس میں مواعظ اور احکام ہوں ۞

۱۸۵ ۵۶۴- لتبلون فی اموالکم وانفسکم ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذی کثیرا۔ تم ضرور آزمائے جاؤ گے۔ اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں۔ اور تم کو سننی پڑیں گی بہت سی دکھ کی باتیں ان لوگوں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور اُن سے جو مشرک ہیں۔ سورہ بقرہ میں فرمایا تھا ولنبلونکم بشیئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات۔ یہاں اسی کی طرف اجمالاً اشارہ فرمادیا۔ مگر اس ابتلا کے علاوہ ایک اور قسم کے ابتلا کا ذکر فرمایا۔ اور وہ یہ ہے کہ اہل کتاب سے اور مشرکوں سے بہت سی دکھ کی باتیں سننی پڑیں گی۔ یعنی علاوہ مالی اور جانی نقصان کے تمہارے خلاف زبانوں سے بھی کام لیا جائیگا۔ اور تمکو دکھ دینے والی باتیں اہل کتاب اور مشرکوں سے سننی پڑیں گی نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ زبانوں کیساتھ دکھ دیا گیا ہوگا۔ اس کا علم تو سوائے چند اشاروں کی جو قرآن کریم میں ہیں اور چند واقعات حدیث کے ہم کو کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن جو نظارہ اس قرآنی پیشگوئی کا ہمارے زمانہ نے دیکھا ہے وہ آنحضرت کے بعد شاید ہی کبھی زمانہ نے دیکھا ہو۔ ایک طرف پادریوں نے اور دوسری طرف آریوں نے اسلام کے خلاف ایسی زبان کھولی ہے۔ اور ایسے ایسے ناپاک اور گندے حملے ذات مقدس نبوی پر اور آپ کے ازواج مطہرات اور صحابہ پر کیئے ہیں کہ الامان۔ نہایت ناپاک اور گندے الفاظ میں سید نوع بشر کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اور وہ جو تمام پاکوں کا سردار ہے اس کو نعوذ باللہ من ذالک ڈاکو اور لٹیرا اور کیا کیا کہا گیا ہے ۞

۱۹۰ ۵۶۵- الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبھم ویتفکرون فی خلق السموات والارض۔

۱۹۵

صحابہ میں سے ہر ایک صلیب سے بڑھ کر مصیبت اُٹھاتا ہے۔ ہجرت کی گھروں سے نکالے گئے۔ پھر دوسری جگہ چلے جانے کے باوجود بھی خدا کی راہ میں اُن کو دکھ دیئے گئے۔ یہاں تک کہ اُن کو جنگ کرنے پڑے اور ایک گروہ اُن میں سے قتل ہو گیا۔ حق یہ ہے کہ ایک کی صلیب سے دُوسرا نہیں بچتا۔ بلکہ صلیب سے بڑھ کر جو شخص مصائب اُٹھاتا یا اُٹھانے کے لیئے تیار رہتا ہے وہی گناہوں سے پاک کیا جاتا ہے۔ اور وہی نجات پاتا ہے۔ مسلمان بھی آج اپنے حالات پر غور کریں کہ انھوں نے خدا کی راہ میں کیا دکھ اُٹھایا ہے یا کس قدر دکھ اُٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ دینی جنگ تو ہے نہیں۔ گھروں سے اُن کو نکالا نہیں جاتا۔ کاش خدا کی راہ میں اتنا ہی دکھ اُٹھانے کے لیئے تیار ہوتے۔ کہ اپنی آسائش کو کم کر کے کچھ حصہ مال کا خدا کی راہ میں خرچ کرتے +

۵۷۰۔ لا یغرنک تقلب الذین کفروا فی البلاد متاع قلیل۔ شہروں میں کافروں کا تصرّف تم کو مغالطہ میں نہ ڈالے۔ یہ تھوڑا سا سامان ہے۔ یہاں اس پیشگوئی کی اور بھی وضاحت کی ہے کہ کفار کا تصرّف صرف چند روزہ ہے۔ اور جلدی ہی اس کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے۔ کیا طاقت ہے اور کیسا وسیع وہ قلب ہے جس پر یہ وحی نازل ہوتی ہے۔ کہ ادھر کفّار کے ہاتھ سے دکھ اٹھاتے ہیں اُدھر یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہ طاقت کفار کی جلد ختم ہونیوالی ہے۔ تقلّب سے مراد تصرّف فی التجارات والمکاسب لیا گیا ہے یعنی ہر قسم کی تجارتوں اور پیشوں پر انکا تصرّف کیونکہ اس وقت مسلمان تجارت وغیرہ کے لیئے بھی باہر نہ نکل سکتے تھے +

۱۹۷

۵۷۱۔ لکن الذین اتقوا ربھم لھم جنّٰت تجری من تحتھا الانھٰر خٰلدین فیھا نزلًا من عند اللہ وما عند اللہ خیر للابرار۔ لیکن ان لوگوں کے لیئے جنھوں نے اپنے رب کا تقوے اختیار کیا باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ انہی میں رہیں گے یہ اللہ کی طرف سے ان کی مہمانداری ہے۔ اور اللہ کے ہاں جو ہے وہ نیکوں کیلئے بہت بہتر ہے۔ باغوں کے متعلق نوٹ ۵۵ میں لکھا جا چکا ہے۔ اس آیت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ ان باغوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ نزلًا من عند اللہ۔ نزل۔ اس کو کہتے ہیں جو مہمان کے لیئے بطور مہمانداری پہلے پیش کیا جاتا ہے۔ گویا یہ دُنیا کے باغات جن کا وعدہ فتوحات کے رنگ میں دیا گیا ہے۔ یہ گویا مہمانداری کا پیش کش ہے۔ اس سے بہت بہتر چیزیں اللہ کے ہاں اُن کے لیئے موجود ہیں +

۱۹۸

۵۷۲۔ وان من اھل الکتاب لمن یؤمن باللہ۔ اس آیت میں اہل کتاب مومنین کا ذکر ہے۔ ابھی تک تو اہل کتاب اسلام میں بہت کم داخل ہوئے تھے۔ یہ ایک پیشگوئی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو ابھی فرمایا تھا کہ تم کو اُن اہل کتاب سے جنکو تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے۔ بہت کچھ دکھ کی باتیں سننی پڑیں گی۔ تو یہاں گویا تسلی دی ہے کہ یہ بھی ایک وقت ہے۔ وہ بھی وقت آئے گا کہ اہل کتاب میں سے لوگ اللہ پر اور قرآن پر ایمان لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نظارہ اس زمانہ میں بھی ہمیں دکھا دیا ہے کہ ایک طرف اگر پادریوں نے اسلام پر بے باکانہ حملے کیئے ہیں تو دوسری طرف اہل کتاب میں سے لوگ اسلام میں بھی داخل ہو رہے ہیں۔ اور ایک قلیل عرصہ میں ووکنگ مشن کے تھوڑے سے کام سے ڈیڑھ سو کے قریب ذی عزت اور ذی علم لوگ۔ بڑے بڑے نواب

۵۶۸- انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثیٰ۔ مَیں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو خواہ مرد ہو یا عورت ضائع نہیں کروں گا۔ یہ قبولیت دُعا ہے۔ کہ کام کروگے تو اجر پاؤگے۔ یہ نہیں کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر دُعا کرتے رہو تو بھی کچھ ملے گا۔ کیسی پاک تعلیم اسلام کی ہے۔ صرف دُعا کوئی چیز نہیں جب تک کہ اُس کے ساتھ عمل نہیں۔ مسلمانوں نے دُعا کے مسئلہ کو کس قدر غلط سمجھ رکھا ہے۔ بعض تو قبولیت دعا کے ہی منکر ہوگئے بعض افراط کی طرف چلے گئے۔ مگر یہ قرآن کی تعلیم نہ تھی۔ دُعائیں بھی کرو کام بھی کرو تو اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے کہ تمہاری دعاؤں کو قبول کرے گا اور تمہاری محنتوں کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ یہاں بھی قوائے انسانی کی ساری شاخوں کی تربیت کو مدِّ نظر رکھا ہے۔ دُعا سکھائی ہے۔ اس کی قبولیت کا وعدہ دیا ہے۔ تو ساتھ عمل کو ضروری ٹھیرا دیا ہے کہ تا افراط و تفریط سے لوگ بچے رہیں ✦

۵۶۹- فالذین ھاجروا واخرجوا من دیارھم واوذوا فی سبیلی وقٰتلوا وقتلوا لاکفرن عنھم سیاٰتھم ولادخلنھم جنّٰت تجری من تحتھا الانھٰر۔ پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں اُن کو دُکھ دیئے گئے اور اُنھوں نے جنگ کیئے اور مارے گئے اُن سے میں اُن کی برائیوں کو دور کروں گا۔ اور اُن کو باغوں میں داخل کروں گا۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ اس استجابت دُعا کا اب تفصیلی ذکر ہے اور ان کی نسبت دو وعدے فرمائے۔ ایک اُن کو گناہوں سے پاک کرنا دوسرے باغات میں داخل کرنا۔ پس صحابہ رضی اللہ عنہم کا گروہ وہ گروہ تھا۔ جسے اللہ تعالےٰ نے گناہوں سے پاک کر دیا اور چونکہ یہ ایک امر نظروں سے پوشیدہ تھا۔ اس لیئے اس کی صداقت پر ایک کھلی کھلی شہادت اور بیان کی کہ ان کو نہروں والے باغوں میں داخل کیا جائے گا۔ یہ دوسرا وعدہ گو اخروی زندگی کے متعلق بھی ہے۔ مگر صحیح مسلم کی حدیث میں دجلہ اور فرات کو اور جیحون اور سیحوں کو انہار الجنۃ قرار دے کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس سرزمین کا نام بھی جہاں دجلہ اور فرات بہتے ہیں کتب مقدسہ کی پیشگوئیوں میں جنّت ہے پس اس پاک گروہ کو اللہ تعالےٰ نے یہ سرزمین دے کر نہ صرف آخرت کی جنّت کے وعدہ کی صداقت پر مُہر لگا دی بلکہ اس پہلے وعدہ پر بھی یہ شہادت ہوئی۔ کہ یہ گروہ گناہوں سے پاک کیا گیا تھا۔ اور اس میں الذین ھاجروا واخرجوا من دیارھم یعنی مہاجرین سب سے اوّل ہیں۔ پس مہاجرین کو بُرا کہنے والے قرآن کے ان الفاظ سے ڈریں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ شام کی سرزمین کا وعدہ اس وقت دیا جاتا ہے جب ابھی احد میں یعنی مدینہ کے پاس کفار کے ہاتھ سے مسلمان سخت مصیبت اُٹھا چکے ہیں۔ قرآن کریم کی پیشگوئیوں میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ جس قدر مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اُسی قدر تصریح کے ساتھ اور اسی قدر زیادہ کامیابیوں کے وعدے اُن کو دیئے جاتے ہیں۔

یہ بھی قابل غور امر ہے کہ یہاں اللہ تعالےٰ نے کس قدر امور کو گناہوں سے پاک کرنے کے لیئے ضروری قرار دیا ہے۔ مسیحی تو ایک مسیح کی صلیب کو لیئے پھرتے ہیں۔ کہ اس سے ساری دُنیا گناہوں سے پاک ہوگئی یہاں تو

کالجوں کے پروفیسر۔ ایڈیٹر۔ سرکاری عہدوں پر ممتاز جیسے میجر کپتان اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔

۱۹۹ ۵۷۳۔ یا یہا الذین اٰمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور صبر میں فوقیت لے جاؤ اور مضبوط ہو جاؤ تاکہ تم کامیاب ہو۔ جیسا کہ میں نے سورۂ آل عمران کے شروع میں کہا تھا۔ اس سورت اور سورہ بقرہ کا درحقیقت ایک ہی مضمون ہے اور ان دونوں میں مسلمانوں کو کامیاب اور زندہ بننے کی راہ بتائی گئی ہے۔ چنانچہ فلاح یا کامیابی سے ہی اُن کی ابتداء ہوئی اور فلاح اور کامیابی پر ہی انکا خاتمہ ہوتا ہے سورہ بقرہ کے شروع میں فرمایا تھا اولٓئک ھم المفلحون اور اب آل عمران کے اخیر میں فرمایا لعلکم تفلحون۔ پس اوّل وآخر بھی ان سورتوں کے اصل مضمون کا فیصلہ کرتے ہیں۔

یہاں فلاح کے لیئے تین باتیں بتائی ہیں۔ صبر۔ مصابرہ۔ رباط ان تینوں الفاظ میں اگر ایک طرف نیکی پر قائم ہونے اور باہم اچھا معاملہ کرنے کی ہدایت ہے تو دوسری طرف بدی کے مقابلہ اور دشمن کے مقابل میں تیار رہنے کی ہدایت ہے۔ صبر تو یہ ہے کہ نیکی پر قائم ہو جائے۔ اور معصیت سے رک جائے یا جو مشکلات اور مصائب قضاو قدر سے یا دشمن کی طرف سے پیش آئیں اُن کو برداشت کرے اور اُن کے نیچے ہمت کو نہ ہارے۔ مصابرہ ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرنا یا اپنی خواہشات کے ساتھ جہاد کرنا۔ یا اپنوں اور قریبیوں اور ہمسائیوں سے جو دکھ پیش آئیں ان کو برداشت کرنا۔ یا مصائب اور تکلیفوں کی برداشت میں اپنے دشمن سے فوقیت لے جانا ہے گویا دشمن کے مقابلہ میں اس سے بڑھ کر مصائب کو برداشت کرنے کے عادی ہو۔ اور رباط سے مراد لزوم اور ثبات ہے یعنی نیکیوں کے کرنے پر یا بدی سے رکنے یا مصائب و مکارہ کے اٹھانے میں دوام اور مضبوطی اختیار کی جائے اور دشمن کے مقابلہ میں رباط سے مراد ہے ربط الخیل فی الثغور۔ یعنی سرحدوں پر گھوڑوں کا باندھنا۔ گویا ہر وقت دشمن کے مقابلہ کے لیئے مومن تیار رہے۔ اور ایک لحہ بھی اُس کی طرف سے غافل نہ ہو۔ دشمن سے مراد ملکی دشمن ہی نہیں۔ جو لوگ دین پر حملہ کرتے ہیں ان کے مقابل میں دلائل اور جواب سے اسی طرح تیار رہنا چاہیئے۔ مگر افسوس کہ مسلمان اسقدر غفلت کی نیند سو رہے ہیں کہ ان کے مذہب پر حملہ پر حملہ ہو رہا ہے۔ کتابوں پر کتابیں نکل رہی ہیں اور وہ تاریک کوٹھڑیوں کے اندر آنکھیں بند کیئے ہوئے یہی سمجھ رہے ہیں کہ کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ تیاری کیسی۔ یہاں تو ایسی غفلت اور نیند میں پڑے ہیں کہ موت قبول کرنے کو راضی ہیں مگر بیدار ہونا نہیں چاہتے۔ افسوس کہ جس قدر ہوشیار اور چوکس رہنے کی تعلیم اس قوم کو دی گئی تھی اسی قدر زیادہ غفلت میں یہ مبتلا ہو گئے۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ اصولِ قرآنی کو محکم نہ پکڑیں +